# ناقدینِ اقبال کا تنقیدی مطالعہ

(مقالہ برائے ڈاکٹر آف فلاسفی)

مقالہ نگار

**عزیر احمد**

نگراں

**پروفیسر ابن کنول**

(ناصر محمود کمال)

**شعبۂ اردو**

دہلی یونی ورسٹی، دہلی، 110007

2014

# ناقدین اقبال کا تنقیدی مطالعہ

(مقالہ برائے ڈاکٹر آف فلاسفی)


مقالہ نگار

**عزیر احمد**

نگراں

**پروفیسر ابن کنول**

(ناصر محمود کمال)


**شعبۂ اردو**

دہلی یونی ورسٹی، دہلی، 110007


2014

## DECLARATION
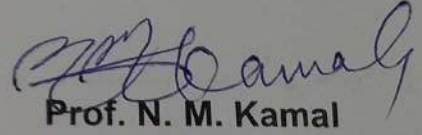
I to certify that the matter of this thesis entitled "**Naaqadin -e- Iqbal Ka Tanqeedi Mutalaa**" is an original work and to the best of my knowledge this work or any part of it has not been published or submitted for the degree of Ph.D. or any other degree or Diploma in this university or any other institution.

This is being submitted to the University of Delhi for the award of the degree of Doctor of philosophy in Urdu.

Name: **Uzair Ahamad**

(Research Scholar)
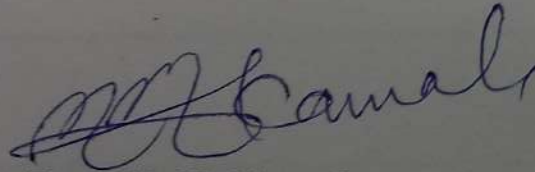
**Prof. N. M. Kamal**

(Supervisor)

Enrolment No. Roll No. URD/24/07

Date of admission:23.03.2011

Date of submission:

**Prof. N. M. Kamal**
Head
Deptt. of Urdu
University of Delhi

# پیش لفظ

اردو زبان وادب میں اقبال اور غالب دو ایسی شخصیتیں ہیں جن کی زندگی، شخصیت، فکر اور فن پر دیگر شعرا کی بہ نسبت زیادہ توجہ دی گئی۔ تاہم اس معاملہ میں بھی علامہ اقبال، غالب سے زیادہ خوش قسمت ثابت ہوئے۔ غالب کو پوری زندگی اپنی ناقدری کا شکوہ رہا جب کہ اقبال اپنی زندگی ہی میں شہرت ومنزلت کے اعلامقام پر پہنچ گئے تھے۔ ان کی زندگی ہی میں ان پر مضامین اور کتابیں لکھی گئیں۔ رسائل کے خصوصی نمبر نکالے گئے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ سر عبدالقادر کے مضمون سے لے کر اب تک علامہ اقبال کی فکر و فن، شخصیت اور سوانح پر لکھی گئی کتابوں کی تعداد ڈھائی ہزار سے بھی زائد ہے۔ ادب میں اقبالیات نے ایک مستقل شعبہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے جس کے ضمن میں اقبال کی شخصیت، فکر اور فن کے حوالے سے لکھی گئی ہر تحریر، خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں، موضوع بحث بنتی ہیں۔ خود اقبال کے نثری اور شعری سرمایے کو بھی "اقبالیات" ہی کے ضمن میں رکھا جاتا ہے۔

اقبالیات میں کتابوں کی کثرت کے باوجود ایسی کتابوں کی تعداد جو اقبال کے فکر و فن کی تفہیم میں زیادہ دیر اور دور تک ساتھ دے سکیں، اتنی کم ہے کہ انہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ اکثر کتابیں اقبالیات میں عددی اضافہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ الفاظ کے تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ سابقہ اقبال شناسوں کی باتوں کا اعادہ ہیں۔ اقبال پر کثرت سے لکھا جارہا ہے۔ بیشتر نقادوں نے اپنے تنقیدی سفر کا آغاز اقبال سے ہی کیا ہے۔ یہ اقبال کی مقبولیت ہی نہیں بلکہ ان کی مظلومیت کی بھی دلیل ہے۔ ان مبتدیانہ تنقیدی کاوشوں کا ایک بڑا حصہ 'صاحب کتاب' بننے کی طلب کی وجہ سے کتابی صورت میں سامنے آجاتا ہے اور اقبالیات میں معیاری اضافہ کے بجائے خزف ریزوں کی تعداد میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

اس وجہ سے ضرورت اس بات کی تھی کہ اقبال شناسوں کی تنقیدی اور تحقیقی کاوشوں کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے اور معلوم کیا جائے کہ ان میں سے کس نے اقبال کے فکر و فن کے ساتھ انصاف کیا ہے اور کون سے ناقدین ان کے فکر و فن اور شخصیت کے اسرار و رموز نیز فنی و فکری سطح تک پہنچنے میں ناکام رہے۔

اقبالیات کے سرمایہ کو بنیادی طور پر چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

سوانح، فکر و فلسفہ، فن اور شروحات، اس وجہ سے میں نے اپنے مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب 'اقبال کے سوانح نگار' ہے۔ اس میں ان اقبال شناسوں کو رکھا گیا ہے جنہوں نے اقبال کی سوانح عمری مرتب کی ہے۔ اقبال کی عظمت کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے ان میں شاعری کے علاوہ ان کی شخصیت کی جاذبیت بھی ہے۔ اس باب کے شروع میں ایک مختصر نوٹ اردو میں سوانح نگاری کی روایت پر شامل کیا گیا ہے۔ تاکہ سوانحی ادب کا ایک سلسلہ وار مطالعہ سامنے آجائے۔ اقبال کے سوانح نگاروں ہی کے ضمن میں ان سوانح نگاروں کو بھی رکھا گیا ہے جنہوں نے اقبال کی زندگی کے کسی ایک گوشہ پر بھی لکھا ہے۔ مثلاً اقبال کی ازدواجی زندگی، یا تعلیمی سفر پر لکھنے والے شارحین وغیرہ۔

مقالے کا دوسرا باب 'اقبال کی فکر و فلسفہ کے ناقدین' ہے۔ اس میں ان اقبال شناسوں کو رکھا گیا ہے جن کی زیادہ تر تنقید اقبال کے فکر و فلسفہ پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالیات کا زیادہ تر سرمایہ اقبال کے فکر و فلسفہ کی تنقید پر مشتمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں مشرق و مغرب کی خوشہ چینی اور خود اقبال کی جدت طبع کے نتیجے میں فکر و فلسفہ کی جو دنیا آباد ہے وہ ناقد کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد دین سے لے کر عصر حاضر کے ناقدین اقبال تک سب نے اقبال کی شاعری اور فن کی عظمت کے اعتراف کے باوجود اقبال کی فکر و فلسفہ پر توجہ زیادہ دی ہے۔

تیسرے باب 'اقبال کے شاعری کے نقاد' میں ہم نے ان ناقدین اقبال کو رکھا ہے جنہوں نے اقبال کے فن پر تنقید کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اقبال کی شاعری اور فن کو ان کے فکر و فلسفہ سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس لیے کہ اقبال کے یہاں فکر و فلسفہ میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ شاعری کے اعلی فنی نمونوں میں ان کے یہاں فکر و فلسفہ کے جواہر ریزے بکھرے ہوئے ہیں۔ ناقدین اقبال کا اس بابت شدید اختلاف ہے کہ اقبال بحیثیت شاعر مقدم ہے یا بحیثیت مفکر و فلسفی۔ حالانکہ دونوں کے یہاں اس بات پر عمومی طور پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ اقبال شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی۔ مسئلہ صرف اولیت کا ہے۔ اس وجہ سے میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ کس کو فکر کے ناقدین کے زمرے میں رکھا جائے

اور کس کو فن کے ناقدین کے زمرے میں۔ اس سلسلے میں دو باتوں کا اعتبار کیا گیا ہے۔ پہلا خود ناقد کی رائے کا، کہ وہ اقبال کی کس حیثیت کو مقدم کرتا ہے؟ دوسرے اس کے اقبال تنقید کے زیادہ تر سرمائے اقبال کے فن سے متعلق ہیں یا فکر سے ہیں۔ ہمارا یہ مطالعہ ناقدین اقبال کا مطالعہ ہے۔ اس وجہ سے ایک ناقد کو ایک ہی جگہ اس کی ترجیحات کے مطابق فکر، فن، سوانح یا شارح میں سے کسی ایک زمرہ میں رکھا گیا ہے۔ اسی کے تحت اس ناقد کی اقبال تنقید کی دوسری کاوشوں کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ مثلاً جگن ناتھ آزاد کو اقبال کے سوانح نگاروں میں رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کی اقبال کی فکر و فن کی تنقید کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

چوتھا باب 'اقبال کے شارحین' کا ہے۔ اس میں کلام اقبال کے ان شارحین کا جائزہ لیا گیا ہے جنھوں نے اقبال کے کلام کی شرحیں لکھی ہیں۔ شارحین اقبال میں یوسف سلیم چشتی کے علاوہ کسی نے سبھی مجموعوں کی شرح نہیں لکھی ہے۔ ان میں سے کچھ نے ایک سے زائد مجموعوں کی شرح لکھی ہے تو کچھ نے صرف ایک مجموعے کی شرح لکھی ہے۔ اس باب میں ان شارحین اقبال کا جائزہ لے کر ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب کے شروع میں ایک مختصر نوٹ اردو میں شرح نگاری کی روایت اور ضروری مسائل پر تحریر کیا گیا ہے۔

مقالے کے آخر میں ایک خلاصہ شامل ہے جس میں پورے مقالہ کے اہم نکات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کتابیات میں بنیادی مآخذ کے تحت اقبال کی شعری اور نثری تصانیف درج کی گئی ہیں۔ اس کے بعد ان کتابوں کو درج کیا گیا ہے جن سے دوران تحقیق استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے باعتبار مصنفین ہے۔

اقبال پر لکھنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر اقبال پر ایک دو مقالہ لکھنے والوں کا ذکر بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو صرف نام ہی سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ مطالعہ ایک صدی سے بھی زائد عرصہ پر محیط ہے اس لیے اگرچہ ہم نے اکثر اہم ناقدین کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ کچھ اہم نام شامل ہونے سے رہ گئے ہوں۔

ترتیب میں اقبال شناسوں کی عمر اور مرتبہ کا خیال رکھا گیا ہے۔ پہلے ان ناقدین کو رکھا گیا ہے جو اقبال تنقید میں خشت اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بعد ان کو جو ان سے عمر میں کم ہیں۔ ناقدین اقبال کی اس کہکشاں میں اقبال کے مداح مولانا عبد السلام ندوی، سید عابد علی عابد بھی ہیں اور کلیم الدین احمد، سلیم احمد، مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری

جیسے اقبال شکن بھی۔ ہمارے لیے وہ اقبال شکن ناقدین بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے دوسرے ناقدین اقبال۔ اس لیے کہ اقبالیات کو فروغ دینے میں ان کا بھی اہم کردار ہے۔

اس موقع پر میں اپنے تمام اساتذۂ کرام کا اور خصوصی طور پہ اپنے نگراں ، مشفق و مربی استاد پروفیسر ابن کنول صاحب، صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے ہماری رہنمائی کی۔ یہ سچ ہے کہ ان کی رہنمائی کے بغیر میں یہ بار گراں اٹھانے کا متحمل نہیں تھا۔ اپنے دوستوں میں عظیم الدین، سلمان فیصل ، (ریسرچ اسکالرس، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، محمود فیصل اور شمیم اختر (ریسرچ اسکالرس، دہلی یونیورسٹی) کا ممنون ہوں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس مقالے کا پروف دیکھا۔ اپنی شریک حیات نا ءمہ عزیز کا شکریہ ادا کرنا فرض سمجھتا ہوں کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مجھے ہر قسم کی مصروفیات سے دور رکھا بلکہ مقالے کی تصحیح و تسوید میں بھی ہماری مدد کی۔ آخر میں اپنی والدہ کا شکریہ جس کی آہ سحر گاہی کا ثمرہ ہے کہ میں یہ مقالہ جمع کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کو اجر عظیم دے۔ آمین

عزیر احمد

ریسرچ اسکالر

(شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی)

# فہرست مضامین



## باب اول۔اقبال کے سوانح نگار

## باب دوم۔ اقبال کی فکر و فلسفہ کے نقاد

## باب سوم۔اقبال کی شاعری کے نقاد

## باب چہارم۔ اقبال کے شارحین



## خلاصۂ بحث

# خلاصۂ بحث

علامہ اقبال اردو وفارسی کے عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر وفلسفہ کی دنیا آباد ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو وسعت دینے میں اہم کردار نبھایاہے۔ غزل، نظم، مثنوی، قطعہ، رباعی اور مرثیہ تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اشعار کہے ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی، انگریزی، عربی، جرمن اور سنسکرت زبان سے واقف تھے اس وجہ سے ان کی نظر ان تمام زبانوں کے ادبیات پر تھی۔ یہ اقبال کی ایسی خصوصیات ہیں جن میں ان کا مد مقابل دور دور تک نہیں نظر آتا ہے۔

علامہ اقبال کی خوش قسمتی ہے کہ ان کی زندگی، شخصیت، فکر اور فن پر ان کی زندگی ہی میں مضامین اور کتابوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ رسائل کے خصوصی نمبر نکالے گئے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ علامہ اقبال اگرچہ انجمن حمایت اسلام کے جلسے (۲۴ فروری ۱۹۰۰ء) میں اپنی نظم ''نالۂ یتیم'' کے ذریعہ ایک محدود حلقے میں متعارف ہو چکے تھے لیکن ادبی دنیا میں وہ متعارف نہیں ہوئے تھے یہی وجہ ہے کہ سر عبدالقادر مدیر 'مخزن' نے اقبال کی نظم 'ہمالہ' شائع کرتے وقت ان کا تعارف ان الفاظ میں کرنا ضروری خیال کیا: ''شیخ محمد اقبال صاحب اقبال، ایم اے قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور، علوم مشرقی و مغربی دونوں میں صاحبِ کمال ہیں''[1]

حقیقی معنوں میں ادبی دنیا میں یہ اقبال کا پہلا تعارف تھا جو سر عبدالقادر نے اپنے رسالے میں کیا تھا۔ یہ تعارف ان کے اس مضمون سے پہلے کا ہے جسے اقبالیاتی ادب میں پہلا تنقیدی مضمون ہونے کا شرف حاصل ہے۔ سر عبدالقادر نے اس تعارف میں خصوصی طور پر اقبال کے مشرقی اور مغربی علوم سے واقفیت کا ذکر کیا ہے۔ بعد میں اقبال تنقید نے جو رخ اختیار کیا اس کی بنیاد یہی ہے۔ یہیں سے اقبال کے فن پر ان کی فکر کو ترجیح دینے کی روایت کا سراغ ملتا ہے۔ اس وقت کے ایک مشہور ادبی جریدہ 'خدنگ نظر' کے مدیر کی خواہش تھی کہ وہ اقبال کا تعارف اپنے رسالہ میں شائع کریں۔ اس کے لیے انہوں نے

---

[1] مخزن اپریل ۱۹۰۱ء

سر عبد القادر سے گزارش کی۔ سر عبد القادر چونکہ اقبال کے دوستوں میں سے تھے اس وجہ سے وہ اس کے زیادہ اہل سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اقبال پر ایک تعارفی مضمون لکھا جس میں انہوں نے اقبال کی تعلیم، زندگی کے اہم واقعات اور ان کی فکر و فن پر مختصر گفتگو کی۔ اس میں انہوں نے اقبال کی شاعری کے بارے میں بتایا کہ ان کا کلام ''قوت بیان اور جوش سخن کے ساتھ اعلیٰ درجے کی علمی معلومات کا ثبوت دے رہا ہے'' اور یہ رائے دی کہ ''جو کچھ اقبال نے اب تک لکھا ہے، وہ اس اعتبار سے، کہ ایک نوجوان انگریزی خواں کا کلام ہے جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علوم انگریزی کی تحصیل میں صرف کیا ہے اور جسے اہل زبان ہونے کا دعویٰ نہیں، نہایت بے بہا ہے اور مایۂ فخر و ناز ہے۔'' [2]

ایک صدی سے بھی زائد عرصہ پر محیط اقبالیاتی ادب میں اس کثرت اور تواتر کے ساتھ لکھا گیا کہ اقبالیات کا ایک عظیم ذخیرہ وجود میں آ گیا۔ ادب میں اقبالیات نے ایک شعبہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اقبالیات کیا ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں کن کن چیزوں کو اقبالیات میں شمار کریں گے؟ اس بارے میں قاضی اختر میاں جوناگڑھی لکھتے ہیں:

> ''اقبالیات کا جائزہ لینے سے پیشتر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس اصطلاح سے ہماری مراد کیا ہے اور یہ جن چیزوں پر حاوی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں تمام تحریریں اور تقریریں، نظم و نثر خواہ وہ کسی زبان میں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ یا روایتی صورت میں اقبال کی زندگی، ان کی شخصیت، ان کے علمی و ادبی کمالات کے کسی پہلو اور کسی حیثیت سے نزدیک و دور کا تعلق رکھتی ہیں اقبالیات میں شمار ہوتی ہیں۔ اسی طرح خود علامہ اقبال کی اپنی تحریروں، تقریروں، مکاتیب، تصانیف اردو، فارسی، انگریزی وغیرہ بھی اس ضمن میں آ جاتی ہیں۔''[3]

اس تعریف میں 'اقبالیات' میں اقبال پر لکھی گئی تنقیدی اور تحقیقی کتابوں کے علاوہ خود اقبال کی تحریروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہی بات صحیح بھی ہے۔ اس لیے کہ اقبال کی شعری اور نثری تحریریں ہی اقبالیات کی بنیاد ہیں۔ اسی خیال کی تائید رفیع الدین ہاشمی نے بھی کی ہے۔ [4]

---

[2] خدنگِ نظر مئی ۱۹۰۲ء، بہ حوالہ: اقبال، جادوگرِ ہندی نژاد از عتیق صدیقی، علی گڑھ، اگست ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۷، ۱۴۴

[3] قاضی اختر میاں جوناگڑھی اقبالیات کا تنقیدی جائزہ ص ۲

[4] مقدمہ اقبالیات کے سو سال

# باب اول

## اقبال کے سوانح نگار

# اردو میں سوانح نگاری کی روایت

اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کو محفوظ کرنا اور اپنے بچوں کو ان کے بارے میں بتانا ایک انسانی فطرت ہے۔زمانۂ قدیم سے یہ دستور چلا آرہا ہے۔قبیلہ کے سردار یا حاکم کے بارے میں سبھی لوگ معلومات رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔سوانح نگاری کے اولین تحریری نقوش پتھروں اور اہرام مصر کی دیواروں پر کندہ ہیں۔ ویسے سوانح نگاری کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی تمدن کی تاریخ۔ابتدا میں لوگ اپنے اجداد اور سرداروں کے کارنامے لکھا نہیں کرتے تھے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔لیکن بعد میں جب لوگوں نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔تو پھر تحریر کا آغاز ہوا اور ساتھ ہی فن سوانح پر بھی کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔سوانح بھی ایک قسم کی تاریخ ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ یہ مخصوص لوگوں کی تاریخ ہوتی ہے۔یہ تاریخ کا ایک جزو ہے۔

سوانح کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے کی ہے عبدالواسع لکھتے ہیں:

> 'سوانح ایک ایسی صنف ہے جس میں ہم برگزیدہ ہستیوں کی خلوت و جلوت میں چپکے سے داخل ہو کر ان کو اپنے درمیان لا کھڑا کرتے ہیں۔'

اس تعریف میں دو باتوں پر زور دیا گیا ہے۔پہلی بات یہ کہ جس کی سوانح لکھی جائے وہ کوئی برگزیدہ ہستی ہو۔دوسری بات یہ کہ صاحب سوانح کی ظاہری اور باطنی سبھی امور کو شامل ہونا چاہیے۔کارلائل کے نزدیک صاحب سوانح کا برگزیدہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ایک عام آدمی کی سوانح بھی لکھی جاسکتی ہے۔جب کہ سڈنی لی وغیرہ عام انسانوں کو سوانح کا موضوع بنانے کے قائل نہیں ہیں۔ان کے نزدیک صاحب سوانح میں کوئی ایسی بات ہونی چاہیے جو اس کو دوسروں سے الگ کرتی ہو۔اس کی زندگی میں دوسروں کے سیکھنے کے لیے کوئی چیز ہو۔

عام فہم زبان میں سوانح کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ سوانح ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی شخصیت کی زندگی کے بارے میں اس کی زندگی سے لے کر موت تک کے اہم واقعات ایک منطقی ترتیب میں بیان کیے گیے ہوں۔اہم واقعات کی شرط اس لیے کہ سوانح کسی انسان کی زندگی کے تمام اعمال کے بیان کا نام نہیں ہے۔اگر ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو سوانح میں بیان کیا جائے تو سوانح بھی صاحب سوانح کی زندگی کی طرح طویل ہوجائے گی۔جس سے استفادہ کرنا آسان نہیں ہوگا۔اس لیے سوانح میں واقعات کا انتخاب ضروری ہے۔

سوانح ادب کی شاخ ہے یا تاریخ کی؟ یا وہ کون سے عوامل ہیں جن کی وجہ سے کوئی سوانح ادب کے دائرے میں داخل ہوتی ہے۔شبلی سوانح میں طرز اظہار پر کافی زور دیتے ہیں۔وہ واقعات کے بے کیف بیان کو واقعات کی 'نری کھتونی' سے تعبیر کرتے ہیں۔

مسلمانوں نے علم حدیث کی ضرورتوں کے تحت راویان حدیث کی زندگیوں کو محفوظ کرنے کا عظیم الشان کام انجام دیا۔انہوں نے ایک خاص فن ایجاد کیا جس کو علم الرجال کا نام دیا گیا۔اس میں راویان حدیث کے بارے میں مختصر معلومات درج ہوا کرتی تھی۔یہ فن سوانح کے اولین نقوش ہیں۔اس کے بعد مسلمانوں نے نبی پاک کی سیرت لکھنے پر توجہ دی اور آپ کی زندگی کے ہر گوشہ کو آنے والے زمانے کے لیے محفوظ کردیا۔علم الرجال ہی کی طرح اردو اور فارسی میں ایک صنف کا وجود ہوا ' تذکرہ نگاری' کا، اس میں شاعروں اور ادیبوں کے مختصر حالات اور نمونے کے چند اشعار درج ہوا کرتے تھے۔لیکن تذکروں میں شاعروں کی زندگی کے بارے میں علم الرجال کی کتابوں کی طرح صرف چند باتوں تک ہی معلومات ہوا کرتی تھیں۔اردو میں تفصیلی سوانح کا آغاز سیرت کی کتابوں سے ہوتا ہے۔سیرت پاک پر لکھی گئی کتابیں اردو میں عموماً صرف واقعات و حادثات کے بیان تک محدود ہوتی ہیں۔جبکہ عربی کی اکثر کتابیں صرف نبی کریم ﷺ کی زندگی سے متعلق واقعات ہی نہیں بلکہ مسئلہ و مسائل کو بھی شامل ہوتے ہیں۔جن لوگوں نے سیرت النبی کی کتابوں کو ادب کے دائرے سے باہر گردانا ہے ان کی نظر غالباً سیرت کی ان کتابوں پر رہی ہوگی جو واقعات کے ساتھ مسائل دین کو بھی سیرت مصطفی میں شامل کرتے ہیں۔

سوانح ہی کی ایک قسم ہے خود نوشت سوانح۔اس میں صاحب سوانح اپنی زندگی کے اہم واقعات کے بارے میں خود لکھتا ہے۔یہ سوانح اس وجہ سے مستند ہوتی ہے کہ راوی کو خود اپنے بارے میں جتنا علم ہوتا

ہے اتنا کسی اور کو اس کے بارے میں نہیں ہو سکتا۔ لیکن خود نوشت سوانح میں پریشانی یہ ہوتی ہے کہ بعض دفعہ صاحب سوانح اپنی زندگی کے ایسے واقعات سے پہلو بچا کر نکل جاتا ہے جس کو وہ منظر عام پر نہیں لانا چاہتا۔ اور کبھی کبھی وہ دروغ گوئی سے بھی کام لیتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی خود نوشت 'یادوں کی بارات' اردو کی سب سے مشہور خود نوشت مانی جاتی ہے۔ لیکن اس خود نوشت کو دروغ گوئی کی مثال کے طور پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

اردو میں باقاعدہ ادبی سوانح نگاری کا آغاز علی گڑھ تحریک سے ہوا۔ حالی نے یادگار غالب، حیات جاوید اور حیات سعدی کی لکھی۔ شبلی نے سیرت النبی، سیرۃ النعمان اور الفاروق لکھی۔ حالی نے خاص طور ادبی شخصیات کا انتخاب کیا ہے تو شبلی نے مذہبی شخصیات کو چنا۔ دونوں نے اپنی تحریروں میں ادبیت کو ملحوظ رکھا۔ اس طرح یہ کتابیں سوانح ہونے کے ساتھ ادبی پاروں کی بھی حیثیت رکھتی ہیں۔

علامہ اقبال اپنی زندگی ہی میں شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچ چکے تھے جہاں تک کوئی دوسرا اردو شاعر نہیں پہنچا۔ غالب کو پوری زندگی اپنی ناقدری کا گلہ رہا۔ لیکن اقبال کو قوم نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ان کی زندگی میں ہی ان کی شاعری فکر اور فلسفہ پر ناقدین نے توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ جہاں تک اقبال کی سوانح کی بات ہے تو سر عبدالقادر کا مضمون جو اپریل ۱۹۰۲ میں خدنگ نظر میں شائع ہوا تھا کو پہلا تنقیدی مضمون ہونے کے ساتھ پہلا سوانحی مضمون ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ اس کے بعد محمد فوق نے لاہور کے کشمیری میگزین میں ۱۹۰۹ میں ایک مضمون کی شکل میں لکھا۔ اسی مضمون میں اضافہ کرکے انہوں نے اس کو 'نیرنگ خیال' کے اقبال نمبر میں شائع کرایا۔ اس مضمون کے لیے انہوں نے اقبال سے خط وکتابت بھی کی۔ اقبال کی سوانح کی بنیاد انہی دو مضامین پر رکھی گئی۔ اقبال کی وفات کے بعد باقاعدہ لوگوں نے اس جانب توجہ دی۔

علامہ اقبال کے انتقال کے بعد غلام رسول مہر نے 'انقلاب' میں اقبال کی سوانح لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ اور اس خدشہ کا اظہار کیا کہ اگر اقبال کی جلوت اور خلوت میں بیٹھنے والے ختم ہوگئے تو ان کی زندگی کے حالات بھی انہی کے ساتھ دفن ہو جائیں گے۔ اس کے بعد کئی میٹنگیں اس سلسلے میں ہوئیں۔ جس کی پوری تفصیل رفیع الدین ہاشمی نے اپنے ایک مضمون 'اقبال صدی کی سوانح عمریاں' میں دی ہے۔ رفیع الدین ہاشمی کے

مطابق اکثر لوگوں کی توقعات مولانا غلام رسول مہر سے وابستہ تھیں۔لیکن وہ کسی وجہ سے وہ اس کام کو نہیں کرسکے۔حالاں کہ انہیں تمام عمر اس بات کا احساس رہا۔حمزہ فارقی نے جب 'انقلاب' اور دوسرے اخبارات کی فائلوں سے معلومات اکٹھا کرکے سفر نامہ اقبال شائع کیا تو مولانا مہر نے ۲۳ فروری ۱۹۶۹ء میں ان کو لکھا:

''یہ کام خود مجھے کرنا چاہئیں (کذا) تھے۔کیوں کہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے گزرا تھا۔اور مشہور مثل ہے 'شنیدہ کے بود مانند دیدہ' لیکن یقین رکھیں کہ آپ ایسے درد مند اصحاب کے ہاتھوں بھی یہ داستان ترتیب پاجائے تو مجھے دلی مسرت ہوگی۔اس لیے کہ مقصود حقیقی اصل کام ہے نہ یہ کہ انتساب کس سے ہوا۔''[1]

بہرحال مولانا مہر اس تعلق سے کوئی خاص کام نہ کرسکے۔البتہ انہوں نے ایک کام ضرور کیا کہ اپنے اخبار 'انقلاب' میں اقبال کے تعلق سے خبریں اور مضامین خصوصی توجہ سے شائع کرتے رہے۔جو بعد میں اقبال پر کام کرنے والوں کے لیے اہم مرجع ثابت ہوئے۔اقبال سے محبت کرنے والوں نے اس دوران اپنی کوششیں جاری رکھیں۔چنانچہ طالب فارسی نے 'سیرت اقبال' (۱۹۳۸) چراغ حسن حسرت نے 'حیات اقبال' (۱۹۳۸) اور محمد طاہر فاروقی نے سیرت اقبال(۱۹۳۹)اور عبدالسلام ندوی نے اقبال کامل (۱۹۴۸) لکھی۔یہ سبھی کتابیں اگرچہ بنیادی طور پر اقبال کی سوانح ہیں لیکن ان میں اقبال کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔اس میں سے اکثر کتابیں اقبال کے فکروفن کو بھی محیط ہیں۔اس وجہ سے اقبال کی ایک مکمل اور جامع سوانح کی ضرورت محسوس کی گئی اس کے لیے کمیٹیاں بنیں۔بزم اقبال لاہور کی طرف سے عبدالمجید سالک کو ذمہ داری دی گئی۔انہوں نے ۱۹۵۵ میں ذکر اقبال لکھ کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔مگر اولین کاوش ہونے کی وجہ سے ان میں بہت ساری کمیاں رہ گئیں۔ اس درمیان اقبال صدی تقاریب کی مناسبت سے اقبال کی سوانح عمریوں پر کام میں تیزی آئی۔کئی سوانح نگاروں نے اس مناسبت سے اقبال کی سوانح عمریاں مرتب کیں ان میں سے چند نام یہ ہیں:

---

1 اقبال صدی کی سوانح عمریاں از رفیع الدین ہاشمی، مشمولہ : اقبالیات تفہیم وتجزیہ

یاد اقبال　　صابر کلوروی (اپریل ۱۹۷۷)

مفکر پاکستان　　محمد حنیف شاہد (۱۹۸۲)

حیات اقبال　　ایم ناز (۱۹۷۷)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید　　سرگذشت اقبال(۱۹۷۷)

سید نذیر نیازی　　دانائے راز (۱۹۷۹)

سب نے اپنے مقدور بھر اقبال کی سوانح حیات مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ان میں سب سے جامع سوانح اقبال کے صاحبزادے ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال نے لکھی ہے۔انہوں نے زندہ رود لکھ کر ایک طرف اپنی حق فرزندی کا حق ادا کیا تو دوسری طرف اقبالیاتی ادب میں اقبال کی سوانح کی ضرورت کو ایک حد تک پورا کردیا۔ایک حد تک اس لیے کہ کوئی بھی کاوش مکمل نہیں ہوتی۔کاغذ تک آتے آتے اس میں کچھ کمی رہ جاتی ہے۔بعد میں آنے والے اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔اب تک کی موجود سوانح عمریوں میں سب سے جامع اور مستند سوانح یہی 'زندہ رود' ہے۔

آنے والے صفحات میں اقبال کے اہم سوانح نگاروں کے بارے میں گفتگو کی جائے گی۔

# محمد طاہر فاروقی

محمد طاہر فاروقی کا شمار اقبال کے اولین سوانح نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اقبال کی سوانح پر اس وقت قلم اٹھایا جب لوگ اقبال کی سوانح کے لیے میٹنگیں اور قراردادیں پاس کرنے میں مصروف تھے۔ اقبال کی سوانح کے لیے کئی کئی انجمنوں کی طرف سے کوششیں ہوئیں۔ لیکن اردو میں ٹیم ورک کے طور پر کام کرنے کا نتیجہ ابھی تک صحیح نہیں رہا ہے۔ اس وجہ سے جن لوگوں نے بھی بغیر کسی جمعیت جماعت کے انفرادی طور پر اقبال کی سوانح پر قلم اٹھایا ہے وہ زیادہ کامیاب رہے ہیں۔

محمد طاہر فاروقی اقبال کو پیغمبر شاعر مانتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے یہاں اقبال کے لیے عقیدت ہے۔ یہ عقیدت ان کے ہر لفظ سے ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ اقبال کی زندگی کے احوال سے زیادہ ان کی سیرت اور ان کے عادات وطوار پر زور دیتے ہیں۔ ان عادات اطوار کے فنکارانہ بیان سے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اقبال کی ایک پیشوا اور رہنما کی شبیہ قائم ہو جائے۔

اقبال کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ اقبال شاعر، سیاست داں، وکیل اور اسلامیات کا ماہر، ہر میدان میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ ہر میدان میں وہ میر مجلس ہوا کرتے۔ اقبال کے سوانح نگاروں میں سے اکثر نے اقبال کے کسی ایک پہلو پر اس قدر زور دیا ہے کہ دوسرے پہلو متاثر ہو گئے ہیں۔ محمد طاہر فاروقی نے پوری کوشش کی ہے کہ اقبال کی شخصیت کے مکمل خدوخال سامنے آئے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'سیرت اقبال' کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ سیرت، شاعری اور سیاست۔

اس کتاب کا تیسرا حصہ خصوصیات شعر اقبال پر مشتمل ہے جس میں کلام اقبال سے مثالیں دے کر انہوں نے اقبال کے کلام میں پائی جانے والے جوش بیان، سوزو گداز، جدید تراکیب، حسن ادا اور رفعت تخیل، تشبیہ واستعارہ وغیرہ پر مختصر بحث کی ہے۔

اس کے بعد کے حصہ میں انہوں نے اقبال کی تصانیف کا تعارف پیش کیا ہے۔ یہ حصہ اگرچہ براہ راست سیرت یا سوانح سے نہیں ہے لیکن اس کے باوجود کو سوانح سے الگ کر کے نہیں دیکھا جسکتا ہے۔ صاحب تخلیق کی کاوش اور تخلیق اس کی شخصیت کا ہی ایک حصہ ہوا کرتا ہے۔ اس حصے میں انہوں نے اقبال کے اردو اور فارسی مجموعوں کے علاوہ ان کی کی نثری تخلیقات کا بھی تعارف و تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس طرح وہ لوگ بھی جو اقبال کی ان کتابوں تک رسائی نہ حاصل کر سکے ہوں ہوں یا انہوں نے اقبال کی کتابوں کو نہیں پڑھا ہے اقبال کی مطبوعات سے ایک حد تک واقف ہو جاتے ہیں۔

طاہر فاروقی کا انداز علمی اور استقرائی ہے۔ لیکن طاہر فاروقی واقعات کو بیان کرتے ہوئے عام طور پر تحقیق کے معیار کو برقرار نہیں رکھ پائے ہیں جس کی وجہ سے بہت ساری خامیاں ان کی یہاں راہ پا گئی ہیں۔ بہت ساری جگھوں پر وہ سرسری طور پر گزر گئے ہیں حالانکہ وہاں پر انہیں تفصیلی بحث کرنی چاہئے تھی۔ ۳۶۰ صفحات کی کتاب میں اقبال کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے واقعات کو محض ۱۹ صفحات میں سمیٹ دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو خالص سوانح میں شمار نہیں کیا جاتا ہے۔ وہ اقبال کی پیدائش کی تاریخ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ بتاتے ہیں۔ حوالے کے طور پر انہوں نے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

' پیدائش کی یہ تاریخ سیالکوٹ کے رجسٹر فوتی سے تصدیق شدہ ہے۔'

یہ تاریخ دراصل روزنامہ انقلاب کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش واموات میں کسی نتھو کے گھر اسی تاریخ کو کسی بچے کی ولادت کا اندراج پایا۔ انہوں نے اسے اقبال کی تاریخ پیدائش کے طور پر انقلاب میں شائع کر دیا۔ چونکہ بات میونسپل کے رجسٹر سے تصدیق شدہ ہونے کی تھی اس وجہ سے بہت سارے اس سے متاثر ہو گئے۔ بعد میں محققین نے ثابت کیا کہ یہ تاریخ پیدائش اقبال کی نہیں کسی اور کی ہے۔ طاہر فارقی کے زمانے تک اقبال کی سوانح محقق انداز میں مرتب نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے انقلاب کی بتائی ہوئی تاریخ پیدائش لکھ دی۔

محمد طاہر اقبال کے والد نور محمد کی سلائی کی نوکری چھوڑنے کی وجہ بتاتے ہیں کہ ان کے مالک کی آمدنی مشکوک تھی اس وجہ سے اقبال کی والدہ ان کی تنخواہ کا پیسہ نہیں استعمال کرتی تھیں۔ اس وجہ سے انہوں نے نوکری چھوڑ دی۔ اس

پورے واقعہ کو خود اقبال کے والد بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے نوکری اس لیے چھوڑ دی کہ ان کے یہاں کام زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ تر وقت ان کی مصاحبت میں گزرتا تھا۔ اس وجہ سے انہیں لگتا تھا کہ یہ تنخواہ ان کے لیے جائز نہیں ہے۔[1]

اقبال کی زندگی کے احوال پر سرسری طور پر واقعات بیان کرنے والا قلم ان کی وفات کے بعد کے واقعات، تاریخ قطعات، اقبال کے بارے میں اہل علم وسیاست دانوں کے تأثراتی اقوال اور احباب پر اقبال کی وفات کے اثرات وغیرہ تفصیل سے بیان کرنے لگتا ہے۔ اس تعلق سے بغیر کسی تحقیق کے رطب ویابس جمع کر دیتا ہے۔ اقبال کے مزار پر اہل اللہ کا اجتماع کے عنوان کے تحت وہ اقبال کی قبر کو مرجع خلائق بنانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اقبال کی قبر پر ایسے لوگ بھی دکھائی دینے لگتے ہیں جو کبھی نہیں دیکھے گئے۔ اقبال کے قبر پر مجذوبوں کے آنے کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ ساری کوششیں اقبال کو ان کے حقیقی منصب سے ہٹاکر رحمۃ اللہ کے پر تقدس ہالہ میں ان کو قید کرنے کی کوشش ہے۔ اقبال ایک شاعر تھے۔ ان کا حقیقی مرتبہ وہی ہے۔ اقبال کے ایک عزیز دوست مرزا جلال الدین اقبال پرستی کی اس غیر معتدل روایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ' اقبال آخر انسان تھے۔ پیغمبرانہ اعجاز رکھنے کے باوجود پیغمبر نہیں تھے اس لیے ان کو ایسی باتوں سے معرا سمجھنا جو بشریت کا لازمہ اور انسانیت کا خاصہ ہیں ایک ایسا تمسخر انگیز دعوا ہے جس میں نہ تو حقیقت کو دخل ہے نہ خود ڈاکٹر صاحب کی روح کے لیے مسرت کا سامان موجود ہے اقبال نہ زاہد خشک تھے نہ ریاکار صوفی۔۔۔۔ ان کے چہرے پر تقدس کا جو ہالہ ہر وقت نظر آتا تھا اس سے یہ کسی طور پر لازم نہیں آتا کہ انہیں ان کے اصلی مرتبہ سے محروم کرکے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے زمرے یں شامل کر لیا جائے۔ حالانکہ ان سے علاحدہ رہ کر بھی اقبال کی عظمت و وقار میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی۔۔۔'[2]

ہو سکتا ہے کہ یہ سب تفصیلات جو طاہر فاروقی نے اقبال کے بارے میں جمع کی ہیں ان کے یہاں اہمیت رکھتی ہوں۔ مگر عام آدمی کے لیے ان واقعات میں کوئی اہم بات نہیں ہے۔ یہ سب وقتی دلچسپی کے واقعات ہیں۔ جن کو سوانح جیسی کتاب میں درج کرنا مناسب نہیں تھا۔

---

1 زندہ رود جلد : اول

2 خدنگ نظر (لکھنؤ) جلد ۵ شمارہ ۶ مئی ۱۹۰۲ ص ۷، بحوالہ اقبال جادوگر ہندی نژاد از عتیق صدیقی

قاضی اختر میاں جوناگڑھی سیرت اقبال کو اقبال کی پہلی سوانح مانتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا ماننا ہے کہ اقبالیات پر لکھی گئی تحریروں کا اکثر حصہ ان کے پیش نظر ہونے کے باوجود اس کو مکمل سیرۃ نہیں کہا جاسکتا۔ 'اور نہ اس کے اندر وہ جامعیت پائی جاتی ہے جس کی ایسی کتاب سے توقع کی جاسکتی ہے۔'

وہ لکھتے ہیں:

'اس میں زیادہ حصہ اشعار اور منقولات کا ہے اقتباسات اور واقعات کے لیے اکثر حوالے نہیں دئے گئے ترتیب عام تذکروں کسی سی ہے اور اقبال کی خصوصیات پر سرسری طور سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔'[1]

محمد طاہر فاروقی کی کتاب سیرت اقبال کو مکمل سوانح کے بجائے ایک ایسی کتاب کے طور پر دیکھا جانا چاہئے جو مختصر طور پر اقبال کی شخصیت کے ساتھ ان کی شاعری اور فلفسہ سے بھی متعارف کرادے۔ محمد طاہر فاروقی کا زیادہ تر زور اقبال کی سیرت و کردار کے بیان پر ہے اس وجہ سے انہوں نے لباس، حلیہ، حسن اخلاق، سادگی، انکسار اور قناعت جیسے چھوٹے چھوٹے عنوان قائم کرکے اقبال کی شخصیت کو قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ کامیاب بھی ہیں۔ طاہر فاروقی کی کتاب کا یہ حصہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

محمد طاہر فاروقی نے اقبالیات پر ایک کتاب 'اقبال اور محبت رسول' بھی لکھی ہے۔ اس کتاب میں بھی سیرت اقبال کی طرح اقبال کی شخصیت کے ایک پہلو محبت رسول کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔[2]

محمد طاہر فاروقی کے سامنے اقبال کی کوئی سوانح عمری نہیں تھی اس وجہ سے ان کی کوتاہیوں کو اس وجہ سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ ان کے سامنے اقبال کی سوانح عمری کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ بکھرے معلومات تھے۔ ان سے مطلب کی چیزیں نکالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ محمد طاہر فاروقی نے جو بھی لکھا وہ قابل استحسان ہے۔

---

1 اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، قاضی اختر میاں جوناگڑھی ص: ۳۷

2 ۱۶۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی ہے۔

# عبدالمجید سالک

اقبال کے سوانح نقاروں میں عبدالمجید سالک کا مقام و مرتبہ اس وجہ سے بلند ہے کہ وہ اقبال کے اولین سوانح نگار ہیں۔ ان سے پہلے اگرچہ محمد دین فوق نے اقبال کی سوانح پر (۱۹۰۹) میں ایک مضمون لکھا تھا۔ مگر یہ ایک مستقل کتاب نہیں۔ اس کا دائرہ بھی اقبال کی ابتدائی زندگی تک محیط ہے۔ سر عبدالقادر کا مضمون جس کو بعد میں بانگ درا کے دیباچہ کے طور پر شائع کر دیا گیا ہے۔ اقبال کی سوانح نہیں ہے۔ بلکہ ان کی شاعری پر تبصرہ ہے۔ اگرچہ ان کی سوانح سے متعلق بھی باتیں اس میں مل جاتی ہیں۔ مگر اس کی حیثیت ثانوی ہے۔

'ذکر اقبال'عبدالمجید سالک کی کتاب 'ذکر اقبال' اقبال کی پہلی مکمل سوانح حیات ہے۔ انہوں نے دوسرے مصنفین کی طرح اقبال کی شاعری اور فن پر گفتگو نہیں کی ہے بلکہ ان کی سوانح پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> 'میری یہ کتاب علامہ اقبال کی محض سوانح عمری ہو گی۔ ان کی شاعری ان کے فلسفے اور ان کی تعلیمات پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور مزید لکھی جائیں گی۔ لیکن سوانح حیات گزشتہ ستر سال کے دوران میں کسی نے بھی مرتب نہیں کیے ہیں'[1]

یہ بات اپنے آپ میں تعجب خیز ہے کہ اقبال کی وفات (۱۹۳٦) کے بعد سے لے کر ۱۹۵۵ تک اقبال کی ایک بھی سوانح نہیں لکھی گئی۔ ایسی بات نہیں کہ اس سلسلے میں کوشش نہیں ہوئی۔ اقبال کی وفات کے ایک ہفتہ بعد جاوید منزل میں ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کی صدارت میں 'مجلس اقبال' کا قیام عمل میں آیا۔ غلام رسول مہر نے یکم مئی ۱۹۳۸ کے انقلاب کے اداریہ میں اس مجلس کے ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال کی سوانح کی ضرورت و اہمیت بیان کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> 'اقبال کے خیالات وافکار کی اشاعت کا پہلا بنیادی و اساسی کام یہ ہے کہ مرحوم کی ایسی سوانح عمری تیار ہو جائے جو ان کے خیالات وافکار اور تعلیمات پیغام کی بنیادی حقیقتوں کا روشن آئینہ ہو'[1]

---

1 ذکر اقبال ص ۱۲

اس موقع پر غلام رسول مہر نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کام کے لیے سب سے اہل چودھری محمد حسین ہیں۔ انہیں اقبال کی معیت جس قدر نصیب ہوئی اتنی کسی اور کو نہیں۔ اس وجہ سے یہ کام ان کے سپرد کیا جائے یا ان کے ان کی نگرانی میں ہو۔[2]

لیکن چودھری صاحب نے اس طرف توجہ کی اور نہ غلام رسول مہر نے کچھ کیا۔ رفیع الدین ہاشمی کی نظر بار بار اس کے کام کے لیے غلام رسول مہر کی طرف جاتی ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ اس کام کے لیے سب سے زیادہ اہل تھے، ایک وقت ایسا آیا بھی کہ جب ان کو اقبال کی سوانح لکھنے کی ذمہ داری مہر صاحب کو سونپی بھی گئی۔

> 'گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر کی تحریک پر اگست ۱۹۵۱ میں بزم اقبال لاہور نے تدوین سوانح کے لیے سعی و کاوش شروع کی کر دی اور سلسلے میں بزم اقبال نے غلام رسول مہر کی سربراہی میں تین چار اصحاب کی سربراہی میں تین چار اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی تاکہ وہ ایسے لوگوں سے مل کر معلومات جمع کرے جو کبھی اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں۔ طے ہوا کہ روایات کو مہر صاحب بالفاظ راویان قلم بند کریں گے۔ اس طرح روایات کی پانچ کاپیاں تیار ہو گئیں۔ اپریل ۱۹۵۴ میں تدوین سوانح کے لیے مہر کا نام تجویز ہوا جنھوں نے ایک سال تک یہ کام انجام دینے کا وعدہ کیا مگر ان کی (نہایت معقول) شرائط منظور نہ کی گئیں۔ چند ماہ بعد لوازمے کی پانچوں کاپیاں عبدالمجید سالک کے سپرد کر دی گئیں جنھوں نے تقریباً ایک تہائی کم معاوضے پر مہر صاحب کی ضخامت کے مقابلے میں نصف ضخامت کی سوانح بہ عنوان 'ذکر اقبال' چھ ماہ میں تیار کر دی'[3]

''ذکر اقبال'' کی اشاعت سے بہت سارے لوگ خوش نہیں تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جس طرح کی سوانح کی امید کر رہے تھے ذکر اقبال اس پر پوری نہیں اتر رہی تھی۔ اقبال کے معتقدین نے عبدالمجید سالک پر کئی قسم کے الزام لگائے ان میں سے بعض الزامات اتہام بازی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

---

1 بحوالہ اقبال صدی کی سوانح عمریاں از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مشمولہ اقبالیات : تفہیم و تجزیہ، ص: ۲۳۲، اقبال اکادمی پاکستان طبع اول ۲۰۰۴ طبع ثانی ۲۰۱۰

2 حوالۂ سابق ص ۲۳۲

3 اقبالیات تفہیم و تجزیہ از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ص ۲۳۳، بحوالہ بزم اقبال کی رودادیں اور 'اقبال درون خانہ ج ۲

'ذکر اقبال' کی اشاعت پر کچھ سوال اٹھائے گئے اور کچھ لوگوں نے علامہ اقبال سے سالک کے تعلق کو 'مشکوک' نظر سے دیکھا۔ اس کا اظہار بھی کیا۔ ان میں ایک نام علامہ کے نیاز مند صوفی غلام مصطفی تبسم کا ہے۔ مظفر علی سید نے صوفی صاحب کا ایک خاکہ 'صوفی تبسم۔ آدم گر' لکھا اور یہ خاکہ حلقہ ارباب ذوق لاہور کے اجلاس میں 1993ء میں پڑھا گیا۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے

> "جب سالک صاحب کا انتقال ہوا تو اس وقت مظفر علی سید کی عمر تقریباً 18 برس تھی۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ جب 'ذکر اقبال "ذکر اقبال' پڑھنے کے بعد یہ جاننے کی ضرورت پڑی کہ عبدالمجید سالک اگر اقبال کو ہمیشہ اتنا ہی ناپسند کرتے تھے' جتنا کہ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے تو آخر ان کے گھر کیا کرنے جاتے تھے؟ صوفی صاحب سے پوچھا تو کہنے لگے۔ مجھ سے نہ پوچھو لیکن یہاں اپنے استاد کی عزتِ داؤں پر لگی تھی۔ کہا کہ آپ نہیں بتائیں گے تو قیامت تک کسی کو معلوم نہ ہو گا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے' بس اتنا کہا کہ 'مخبری' اور گھر کے اندر تشریف لے گئے۔"[1]

علامہ اقبال اگرچہ خلوت نشینی کو پسند کرتے تھے مگر ان کا کوئی کام ایسا نہیں تھا جس کو وہ کسی سے چھپائیں۔ پھر آخر سالک صاحب پر کس قسم کی جاسوسی کا الزام لگایا گیا ہے۔ جس نے بھی 'ذکر اقبال' پڑھی ہو گی اس کو معلوم ہو گا کہ اس کا ایک ایک حرف اقبال کی عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے۔ عبدالمجید سالک کو اقبال کی صحبت میں رہنے کا زریں موقع ملا۔ ان سے دوستانہ مراسم تھے۔ اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ ناگوار گذرا ہو ان کے بارے میں اس قسم کی باتیں پھیلا دی ہو۔ سالک صاحب نے ذکر اقبال کے علاوہ بھی اقبال پر لکھا ہے ہر جگہ اقبال سے گہری عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اقبال کی وفات پر انہوں نے جو مضمون لکھا تھا وہ اس کا ایک ایک لفظ عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے۔:

" ایک مرتبہ جسد مبارک کو ذرا سہارا دینے کی ضرورت پڑی۔ میں نے اٹھایا۔ بے جان جسم کا بوجھ تو بہت زیادہ تھا لیکن پورا جسم ریشم کی طرح ملائم تھا۔ شاہی مسجد کے بیرونی احاطے میں مرقد کے لیے جگہ تجویز ہوئی۔ عصر کے وقت میت وہاں پہنچی۔ ہم تو بہت پہلے مرقد پر پہنچ گئے تھے۔ میت کے ساتھ قدم قدم چل کر بازاروں سے گزرتے ہوئے پہنچنا ممکن نہ تھا۔ مغرب کے قریب میت پہنچی، اسے قبر میں اتارا، دفن کیا اور واپس

---

1 جاوید اختر بھٹی، جسارت میگزین ۷ انومبر ۲۰۱۲

ہوئے۔ بعد میں سُنا کہ اہل شہر نے نیز ان بے شمار افراد نے جو آس پاس کے شہروں مثلاً امرتسر، سیالکوٹ، وزیر آباد، گوجرانوالہ وغیرہ سے آ گئے تھے، اصرار کیا کہ انھیں بھی میت کو کندھا دینے کا موقع ملنا چاہیے۔ اس غرض سے جنازے کو بانس لگائے گئے تاکہ بہت سے لوگ کم از کم ایک بار ضرور کندھا دینے کی سعادت حاصل کر سکیں۔ یہ اس محبوب وجود کی ہمہ گیر محبوبیت کا ایک کرشمہ تھا، جس نے پوری زندگی خاموشی اور گوشہ نشینی میں گزاری۔ لیکن اس بیش بہا زندگی کا کوئی بھی لمحہ ایسا نہ تھا جس میں اس نے اسلام مسلمانوں اور انسانیت کی بہبود و فلاح کے سوا کبھی کچھ سوچا ہو یا اس کے سوا زبان مبارک پر آیا ہو۔''[1]

غلام رسول مہر بھی 'ذکر اقبال' سے بعض وجوہ کی وجہ سے خوش نہیں تھے۔ جب 'ذکر اقبال' سامنے آئی تو انہوں نے ایک خط لکھا ہے:

> ''عزیزی جاوید اقبال کو میری دعا پہنچایئے۔ میں صرف ان کی مراجعت کے انتظار میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی سوانح حیات کی تسوید روکے بیٹھا ہوں۔ خدا کرے وہ جلد آ جائیں تاکہ ان کے مشورے اور استفادے کے بعد میں کتاب مرتب کر دوں۔ افسوس ہے کہ اس عظیم الشان ہستی کے متعلق اب تک جو کچھ لکھا جانا چاہئے تھا، نہیں لکھا جا سکا۔ چودھری محمد حسین خدا کو پیارے ہو گئے۔ جاوید نے لمبی مدت ولایت میں گزار دی۔ میرے سامنے جو کچھ ہے اگر وہ پورا نہ ہو سکا، تو پھر کون کرے گا۔'' [2]

عبد المجید سالک لکھتے ہیں:

جب ''بزم اقبال'' نے مجھے حکم دیا کہ میں علامہ اقبال کی سوانح حیات مرتب کروں تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ جس شخص کی زندگی علی العلوم گوشہ نشینی اور خلوت گزینی میں بسر ہوئی اور جو دنیا و مافیہا سے بے پروا' آغاز سے انجام تک اپنی فکر ہی کی دنیا میں سرگرداں رہا، اس کی زندگی کے واقعات ایک مقالے کی صورت میں مرتب ہو سکیں تو ہو سکیں' ایک پوری کتاب کا مواد کیوں کر مہیا ہو گا! لیکن چوں کہ مجھے خود بھی چوتھائی صدی تک براہِ راست علامہ کی خدمت میں نیاز

---

1 عبد المجید سالک، بحوالہ اقبالیات کے سو سال

2 ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بحوالہ چند یادیں، چند تاثرات، دوم ڈاکٹر عاشق حیسہ بن بٹالوی۔ لاہور ۱۹۸۵

حاصل رہاہے اور علامہ کے احباب' اعزہ' مداحین اور ملاقاتیوں سے بھی شناسائی رہی ہے، اس لیے رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ علامہ کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن پر اب تک کماحقہ' روشنی نہیں ڈالی گئی لیکن وہ پہلو یقینا ایسے ہیں جو اہلِ عالم کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہنے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے کتاب لکھنے کی ہامی بھر لی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ میری کتاب علامہ اقبال کی محض سوانح عمری ہو گی۔ ان کی شاعری' ان کے فلسفے اور ان کی تعلیمات پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور مزید لکھی جائیں گی، لیکن سوانح حیات گزشتہ سترہ سال کے دوران میں کسی نے بھی مرتب نہیں کیے۔ میں اپنی اہلیت واستطاعت کے مطابق اس کام کو انجام دے دوں گا۔ فلسفے وغیرہ پر تبصرے کے لیے کوئی اور انتظام کر لیجیے۔ قارئین کرام کو یہ دیکھ کر وحشت نہ ہونی چاہیے کہ اقبال پر یہ کیسی کتاب ہے جس میں ان کی فکر کا کوئی تذکرہ ہی نہیں' بات یہ ہے کہ میرا دائرۂ کار صرف سوانح نگاری تھا۔ اور میں نے اسی دائرے کے اندر رہ کر یہ کتاب لکھی ہے''۔[1]

اس اقتباس میں عبدالمجید سالک نے 'ذکر اقبال' کے لکھنے کی غرض وغایت اور اس کے طریقہ کار کو واضح کر دیا ہے۔ اس کے لکھنے کا ان کا کوئی خفیہ منصوبہ نہیں تھا۔

غلام رسول پوری زندگی اقبال کی سوانح لکھنے کی اہمیت پر زور دیتے رہے اور اس کے لیے پر تولتے رہے۔ غالبا اس کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے لیکن وہ موقع نہیں آیا اور وہ اپنے بعد والوں کے کندھوں پر اپنی سوانح کا بھی بوجھ چھوڑ گئے۔

عبدالمجید سالک قادیانیت کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اور قادیانیت کے بارے لکھتے ہوئے انہوں نے واضح بات کہنے سے اجتناب کیا ہے۔ اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد کے بارے میں سالک نے لکھا ہے کہ وہ احمدی عقیدہ رکھتے تھے۔[2]

---

1 ذکر اقبال از عبدالمجید سالک

2 ذکر اقبال ص ۲۰

انہوں نے قادیانی فرقے کے بارے میں جہاں بھی اس کتاب میں لکھا ہے ان کے بارے میں ہمیشہ نرم رویہ اختیار کیا ہے۔وہ قادیانیوں کے بارے میں اقبال کے موقف کو'سوئے ظن' سے تعبیر کرتے ہیں۔[1]

ایک جگہ لکھتے ہیں:

'اخباروں نے بالخصوص 'زمیندار' نے اپنے صفحے کے صفحے احمدیت کی مخالفت میں سیاہ کر دیے ----- حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ احمدیوں کو مسلمانوں کی فہرست رائے دہندگان سے حذف کر دیا جائے اور ان کو ہندوؤں، اچھوتوں، اور عیسائیوں کی طرح ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے------ خدا جانے علامہ اقبال نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا جس میں بتایا کہ اس فرقے کی بنیاد ہی غلطی پر ہے'[2]

قادیانیت کے خلاف اقبال کے مضامین گہری فکر اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ اقبال کے بارے میں یہ رائے رکھنا کہ انہوں نے قادیانیت کے بارے میں مضامین کسی عقیدت مند کے کہنے پر لکھا۔ اقبال کے اوپر بہتان ہے۔ وہ شخص جو فرمائش پر شاعری نہ کرتا ہو ایک خالص علمی مضمون کیسے لکھ سکتا ہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

'ان مضامین کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے انتہائی اشتعال اور ناراضی کی حالت میں بھی بانی احمدیت، امام جماعت اور احمدیوں کے خلاف کوئی دل آزار لفظ نہیں لکھا۔ بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نہایت متین و سنجیدہ عالمانہ انداز اختیار کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان تحریروں میں علامہ نے بعض ایسے نکات پیش کیے ہیں جن کا جواب تک کسی سے نہیں ہو سکا۔"[3]

---

1 ذکر اقبال ص: ۱۸۷

2 ذکر اقبال ص ۲۵۱، ۲۵۲

3 ذکر اقبال ۲۵۲۔۲۵۳

قادیانیت کے بارے میں اقبال کا دوٹوک فیصلہ جو انہوں نے پنڈت نہرو کے جواب میں لکھا تھا کہ 'احمدی، اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں'' [1]۔ سالک صاحب نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ احمدیت کے بارے میں سالک ہی نہیں اس زمانے کے اکثر قلم کار تذبذب کے شکار معلوم ہوتے ہیں۔ سید نذیر نیازی بھی اقبال اور احمدیت کے بارے میں کوئی بات کھل کر بیان نہیں کرتے۔ اس سے بڑی اہم بات کیا ہے ہو گی کہ علامہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف مضامین لکھے۔ مضامین کا جواب دیا۔ اس کے باوجود خود ان کے محترم بھائی شیخ عطا جن کی وہ بہت عزت کرتے تھے۔ ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ بھی قادیانی عقیدہ رکھتے تھے۔ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز بھی قادیانی تھے۔ اپنے ایک خط میں اقبال لکھتے ہیں:

'شیخ اعجاز میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے تم کو تو معلوم ہی ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارجین بن سکتا ہے یا نہیں۔'

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ایسے لوگوں کو اپنے لڑکے جاوید اقبال کا گارجین بنانے کے بارے میں تذبذب کا شکار تھے جو نیک اور صالح ہونے کے باوجود قادیانی عقیدہ رکھتے تھے۔

سالک کے پاس معلومات کا ذریعہ اقبال کے خطوط، یادداشتیں، متفرق مضامین اور اقبال کے ساتھ نشست و برخاست رکھنے والے اصحاب کی زبانی یادداشتیں تھی۔ سالک خود بھی اقبال کی صحبت میں رہ چکے ہیں۔ ان کے اس کام کے پیچھے ایک ادارہ تھا۔

'ذکر اقبال' اقبال کی زندگی کے سبھی گوشوں کو محیط ہے۔ اقبال کی تعلیم وتربیت، ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، کالج اور پھر ولایت جا کر اعلیٰ تعلیم کا حصول سب کچھ انہوں نے اس کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ سالک کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اقبال کو ایک انسان بنا کر پیش کیا ہے۔ انہیں ولایت کی مسند پر بٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے۔

انہوں نے لندن سے بیرسٹری کا امتحان دینے کے بارے میں لکھا ہے کہ اقبال ۱۸۹۸ میں قانون کے ابتدائی امتحان میں فیل ہو گئے تھے۔ اقبال نے دوبارہ امتحان دینا چاہا۔ لیکن اقبال یہ چاہتے تھے کہ انہیں کلاس میں حاضری سے مستثنیٰ رکھا

---

1 خطوط اقبال مرتب، رفیع الدین ہاشمی ص: ۲۵۸، (لاہور ۱۹۷۶)

جائے لیکن ان کی یہ درخواست منظور نہیں ہوئی اس سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ تہیہ کیا کہ قانون کی تعلیم انگلستان سے حاصل کریں گے۔ وہ لکھتے ہیں:

' اگر مسٹر جسٹس چیرجی اس درخواست کو منظور کر لیتے تو اقبال اسی زمانے میں کسی قصبے کی عدالت یا ضلع میں وکالت شروع کر دیتے اور اس تعلیم و تربیت سے محروم رہ جاتے جو انہیں انگلستان اور جرمنی کے اکابر علم کی صحبت سے نصیب ہوئی۔''[1]

بعض دفعہ ان کی کچھ باتیں اقبال کے معتقدین کو ناگوار بھی گذر جاتی ہیں۔ ایسے معاملات میں انہوں نے بعض جگہ احتیاط کا دامن بھی چھوڑ دیا ہے۔ محض سنی سنائی باتوں کو بھی درج کر دیا ہے جس سے اقبال کی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔

دراصل سالک ایک صحافی ہیں۔ اس وجہ سے صحافیانہ مزاج ان کی اس تصنیف پر بھی حاوی ہے۔ انہوں نے تحقیق کی طرف توجہ کم دی۔ زیادہ تر بکھرے ہوئے معلومات کی کھتونی میں ہی مصروف رہے۔ اقبال کی تیسری شادی کے بارے میں تفصیل فراہم کرتے ہوئے مرزا جلال الدین کا بیان درج کرتے ہیں:

' اس خاتون سے (جو جاوید اور منیرہ کی والدہ ہیں) شادی ہو جانے کے بعد اقبال نے کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں، یہ ۱۹۱۳ کا واقعہ ہے اس کے بعد اقبال کی زندگی کا سلوب کا ملا بدل گیا۔''[2]

معلوم نہیں کہ یہ اقبال کی تعریف ہے یا تنقیص، اس سے کسی کے بارے میں بھی کوئی اچھی شبیہ نہیں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ رنگ رلیاں ہمیشہ منفی خیالات کے اظہار کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہ صحافیانہ مزاج کی دین ہے۔ اقبال کس قسم کی رنگ رلیاں مناتے تھے۔ اس بارے میں سالک لکھتے ہیں کہ:

---

1 ذکر اقبال ص ۸۵

2 ذکر اقبال ص ۹۱

'رنگ رلیوں کا ذکر آ گیا تو یہ بھی سن لیجئے کہ اقبال عہد عنفوان شباب میں اپنے عہد کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے۔ بلاشبہہ وہ مصری کی مکھی ہی رہے شہد کی مکھی نہ بنے لیکن آج بھی ان کے بعض ایسے کہن سال احباب موجود ہیں جو اس گئے گذرے زمانے کی رنگین صحبتوں کی یاد کو اب تک سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ خود اقبال نے اپنی ابتدائی لغزشوں کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی ان کے تمام ہم نشین اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ علاوہ بریں 'رموز بیخودی' کے آخر میں 'حضور رحمۃ اللعالمین' میں عرض کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ میں مدتوں عشق مجاز اور اس کے متعلقات میں مبتلا رہا لیکن یہ آرزو میرے سینے میں برابر رہی کہ میری موت حجاز میں ہو'[1]

اقبال کی 'رنگ رلیوں' کی روداد سالک کے علاوہ کسی اور نے نہیں بیان کیا۔ اور جہاں تک رموز بیخودی کے مذکورہ اشعار کی بات ہے تو یہ ثبوت نہیں بن سکتا ہے اس لیے کہ اوّلاً آدمی اللہ کی بارگاہ میں اپنی عاجزی کے اظہار کے لیے ایسی باتیں بھی کہتا ہے جس کا غلط مطلب بھی نکالا جا سکتا ہے۔ اور دوسری بات کسی کی شاعری میں عاشقی کے ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے واقعی عشق کیا ہے۔ کتنے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا مگر انہوں نے خمریات میں اپنے عمدہ اشعار کی وجہ سے شہرت پائی ہے۔

علامہ اقبال کی پوری زندگی قناعت سے عبارت ہے وہ کبھی دولت کے پیچھے نہیں بھاگے۔ اپنی طرف آتی دولت کو بھی بے اعتنائی سے رد کر دیا۔ لیکن سالک صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے مہاراجہ الور کی سکریٹری شپ کی درخواست صرف اس وجہ سے رد کر دیا کیوں کہ تنخواہ صرف چھ سو روپئے تھی۔ 'علامہ اقبال نے جواب دیا کہ سوچ کر جواب دوں گا۔ یہ کہہ کر واپس آ گئے اور چپ چاپ ریاست الور سے رخصت ہو کر لاہور پہنچ گئے۔'' [2]

اقبال کے استاد میر حسن کو شمس العلما کا خطاب دینے جانے کا وقعہ سبھی سوانح نگاروں نے بیان کیا ہے۔ دوسرے سوانح نگاروں کے مطابق اقبال نے سر کا خطاب اسی شرط کے ساتھ لینا منظور کیا تھا کہ ان کے استاد میر حسن کو خطاب دیا جائے۔ لیکن عبدالمجید سالک نے اس واقعہ کو دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق اقبال اس خطاب کو قبول

---

1 ذکر اقبال ص ۹۲

2 ذکر اقبال ص ۱۰۶

نہیں کرنا چاہتے تھے مگر اس وجہ سے انہوں نے 'سر' کے خطاب کو قبول کر لیا کہ اس سے میکایگس اور حکومت کے اہلکار کوئی دوسرا مطلب نہ نکالیں۔ اس کے بعد گورنر نے اقبال سے پوچھا کہ کوئی اور بھی خطاب کا حق دار ہے تو اقبال نے ایک شرط کے ساتھ اپنے استاد میر حسن کا نام بتایا کہ ان کے علاوہ کسی اور نام پر غور نہیں کیا جائے گا۔[1]

ان کو تاہیوں کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سالک کو اقبال سے انسیت نہیں تھی۔ انہوں نے اقبال کی 'جاسوسی' کی وغیرہ۔ کوئی بھی کتاب مکمل نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہو تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ ہی بند ہو جائے۔ ہر مصنف اپنے بعد والوں کے لیے کوئی نہ کوئی چیز چھوڑ جاتا ہے۔ بعد میں آنے والا ان چھوڑی ہوئی کڑیوں کو تلاش کر کے اس کمی کو پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کے باوجود کوئی بھی مکمل ہونے کا دعوی نہیں کرتا۔

اقبال ہی کی زبان میں:

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

سالک کی 'ذکر اقبال' کی اہمیت کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اقبال کی پہلی منظم سوانح حیات ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے بھی اقبال کی سوانح حیات پر قلم اٹھایا وہ اس سے بے نیاز نہیں رہے۔ سالک نے معلومات اکٹھا کرنے کے لیے زبانی روایتوں کے علاوہ اخبارات کی فائلوں سے بھی مدد لی ہے۔ سالک نے کوشش کی ہے کہ اس 'ذکر اقبال' کو زیادہ سے زیادہ مفید بنائیں۔ اس وجہ سے انہوں نے اقبال کی نظموں کی ابتدائی شکلوں کو بھی درج کر دیا ہے۔ اگرچہ اقبال نے ان نظموں میں تبدیلی کر دی ہو۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اقبال کی شاعری کی وہ شکل بھی سامنے آجاتی ہے جو انہوں نے ترمیم سے پہلے لکھی تھی۔[2]

'ذکر اقبال' کے مطالعہ سے بعض نظموں کے وجہ ورود پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اقبال کا ایک مشہور شعر ہے:

---

1 دیکھیں: ذکر اقبال، ص:

2 ملاحظہ فرمائیں ذکر اقبال ص ۱۱۳

مسجد تو بنا لی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے

پر من تو پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اس شعر کے بارے میں سالک لکھتے ہیں کہ لاہور میں چند جوشیلے نوجوانوں نے بلدیہ کی زمین پر راتوں رات ایک مسجد کھڑی کر دی، اس کی وجہ یہ کہ ہندوؤں نے وہاں ایک عالیشان مندر بنوایا تھا۔ اس موقع پر اقبال نے یہ شعر کہا تھا۔ جو حقیقت حال کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔

اقبال عرب اور دنیائے اسلام کی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ترکی سلطنت سے حجاز کے الگ ہو جانے پر بہت سارے لوگوں نے ان سے سعودی حکومت کے بارے میں رائے جاننی چاہی تو انہوں نے سعودی فرماں رواؤں پر اعتماد کا اظہار کیا۔ اس موقع پر کسی نے کہا کہ وہ تو بادشاہت ہے۔ اس پر اقبال نے ایک تاریخی جملہ کہا تھا۔

'عرب فطرتاً جمہوریت پسند ہیں، اور سرزمین عرب میں کوئی مطلق العنان حکومت زیادہ مدت تک پھل پھول نہیں سکتی۔'[1]

اقبال کی یہ بات آج حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ عرب نوجوان آمروں کے خلاف ایک آواز ہو کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ کئی ملکوں سے آمروں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اور دوسرے ممالک میں آمروں کے خلاف تحریک زوروں پر ہے۔ آنے والا دن اقبال کی اس پیشین گوئی کو پورا کر کے رہے گا۔

مجموعی طور پر اقبال کے شارحین میں عبدالمجید سالک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے چونکہ اقبال کی سوانح کی بنیاد رکھی ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر کچھ خامیوں کا رہ جانا ایک فطری امر ہے۔ اس کے باوجود عبدالمجید سالک کی کتاب 'ذکر اقبال' بنیادی ماخذ کا کام دے گا۔

---

1 ذکر اقبال ص ۱۵۴

# سید وحیدالدین فقیر

سید وحید الدین فقیر ان خوش بختوں میں سے ہیں جنہیں اقبال کی صحبت نصیب ہوئی۔ انہوں نے اقبال کی علمی مجلسوں سے استفادہ کیا ہے۔ آپ کو اقبال سے عشق تھا۔ انہوں نے اقبال کی زندگی سے متعلق تصویروں کو بھی جمع کر کے Iqbal in pictures کے نام سے شائع کیا تھا۔ اقبالیات پر ان کی کتاب 'روز گار فقیر' اقبال سے ان کی ملاقاتوں کی روداد ہے۔ دو جلدوں پر مشتمل اس روداد کی حیثیت اقبال کے سوانحی ادب میں مرجع کی ہے۔ تقریباً تمام اقبال ناقدین اور شارحین نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ اس سے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سید وحید الدین فقیر نے کتاب کے 'نقش اول' میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ 'اس کتاب کا بنیادی موضوع 'اقبال بحیثیت شاعر' نہیں، 'اقبال بحیثیت انسان' اور 'اقبال بحیثیت عاشق رسول' ہے۔'[1]

فیض احمد فیض نے اس کتاب کو تذکرہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ اقبال کی حیات کا جامع تذکرہ نہیں ہے۔ اس کی حیثیت ایک سیاح کی ڈائری کی ہے۔ جس کو اس نے سفر کی واپسی کے بعد فرصت کے ایام میں حسین لمحوں کی شیرازہ بندی کہ یہ ہے۔[2]

روز گار فقیر کے لیے ایک سیاح کی ڈائری سے اچھی کوئی تشبیہ نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب وحیدالدین فقیر کی یادداشتیں ہیں جو اقبال کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لیکن اس سے اس کتاب کے استناد پر کوئی حرف نہیں آئے گا کیوں کہ کسی بھی

---

1 روز گار فقیر، سید وحید الدین فقیر ج ا ص ۱۰، طبع اول ۱۹۵۰ء

2 روز گار فقیر ص ۱۵

شخصیت کی سوانح کی بنیاد یہی تذکرے اور یادداشتیں ہوا کرتیں ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں شخصیت کی اہم معلومات کھو جاتی ہیں۔

وحید الدین فقیر نے اگرچہ کہا ہے کہ اس کتاب میں وہ اقبال کی شاعری کے بجائے شخصیت کو موضوع بنائیں گے لیکن کسی بھی فنکار کی شخصیت کو اس کے فن سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا ہے اس وجہ سے ضمنی طور پر اقبال کی شاعری اور فن سے وہ اپنا دامن بچا نہیں پائے ہیں۔ اور سچ بات یہ ہے کہ اس سے دامن بچانا ممکن بھی نہیں تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سورج کا ذکر ہو اور اس کی روشنی کا بیان نہ ہو۔ چاند کا ذکر ہو اور چاندنی کا ذکر نہ ہو۔ یہی حال اقبال کی شخصیت اور ان کے فکر وفن کا ہے۔

ان ملاقاتوں کا سلسلہ ۱۹۱۶ سے شروع ہوتا ہے اور علامہ کی موت تک برقرار رہتا ہے۔ علامہ سے پہلی ملاقات کی روداد بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''والد محترم ڈاکٹر صاحب کی صحبت کو مکتب و مدرسہ کہیں بہتر گردانتے تھے چنانچہ ایک دفعہ رخصت پر آئے تو مجھے ہدایت فرماگئے کہ 'تمہارا پڑھنے میں جی نہیں لگتا تو مت پڑھو لیکن یہ وعدہ کرو کہ ہر روز ڈاکٹر اقبال کے گھر صبح سے شام تک حاضر رہا کرو گے اور ان کی گفتگو کو غور سے سنا کرو گے۔''[1]

علی گڑھ تعلیم کے دوران انکی ملاقات ہوئی تھی جب وہ چھٹی گزارنے گھر آئے ہوئے تھے وہ اقبال سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''مجھے گھر آئے دو دن گزرے تھے سہ پہر کا وقت تھا ملازم نے آ کے کہا' ابا بلا رہے ہیں۔''

والد صاحب قریب ایک صاحب صوفے پر دراز تھے۔

والد بزرگوار نے کہا: 'یہ میرا دوسرا لڑکا ہے۔

---

1 روزگار فقیر ص ۳۱، ج ۱

صوفہ نشین صاحب نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا، اور مجھے شفقت سے اپنے پاس فرش پر بٹھا لیا۔ یہ اقبال مرحوم سے میری پہلی ملاقات تھی۔[1]

سید وحید الدین فقیر نے اقبال کی سوانح کے بارے میں کچھ باتیں ایسی بھی لکھی ہیں جو دیگر شارحین سے مختلف ہیں، مثلاً علامہ اقبال کے دورہ اسپین کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے پہلے سے مسجد قرطبہ مین نماز کی اجازت لی تھی۔ اس وجہ سے وہاں جا کر انہوں نے نماز پڑھی۔ لیکن وحید الدین فقیر اس کے برعکس کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ جب قرطبہ پہنچے اور وہاں کی مسجد دیکھنے گئے جو انقلاب زمانہ کی بوقلمونی سے گرجا بن چکی ہے تو انہوں نے ایک پادری کو جو مسجد کی نگہبانی پر مامور تھا وہاں نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پادری نے یہ سن کر تامل کیا ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تعجب ہے تم مسیحی ہم سے اس قسم کا سلوک روا رکھتے ہو۔ حالانکہ ہم نے کبھی تم سے اس قسم کا سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ پادری اس فقرہ سے متاثر ہوا اور کہنے لگا آپ یہیں ٹھہرئے میں بڑے پادری سے پوچھ کے آتا ہوں۔ لیکن جب تک وہ واپس آتا ڈاکٹر صاحب نماز پڑھ چکے تھے۔''[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے لیے پہلے سے اجازت نہیں لی گئی تھی۔

انہوں نے اپنی کتاب میں اقبال پر وارد اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے۔ علامہ اقبال پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ مسولینی کی فکر سے متاثر تھے۔ اس حوالے سے آپ لکھتے ہیں:

''مسولینی سے ڈاکٹر صاحب کی اس ملاقات اور ان کی ایک نظم جو انہوں نے مسولینی کے متعلق لکھی ہے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا رجحان بھی فاشزم کی جانب تھا لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ مسولینی نے اپنے ملک کے لوگوں میں جو تنظیم پیدا کر دی تھے اسے وہ پسند کرتے تھے۔ کیوں کہ اسلام کی حقیقی روح بھی تنظیم ہے اور ان کی عادت تھی کہ جب کسی تحریک میں انہیں کوئی ایسی بات نظر آتی جو اسلامی اصولوں سے مشابہ معلوم ہوتی تھی تو وہ اس کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ ورنہ یہ سب کو معلوم ہے کہ جب مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کر لیا تو

---

1 روزگار فقیر ص ج ا ص ۲۸

2 روزگار فقیر ج ا ص ۴۳

انہیں سخت صدمہ ہوا چنانچہ انہوں نے اپنی مشہور نظم 'چہ باید کرد اے اقوام مشرق' لکھی جس میں یورپ والوں کی ہوس ملک گیری کا ذکر نہایت تلخ انداز میں کیا گیا ہے۔"[1]

روز گار فقیر کی دوسری جلد علامہ کی بیماری وصیت، اقبال کے احباب کے تذکروں اور کچھ متروک کلام اقبال پر مشتمل ہے۔ آخر میں اقبال کی نادر تصویروں کو جمع کر دیا ہے۔ جس علامہ کی ڈگری، پاسپورٹ وغیرہ کے نقول ہیں۔ یہ نقول اور تصاویر اس لحاظ سے اہم ہیں کہ بعد میں آنے والوں کو ان نقول کے لیے میوزیم وغیرہ جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

علامہ کی بیماری کے بارے میں تفصیل فراہم کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "علامہ کا گلا اکثر خراب رہتا۔ اعجاز صاحب کے بقول علاج کرانے میں ان معالجوں اور تیمارداروں کی تین دقتوں سے دوچار ہونا پڑتا۔ ایک تو یہ کہ دوا اگر بدذائقہ یا ناگوار بو والی ہوتی تو علامہ اس کو پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ استعمال کرنے سے جی چراتے تھے۔ دوسرے جو لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے وہ کوئی نہ کوئی مجرب اور آزمودہ نسخہ ضرور بتا جاتے علامہ ان نسخوں کو بھی استعمال فرما لیتے تیسری مشکل یہ تھی کہ طبیعت پرہیز کی پابندی سے کتراتی تھی۔ اس طرح باقاعدگی کے ساتھ مسلسل علاج معالجہ نہ ہو سکتا تھا۔"[2]

علامہ کے بارے میں یہ معلومات وہی دے سکتا ہے جو علامہ کی صحبت میں زیادہ رہا ہو، علامہ کی پسند و ناپسند پر اس کی نظر ہو۔ اس سے بڑھ کر اہم بات یہ کہ اسے علامہ سے محبت ہو، اس لیے کہ محبت کے بغیر کسی شخصیت کے ان امور پر لوگ توجہ نہیں دیتے۔

---

1 روز گار فقیر ج ا ص ۵۰

2 روز گار فقیر ج ۲ ص ۳۶۵ اسلامک بک فاونڈیشن، ۱۹۹۲ء

# سید نذیر نیازی

سید نذیر نیازی کا شمار ماہرین اقبالیات میں ہوتا ہے۔ یہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں اقبال کی صحبت میسر ہوئی۔ انہوں نے اقبال کی مجلسوں کی ایک روداد بھی 'اقبال کے حضور' کے نام سے شائع کی ہے۔ یہ روداد اگرچہ مختصر ہے مگر اقبال کے فکر و فن ان کی نفسیات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اقبال کی ایک مبسوط اور جامع سوانح لکھنے کا مسئلہ اقبال کی وفات کے بعد سے ہی اقبال شناسوں کے لیے فکر کا باعث تھا۔ غلام رسول مہر نے انقلاب میں اس بابت اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر حالت یہی رہی تو اقبال کی جلوت و خلوت میں بیٹھنے والے اس دنیا سے اٹھ جائیں گے اور اقبال کی سوانح سے متعلق مواد کی فراہمی مشکل ہو گی۔ سید نذیر نیازی کو نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات کی طرف سے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اقبال کے ساتھ انہوں نے شب و روز گزارے تھے اس وجہ سے امید تھی کہ وہ اس کام کو بہتر ڈھنگ سے انجام دیں گے۔ مگر نذیر نیازی صرف تین ہی فصل لکھ سکے مجبوراً اقبال اکیڈمی پاکستان کو 'تبرکاً' اسے شائع کرنا پڑا۔

نذیر نیازی کا ارادہ 'قطعی' . . . قیہی 'سوانح لکھنے کا تھا۔ وہ بھی 'محض ایک سال کی مدت میں' انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ وہ اقبال کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر خصوصی توجہ دیں گے۔:

1. 'شاعر اسلام اور مفکر اسلام
2. مسلمانان جنوب مشرقی ایشیا کے لیے ایک آزاد وطن (کذا)
3. مسلمانان عالم کے اتحاد اور
4. استعماری اور رجعت پسند قوتوں کے خلاف تیسری دنیا کے اتحاد و استحکام کے علمبردار کی حیثیت سے حضرت علامہ کی شخصیت اجاگر کی جائے۔'[1]

---

1 دانائے راز ص ۵

کام تو نیازی صاحب نے شروع کیا مگر ان کی خود کی مصروفیات نے انہیں مہلت نہیں دی اس طرح یہ سوانح نامکمل ہی رہی۔ اس درمیان دوسری سوانح عمریاں بھی تیار ہو گئیں۔ اب سید نذیر نیازی کے پاس وقت تھا پہلے وہ سوانح کو جلد بازی میں سمیٹ رہے تھے۔ اب وہ تفصیل سے سوانح لکھنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ 'دانائے راز' کے اسلوب میں ابتدا اور آخر میں فرق ہے۔

نذیر نیازی کے سامنے، محمد دین فوق کا تفصیلی مضمون جو اپریل ۱۹۰۹ میں کشمیری میگزین میں شائع ہوا، چراغ حسن حسرت کی حیات اقبال، محمد طاہر فاروقی کی سیرت اقبال، عبدالسلام ندوی کی اقبال کامل، عبدالمجید سالک کی ذکر اقبال اور صابر کلوروی کی یاد اقبال موجود تھیں ان کتابوں سے وہ استفادہ کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے چند کتابوں تک ہی اپنے کو محدود رکھا۔ زیادہ تر انہوں نے 'روز گار فقیر' اور اقبالکی سے ابتدائی زندگی کے بارے میں فوق کے مضمون سے مواد لیا ہے۔ 'اقبال کے حضور' اس وقت تک مسودہ کی شکل میں تھا۔ یہ خود انکی کتاب ہے اس وجہ سے مسودہ سے مدد لینے میں انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

کتب اور مضامین کے علاوہ اقبال پر نذیر نیازی نے معلومات کی فراہمی کے لیے ذاتی ملاقاتیں بھی کیں۔ لوگوں سے مل کر معلومات جمع کیا۔ اس کے علاوہ اقبال کے اشعار اور خطوط کو بھی مواد کے طور پر استعمال کیا ہے۔

نذیر نیازی کو اقبال کی صحبت حاصل تھی، اس وجہ سے ان سے امید کی جاتی تھی کہ وہ جو بھی لکھیں گے اس کے اندر قطعیت ہو گی لیکن ان کے یہاں قطعیت کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ نذیر نیازی کئی جگہوں پر محض ظن اور تخمینہ کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ ایسے مقامات پر وہ ایسے جملے استعمال کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اس تعلق سے کشمکش کے شکار ہیں۔ مثلاً:

''محمد اقبال ابھی لاہور نہیں آئے تھے کہ شیخ نور محمد انہیں اوان شریف لے گئے۔ قاضی سلطان محمود کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ قیاس یہ ہے کہ اسی سفر میں محمد اقبال قاضی صاحب سے بیعت ہوئے۔''[1]

1 دانائے راز، ص ۲۵

''حرمت خاں کا مزار شاید سیالکوٹ ہی میں واقع ہے''[1]

'محمد اقبال نے اس مکتب (عمر شاہ) میں نوشت و خواند سیکھی، قران مجید پڑھا۔ یہ مرحلہ طے پایا یا اس کے کے دوران ہی میں شیخ نور محمد نے انہیں مولانا غلام حسین کے مدرسے میں بھیج دیا''[2]

کئی جگہوں پر تخیل کی پرواز سے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کی نظر میں اقبال کی سوانح کو مکمل کردے۔ 'شہر اقبال' کے تحت صاحب سوانح نے سیالکوٹ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ وہاں کے بود و باش اور بچپن کے واقعات اور پھر وہاں کی آب و ہوا سے اقبال کس قدر متاثر ہوئے، ضروری سی بات ہے کہ اس سلسلے میں مواد کی کمی تھی۔ نذیر نیازی نے اس خلا کو اپنے تخیل سے پر کرنے کی کوشش کی ہے:

محمد اقبال سَیر کرتے، دوستوں کے ساتھ پھرتے پھراتے ادھر بھی جا نکلے ہوں گے۔ چھاونی اور اسے کے مضافات بلکہ پورن کے کنوئیں سے ہوتے ان کا گذر 'بابے کے بیر' جہاں گرونانک کا قیام رہتا اور اس کے پاس ہی سید حمزہ غوث کے پاس سے بھی ہوتا ہوگا۔۔۔''[3]

''لحن بڑا دلکش۔ قصیدے نشید کرتے۔ خود محظوظ ہوتے سننے والوں کو محظوظ کرتے۔ یوں موسیقی سے شغف پیدا ہوتا گیا۔ شعر کہنے لگے۔ شروع شروع میں جو کچھ کہا دوستوں تک محدود رکھتے ہوں گے۔'' [4]

''قیاس یہ ہے کہ ۱۹۰۴ اور ۱۹۰۵ کے درمیان جناب داغ کسی وقت لاہور آئے۔ محمد اقبال ان سے ملے ہوں گے۔''[5]

---

1 دانائے راز، ص ۵۶

2 دانائے راز، ص ۹

3 دانائے راز، ص ۵۸

4 دانائے راز، ص: ۷۶

5 دانائے راز، ص: ۷۹

اس قسم کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں نذیر نیازی نے کوئی بات پورے اعتماد کے بجائے تذبذب کے ساتھ کہی ہے۔ اس قسم کی مثالیں بتاتی ہیں کہ نذیر نیازی کے یہاں اعتماد کی کمی ہے۔ انہیں وسائل بھی ملے تھے لوگوں کا تعاون بھی ملا اس کے باوجود کام کی نوعیت مایوس کن ہے۔

اقبال کے دیگر شارحین کی طرح نذیر نیازی بھی اقبال کے مرزا غلام احمد قادیانی کے تعلقات کے بارے میں گول مول بات کہہ کر آگے نکل گئے ہیں۔ حالانکہ کئی ناقدین نے مرزا غلام احمد قادیانی کے لیے نرم گوشہ رکھنے کا الزام اقبال پر رکھا ہے۔ اس وجہ سے اس بارے میں کوئی بات کہنی ضروری تھی۔ ایک جگہ مرزا غلام احمد کا ذکر نہایت مبہم انداز میں کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قادیانیوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں:

> 'کنور سین کے والد بھیم سین بڑے کٹر آریا سماجی تھے، اسلام پر طرح طرح سے معترض ہوتے ایک دن مرزا غلام احمد مراقبے میں بیٹھ گئے۔ کمبل اوڑھ لیا۔ پسینہ پسینہ ہوگئے۔ کہنے لگے ان کے ماتھے پر جلی حروف میں لفظ دجال لکھا ہے۔'[1]

کس نے کہا؟ بھیم سین نے یا مرزا غلام احمد قادیانی نے کہا؟ کس کے ماتھے پر جلی حروف میں لفظ دجال لکھا ہوا ہے۔؟ عبارت مبہم ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر یہ جملہ بھیم سین کی طرف سے ہے تو کیا صاحب سوانح مرزا پر کیا گیا تبصرہ اسلام کے خلاف مانتے ہیں؟

اس کے ایک صفحہ کے بعد ایک مرتبہ پھر مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر کرتے ہیں۔:

'مسلمانوں کے اندر مذہبی اختلافات اور نزاعات کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی گروہ بندیاں قائم تھیں۔ تحریک علی گڑھ کی بلاوجہ مخالفت کچھ کم یاس انگیز نہیں تھی۔ مرزا غلام احمد بھی ان دنوں سیالکوٹ میں مقیم تھے۔ شیخ نور کے قریب

---

1 دانائے راز، ص ۷۱

ایک مکان میں رہتے۔ ہنوز ان کی دعوت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ زمانہ ان کے مراقبوں، علمی اور مذہبی گفتگوؤں کا تھا۔ شیخ نور محمد اور میر حسن سے ملاقات رہتی۔ محمد اقبال یہ سب کچھ دیکھتے اور سب کچھ سنتے۔'[1]

'سب کچھ دیکھتے اور سب کچھ سنتے' سے مصنف کی مراد کیا ہے؟ یہ واضح نہیں ہے۔ یہ پوری عبارت بھی گزشتہ عبارت کی طرح مبہم ہے۔ ایک ایسے مسئلے پر اس قسم کی مبہم عبارت مزید شبہات کو جنم دیتے ہیں۔

'اقبال کے حضور میں' سید نذیر نیازی کی کتاب ہے۔ اس میں اقبال کے شب وروز اور ان سے ملاقاتوں کی روداد ہے۔ اقبال سے گفتگو کے دوران جو موضوعات جن موضوعات پر گفتگو ہوتی سید نذیر نیازی اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے قادیانیوں کے بارے میں ایک معنی خیز جملہ لکھا ہے۔ لکھا ہے:

> سالک ومہؔر گئے تو کانگریسی اوریو . . ید . سہٖ خیال مسلمانوں کی باتیں ہونے لگیں۔ پھر قادیانیوں اور دیوبندیوں کی۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ قادیان اور دیوبند اگرچہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور دونوں اس تحریک کی پیداوار ہیں جسے عرف عام میں وہابیت کہا جاتا ہے۔"[2]

جہاں تک اقبال اور مرزا غلام احمد قادیانی کی دعوت کا سوال ہے تو اقبال ابتدا میں دوسرے مسلمانوں کی طرح مرزا کی حقیقت کو پہچان نہیں سکے۔ لیکن جیسے ہی انہیں مرزا غلام احمد قادیانی کی حقیقت کا علم ہوا انہوں نے قادیانی دعوت کے خلاف سخت موقف اختیار کیا۔ اقبال نے اس تحریک کے خلاف اخبارات میں مضامین بھی لکھے۔ اسی موضوع پر اقبال اور جواہر لعل نہرو سے اخبارات میں مباحثہ بھی ہوا تھا۔ اقبال نے اپنا موقف قادیانیت کے بارے میں بہت ہی واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ قادیانیت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔ اس وجہ سے اس تعلق سے کوئی مبہم بات کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

---

1 دانائے راز، ص ۴۷

2 اقبال کے حضور میں از سید نذیر نیازی ج ا ص: ۲۶۱، (جنوری تا ۲۱ مارچ) مطبوعہ اقبال اکادمی کراچی۔ سن طباعت ۱۹۳۸

نذیر نیازی کا ماننا ہے کہ اقبال کی نوجوانی کا زمانہ (۱۹۸۵تک) سب سے اہم دور ہے۔ یہ اقبال کی تشکیل کا زمانہ ہے اسی زمانے میں اقبال کی صلاحیتیں پروان چڑھیں۔ نذیر نیازی نے اقبال کے سیالکوٹ اور لاہور کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کے احوال کو بھی بیان کیا ہے۔ اقبال کے دوستوں میں علما دانشور اور عالم بچپن کے ساتھی سبھی شامل تھے۔ اقبال سبھی کی قدر کرتے تھے۔ اقبال کے بعض بچپن کے دوست اقبال کی شخصیت کی وجہ سے مرعوبیت کا شکار ہو جاتے۔ لیکن اقبال اپنے عمل سے انہیں احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کے درمیان کسی قسم کا فاصلہ ہے۔ نوجوانی میں اقبال کو کبوتروں سے کافی انسیت تھی۔ سیالکوٹ میں آپ خالی اوقات میں کبوتر اڑایا کرتے تھے۔جب لاہور گئے تو کبوتر ساتھ لے گئے۔ کہیں سے مدینہ کا ایک کبوتروں کا جوڑا مل گیا اسے بڑی عقیدت سے پالا۔ اتفاق سے اسے بلی کھا گئی۔ اس کا اقبال کو سخت صدمہ ہوا۔ مولانا ظفر علی خان نے اس پر مرثیہ لکھا۔ نذیر نیازی کہتے ہیں کہ کبوتروں سے اقبال کی انسیت کو دیکھنے کے باوجود 'میر حسن نے روکا اور نہ شیخ نور محمد نے۔ شاید اس لیے کہ انہیں خواب میں جو اشارۂ غیبی ہوا تھا کبوتر کی شکل میں۔ اقبال کا دوسرا مشغلہ اکھاڑے میں کسرت کرنا تھا۔ اقبال کے یہ دونوں مشغلے آگے چل کر ان کی شاعری میں کافی اثر انداز ہوئے۔ کبوتر کی بلند پروازی انہیں محبوب تھی مگر کبوتر ایک کمزور پرندہ ہوتا ہے اس وجہ سے انہوں نے عقاب کو اپنی شاعری میں علامت کے طور پر استعمال کیا جو بلند پروازی اور قوت میں کبوتر سے تیز ہوتا ہے۔

دانائے راز اقبال کی مکمل سوانح نہیں ہے اس میں ۱۹۰۵تک کے حالات کا ہی احاطہ کیا گیا ہے۔ اقبال اکادمی پاکستان کی طرف سے شائع ہونے والی اس کتاب کے شروع میں کوئی فہرست بھی نہیں جس سے کتاب کے مشمولات سے ایک نظر میں آگاہی ہو جائے۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل آغاز سے ۱۸۹۵ء کے حالات پر مشتمل ہے جبکہ دوسری فصل میں ۱۹۰۵ءتک کے حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ ہر فصل کو مختلف ذیلی عنوان سے سجایا گیا ہے۔

نذیر نیازی سے اقبال کی سوانح کے سلسلے میں چند تسامحات بھی ہوئی ہیں، ان میں سے چند ایک کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ۱۔ منشی طاہر الدین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اقبال نے جب وکالت چھوڑ دی تو منشی طاہر الدین اپنے کام پر لگ گئے مگر اقبال کا ساتھ نہیں چھوڑا، کاغذات انہیں کے پاس رہتے تھے۔ 'ڈاکٹر صاحب تنخواہ دینا چاہتے مگر انہوں نے تنخواہ نہیں لی' [1]

1 دانائے راز، ص ۱۷۸

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی طاہر الدین نے اس کے بعد اقبال سے کوئی تنخواہ نہیں لی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وکالت ترک کرنے کے بعد بھی اقبال کا حساب کتاب انہی کے پاس رہتا تھا۔ اس کے عوض اقبال انہیں ۵۰ روپئے ماہوار دیا کرتے تھے۔ آخری عمر میں یہ رقم ۳۰روپئے کر دی گئی تھی۔

نذیر نیازی نے دوسری جلد پہلی کے مقابلے زیادہ تفصیلی لکھی ہے۔ بعض جگہوں پر یہ تفصیل قاری کے لیے تشویش کا باعث بن جاتی ہے۔ اقبال کے متعلقین کے بارے میں تفصیلات، کتابوں پر غیر ضروری تفصیلی تبصرے، اور 'حلقہ احباب سخن' کے تفصیلی بیان میں اقبال کی شخصیت گم ہو جاتی ہے۔ یہ اقبال ہی کی نہیں بلکہ اس کے علاوہ دیگر ہم عصر اکابرین اور شعرا کی بھی روداد بن کر رہ گئی ہے۔

نذیر نیازی کے کتاب کے آخر میں 'وطنیت' اور 'وحدۃ الوجود' کے نام سے عنوان قائم کرکے ان کے بارے میں اقبال کا موقف بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حصہ خالص سوانح کا نہیں ہے۔ اگرچہ شخصیت کے نظریات کو اس کی سوانح سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ مگر اقبال کے فکر وفن پر سیکڑوں کتابیں ہیں جن میں ان موضوعات کو مزید تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس وجہ سے میری رائے میں ان موضوعات سے سوانح نگار کو سرسری طور پر گزر جانا چاہئے۔

سید نذیر نیازی نے اقبال پر متفرق مضامین لکھے۔ اقبال کی ذاتی محفلوں کی روداد 'اقبال کے حضور میں 'معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اس میں انہوں نے اقبال کے شب وروز کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ 'اقبال کے حضور' کے شروع میں وہ کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> 'حضرت علامہ کے حضور راقم الحروف کی نشستوں اور گفتگوؤں کی یہ روداد جو اساساً حضرت علامہ کے ارشادات اور طویل ایام علالت کی روز مرہ کیفیتوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ بلا مقدمہ شائع ہو رہی ہے اور ہونی چاہئے بھی۔ مقدمے کی نوبت تو جب ہی آئے گی جب اس روداد کی از اول تا آخر تکمیل ہو جائے۔ یہ رداد نہایت طویل ہے اور ۱۹۱۸ء سے لے کر جب راقم الحروف پہلے پہل حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا، ۱۹۳۸ء تک کہ ان کا سال وفات ہے کم وبیش بیس برس کی مدت پر حاوی ہے۔۔۔۔ کبھی نسبتاً طویل اور کبھی مختصر وقفوں کے بعد لاہور آتا حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا، ان کے ارشادات سنتا اور باحتیاط محفوظ کرلیتا۔ ۱۹۳۶ء میں البتہ جب راقم الحروف بظاہر مستقلاً لاہور منتقل ہو گیا تو اسے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ شب وروز حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر رہے اور ان کے یہاں نشستوں اور گفتگوؤں میں حصہ لے۔ بایں ہمہ ان اوراق میں جو اس وقت قارئین

> کے سامنے ہیں دو سوا دو برس کی اس قلیل مدت کے صرف ایک حصے کا ذکر ہے، تقریباً چار مہینوں کا۔ جنوری ۱۹۳۸ء سے لے کر اپریل ۱۹۳۸ء کے عشرۂ ثنی تک۔"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ 'اقبال کے حضور میں' انہوں نے اقبال کی زندگی کے آخری ایام کی پیسوں کی روداد لکھی ہے۔ یہ روداد اگرچہ نامکمل ہے لیکن اس معنی میں اہم ہے کہ اس سے اقبال کی دلچسپی اور شخصیت کے ایسے پہلو سامنے آگئے جو عام تنقیدی اور سوانحی کتابوں میں ممکن نہ تھا۔ نذیر نیازی کے اقبالیاتی مضامین کا مجموعہ 'اقبالیاتِ نذیر نیازی' کے نام سے عبداللہ شاہ ہاشمی نے مرتب کیا ہے جس کو اقبال اکادمی لاہور نے ۱۹۹۶ء میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں اقبالیات پر ہر قسم کے مضامین ہیں۔ نذیر نیازی کا خاص موضوع سوانح اقبال ہے اس وجہ سے اس میں بھی سوانحی مضامین شامل ہیں۔ خاص طور ان کا مضمون 'اقبال کی آخری علالت' کافی اہم ہے۔ اس طویل مضمون میں انہوں نے اقبال کی زندگی کے چار سالوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ یہ مضمون اس شخصیت کے بارے میں ہے جو آخری وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کر کے اس دنیا سے جانا چاہتا تھا۔ وہ علامہ کی آخری علالت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " ۱۹۳۶ء کی سردیاں آئیں تو حضرت علامہ کی طبیعت بہتر ہونا شروع ہو گئی اور ۱۹۳۷ء کے اختتام تک صحت کی یہ رفتار برابر قائم رہی۔ اس زمانے میں ایسا بھی ہوا کہ کبھی کبھی ان کی آواز نہایت صاف ہو جاتی علی ہذا تنفس اور بلغم میں بھی کمی تھی۔ البتہ کمزوری کا احساس باقی تھا۔ لیکن اس کے باوجود حضرت علامہ پلنگ پر لیٹے رہنے کی بجائے اکثر نشست کے کمرے میں آ بیٹھتے مگر انہوں نے خود پڑھنا لکھنا ترک کر دیا تھا کیونکہ مارچ یا اپریل ۱۹۳۷ء میں موتیا بند کی علامتیں قطعی طور سے ظاہر ہو گئی تھیں۔ بہر کیف اب ان کی خواہش تھی کہ قرآن پاک کے حقائق و معارف کے متعلق اپنا دیرینہ ارادہ پورا کریں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کس رنگ میں؟ تفسیر و تشریح یا ابتدائی مطالعہ کے لیے ایک مقدمہ؟ بالآخر موجودہ زمانے کی اجتماعی تحریکات کو دیکھتے ہوئے ان کے دل میں یہ خیال دن بدن مستحکم ہوتا چلا گیا کہ اس وقت ضرورت اسلام کے نظام عمرانی کی تصریح و توضیح کی ہے وہ چاہتے تھے کہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی مانند تشکیل جدید فقہ اسلامی پر قلم اٹھائیں اور دیکھیں کہ قرآن پاک نے ان مسائل کی رہنمائی کس انداز میں کی ہے۔ لیکن اس کے لیے وقت کی ضرورت تھی اور ان حضرات کی

---

1 اقبال کے حضور از سید نذیر نیازی، ص ۳

بھی جو فقہ اسلامی پر نظر رکھتے ہوئے جدید عمرانی رجحانات کو سمجھتے ہوں۔ بایں ہمہ انہوں نے اس غرض سے یورپ اور مصر کی بعض نئی مطبوعات فراہم کرنا شروع کر دی تھیں لیکن افسوس ہے کہ اس تصنیف کا کام ابھی فصائے مسائل، ترتیب مقدمات اور تقسیم مباحث سے آگے نہیں بڑھا اور وہ بھی صرف ان کے غور و فکر اور گفتگوؤں کی دنیا میں۔ آگے چل کر جب وہ اپنی صحت سے ناامید ہو گئے تو اس ارادے کی ناکامی سے اس قدر شکستہ خاطر تھے کہ دو ایک بار فرمایا۔''میں یہ کتاب لکھ سکتا تو اطمینان سے جان دیتا۔''[1]

اس آخری جملے سے اقبال کی تڑپ کا اندازلگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر اپنے مشن کی تکمیل کے لیے بے چین تھے۔ اقبال کے آخری دو سالوں کی روداد عاشق حسین بٹالوی نے بھی 'اقبال کے آخری دو سال' کے نام سے لکھی ہے۔ لیکن نذیر نیازی نے جو بات اس مضمون میں لکھ دی ہے وہ عاشق حسین بٹالوی چھ سو صفحات سے زائد کی کتاب میں نہیں پیش کر سکے۔

بہر حال مجموعی طور پر سید نذیر نیازی کی کتاب کو پڑھ کر اقبال شخصیت کے خدوخال اجاگر نہیں ہوتے۔ ایک ایسی سوانح کی ضرورت باقی ہے جو اس کمی کو پوری کر سکے۔ اس کے باوجود اقبال کے سوانحی سرمائے میں اس کی ضرورت رہے گی اور اس کو ایک مستند مآخذ کے طور پر تسلیم کیا جائے گا۔

---

1 اقبال کی آخری علالت، مشمولہ اقبالیاتِ نذیر نیازی، مرتبہ: عبداللہ شاہ ہاشمی۔ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۹۶ء

# جگن ناتھ آزاد

آزادی کے بعد ہندوستان میں اقبالیات کی نشر و اشاعت میں جن بزرگوں کا ہاتھ ہے ان میں ایک اہم نام جگن ناتھ آزاد کا بھی ہے۔ جگن ناتھ نے اقبالیاتی سرمایے کو اپنی گراں قدر تحقیقات کے ذریعہ وقار بخشا۔ آزادؔ یوں تو ایک ناقد اور محقق کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اقبال ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ انہوں نے اقبال کی سوانح پر بھی کام کیا۔ وہ اقبال کی ایک مبسوط سوانح لکھنا چاہتے تھے مگر کسی وجہ سے لکھ نہیں سکے لیکن انہوں نے درسی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے کئی سوانحی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سب سے مبسوط ''اقبال۔ ایک ادبی سوانح'' ہے[1]۔ درسی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی اس کتاب میں جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی حیات اور ان کی شاعری کے محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کی سوانح ان کے فن اور فلسفہ کو نظر انداز کرکے نہیں لکھی جاسکتی۔ اقبال کی یہ سوانح اقبال کے فن اور فلسفہ کو بھی محیط ہے۔ جگن ناتھ آزاد اردو ادب کے عظیم ناقد و محقق ہیں اس وجہ سے اردو کے ادبی سرمایہ پر بھی ان کی نظر ہے۔ وہ اقبال پر لکھتے ہوئے چند ایسی معلومات بھی دے جاتے ہیں جو اردو کے عام قاری کے لیے مفید ہوں۔ مثلاً اقبال کے خاندانی پس منظر پر لکھتے ہوئے جگن ناتھ آزاد نے بتایا کہ مشہور وکیل اور ادیب سر تیج بہادر کا خاندان بھی کئی پشتوں پر جاکر ان سے مل جاتا ہے۔ اسی طرح میر مظہر علی، جن کے یہاں اقبال کے والد سلائی کا کام کرتے تھے، کے بارے میں آزاد کی یہ معلومات بھی اہم ہیں کہ وہ قرۃ العین حیدر کے جدامجد ہیں۔ اقبال کشمیری النسل برہمن سپرو سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن کم ہی سوانح نگاروں نے اقبال کے اصلی گاؤں کی نشاندہی کی ہے۔ آزاد نے اس گاؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ اس چھوٹے سے گاؤں کا نام چکّر ہے۔ لیکن اب اس گاؤں کا وجود نہیں ہے۔

چونکہ آزاد کے ذہن میں ایک مبسوط سوانح کا خاکہ تھا۔ اور وہ اسے اپنے منصوبوں میں شمار کرتے تھے، اس وجہ سے انہوں نے اکثر اختلافی مباحث میں بغیر کسی بحث میں الجھے اپنی رائے دے دی ہے۔ اقبال کی تاریخ پیدائش کے بارے میں

---

1 جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی سوانح پر تین کتابیں لکھی ہیں: اقبال کی کہانی ؛ اقبال، زندگی شخصیت اور شاعری اور اقبال ایک ادبی سوانح، ایک کتاب روداد اقبال لکھنا چاہتے تھے لیکن اس کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا۔

مختلف اقوال گنانے کے بعد انہوں نے راجح قول ۱۹۷۷ کو ذکر کیا ہے۔ بعد میں یہی تاریخ راجح شمار کی گئی اور اسی کے مطابق ہندوستان و پاکستان میں اقبال صدی تقریبات منائی گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی تحقیق بہت جامع اور معتبر ہوا کرتی ہے۔ یہ جگن ناتھ کے لیے بھی بڑے اعزاز کی بات ہے کہ دنیا نے ان کی تحقیق شدہ تاریخ پیدائش کے حق میں فیصلہ کیا۔[1] اقبال کشمیری النسل تھے اس بات پر تمام شارحین متفق نظر آتے ہیں مگر اس بات پر باہم مختلف ہیں کہ اقبال کے جد امجد نے کب ترک وطن کیا تھا۔ آزاد اس اہم مسئلہ کو محض چند سطور میں بیان کر کے آگے نکل گئے ہیں:

"اگر چہ اس بات کا صحیح طور سے تعین کرنا دشوار ہے کہ اس خاندان نے کشمیر سے کب ہجرت کی لیکن تحقیق سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ غالباً اٹھارہویں صدی کے آخر میں بابا صالح کے خاندان کے ایک فرد شیخ جمال الدین نے جو اقبال کے پر دادا تھے بیوی بچوں سمیت کشمیر سے ہجرت کر کے سیال کوٹ کو اپنا مسکن بنایا ہوگا"[2]

سوانح کے اندر ادبیت نہ ہو تو شبلی کے نزدیک وہ معلومات کی کھتونی ہے۔ آزاد اس حقیقت سے واقف ہیں۔ اس وجہ سے وہ اقبال کی زندگی کے کسی بھی گوشے پر روشنی ڈالتے ہیں تو ادبی چاشنی کے ساتھ کرتے ہیں۔ عام طور پر دلی کی ٹکسالی زبان کے نمونے ان کی ترتیب کردہ سوانح میں مل جاتے ہیں۔

"اقبال کی اپنی ذہانت اور استعداد اور ٹامس آرنلڈ کی تعلیم، اسی کو کہتے ہیں سونے پر سہاگہ۔ یہ جوہر قابل چمک اٹھا۔"[3]

---

1 اس سلسلے میں آزاد نے ایک مضمون ہندوستان ٹائمز میں لکھا تھا جو ۱۸، فروری ۱۹۷۳ء کو شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے ثابت کیا تھا کہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۹/ نومبر ۱۹۷۷ء قرار دیا تھا۔ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کے ذریعہ تشکیل کردہ کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ میں جو اس نے ۴ فروری ۱۹۷۴ء کو سونپی تھی، اسی کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ دیکھیں: جگن ناتھ آزاد: فکر و فن، از منظور احمد

2 آزاد، پروفیسر جگن ناز، اقبال: ایک ادبی سوانح ص: ۲۰، ط۔۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، مارچ ۱۹۸۳

3 اقبال ایک ادبی سوانح، ص: ۳۶

جگن ناتھ آزاد نے جو کچھ بھی اقبال کی سوانح پر لکھا ہے اس کو پڑھ کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس معلومات کا بیش بہاذخیرہ تھا۔ صلاحیت بھی تھی۔ لیکن دوسری مصروفیات کی وجہ سے توجہ نہیں دے سکے ورنہ اقبال کی ایسی سوانح وجود میں آجاتی جو کسی حد تک اس خلا کو پر کر سکتی تھی۔

آزاد نے میر حسن کے 'شمس العلما' کا خطاب دیئے جانے کے بارے میں لکھا ہے کہ اقبال نے حکومت کے سامنے یہ شرط رکھی تھی کہ جب تک ان کے استاد میر حسن کو شمس العلما کا خطاب نہیں ملتا وہ اس خطاب کو نہیں لیں گے۔ گورنر ایڈورڈ میکلیگن نے ان سے پوچھا کہ ان کی کوئی تصنیف نہیں تو کیسے انہیں یہ لقب دیا جاسکتا ہے۔ اس پر اقبال نے کہا کہ ان کی تصنیف میں خود ہوں[1]

اقبال نے داغ سے بالمصافحہ ملاقات کی یا نہیں اس کے بارے میں آزاد نے کوئی واضح رائے نہیں دی ہے۔ لیکن ان کے جملے 'غائبانہ تعلق۔۔۔' سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اقبال نے بالمصافحہ ملاقات نہیں کی۔ اس کے باوجود آزاد کا یہ لکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟:

'۔۔۔اقبال بھی اس بات پر فخر کرتے رہے کہ انہوں نے داغ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا'[2]

کسی کے سامنے زانوے ادب تہ کرنے کا مطلب ہوتا ہے بالمصافحہ ملاقات کرنا۔ لیکن خود آزاد اس سے ایک دو جملہ پہلے داغ کی شاگردی کو غائبانہ قرار دے چکے ہیں۔

آزاد نے سوانح اقبال پر بہت مختصر لکھا ہے۔ اس کے باوجود ان کی کوشش رہی ہے کہ اقبال کی زندگی کا ایک ایسا اجمالی خاکہ تیار ہو جائے جس سے اقبال کی شخصیت کے داخلی اور خارجی عناصر کی ایک جھلک سامنے آجائے۔ انہوں نے ا قبال کے بارے میں پھیلی بہت ساری غلط فہمیوں کی مختصر مگر جامع انداز میں تردید کی ہے۔ اقبال کے بہت سے ناقدین نے اقبال کے بارے میں یہ غلط فہمی پھیلائی ہے کہ ان کی وکالت نہیں چلتی تھی اس وجہ سے اقبال دوسرے ذرائع آمدنی کی

---

1 اقبال ایک ادبی سوانح: ص ۲۷۔ ۲۸

2 اقبال : ایک ادبی سوانح ص ۳۱

طرف دیکھنے لگے تھے۔ آزاد نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال ایک قناعت پسند انسان تھے۔ وہ اتنے ہی مقدمے لیتے تھے جتنے کی ان کو ضرورت ہوا کرتی تھی۔ اقبال کو بہت قابل وکیل مانا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پٹنہ عدالت میں دمراو راج کیس میں سرکاری وکیل نے کسی متنازعہ لفظ کے بارے رائے دینے کے لیے اقبال ہی کا نام لیا۔ اس مقدمہ میں مخالف وکیلوں میں موتی لعل نہرو اور ڈاکٹر عبداللہ سہروردی جیسے لوگ تھے۔ اقبال کو یومیہ ایک ہزار روپئے پر بلایا گیا۔ اقبال جس دن وہاں پہنچے اسی دن اپنا بیان درج کر کے واپسی کی اجازت چاہی۔ سرکاری وکیل نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی کہ یومیہ ایک ہزار روپئے کی رقم آپ کو مل رہی ہے دو چار دن رک کر آرام سے کاغذات پڑھ کر بیان دے دینا مگر اقبال تیار نہ ہوئے۔[1]

یہ علامہ اقبال کی قناعت پسندی اور روپیوں پیسوں کی لالچ سے بے نیازی کی دلیل ہے۔ اقبال نے یہ سفر ایک وکیل کی حیثیت سے کیا تھا۔ انہوں نے خان محمد نیاز کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ 'ایک مقدمہ کے سلسلے میں آراہ (صوبہ بہار) گیا ہوا تھا' آزاد لکھتے ہیں کہ غالب گمان یہ ہے کہ یہ اسی پٹنہ کے سفر کی بات ہوگی۔ لیکن حاشیہ میں اس شبہہ کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر اقبال اس سفر میں آرہ گئے بھی ہوں تو بھی آرہ کے مقابلے میں پٹنہ معروف شہر ہے اس وجہ سے قاعدے کی رو سے اقبال کو اپنے خط میں پٹنہ لکھنا چاہئے تھا۔ اس وجہ سے یہ ایک تحقیق کا موضوع بن سکتا ہے۔

آزاد اقبال کی اسلام پسندی کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ اقبال کے سینے میں ایک بے چین مسلم دل دھڑکتا ہے لیکن وہ اقبال کے سیکولزم پر کافی زور دیتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کی زندگی کے ان گوشوں پر خصوصی توجہ دی ہے جو اقبال کو ایک سیکولر اور وسیع المشرب شاعر اور سیاستداں ثابت کرتے ہیں۔ اقبال نے سیاست بھی کی۔ ایک بار لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر بھی منتخب ہوئے اس ممبری کے دوران اقبال نے اسمبلی میں جن مسئلوں کو اٹھایا ان کا جائزہ لینے کے بعد آزاد نے لکھا ہے کہ اگر چہ وہ کونسل میں مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے گئے تھے لیکن انہوں نے کسانوں، غریبوں اور مزدوروں کے حق کے لیے آواز اٹھائی۔[2]

---

1 اقبال ایک ادبی سوانح ۱۰۰۔۱۰۱

2 دیکھیں: اقبال ایک ادبی سوانح ص ۱۱۵۔ ۱۱۹

آزاد نے اقبال کی ایک مختصر سوانح ابتدائی درجات کے بچوں کے لیے لکھی ہے۔ اس کا نام انہوں نے 'اقبال کی کہانی' رکھا ہے۔ اس مختصر سی چالیس صفحات کی سوانح میں بیس صفحات کے قریب ان کی شاعری کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ یہ سوانح جیسا کہ آزاد نے خود اس بات کی وضاحت کی ہے کہ 'شاعر مشرق علامہ شیخ سر محمد اقبال کی زندگی اور شاعری کی ایک جھلک' ہے۔ لہٰذا اس میں تفصیلی مباحث نہیں ہیں۔ لیکن یہ کتاب طلبہ کو اقبال کی زندگی اور ان کے پیغام سے متعارف کرانے کی ایک اہم کوشش ہے۔ جس میں وہ کامیاب ہیں:[1]

پروفیسر مظفر حنفی نے 'اقبال۔ ایک ادبی سوانح' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "بحیثیت مجموعی یہ کتاب ایک اوسط تعلیم یافتہ قاری کے لیے اقبال کے بارے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی اور ایسی معلومات فراہم کرتی ہے۔ جس سے لاعلم رہ کر اقبال کی شاعری اور ان کے پیغام کو سمجھنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔"[2]

جگن ناتھ آزاد کی اقبال شناسی پر عبدالحق نے ان کی نیت وخلوص پر شک کا اظہار کرنے کے باوجود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:[3]

---

1 اقبال کی کہانی انجمن ترقی اردو بیورو سے اسکولی طلبہ کی نصابی ضرورتوں کے لیے شائع کی گئی تھی۔

2 جگن ناتھ آزاد: فکروفن، از منظور احمد، ط۔ محروم میموریل لٹریری سوسائٹی نئی دہلی، ص: ۱۷۳۔

3 عبدالحق، اقبال اور اقبالیات ص ۱۴۸، مضمون: کرتا ہے ترا جوش جنوں تیری قبا چاک (آزاد کی اقبال شناسی)

اقبالیات

سے ان کا شغف منصوبوں، مصلحتوں اور مجبوریوں کا محکوم تھا۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود وہ اقبال کے شارح، مداح اور تجزیہ نگار کے طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اقبال کو مقبول عام اور متعارف کرانے میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جائے گا۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب اقبال کے نام کو انگیز کرنے کے لئے ایک بڑا طبقہ آمادہ نہ تھا۔ برادرانِ وطن کے ساتھ ترقی پسند طبقہ بھی نالاں و گریزاں تھا۔ ایسی پرآشوب سیاہ رات میں مفلس کا دیا بھی رہبری کے لئے قندیلِ رہبانی کا کام کرتا ہے۔ آزاد کی شاعری اور شخصیت کا رنگِ سخن ماند پڑ جائے گا مگر اقبالیات میں ان کی تحریریں انہیں یاد دلاتی رہیں گی۔ اقبال پر لکھنے والے تمام غیر مسلم ادیبوں میں آزاد کی عقیدت مندی قابلِ ستائش ہے۔ جسے خراج پیش کرنے کے لئے ہم مامور ہیں اور مجبور بھی۔

اقبال کی سوانح کو آزاد نے طلبہ کی ضرورتوں کے لیے لکھی ہے۔ انہیں تفصیلی سوانح لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن انہوں نے جو بھی لکھا اس میں ان کے علم، تجربہ اور فنی مہارت کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے۔

آزاد نے اقبال پر سوانحی کتابوں کے علاوہ تنقیدی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ مرقع اقبال(۱۹۷۷)، اقبال اور مغربی مفکرین، اقبال اور کشمیر(۱۹۷۷)، ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد (۱۹۸۹) ، فکر اقبال کے بعض اہم پہلو(۱۹۸۲)[1]، اقبال کی کہانی(۱۹۷۶)، اقبال: زندگی، شخصیت اور شاعری(۱۹۷۷)، محمد اقبال ایک ادبی سوانح (۱۹۸۳)، اقبال اور ان کا عہد۔

ان میں سے کچھ کتابیں سوانحی نوعیت کی ہیں باقی اقبال کے فکر و فن کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب اس قابل ہے کہ اس پر الگ سے گفتگو کی جائے۔ آزاد نے ہندوستان میں اقبالیات کا پرچم جس وقت بلند کیا ہے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ اقبال کو متعارف کرانے کا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے اس جانب خصوصی توجہ دی۔ اقبال پر نوجوانوں اور بچوں کے لیے جس قدر کتابیں انہوں نے لکھی ہیں ان کے بعد کے ادوار میں بھی کسی نے نہیں لکھیں۔

---

1 فکر اقبال کے بعض اہم پہلو، اقبال کے فکروفن پر مختلف اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں اقبال کے فکر و فن پر ۲۸ مضامین ہیں۔

جگن ناتھ اقبال کو ایک آفاقی شاعر مانتے ہیں۔ وہ اقبال کی بین الاقوامیت پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں سے نالاں ہیں جو اقبال کو کسی خاص خانہ میں مقید کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون 'شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر' میں انہوں نے بڑی شدت کے ساتھ ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو اقبال کو مختلف خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین میں اقبال کی شاعری میں ہندوستانی عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ اقبال پر یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ انہوں نے ہندوستانی عناصر کو نظر انداز کیا ہے انہوں نے ان لوگوں کی سختی سے تردید کی ہے۔ آزاد ایسے لوگوں کے نقطۂ نظر کو بے کار قسم کی نعرہ بازی قرار دیتے ہیں۔ اپنے مذکورہ بالا مضمون میں انہوں نے بانگ درا کی نظموں ہمالہ، تصویر درد، اور آفتاب کے حوالے سے اپنی بات کو ثابت کیا ہے۔ اقبال کی شاعری پر مغربی مفکرین کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے اقبال پر نطشے، برگسان ، دانتے، شوپن ہار، ملٹن اور گوئٹے کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس تعلق سے ان کی کتاب 'اقبال اور مغربی مفکرین'[1] مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ آزاد کا ماننا ہے کہ اقبال کی شاعری کو ان کے عہد سے کاٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ وہ کلام اقبال کو ان کے عہد کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون 'اقبال اور ان کا عہد' میں ہندوستان کی قومی اور سیاسی صورتحال جس میں اقبال سانس لے رہے تھے، بیان کیا ہے ساتھ ہی انہوں نے حوالوں سے ان حالات کا اقبال کی شاعری اور فکر پر پڑنے والے اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ 'اقبال اور ان کا عہد' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام قدوس لکھتے ہیں:

> ''مصنف کا زور اس بات پر ہے کہ کلام اقبال دراصل عہد اقبال سے شاعر کے تعلق کا آئینہ ہے ایک طرف آویزش نظر آتی ہے اور دوسری طرف مفاہمت۔ لیکن اس مفاہمت میں مصلحت اندیشی نہیں۔ اقبال نے اپنے عہد کے نام پیغام دیا ہے۔ پیغام اس قابل ہے کہ اسے عملی زندگی اور ذہنی وفکری زندگی کے لیے مشعل راہ بنایا جائے۔''[2]

جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی شاعری کی فنی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اپنے مضمون ''مناظر فطرت اور اقبال'' میں وہ لکھتے ہیں:

---

1 ط: بہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۵

2 ڈاکٹر غلام قدوس، تفہیم اقبال ص ۱۶۵

''اقبال کا مناظر فطرت کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور کئی پہلوؤں کا حامل ہے یہ تعلق ایک عاشق اور معشوق کا تعلق بھی ہے، رقابت کا تعلق بھی ہے لیکن اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کلام اقبال میں منظر نگاری کی موجودگی منظر نگاری کے لیے نہیں ہے منظر نگاری اقبال کے یہاں عظیم مقاصد کے پس منظر کا کام دیتی ہے۔ یہ اقبال کی کیفیات کے ابلاغ کے لیے آتی ہے اور اکثر و بیشتر اقبال کی تلاش و جستجو کے لیے ذریعہ بنتی ہے۔'' [1]

جگن ناتھ آزاد نے آئن اسٹائن اور برگسان کے زمان کے نظریات کو اقبال سے ملایا ہے اور تصور زمان و مکان پر ایک جامع نوٹ لکھنے کے بعد مختلف ناقدین اقبال سے اختلاف کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے۔ خلیفہ عبد الحکیم کے اس اعتراض پر کہ اقبال نے یہ نظریہ برگسان سے لیا مگر حوالہ نہیں دیا اور اقبال نے برگسان کے دہریت اور الحاد کو اسلام کے تصور توحید سے ملا دیا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''خلیفہ عبد الحکیم اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ برگسان استمرار زمان کو بامقصد نہیں بلکہ بے مقصد قرار دیتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے برگسان اور اقبال کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں، خلیفہ صاحب کے اس بیان سے انکار نہیں کہ اقبال برگسان کا بڑا مداح تھا اور اس کے فلسفہ سے اقبال نے فیض بھی حاصل کیا لیکن ان کا یہ کہنا کہ اقبال کا نظریہ زمان برگسان کے نظریہ زمان کا چربہ ہے تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ برگسان کے نظریۂ زمان پر اقبال نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں کئی موقعوں پر مدلل بحث کی ہے اور اس بحث کے دوران میں اقبال کا برگسان سے اختلاف بھی پوری طرح واضح ہو جاتا ہے خواہ وہ 'زمان کی حقیقت کا نظریہ ہو خواہ زمان میں زندگی بطور مسلسل حرکت' کا نظریہ ہو اور خواہ 'استمرار زبان کا نظریہ' [2] س طرح آزاد کا یہ مضمون ان لوگوں کے لیے ایک جواب ہے جو اقبال کے فلسفہ زمان کو مغرب کا چربہ قرار دیتے ہیں۔''

آزاد نے اقبال پر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اقبال کے تقریباً سبھی مباحث کو انہوں نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے عالمی پس منظر میں اقبال شناسی میں ان کا مقام جو بھی ہو لیکن ہندوستان کی سطح پر انہیں اقبالیات کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے۔

---

1 جگن ناتھ آزاد، بحوالہ اقبالیات، مرتب۔ آل احمد سرورص 94

2 بحوالہ اقبال اور مغرب از سرورص 26

# عبدالسلام خورشید

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی کتاب 'سرگزشت اقبال' ۱۹۷۷ میں اقبال اکادمی پاکستان سے شائع ہوئی۔ اقبال صدی تقاریب کی وجہ سے علامہ اقبال پر کئی اہم اور عمدہ کتابیں سامنے آئی ہیں۔ اس موقع پر سب سے زیادہ کوشش اقبال کی سوانح پر ہوئی۔ اقبال کے جشن کے موقع پر قائم کی گئی مرکزی اقبال کی کمیٹی کی طرف سے عبدالسلام خورشید کو اقبال کی سوانح لکھنے کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ انہوں نے سرگزشت اقبال لکھ کر اس ذمہ داری کو نبھایا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی کتاب ایک مکمل سوانح کا درجہ رکھتی ہے۔ انہوں نے اقبال کی سیاسی زندگی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اس سلسلے میں انقلاب کی فائلوں پر زیادہ بھروسہ کیا گیا ہے۔ عبدالسلام خورشید ایک صحافی ہیں اس وجہ سے اس کتاب میں صحافتی رنگ غالب ہے۔ انہوں اس کتاب میں سوانحی مواد سے کم سروکار رکھا ہے۔ سرگزشت اقبال میں عبدالسلام خورشید نے اڑتیس ابواب قائم کیے ہیں۔ طاہر فاروقی کی طرح انہوں نے بھی ابواب قائم کرنے میں پوری فراخ دلی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

اقبال صدی تقاریب کے موقع پر لکھی گئی سوانح عمریوں پر کئی طرح کے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ غلام حسین ذوالفقار اور رفیع الدین ہاشمی نے اپنے مضامین میں ان کی خامیوں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ غلام حسین ذوالفقار نے اپنے تنقیدی مضمون میں عبدالسلام خورشید کی کتاب کا محاکمہ کرتے ہوئے اس کتاب کو سرے سے سوانحی کتاب ماننے سے انکار کیا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی نے بھی اس کتاب میں ضرورت سے زیادہ ابواب بندی، اور صحافتی رنگ کی وجہ سے اس کتاب کی تنقید کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اقبال پر لکھی گئی دوسرے کتابوں کے مقابلہ میں اس کتاب کے اختصار کی تعریف بھی کی ہے۔[1]

---

1 ڈاکٹر شفیق علی عجمی، اقبال شناسی عالمی تناظر میں، ص ۱۴۱، اور رفیع الدین ہاشمی کے مضمون کے لیے دیکھیں: اقبال تفہیم وتجزیہ از رفیع الدین ہاشمی۔

مجموعی طور پر یہ کتاب اقبال کی سوانح عمریوں میں ایک اضافہ ہے۔ ہر سوانح کو ہم زندہ رود کے پیمانہ پر نہیں تول سکتے۔ ہر مصنف کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ عبدالسلام خورشید نے اگر سیاسی پہلو پر زیادہ توجہ دی تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

# جاوید اقبال

علامہ اقبال کی سوانح یوں تو کئی لوگوں نے لکھی لیکن ان سب میں سب سے جامع اور عمدہ کوشش اقبال کے صاحب زادے جاوید اقبال کی ہے۔ جاوید اقبال نے تین جلدوں پر مشتمل 'زندہ رود' لکھ کر حق فرزندی ادا کر دیا ہے۔ وہ محمد دین فوق کے مضمون 'حالات اقبال' کو اقبال پر لکھا گیا سب سے پہلا سوانحی مضمون قرار دیتے ہیں۔ یہ مضمون کشمیری میگزین کے اپریل ۱۹۰۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اقبال کی زندگی کے ابتدائی ایام کے بارے میں یہ مضمون اولین مآخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جاوید اقبال نے اقبال کی زندگی کے بارے میں فوق کے اس مضمون سے کافی استفادہ کیا ہے۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ اقبال خود اپنی سوانح لکھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ البتہ اقبال اپنے خیالات کے تدریجی ارتقا کو سبق آموز مانتے تھے۔ 'خیالات کے تدریجی انقلاب کی سرگذشت' اقبال خود مرتب کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اقبال کو مہلت نہیں مل سکی۔ جاوید اقبال نے 'زندہ رود' لکھ کر اپنے والد کی اس خواہش کی تکمیل کی ہے۔ انہوں نے اقبال کی زندگی سے زیادہ اقبال کے افکار و خیالات کے ارتقائی مراحل اور ان عوامل کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو ان تبدیلیوں کا سبب بنے ہیں۔

'زندہ رود' کا نام جاوید اقبال نے خود اقبال کے کلام سے لیا ہے۔ اقبال نے 'جاوید نامہ' میں اپنے لیے 'زندہ رود' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں: 'مسلسل بہتی ہوئی حیات آفریں ندی' جاوید اقبال کہتے ہیں کہ اقبال جرمن شاعر گوئٹے سے کافی متاثر تھے۔ گوئٹے قرآنی تعلیمات اور حیات طیبہ سے کافی متاثر تھا اس نے رسول اکرم پر ایک منظوم تمثیل لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر مکمل نہ کر سکا۔ اس نامکمل نظم میں اس نے رسول اکرم ﷺ کے لیے 'حیات آفریں جوئے آب' کی تشبیہ استعمال کی تھی۔ وہ نبی ﷺ کو ایک ایسی ندی سے تعبیر کرتا تھا جس کا کام بہت ساری ندیوں اور نالوں کو اپنی آغوش میں لے کر سمندر یعنی اللہ کی طرف لے جانا ہے۔ اقبال، نبی ﷺ کو انسان کامل سمجھتے تھے جس کا اتباع مسلمان کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 'جاوید نامہ' کے روحانی سفر کے لیے اپنا نام 'زندہ رود' رکھا۔[1]

---

1 زندہ رود ج ۱ ص: د

جاوید اقبال نے مواد کی فراہمی کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اقبال کے سوانح نگاروں کی تحریریں، زبانی معلومات، اخبارات کے تراشے، خطوط اور خود اقبال کی تصانیف ہر ایک کو سامنے رکھا۔ اس کے باوجود جاوید اقبال کی حد سے زیادہ خود اعتمادی کی وجہ سے تحقیق کا معیار متاثر ہوا ہے۔ بے شمار ایسی خامیاں اس سوانح میں ایسی رہ گئیں جن کی اصلاح کے لیے نہ علامہ اقبال خواب میں نمودار ہوئے اور نہ جاوید اقبال نے ان کے لیے بنیادی ماخذ کی طرف رجوع کرنا ضروری سمجھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے اقبال کو خواب میں دیکھا۔ اقبال کچھ ناراض دکھ رہے ہیں۔ اقبال نے پوچھا تم کیا لکھتے رہتے ہو۔ جاوید اقبال نے کہا کہ میری طرف سے یہی کوشش رہی ہے کہ آپ کے افکار صحیح طور پر لوگوں تک پہنچ جائیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس بارے میں میرے تاثرات کل تک معلوم ہو جائیں گے۔ جاوید اقبال نے دوسرے دن اتفاق سے روز گار فقیر کھولا تو پہلا صفحہ جو کھلا اس کے اندر یہ شعر نظر آیا:

بت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے
یاد ایام گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکا اقبال
کوئی پنڈت جو کہتا ہے تو شرم آتی ہے

وہ دوڑے دوڑے اپنی بیوی کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ اقبال نے اپنے تاثرات ان تک پہنچا دیئے۔ ان کی بیوی نے کہا کہ آپ نے مذاق میں کہا تھا کہ پنڈتوں نے ہندوستان آزاد کرایا اور ایک پنڈت ہی نے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ یہ تو مجھے پنڈتوں کا جھگڑا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات ان کو ناگوار گزری ہے۔ ان کی بیوی نے دلاسہ دیا کہ آپ کام جاری رکھیں اگر کہیں کوئی لغزش ہو گی تو وہ ضرور خواب میں حاضر ہو کر آپ کی رہنمائی کریں گے۔[1]

جہاں خواب اور غیبی مدد کا انتظار ہو، وہاں تحقیق متاثر تو ہو گی ہی۔ چنانچہ 'زندہ رود' اقبال کی سوانح عمریوں میں سب سے عمدہ ہوتے ہوئے بھی بقول ڈاکٹر راشد حمید اغلاط کا 'نادر اور عمدہ مجموعہ' بن گیا ہے۔[2]

---

1 زندہ رود ج اول کا مقدمہ

2 زندہ رود کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ ص ۴۴

چند اغلاط بطور مثال ملاحظہ ہو:

"۱۸۵۷ کی بغاوت دراصل بنگالی فوج کی سرکشی تھی۔۔۔۔"[1]

اقبال کے صاحب زادے کے منہ سے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے لیے بغاوت اور سرکشی کا لفظ مناسب نہیں۔

بابالول حج کا ذکر کرتے ہوئے جاوید اقبال نے ابو محمد حاجی محی الدین مسکین کی کتاب 'تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔:[2]

"ولادتش در موضع چلو علبند پرگنہ آڈون بود۔ ہر دو چشم و پایش کج بودند۔ پس ویرا داعیۂ تنزویج بظہور آمد و بازنی عقد نکاح بربست چوں منکوحہ اش صورت ویرا بدید و بخندید دل بابا ازوی متنفر گردید۔ پس کمر ہمت بربستہ برآمد، سفر زیارت حرمین شریفین نمود و پس از تشریف یابی بزیارت مبارک چوں مراجعت بجانب کشمیر کرد در خدمت بابا نصرالدین رود ی ارادت آورده گوی تجرید و تفرید ربود۔ چوں رحلت کرد در مقبرۂ مرشد آسود۔ و بعضی نوشتہ اند کہ در قریۂ زالرہ پرگنہ کامراج مدفون است۔"

ڈاکٹر راشد حمید لکھتے ہیں کہ 'بابالول حج کے بارے میں جس اقتباس کو ان کے احوال و آثار کے سلسلے میں نقل کیا گیا ہے وہ داخلی حوالے سے خود ان کے خلاف جا رہا ہے۔ فاضل مصنف نے اس جانب توجہ نہیں دی اور مذکورہ بالا اقتباس کو بہ طور سند استعمال کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے بہت سے حج کیے اور پیادہ پا دنیا کی سیاحت کرتے رہے۔ حالانکہ پیش نظر اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ وہ آنکھوں سے اندھے اور پاؤں سے معذور تھے۔

---

1 زندہ رود ج ۱، ص ۲۵

2 زندہ رود ج ۱ ص ۳

۱۔ ایک معذور آدمی کس طرح پیادہ پاچ وسیاحتِ دنیا میں مگن رہ سکتا ہے، سوچنے کی بات ہے ہمارے فاضل مصنف نے اس طرف توجہ نہیں دی۔

۲۔ یہ بکذنی عقد نکاح بربست چوں منکوحہ اش صورت ویربدید بحید  ید دل بابا ازوی متنفر گردید" ۔۔۔ سے سلسلۂ اولاد چلتا دکھائی نہیں دیتا، جہاں بیوی دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیتی ہو۔ وہاں سلسلۂ نسب کی تحفیظ معلوم!" [1]

جاوید اقبال کی پوری کوشش رہی ہے کہ 'زندہ رود' کی ترتیب منطقی ہو۔ انہوں نے کتاب کی ترتیب زمانی رکھی ہے۔ کتاب کو مختلف عناوین سے سجایا ہے۔ اس کے باوجود ان کے یہاں کچھ خامیاں در آئی ہیں۔ بعض ابواب میں ان مباحث کو بیان کر دیا ہے جن کا محل نہیں تھا۔ مثلاً 'ہندو مسلم تصادم کا ماحول' جو کہ دوسری جلد کا آخری باب ہے، اس میں جاوید اقبال نے پیام مشرق اور بانگ درا کی اشاعت اور اس کے مندرجات کا ذکر کیا ہے۔ سر کے خطاب کی روداد بیان کی ہے، علامہ کی تکفیر اور مختار بیگم کی بیماری اور وفات کا ذکر کیا ہے۔ یہ سارے موضوعات اگرچہ اہم ہیں لیکن یہ اس کا محل نہیں تھا۔ ان کا ہندو مسلم تصادم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جاوید اقبال کی سوانح میں لفظی غلطیاں بھی کثیر تعداد میں ہیں۔ ڈاکٹر راشد حمید ان غلطیوں کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔:

''بندہ اپنی جان بھی حضور پر سے قربان کر سکتا ہے۔"

بندہ واقعتاً جان قربان کرنے والا ہو، تو'' پر اور سے "کی اکٹھی ضرورت نہیں رہتی۔ 'سے' اکیلا ہی کافی ہو سکتا ہے۔ [2]

''محمد عبد الرزاق نے ان کی اجازت کے بغیر مختلف رسالوں اور اخباروں میں سے ان کا کلام اکٹھا کر کے 'کلیات اقبال' کے نام سے حیدر آباد میں شائع کر دیا" (ص ۴۲)

راشد حمید لکھتے ہیں:

---

1 زندہ رود کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ ص ٦٦

2 زندہ رود کا تنقیدی مطالعہ ص ۹۳

'حیدر آباد میں' کے بجائے 'حیدر آباد سے' ہونا چاہیے تھا۔[1]

اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری جگہیں ہیں جہاں علاقائی اثرات ان کی زبان اور طرز اظہار پر حاوی ہیں۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

"مقابلہ ناکامل دستکاروں کی حالت پر کیا اثر کرتا ہے" [2]

کامل کی ضد خام ہے نا کامل نہیں۔

جاوید اقبال اپنی کتاب میں بار بار 'دوران' کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن اس کے بعد 'میں' نہیں لکھتے۔ کئی جگہوں پر وہ 'میں نے کرنا ہے' جیسے جملے استعمال کرتے ہیں۔ یہ سب علاقائیت کے اثرات ہیں۔

اگرچہ زبان وبیان کی ان غلطیوں کا اثر کتاب کے مواد پر نہیں پڑتا لیکن یہ علامہ اقبال کی سوانح ہے اس وجہ سے اس کے اندر اگر ادبیت نہ بھی ہو تو کم از کم زبان وبیان کی غلطیوں سے پاک ہونا چاہیے۔

جاوید اقبال نے پہلی جلد کے صفحہ ۲۰ سے لے کر ۲۸ تک ایک طویل نوٹ اس وقت کے ملکی حالات پر روشنی ڈالنے کے لیے وقف کیا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور رفتہ رفتہ پورے ملک پر چھا جانے اور سکھوں اور مرہٹوں کی خوں ریزی اور مسلمانوں کی مدافعانہ کوششیں ان سب موضوعات کو جاوید اقبال نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ جاوید اقبال کی منشا اس سلسلے میں یہ ہے کہ وہ اقبال کے اہل خانہ اور خود اقبال پر ان واقعات کے اثرات پر گفتگو کر سکیں۔ مگر جہاں حالت یہ ہو کہ معلومات کے لیے مآخذ نہ ہوں اور صرف قیاس اور تخمینہ کے سہارے بات کرنی ہو وہاں کتنی بھی تفصیلی تمہید بنائی جائے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ ہندوستان کی تیزی سے تبدیل ہونے والی فضا پر روشنی ڈالنے کے بعد جاوید اقبال رقم طراز ہیں:[3]

---

1 زندہ رود کا تنقیدی مطالعہ ص ۹۴

2 زندہ رود ج۔ ۱، ص ۸۹

3 زندہ رود، ج۔ ۱، ص ۲۷

> اس حوصلہ شکن ماحول اور ناموافق گرد و نواح سے تقریباً ہر مسلم خاندان متاثر ہوا۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اقبال کے بزرگوں نے اس صورتِ حال سے کیا اثر قبول کیا۔ سیالکوٹ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور اقبال کا تعلق ایک متوسط الحال تجارت پیشہ خاندان سے تھا جس کی نمایاں خصوصیات شرافت اور دین داری تھیں۔ یہ قیاس کرنا تو صحیح نہیں کہ جس طوفان نے سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لیا اور جس کی زد میں پنجاب بھی آچکا تھا، اُس سے سیالکوٹ محفوظ رہا ہو گا۔ ہو سکتا ہے۔ سید احمد کی تحریک اصلاح اور تنظیم جہاد کے مبلغ یا داعی یہاں بھی پہنچے ہوں اور سید صاحب کی تعلیمات کی بازگشت سیالکوٹ میں بھی سنی گئی ہو۔ لیکن اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق جو کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں تلاشِ رزق میں سرگرداں تھے، کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ پہلے اپنے خاندان سمیت سیالکوٹ سے ہجرت کر کے ہندوستان کے کسی شہر کا رخ کرتے اور پھر وہاں سے سندھ کے رستے سرحد پہنچ کر سکھوں یا انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیتے۔

اس سلسلے میں سید نذیر نیازی کے اس بیان پر کہ اقبال کے دادا انگریزوں کی طرف سے سکھوں کے خلاف پنجاب کی جنگ میں لڑے تھے کوئی حتمی رائے دینے سے احتراز کیا ہے۔:[1]

> سید نذیر نیازی بیان کرتے ہیں کہ انہیں اقبال نے بتایا کہ اُن کے دادا شیخ محمد رفیق سکھوں کی طرف داری میں گجرات میں انگریزوں سے لڑے تھے (۲۱)۔ اس بارے میں مزید تفصیل نہیں دی گئی۔ سکھ فوج مئی ۱۸۴۸ء اور فروری ۱۸۴۹ء میں آخری بار انگریزوں سے نبرد آزما ہوئی اور گجرات میں شکست کھائی۔ بہر حال اقبال کے دادا کے متعلق یہ بات پہلے کبھی سننے میں نہیں آئی۔ فوق اپنی کسی تحریر میں اس بات کا ذکر نہیں کرتے۔ اگر اقبال نے یہ بات کہی اور نیازی کو سننے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تو اُن کے اپنے بیان کے بعد اس امر واقعہ کی صحت کے متعلق مزید تحقیق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر ہو بھی تو مزید تحقیق کے لئے اب کس سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

اس کے باوجود اب تک لکھی گئی سبھی اقبال کی سوانح عمریوں میں جاوید اقبال کی 'زندہ رود' سب سے مکمل، جامع اور لائق اعتبار ہے۔ انہوں نے حتی المقدور روایات کے انتخاب اور ترتیب میں تحقیق کے اصولوں کی رعایت کی ہے۔ اقبال صدی کی سوانح کے بعد 'زندہ رود' کی آمد بادِ بہاری سے کم نہیں۔

1 زندہ رود، ج۔۱، ص ۲۷

جاوید اقبال ہر بات دلیل کے ساتھ کرتے ہیں۔ جہاں ضرورت محسوس کی ہے وہاں اپنے پیشرو سوانح نگاروں کی تحقیق کا رد بھی کیا ہے۔ اقبال کے اجداد نے اسلام کب قبول کیا اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے فوق کی اس تحقیق کو کہ اقبال کی پیدائش سے سوا دو یا ڈھائی سو سال قبل اقبال کے اجداد نے اسلام قبول کیا، کا رد خود ان ہی کی تصنیف بڈشاہی کے حوالے سے کیا ہے۔ بڈشاہی کے مطابق اقبال کے اجداد نے ظہیر الدین بابر کے عہد سے سو سال پہلے اقبال کی پیدائش سے ساڑھے چار سو قبل اسلام قبول کیا:[1]

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے جد اعلیٰ کب مسلمان ہوئے؟ اقبال کے بیشتر سوانح نگار تحریر کرتے ہیں کہ ولادت اقبال سے تقریباً سوا دو یا ڈھائی سو سال پیشتر اُن کے بزرگوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ فوق نے لکھا ہے کہ وہ تقریباً سوا دو سو سال ہوئے عالمگیر کے زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ فوق کی اپنی تحریریں اسے غلط ثابت کرتی ہیں۔ فوق نے اپنی تصنیف تاریخ بڈشاہی طباعت ۱۹۴۲ء کے باب عہد بڈشاہی کے علماء و مشائخ میں جن علماء اور مشائخ یا سلسلۂ ریشیاں سے منسلک جن صوفیاء کے نام درج کئے ہیں۔ اور جو بڈشاہ کے زمانے میں زندہ تھے، اُن میں شیخ نور الدین ولی رشی اور شیخ نصر الدین کے ساتھ بابا لولی حاجی کا ذکر بھی کیا ہے (۱۲)۔ بڈشاہ ۱۴۲۰ء میں تخت کشمیر پر بیٹھا اور ۱۴۷۰ء میں وفات پائی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقبال کے جد اعلیٰ پندرھویں صدی میں مسلمان ہوئے۔ یعنی اقبال کی پیدائش سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل اور ظہیر الدین بابر کے ہندوستان میں ورود سے تقریباً ایک سو سال پہلے جب تخت دہلی پر سادات یا اُن کے بعد سلطان بہلول لودھی کا قبضہ تھا؛ پنجاب کے بیشتر حصہ پر جسرت گکھڑ حاوی تھا۔ اور دکن میں بہمنی خاندان کی حکومت تھی۔

علامہ اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق عرف رفیقا نے کشمیر سے ہجرت کیوں کی تھی اس کیا اسباب تھے اس کے جواب میں جاوید اقبال نے کشمیر کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے جس میں مسلمانوں پر سکھوں کے غلبہ اور پھر ان کے ظلم و جور کا تفصیلی بیان ہے۔ اس طرح یہ باب علامہ اقبال کی سوانح کے ساتھ کشمیر کی سیاسی اور سماجی پس منظر پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے سیالکوٹ ہجرت کے بارے میں رائے دیتے ہوئے اس کی تاریخ انیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ قرار دیا ہے۔:[2]

---

1 زندہ رود، ج۔۱، ص: ۶

2 زندہ رود، ج۔۱، ص: ۱۸

> مغلوں کے عہد میں سیالکوٹ پھلتا پھولتا رہا۔ صوفیاء اور مشائخ اسلام کے حسنِ عمل اور خلقِ محمدی سے بیشتر ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے اور مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۸۰۷ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سیالکوٹ پر فوج کشی کی اور اس پر سکھ قابض ہو گئے۔ پس اگر بزرگانِ اقبال انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں سیالکوٹ آئے تو اُس زمانے میں سیالکوٹ سکھوں کے تسلط میں تھا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ جاوید اقبال کشمیر سے ہجرت کی بنیادی وجہ وہاں پر قابض سکھوں کی بربریت اور ظلم قرار دے رہے ہیں اور اس کے باوجود اقبال کا خاندان سیالکوٹ کی سرزمین کو اپنا مسکن سکھوں کے عہد حکومت ہی میں بناتا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟

علامہ اقبال کی تاریخ ولادت کا مسئلہ اہل علم کے یہاں ابتدا ہی سے مختلف فیہ رہا ہے۔ اس کی وجہ علامہ اقبال بھی ہیں۔ انہوں نے کبھی اس سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ علامہ اقبال نے جرمنی میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کو جمع کرتے وقت جو تاریخ پیدائش لکھی تھی وہ ۳ذی قعدہ ۱۲۴۶ء مطابق ۱۹۷۶ء تھی۔ اس میں اقبال نے ہجری سن کو اصل مان کر اس کے مطابق انگریزی سن لکھ دیا تھا۔ اس کے اعتبار سے ۱۸۷۶ان کی تاریخ پیدائش ہے۔ ایک زمانہ تک اسی ۱۹۷۶کو ہی ان کی تاریخ پیدائش مانا گیا۔ اس کے بعد روزنامہ انقلاب نے سیالکوٹ کے میونسپلٹی میں تاریخ پیدائش کے اندراج سے مدد لے کر ۱۸۷۳لکھا۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک اسی کو مستند تاریخ پیدائش تسلیم کیا جاتا رہا یہاں تک کہ پاکستان میں اقبال پر یادگاری ڈاک ٹکٹ کے اجرا کے وقت بھی اسی تاریخ پیدائش کو درج کیا گیا۔ جاوید اقبال کے مطابق کسی نے بھی ۱۹۷۳کو اقبال کی یوم پیدائش کے طور پر نہیں پیش کیا۔ سب سے پہلے ۱۹۷۳ء کا ذکر روزنامہ انقلاب میں دیا گیا۔ ۷ مئی ۱۹۳۸ کی اشاعت میں ایک نوٹ شائع ہوا جس میں میونسپلٹی رجسٹر کے حوالے سے اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء بتائی گئی۔[1]

بعد میں ذکر اقبال میں عبد المجید سالک نے بھی اسی کو صحیح قرار دیتے ہوئے حاشیہ میں لکھا ''تصدیق ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ بحوالہ رجسٹر پیدائش واموات''

---

1 زندہ رود، ج۔۱،ص ۳۲

لیکن ان صاحبان سے اس تعلق سے غلطی ہوئی۔ یہ رجسٹر یہ اطلاع تو دیتا ہے کہ ۲۲ فروری ۱۹۷۳ کی تاریخ کو محلہ کشمیریاں میں کسی نتھو کے یہاں ایک لڑکے کی ولادت ہوئی مگر یہ اقبال ہی تھے اس کے بارے میں خاموش ہے۔ محض ظن کی بنیاد پر ہم اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ جاوید اقبال رقمطراز ہیں:[1]

> اگر ادارہ انقلاب اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمدؒ سے پوچھ لیتا کہ اُن کے تخمینی بیان اور اس اندراج میں اختلاف کیوں ہے یا اقبال کی بہنوں میں سے کسی ایک سے اس اندراج کو بطور تاریخ ولادت اقبال تصدیق کرنے کے لئے رجوع کرتا تو اس غلط فہمی کا ازالہ بروقت ہو جاتا۔ لیکن رجسٹر پیدائش و اموات کے ایک ایسے اندراج کو جو ولادتِ اقبال سے متعلق نہ تھا، بغیر کسی تحقیق کے اُن کی تاریخ پیدائش تسلیم کر لیا گیا۔ روزنامہ انقلاب کے نوٹ پر انحصار کرتے ہوئے مرے کالج سیالکوٹ کے رجسٹر میں جہاں اقبال کے داخلہ کالج کا اندراج ہے، ان کی وفات کے بعد کالج کے پرنسپل اور وائس پرنسپل نے اسی تاریخ ولادت کو درست تسلیم کرتے ہوئے اضافاً تحریر کر دیا کہ انقلاب نے متذکرہ تاریخ پیدائش اقبال کے دفیملی ریکارڈ، سے ڈھونڈ کر شائع کی ہے، حالانکہ اقبال کے خاندان میں ایسا کوئی ریکارڈ موجود نہیں جس میں اُنکی تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء درج ہو۔ یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب ہوگا کہ مرے کالج کے رجسٹر میں اقبال کی تاریخِ داخلہ کالج ۵ مئی ۱۸۹۳ء درج ہے، مگر تاریخ ولادت کی بجائے عمر اٹھارہ سال لکھی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اقبال ۱۸۹۳ء میں اٹھارہ سال کے تھے، تو بھی ان کا سن ولادت ۱۸۷۳ء کی بجائے ۱۸۷۵ء بنے گا۔

بعد میں جب اقبال صدی تقریبات منانے کی بات آئی تو ہندوستان میں اسی تاریخ کو اصل مان کر اقبال صدی تقریبات منانے کی بات کہی گئی جو بعد میں ۱۸۷۷ کر دی گئی۔ اس کے بعد محققین کے ایک گروہ نے ہجری سن کی انگریزی تاریخ نکال کر یہ ثابت کیا کہ اقبال کے ذریعہ فراہم کردہ ہجری تاریخ سے ۱۸۷۷ ہی مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے بعد اسی سن کو اقبال کی مستند تاریخ پیدائش تسلیم کیا گیا۔ اسی کے مطابق اقبال صدی تقریبات ہند و پاک میں منائی گئی۔

اقبال کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ کس قدر متنازعہ رہا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۹ میں جسٹس ایس اے رحمان کی سر کردگی میں حکومت پاکستان نے ایک کمیشن کی تشکیل دی جس کا کام اقبال کی یوم پیدائش کا پتا لگانا تھا۔ یہ

---

1 زندہ رود، ج۔۱، ص ۳۲

اور بات ہے کہ یہ کمیشن کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا۔ جاوید اقبال نے اس سلسلے میں جو بحث پیش کی ہے وہ بہت اہم ہے۔ انہوں نے تمام اقوال اور ان کے ماخذ پر گفتگو کرنے کے بعد ۱۸۷۷ء کی تاریخ کو راجح قرار دیا ہے۔[1]

راقم کی رائے میں اقبال کی اپنی بیان کردہ تاریخ ولادت کی مطابقت اُن کے تعلیمی ریکارڈ سے ۱۸۷۳ء کے مقابلے میں زیادہ سہولت سے ہوتی ہے۔ مزید برآں واقعیاتی شہادت اور خاندانِ اقبال کے بزرگ اور معتبر افراد کے بیانات بھی بمقابلہ ۱۸۷۳ء اسی سن ولادت کی تائید کرتے ہیں۔ اِن شواہد کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کی تاریخِ ولادت ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ ہے۔ جو ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے برابر ہوتی ہے۔

تاریخ پیدائش کے سلسلے میں جاوید اقبال کی تحقیق قابل قدر ہے۔ انہوں نے جس انداز سے مسئلہ کو اٹھایا ہے اور پھر اس کا حل پیش کیا ہے وہ اپنے آپ میں اہم ہے۔ ان ساری تفصیلات کے بعد بھی حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اقبال کی تاریخ پیدائش واقعی وہی ہے جس کو جاوید اقبال مستند مان رہے ہیں۔ اس لیے کہ ساری تفصیلات ظن اور تخمینے پر مبنی ہے۔ چونکہ کسی ایک تاریخ پر اتفاق رائے بنانی ہے اس وجہ سے کسی نہ کسی کو راجح تو قرار دیناہی پڑے گا۔

عام سوانح نگاروں کی طرح جاوید اقبال نے بھی شیخ نور کے اس خواب کا تذکرہ کیا ہے کہ انہوں نے ایک سفید کبوتر کو اپنے آغوش میں گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر شیخ نور نے یہ کی ہے کہ ان کے ہاں ایک لڑکا ہوگا جو دین کی خدمت کرے گا۔ شیخ نور کا مزاج دینی تھا اس وجہ سے انہوں نے اقبال کو قریب کے محلہ شوالہ کی مسجد میں مولانا غلام حسین کی نگرانی میں دے دیا جہاں خالص دینی تعلیم کا انتظام تھا۔ جاوید اقبال نے مولانا غلام حسین کی درسگاہ میں داخلہ کے وقت ان کی عمر چار سال چار ماہ بتائی ہے۔ مگر کتنے دنوں تک اس درسگاہ میں رہے اس بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دی ہے۔ ایک مرتبہ مولانا میر حسن اس درسگاہ میں آئے اور اقبال کے چہرے پر فطانت کے آثار دیکھ کر انہیں اپنے درسگاہ میں داخل کرنے کی صلاح دی جس کو شیخ نور نے مان لیا۔ اس طرح اقبال کی شخصیت کے اندر چھپے گوہر کو پہچاننے والا مل گیا۔ یہ سچ ہے کہ اقبال کو اقبال بنانے میں میر حسن کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اقبال بھی میر حسن کے بڑے قدردان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے سر کا خطاب اس شرط پر قبول کیا تھا کہ میر حسن کو شمس العلما کا خطاب دیا جائے۔

---

1 زندہ رود، ج۔۱، ص ۴۹

مولانا غلام رسول کی درسگاہ میں خالص دینی تعلیم کا انتظام تھا جبکہ میر حسن کی درسگاہ میں دینی تعلیم کے ساتھ زبان وادب کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ میر حسن سر سید کے بڑے مداح تھے دونوں کے دوستانہ مراسم تھے۔ جب میر حسن اسکاچ مشن اسکول میں پڑھانے لگے تو اقبال کو بھی وہاں پر داخل کرا دیا مگر کس جماعت اور کس عمر میں وہ اسکول میں داخل ہوئے اس بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔[1]

جاوید اقبال نے خاندان کی مالی پریشانیوں کا بھی ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب ایک چھوٹی سی دوکان سے گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو گیا تو شیخ نور نے ڈپٹی وزیر علی کے یہاں ملازمت اختیار کر لی؛ مگر کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے ملازمت ترک کر دی، ملازمت کیوں ترک کی اس سلسلے میں انہوں نے سید نذیر نیازی اور دوسرے سوانح نگاروں کی آرا سے اختلاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:[2]

اقبال کے بعض سوانح نگار ملازمت ترک کرنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ امام بی شیخ نور محمدؒ کی تنخواہ کو ہاتھ تک نہ لگاتی تھیں کیونکہ انہیں شبہ تھا کہ ڈپٹی وزیر علی کے بعض ذرائع آمدنی شرعاً ناجائز تھے۔ لیکن یہ فرضی روایت بیان کر کے بیچارے ڈپٹی صاحب پر ناواجب اتہام تراشی کی گئی ہے۔ ملازمت ترک کرنے کی جو وجہ شیخ نور محمدؒ نے اعجاز احمد کی موجودگی میں ایک عزیز سے بیان کی، اس روایت سے بالکل مختلف ہے۔ شیخ اعجاز احمد کے بیان کے مطابق رزقِ حلال پر گفتگو کے دوران شیخ نور محمدؒ نے بتایا کہ ڈپٹی وزیر علی کے ہاں ملازمت کے کچھ عرصہ بعد انہیں ذاتی تجربہ سے احساس ہوا کہ ڈپٹی صاحب کے ہاں پارچہ دوزی کا کام تو برائے نام تھا یا اتنا نہیں تھا کہ ایک ہمہ وقت خیاط کی ضرورت ہو، البتہ حاضر باشی اور مصاحبت کا کام زیادہ تھا۔ ڈپٹی صاحب کو تصوّف سے لگاؤ تھا اور اپنی فرصت کے اوقات میں وہ اکثر شیخ نور محمدؒ سے اس موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ اس بنا پر شیخ نور محمدؒ کے دل میں یہ خلش رہتی۔ کہ ڈپٹی صاحب سے جو تنخواہ پارچہ دوزی کے لئے انہیں ملتی ہے، اس کا بیشتر حصہ رزقِ حلال نہیں۔ دو ایک مرتبہ

دوسرے سوانح نگاروں کی طرح جاوید اقبال نے بھی اقبال کے کبوتر بازی کے شوق کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس شغل میں ان کے رفیق لالو پہلوان اور سید میر حسن کے لڑکے سید محمد تقی ہوا کرتے تھے۔ کبوتروں کی نسل پہچاننے میں ان

---

1 زندہ رود، ج۔۱، ص ۵۱

2 زندہ رود، ج۔۱، ص ۵۱

کی مدد لالو پہلوان نے کی تھی۔ جاوید اقبال نے عبد المجید سالک کی اس روایت کارد کیا ہے کہ ایک مرتبہ اقبال سید میر حسن کی درسگاہ میں ایک بٹیرلے کر چلے گیے۔ اقبال سبق سنا رہے تھے اور ہاتھ میں بٹیر تھا، میر حسن نے پوچھا کہ اس سے تجھے کیا ملتا ہے تو اقبال نے کہا شیخ ذرا پکڑ کر دیکھیے۔

دیگر سوانح نگاروں کی طرح جاوید اقبال نے بھی اقبال اور ان کے والد کے کئی ایسے واقعات ذکر کیے ہیں جن میں ان کے روحانی تصرف کا بیان ہے۔ جاوید اقبال نے یہ سبھی واقعات راویان کے حوالے سے بیان کیا ہے اس وجہ سے ان کے صحت کی ذمہ داری بھی انہی راویوں پر عائد ہوتی ہے۔ مگر مشاہدہ کی بات ہے کہ اس قسم کے سارے واقعات بعد کے لوگوں کے ذریعہ محض زیب داستان کے لیے بیان کر دیے جاتے ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اقبال ایک شاعر ہیں اور عظیم شاعر ہیں ان کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے۔ ان کو یا ان کے والد کو ولایت کی کرسی پر بٹھا کر یا ان کی طرف چند کرامات کے صدور کا ذکر کر کے ناقدین نے خود اس عظیم شخصیت پر ظلم کیا ہے۔ ان کی شاعری کو منجانب اللہ ثابت کرنے کے لیے بعینہ وہی حالت بیان کی جاتی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کے لیے بیان کی جاتی ہے۔

مشاہدہ کی بات ہے کہ اس قسم کے واقعات محض زیب داستان کے لیے معتقدین بیان کرنے لگتے ہیں۔ بعد میں یہ روایتیں حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہیں اور معتقدین یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ واقعہ کی حقیقت کیا ہے۔

جاوید اقبال نے اقبال کی ابتدائی زندگی کے ان واقعات پر خصوصی توجہ دی ہے جو ان کی شخصیت سازی میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ علامہ اقبال کا معمول تھا کہ وہ روزانہ صبح کو نماز کے بعد تلاوت کلام پاک کیا کرتے تھے شیخ نور نے ایک دفعہ کہا کہ قران کی تلاوت اس طرح کیا کرو جیسے یہ خود تمہارے اوپر نازل ہوا ہو۔ اور خود تم خدا سے ہم کلام ہو۔

ایک مرتبہ اقبال نے ایک فقیر کو دو تھپڑ مار دیا، وجہ یہ تھی کہ بار بار منع کرنے کے باوجود بھی وہ برابر دروازے پر کھڑے ہو کر صدا لگائے جا رہا تھا۔ اس پر شیخ نور آب دیدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ ایک بچے کو اسلام کے مطابق تربیت نہ دے سکا۔

علامہ اقبال کی تربیت شیخ نور نے خالص اسلامی رنگ میں کی تھی یہی وجہ ہے کہ یورپ کی دانش گاہیں بھی ان کے دل سے اسلام کی محبت کو کم نہ کر سکیں۔

سوانح نگاری ایک مشکل فن ہے یہ اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب صاحب سوانح والد جیسی قابل احترام شخصیت ہو۔ اس وجہ سے کہ صاحب سوانح کی ان باتوں کا بھی تذکرہ کرنا ناگزیر ہوتا ہے جن پر عام آدمی پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ جاوید اقبال کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اس معاملہ میں اقبال کو انسان ہی رہنے دیا فرشتہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اقبال کی پہلی شادی کی ناکامی کے سلسلے میں جاوید اقبال نے معتدل رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے اقبال کی شادی بچپن میں ان کی مرضی کے خلاف کر دی گئی تھی۔ ان کی بیوی ایک متمول گھرانے سے تھیں جس کی وجہ سے دونوں کے مزاج میں فرق تھا۔ یہ فرق کم ہونے کے بجائے بڑھتا گیا۔ نوبت علیحدگی کی آئی۔ مگر والدہ آفتاب طلاق پر راضی نہ ہوئیں اقبال ان کو تاعمر نفقہ کی ایک متعین رقم بھجواتے رہے۔[1]

جاوید اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی ایک فرد کی طرف داری کر رہے ہیں۔

لیے کریم بی سے اقبال کی دو اولاد تھی معراج بیگم اور آفتاب اقبال اول الذکر ۱۹۱۵ء میں فوت کر گئیں مگر آفتاب اقبال کے تعلقات پر ماں باپ کے درمیان کے رشتوں کی کڑواہٹ کا اثر تھا۔ آفتاب اقبال اپنی والدہ کی حالت کا ذمہ دار اپنے والد کو سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے تعلقات اقبال سے اچھے نہیں رہے اور نتیجہ کے طور پر لوگوں کی صلح صفائی کی کوششوں کے باوجود بات علیحدگی پر ختم ہوئی۔ جاوید اقبال نے اس زمانے میں عطیہ فیضی کے نام لکھے اقبال کے ایک خط کا ذکر کیا ہے جس سے اس وقت اقبال کی ذہنی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال حالات سے اتنے بد دل تھے کہ ملک چھوڑنے یا شراب میں پناہ ڈھونڈنے کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ جاوید اقبال نے عطیہ فیضی کی اس رائے کی تردید کی ہے کہ اقبال کی اس خانگی الجھن نے اقبال کی خدا داد صلاحیتوں کو پروان نہیں چڑھنے دیا وہ اپنے علم کو وسیع کرنے کے باوجود وہ اقبال نہیں بن سکے جو وہ بن سکتے تھے۔

---

1 زندہ رود ص ۲۴

اس دوران اقبال نے مختار بیگم سے شادی کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سردار بیگم کے بارے میں افواہ ایک وکیل نے خاص مقصد کے تحت اڑائی تھی۔ اقبال کو اپنے کیے پر افسوس ہوا۔ سردار بیگم نے خود ہمت کر کے خط لکھا۔ اقبال نے مختار بیگم کی رضامندی سے سردار بیگم کو اپنے گھر لے آئے۔

جاوید اقبال نے اقبال پر لگنے والے الزامات کا جواب بھی دیا ہے۔ جاوید اقبال نے اقبال کے معترضین کو پانچ گروہوں میں باٹا ہے ۱) دہلی و لکھنؤ کے اہل زبان ۲) تنگ نظر علماء ۳) احمدی علماء کا گروہ ۴) مشائخ کا گروہ ۵) کمیونسٹوں کا گروہ ۶) دیگر افراد جو محض حسد کی خاطر اقبال سے بغض رکھتے تھے۔[1]

ان میں سے ہر ایک کو اقبال سے کچھ شکایات تھیں۔ ضروری سی بات ہے کہ اقبال جیسا مفکر اور دانش ور کچھ خاص افکار و خیالات کا پیغامبر تھا۔ اس وجہ سے اس کے اختلافات دوسروں سے ہونے یقینی تھے۔ جاوید اقبال نے ان میں سے ہر ایک کے اختلافات کی نوعیتوں کو بیان کیا ہے، انہوں نے تمام تنگ نظر علما کو کانگریسی قرار دیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ اقبال کی مخالفت کرنے والے علما صرف کانگریسی ہی نہیں تھے۔ جاوید اقبال کے نزدیک اقبال کی کردار کسی کا آغاز ترک موالات کے بعد شروع ہوا۔

جاوید اقبال نے اقبال پر لگائے گئے الزامات تو گنا دیئے مگر ان کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ حالانکہ دلائل کی روشنی میں ان کا رد کیا جا سکتا تھا۔ اقبال کے عادات و اطوار کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کو ہی ان غلط فہمیوں کا ذمہ دار قرار دیا۔ مولانا مودودی کی زبان میں اقبال کے اندر ملافہوقیہ یہ کے اثرات تھے۔

اقبال اور عطیہ بیگم کے رشتہ کو لے کر اقبال کے کردار کو داغدار ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اپنے والد کی طرف سے اس اہم مسئلہ پر جواب دینا کافی مشکل کام تھا۔ جاوید اقبال اس وادی سے بھی صحیح سلامت نکل آئے۔ اقبال اور عطیہ بیگم کے باہمی رشتوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال بھی ایک انسان تھے ان کے پاس بھی

ایک دل تھا۔ شاعر کا دل چیزوں کے حسن کو زیادہ واضح طور پر محسوس کر تا ہے۔ اس وجہ سے کسی کی طرف اگر دلی میلان ہوا بھی تو انہیں قابل مواخذہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ دوسرے شاعروں کے معاشقے ہم ان کی زندگی کا لازمی جزو قرار دے کر برداشت کر لیتے ہیں لیکن جب معاملہ اقبال کا آتا ہے تو ہم ان کے معاشقوں پر صفائی دینے لگتے ہیں۔ ایسا غالباً اس وجہ سے ہوتا ہے کیوں کہ ہم اقبال کو ایک شاعر ہی نہیں ولی ماننے لگتے ہیں۔ یہ اس اقبال کے ساتھ زیادتی ہے جو ایک انسان بھی تھا۔ جاوید اقبال نے عطیہ فیضی اور اقبال کے رشتوں کے بارے میں مختلف لوگوں کی آراء بیان کرنے کے بعد ان کا جواب دیا ہے۔

جاوید اقبال کی رائے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر ہے۔ انہوں نے اقبال اور عطیہ فیضی کے رشتوں کو نہ اس حد تک تسلیم کیا ہے جہاں تک بعض لوگ لے جانا چاہتے ہیں اور نہ اس رشتے کا سرے سے انکار کیا ہے۔ ان کے درمیان ایک راستہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال پر یہ بھی الزام ہے کہ انہوں نے عہد شباب میں کسی طوائف کا قتل کیا تھا۔ جاوید اقبال نے اس کو لغو قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اقبال کی شاعری اگرچہ تیر و تفنگ کے ذکر سے بھری پڑی ہو لیکن اقبال بہت رقیق القلب تھے۔ وہ بہتا خون نہیں دیکھ پاتے تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی ہتھیار نہیں اٹھایا۔ اس کے بعد اس موضوع پر دیگر سوانح نگاروں کی آرا ء کو ذکر کرنے کے بعد اس پر براہ راست کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا ہے۔ صرف یہ کہہ کر اپنا دامن بچالیا ہے کہ 'راقم اس پوزیشن میں نہیں کہ اقبال کو قریب سے جاننے والوں پر کوئی تبصرہ کر سکے۔'[1]

ایک سوانح نگار کا منصب یہ ہوتا ہے کہ وہ دلائل کی روشنی میں اپنی بات رکھے کسی کی علمیت سے مرعوب نہ ہو۔ لیکن جاوید اقبال نے یہاں معاملہ 'اقبال کو قریب سے جاننے والوں' کے سپرد کر کے اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کیا ہے۔

1 زندہ رود ج ۲، ص ۴۹

علامہ اقبال کی یہ سوانح صرف سوانح ہی نہیں ہے اس کے اندر بہت ساری ایسی تفصیلات ہیں جن سے اقبال کی بہت ساری نظموں اور غزلوں کے شان ورود پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے۔ 'والدہ محترمہ کی یاد میں' اقبال کی ایک مشہور نظم ہے۔ اس کے بارے میں بہت کم قارئین کو معلوم ہو گا کہ اس کے محرک خود اقبال کے والد شیخ نور محمد تھے۔

جاوید اقبال نے اقبال کی ابتدائی زندگی کے بارے میں اکثر واقعات 'اقبال درون خانہ' اور 'روزگار فقیر' کے حوالے سے لکھی ہیں۔ اس میں سلسلے ان شارحین کی روایات پر اعتماد کیا ہے۔ بعض جگہوں پر ان سے اختلاف بھی کیا ہے ایسی صورت میں کوئی معقول وجہ بھی پیش کی ہے۔

جاوید اقبال نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ اقبال نے شاعری میں میر حسن سے اصلاح لی ہے۔ اس بات کی بھی تردید کی ہے کہ اقبال نے داغ کی شاگردی اپنے استاد میر حسن کے مشورے سے اختیار کی تھی۔ اقبال نے شاعری کی ابتدا کب کی اس کا کوئی حتمی جواب دینے کے بجائے جاوید اقبال نے یہ رائے دی ہے کہ اقبال ابتدا سے ہی موزوں طبیعت رکھتے تھے۔ جمخانہ جاوید کی رائے کو انہوں نے بغیر کسی تبصرہ کے لکھا ہے کہ اقبال نے سن شعور سے ہی شاعری کی ابتدا کر دی تھی۔

اقبال کب استاد داغ کے شاگرد ہوئے اس کے بارے میں مختلف شہادتوں کی بنیاد پر جاوید اقبال اس جانب گئے ہیں کہ اقبال ایف اے سال اول کے زمانے میں جو کہ ۱۸۹۳ کا زمانہ ہے شاگردی اختیار کی۔ اقبال کی سب قدیم دریافت شدہ نظم زبان دہلی نومبر ۱۸۹۳ میں اقبال کو داغ کا شاگرد کہا گیا ہے۔ اس سلسے میں لالہ سری رام کی رائے کا رد کیا ہے کہ اقبال نے داغ سے پہلے ارشد گورگانوی کو اپنی نظمیں دکھائی۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال سے ارشد گورگانوی کی پہلی ملاقات ۱۸۹۵ کے بعد ہوئی اور اس سے پہلے اقبال داغ سے اصلاح لے چکے تھے۔[1]

جاوید اقبال نے سید میر حسن کے لڑکے اور اقبال کے ہم جولی سید ذکی شاہ کے اس دعوے کا بھی رد کیا ہے کہ اقبال نے ابتدائی غزلوں کی اصلاح ان کے والد سے لی۔[2]

---

1 ص ۶۹

2 زندہ رود ص ۷۹

اقبال کے شخصیت کے ارتقا میں گورنمنٹ کالج کی چار سالہ صحبتوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اقبال نے یہاں پروفیسر آرنلڈ جیسی شخصیت کی شاگردی پائی۔ 'ذکر اقبال' کی طرح جاوید اقبال نے پروفیسر آرنلڈ کی اثر پذیری کا انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اقبال آرنلڈ کا بہت ادب واحترام کیا کرتے تھے مگر وہ ان کی شخصیت اور حدود سے واقف تھے۔ سید نذیر نیازی کے حوالے سے اقبال کا بیان نقل کیا ہے کہ اقبال نے آرنلڈ کے بارے میں کہا ہے کہ ان کی ساری وفاداری صرف خاک انگلستان سے تھی۔ اقبال نے آرنلڈ کی تجویز پر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران پر کچھ لکھنے سے انکار کر دیا تھا اس وجہ سے کہ اقبال کی نظر میں یہ انگلستان کے مفاد میں تھا۔ اور اقبال علاقائیت کو ہوا دینے والی کوششوں کے مخالف تھے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں جاوید اقبال کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ حالات واقعات کو اس طرح بیان کریں کہ اقبال کے فکر کی ارتقائی شکل واضح ہو جائے اور اقبال کے افکار پر ان واقعات کے اثرات پر گفتگو کی جاسکے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں زندہ رود اقبال کی زندگی کی سوانح ہونے کے بجائے ان کے افکار کی سوانح ہے۔

اقبال کی شاعری کو صیقل کرنے اور پروان چڑھانے میں لاہور کی ادبی محفلوں اور مشاعروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان ادبی محفلوں میں ارشد گورگانی، محمد دین فوق، سر عبدالقادر، مولانا صلاح الدین، غلام بھیک نارنگ، میرزا اعجاز حسین، جسٹس شاہ دین، میاں شاہنواز، میاں فضل حسین اور سر محمد شفیع وغیرہ جیسے اکابرین علم وفن سے ملاقات ہوئی۔ مشاعروں سے اقبال کو عوامی مقبولیت ملی۔ یہاں تک کہ اقبال عوام کے ہر دلعزیز شاعر ہو گئے اور مشاعروں کی کامیابی کے لیے اقبال کا نام ناگزیر سمجھا جانے لگا۔ ان سب کا تفصیلی بیان جاوید اقبال نے پانچویں 'باب اقبال لاہور میں' تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

جاوید اقبال کے مطابق مشاعروں میں ترنم کے ساتھ اشعار پڑھنے کی ابتدا اقبال نے کی۔ لاہور کے پس منظر میں یہ بات تو درست ہو سکتی ہے مگر پورے ملک کے حوالے سے یہ دعوی دلیل کا محتاج ہے۔ یہ بات درست ہے کہ اقبال سے پہلے لاہور کے مشاعروں میں ترنم کے ساتھ اشعار پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ بہت سارے شاعر اقبال کی مقبولیت کی وجہ اقبال کے ترنم کو قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ارشد گورگانی نے ایک مشاعرہ میں ایک دفعہ یہ شعر پڑھا:[1]

---

1 زندہ رود ج ۲، ص ۸۲

نظم اقبال نے ہر اک کو گویا کر دیا
ان کا اشارہ اقبال کے ترنم سے شعر پڑھنے کی طرف تھا۔

اقبال ہمیشہ ترنم کے ساتھ اشعار نہیں پڑھتے تھے، انہی اشعار کو ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے جو اس کے متقاضی ہوا کرتے تھے۔ نظم شکوہ پڑھتے وقت اقبال سے جب سامعین نے ترنم کے ساتھ نظم پڑھنے کی فرمائش کی تو اقبال نے منع کر دیا۔[1]

جاوید اقبال نے حالی کو جدید شاعری کا بانی قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دور کے حالات کے مطابق قومی شاعری زیادہ تر قوم کا ماتم ہوا کرتی تھی: [2]

اردو شاعری میں موضوعاتی نظموں کی تحریک محمد حسین آزاد کے ذریعہ شروع ہو چکی تھی۔ قدیم مشاعروں کی جگہ مغربی انداز کی موضوعاتی نظموں پر مشتمل مشاعرے منعقد کیے جا چکے تھے۔ اقبال نے اس روش کو ایک قدم آگے بڑھایا۔ اس دور کی اقبال کی نظمیں عموماً ترجمہ ہوا کرتی تھیں۔ مگر ان نظموں کو محض ترجمہ نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ اگرچہ خیالات مغربی ہوا کرتے تھے مگر انداز اور فضا مشرقی ہوا کرتی تھی۔ اقبال کے لہجہ کے اندر ایک انوکھا پن تھا جس کی وجہ سے اقبال کی شاعری دن بدن مقبولیت کی منزلیں طے کرتی جا رہی تھی۔

اقبال کے مزاج سے مشاعرے میل نہیں کھاتے تھے۔ بلکہ اقبال مشاعروں کے شاعر ہی نہ تھے۔ اس وجہ سے زمانہ طالب علمی کے اختتامی دور میں اقبال نے مشاعروں میں شرکت کرنا کم کر دیا تھا۔ اقبال کی طالب علمی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے جاوید اقبال نے اس دور کے اقبال کو مجموعۂ اضداد قرار دیا ہے۔[3]

---

1 ایضاً

2 زندہ رود ج ۲، ص ۸۵

3 زندہ رود ج ۲، ص ۸۵

ایم اے کرنے کے بعد اقبال ۔ ۔ ل کالج میں ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ یہاں تقریباً چار سال بحیثیت میکلوڈ عربک ریڈر کے طور پر کام کرتے رہے۔ دروان ملازمت ۱۹۰۱ء میں اقبال نے بلا معاوضہ چھ ماہ چھٹی لے کر گورنمنٹ کالج میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی کام کیا۔ اس دوران اقبال کو پروفیسر آرنلڈ کی مصاحبت کا بھی شرف حاصل ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ ۱۸۹۹ میں قائم مقام پروفیسر کی حیثیت ۔ ۔ ۔ ل کالج میں آئے ہوئے تھے۔ جاوید اقبال نے اس دور کے تمام واقعات کو مختلف حوالوں سے بیان کیا ہے۔ اور ۔ ۔ ۔ ل کالج میں اقبال کی تنخواہ بہتر روپے آٹھ آنے تھی۔ ۱۹۰۱ میں اقبال نے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان دیا مگر بائیں آنکھ کی بینائی کی وجہ سے طبی نقطۂ نظر سے ان فٹ قرار دیے ۔ گئے۔[1]

جاوید اقبال کے مطابق اقبال کو کینیڈا یا امریکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کی تحریک اور ۔ ۔ ل کالج کے کنیڈین پرنسپل پروفیسر اسٹراٹن سے ہوئی جن سے اقبال سے دوستانہ تعلقات تھے۔ بعد میں پروفیسر آرنلڈ نے اقبال کو جرمنی یا انگلستان جانے پر آمادہ کر لیا۔ اورینٹل کالج میں اقبال کی علمی اور تدریسی مصروفیات بیان کرنے کے ساتھ اس دور کی اقبال کی تصنیف 'علم الاقتصاد' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

اقبال کا ذہن ابتدا ہی سے اجتہادی تھا۔ وہ کسی بندھے ہوئے دائرہ کو قبول نہیں کرتے تھے۔ علم الاقتصاد میں اقبال نے عام مسلم فقہا سے الگ فیملی پلاننگ کی حمایت کی ہے۔ وہ آبادی کے لیے بے تحاشہ اضافہ کو انسانیت کے خطرہ مانتے ہیں۔ اقبال نے مفلسی کو تمام برائیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔ آبادی کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے اقبال نے چھوٹی عمر میں شادی کی مخالفت کی۔ علم الاقتصاد کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ اقبال کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔

انجمن حمایت اسلام کے اغراض و مقاصد اقبال سے مطابقت رکھتے تھے اس وجہ سے اقبال اس انجمن سے آخری عمر تک وابستہ رہے۔ اقبال کی بہت سی نظمیں اسی انجمن کی یادگار ہیں، اقبال نے سب سے پہلی نظم اس انجمن کے اسٹیج سے 'نالۂ یتیم' ۲۴ فروری ۱۹۰۰ میں پڑھی۔ اس جلسہ کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[2]

---

1 زندہ رود ج ۲ ص ۳۰ و ۳۱

2 زندہ رود ج ۲ ص ۹۸

جاوید اقبال اقبال کی قومی شاعری سے وطنی شاعری کی طرف مراجعت کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔[1]

اس کے اقبال نے استعمار کے مزاحمت میں برپا کی گئی تحریکوں شخصیات اور کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ ہندوستان کی اور عرب دنیا میں وہابی تحریک، جمال الدین افغانی اور سرسید اور شبلی کے سیاسی نظریات پر گفتگو کی ہے۔ وہ سرسید کی مصلحت آمیز رویے کو دیرپالائحۂ عمل نہیں قرار دیتے۔ ترکی خلافت جس کو یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا ہے۔ اس کے خاتمہ کے لیے انگریزوں کو ہی نہیں خود سلطان عبدالحمید کے رویے کو بھی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ایک طویل نوٹ کے بعد وہ اس بحث کا رشتہ اقبال کے افکار پر ان واقعات سے جوڑنے میں ناکام رہے۔

ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے امتحان کے بارے میں جاوید اقبال کی رائے یہ ہے کہ اقبال سرکاری نوکری کرنا چاہتے تھے مگر اس میں کامیاب نہیں ہوئے تو معلمی ہی ایک کمائی کا ذریعہ باقی بچا۔ جو کوئی معقول آمدنی کا ذریعہ نہ تھا۔

اقبال جیسا دیش ویسا بھیس کے قائل تھے وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ دوستوں اور احباب کے بیچ اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے موضوع بحث بنیں۔ اقبال کے سفر یورپ کی ہر چھوٹی بڑی بات کو جاوید اقبال نے اس کتاب میں درج کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی مدد اقبال کی خود اپنی روداد سے ملی ہے۔ اس روداد سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ہر چیز کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ان کے بارے میں کیا رائے پیش کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان میں سے اکثر تفصیلات غیر ضروری ہیں۔ سوانح کسی انسان کی ہر چھوٹی بڑی بات کو جمع کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے اہم کام یہ ہے کہ اہم اور غیر اہم میں تمیز کیا جائے اور یہ فیصلہ کیا جائے کہ کس کو شامل کتاب کیا جائے اور کس کو نہیں۔ جاوید اقبال علامہ اقبال کی زندگی اور شاعری کو سمجھنے کے لیے اقبال کے سفر یورپ کا مطالعہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ اقبال خود سفر یورپ سے پہلے کی شاعری کو زمانۂ جاہلیت کی شاعری قرار دیتے ہیں۔ یہیں سے اقبال کے فکر اور فن میں پختگی پیدا ہوئی۔

جاوید اقبال نے سفر یورپ کے بعد کے دور کو حیات اقبال کا تشکیلی دور قرار دیا ہے۔ 'زندہ رود' کی دوسری جلد میں جن موضوعات کو موضوع بنایا گیا ہے وہ یہ ہیں:

---

1 زندہ رود ج ۲ ص ۱۰۰

فکر معاش، ازدواجی زندگی کا بحران، ذہنی ارتقا، تخلیقی کرشمہ، قلمی ہنگامہ، خانہ نشینی اور ہندو مسلم تصادم کا ماحول۔ ان میں سے تخلیقی کرشمہ اور قلمی ہنگامہ ایک جیسے موضوعات ہیں۔ اس وجہ سے ان کے کیے کیے الگ اسے عنوان قائم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جاوید اقبال نے اس جلد کو پہلی جلد سے مربوط کر دیا ہے۔ [1]

یورپ سے واپسی کے بعد سب سے بڑا مسئلہ فکر معاش کا تھا۔ اس کے بعد کے چند سالوں تک اقبال معاش کی جد جہد کرتے نظر آتے ہیں۔[2]

چنانچہ ان کے بھائی عطا محمد نے موہن لعل روڈ جس کا موجودہ نام اردو بازار ہے ایک کوٹھی اقبال کی رہائش اور آفس کرائے پر دلوادی۔ ایک منشی کاہن چند بھی رکھ لیا اور قانون کی کتابوں کی ایک لائبریری بھی قائم کرلی۔ اقبال نے بیرسٹری کا آغاز لور کورٹ سے کیا مگر وہاں کے کام کاج سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو بحیثیت ایڈوکیٹ اقبال کا انرو امہ ۔ ٹ ب ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے چیف کورٹ پنجاب میں پرکٹس شروع کر دی۔ جاوید اقبال کے مطابق اقبال نے چند دنوں کے بعد انارکلی میں سکونت اختیار کرلی اور آفس بھی وہیں پر منتقل کر لیا طاہر الدین کو منشی رکھ لیا، اقبال کا قدیم ملازم علی بخش سفر کی واپسی کے بعد سے ہی اقبال کے ساتھ رہا۔ اس دوران اقبال مقدمات کے لیے سخت محنت کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ شعر و شاعری سے بھی کنارہ کش ہو گئے تھے۔

اس درمیان اقبال نے اے ایم یو کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور سے پروفیسری کے آفر کو ٹھکرا دیا۔ اس کی وجہ جاوید اقبال کی نظر میں یہ ہے کیوں کی وہ معلمی کو معقول آمدنی کا ذریعہ نہیں مانتے تھے۔ اس کے برعکس وکالت میں مالی بہتری کے امکانات تھے۔ مگر بعد میں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں آسٹن ائٹ جیہ مر کے انتقال کے بعد ان کو جز وقتی فلسفہ کے پروفیسری کے لیے کہا گیا تو اقبال اس کے لیے تیار ہو گئے۔ اقبال کے لیے خصوصی رعایت کی گئی کہ کورٹ میں ان کے مقدمات شام کے وقت لگانے کے لیے کہہ دیا گیا جس کو منظور کر لیا گیا۔

---

1 پیش لفظ ج ۲ ص الف

2 زندہ رود ج ۲ ص ۱۳۹

۱۹۰۸ سے ۱۹۲۵ء تک کا زمانہ اقبال کی زندگی میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ زمانہ کافی ہنگامہ خیز رہا۔ بانگ درا کی اشاعت ہوئی۔ بانگ درا سے پہلے مولوی عبد الرزاق نے ایک نامکمل 'کلیات اقبال' شائع کی جس کو اقبال نے ناپسند کیا۔ سر اکبر حیدری اور مہاراجہ کشن پرساد کی کوششوں سے اس کی اشاعت حیدر آباد کے باہر نہ ہو سکی۔ اس کے مرتب نے اقبال کو ایک ہزار روپیہ ہرجانہ ادا کیا۔ مولوی احمد دین نے 'اقبال' نام سے ایک کتاب شائع کی۔ جس میں اقبال کی زندگی اور شاعری کے بارے میں مضمون اور اقبال کی شاعری کا انتخاب شامل کیا گیا تھا۔ مگر اقبال نے بعض وجوہ سے اس کو ناپسند کیا۔ جس کی وجہ سے مولوی احمد دین نے اس کے نسخے جلا دیے ۔

جاوید اقبال نے اقبال کے سوانحی پس منظر میں برصغیر ہند کے احوال و کوائف کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ کلام اقبال پر ان احوال و واقعات کے اثرات کا علم ہو جاتا ہے۔ مگر بعض جگہوں پر یہ تفصیلات غیر ضروری طور پر طویل ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اقبال کی سوانح پس منظر میں چلی گئی ہے۔ پس منظر بیان کرنے میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم جن واقعات کا ذکر کر رہے ہیں واقعی اس نے شاعر کو متاثر کیا بھی یا نہیں اور اگر کیا بھی تو کیا اسی نہج پر یا کسی دوسری نہج پر۔

'ذہنی ارتقا' کے تحت جاوید اقبال نے ایک طویل گفتگو کی ہے ان عوامل پر جو اقبال کی ذہنی و فکری تبدیلی کا سبب بنے وہ قیام یورپ کو اگرچہ اقبال کی شاعری کا ٹرننگ پوائنٹ مانتے ہیں لیکن ان کا ماننا ہے کہ اقبال کی شاعری میں اسلامی عناصر پہلے سے موجود تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس سے پہلے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کے لیے پر امید تھے مگر بعد میں ان کا رویہ تبدیل ہو گیا وہ ہندو اور مسلمان دونوں کے الگ تشخص قائم رکھنے کو لازمی قرار دینے لگے۔ یہ تبدیلی غالباً تقسیم بنگال کی تنسیخ کے لیے ہندوؤں کے جارحانہ مظاہروں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ چونکہ جاوید اقبال کا منشا اقبال کی سوانح ہی نہیں بلکہ انکے افکار کے تدریجی ارتقا کی تاریخ پیش کرنا تھا اس وجہ انہوں نے اقبال کے تقریباً سبھی لکچروں اور مضامین کا تفصیلی مطالعہ کرنا اپنے اوپر لازم قرار دے لیا ہے۔

'تخلیقی کرشمہ' کے عنوان سے جاوید اقبال نے اقبال کی اسرار خودی کی اشاعت اور اس پر ہنگاموں کا ذکر کیا ہے لیکن غیر ضروری طور پر جنگ عظیم دوم کا ذکر کیا ہے۔ یہ اس وقت اور بھی غیر ضروری ہو جاتا ہے جب خود جاوید اقبال بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان واقعات کا اقبال پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جنگ عظیم اول اور اسرار خودی میں جو چیز مماثلت رکھتی ہے وہ یہ کہ اسرار خودی کی تصنیف کا زمانہ بھی وہی ہے جو جنگ عظیم کا ہے۔ اسرار خودی کے مخالفین میں خواجہ حسن

نظامی اور دوسرے اکابرین تھے لیکن خود ان کے والد بھی اقبال کے موقف کے خلاف تھے۔ جاوید اقبال نے لکھا ہے کہ اقبال نے اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن سے قابل اعتراض حصہ اپنے والد کے کہنے پر ہی نکالا تھا۔

جاوید اقبال صرف یہی نہیں بتاتے ہیں کہ اقبال نے کیا لکھا۔ بلکہ ان کتابوں کی تفصیل بھی فراہم کرتے ہیں جو انہوں نے لکھنی چاہی مگر کسی وجہ سے لکھ نہ سکے۔ راماین اور گیتا کا ترجمہ، تصوف کی تاریخ، ایک کتاب انگریزی میں 'اسلام میری نظر میں' یہ ساری کتابیں وہ کیوں نہ لکھ سکے اس کی دو وجہیں ہیں پہلی مالی دشواری اور دوسری وقت کی قلت، اقبال کا زیادہ تر وقت تلاش معاش میں نکل جاتا تھا۔ جاوید اقبال نے اقبال کی مالی پوزیشن واضح کرنے کے لیے اقبال کے گوشوارہ کا بھی ذکر کیا ہے جس کی رو سے ۱۹۱۷-۱۹۱۸ کے درمیان اقبال کی آمدنی ۴۲۲۵ روپے تھی۔ جس پر ان کو ۱۱۰ روپے ٹیکس دینے پڑے۔ اس سے پہلے ان کی آمدنی ٹیکس کے دائرے سے باہر تھی۔ اس گوشوارہ سے کئی دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے۔ جیسے ۱۹۲۲ء میں انہیں اسرار و رموز کی پہلی بار را ر یلہ ٹ ی ملی تھی جو ۳۲ روپئے تھی۔ ۱۹۳۲۔ ۱۹۲۲ کے درمیان ان کی آمدنی میں سود بھی تھا۔ صفدر محمود نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہ بینکوں سے ملنے والا سود تھا۔ جس کو حکومت اپنی پسند کی جگہوں پر خرچ کر دیا کرتی تھی اس وجہ سے مسلمان اس کو نکال لیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۵۔ ۱۹۲۴ میں پہلی بار انہوں نے ڈرائیور اور کار رکھی۔ اسی سال ان کو بانگ درا سے ۵۵ روپے ر یلہ ٹ ی کے ملے۔

یہ آمدنی اس وقت کے لحاظ سے کافی تھی مگر اس تلاش معاش کے لیے ان کے پاس دو وسائل تھے۔ وکالت اور یونیورسٹیوں کے پرچے بنانا اور ان کی جانچ کرنا۔ اقبال کا سارا وقت اسی تگ و دو میں ختم ہو جاتا۔ وہ علمی کاموں کے لیے وقت نہیں نکال پاتے تھے۔ ان کا دل بے چین رہتا تھا علمی و تحقیقی کاموں کی تکمیل کے لئے۔ اس لیے وہ بار بار نظام حیدرآباد کی طرف پر امید نظروں سے دیکھتے تھے۔ جاوید اقبال نے اقبال کے سفر حیدرآباد کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے احتراز کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال حیدرآباد تو گئے ہیں مگر دو بار یا تین بار ہمیں اس بحث سے سروکار نہیں۔[1]

---

1 ایضاً ص ۸۴

لیکن چاہت کے باوجود اقبال نظام حیدرآباد کی ملازمت اختیار نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ کیا ہے جاوید اقبال حیدرآبادی کے خیال سے متفق دکھتے ہیں کہ ایسا انگریز بہادر کی وجہ سے ہوا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اقبال جیسا مدبر شخص نظام حیدرآباد کے یہاں جائے۔

زندہ رود کی آخری جلد اقبال کی زندگی کے آخری دور کا احاطہ کرتی ہے۔ اس جلد میں اقبال کی عملی سیاست میں شرکت اور زندگی کے آخری سفر کی روداد ہے۔ اقبال نظریاتی سیاست میں ابتدائی زمانہ سے سرگرم تھے۔ ان کی شاعری اور خطبات اس کے ثبوت کے لیے کافی ہیں مگر ۱۹۲۵ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت سے اقبال نے عملی سیاست میں قدم رکھا۔ اس باب کو پڑھنے کے بعد ایک الگ قسم کے اقبال کی شبیہ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ اقبال جو غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور مسلمانوں کے حقوق کے لیے بحث و مباحثہ کرتا ہے۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کرتا ہے۔ مسلم لیگ کے جلسوں کی صدارت کرتا ہے۔ اپنے خطبات کے ذریعہ مسلم امت کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انہیں مستقبل کے اندیشوں سے ہوشیار کرتا ہے۔ اقبال کی سیاسی زندگی کے بارے میں بہت سارے لوگوں نے یہ غلط فہمی پھیلائی کہ اقبال ایک ناکام سیاست داں تھے۔ جاوید اقبال نے اس جلد میں اس کی تردید کی ہے۔ اقبال چونکہ عام سیاست دانوں کے برخلاف صاف ستھری سیاست پر یقین رکھتے تھے اس وجہ سے وہ کسی کی مخالفت اور ملامت کی پرواہ کیے بغیر قوم وملت کے حق میں جو مفید سمجھتے تھے اس کے حق میں آواز بلند کرتے تھے۔

جاوید اقبال نے اقبال کو قیام پاکستان کا نظریاتی بانی قرار دیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ پاکستان کے قیام کی تجویز سب سے پہلے اقبال نے خطبۂ الٰہ آباد میں پیش کی تھی۔ ان کا نظریہ مسلم ریاست چودھری رحمت علی کے نظریہ سے مختلف تھا۔ انہوں نے اس بات کی بھی تردید کی ہے کہ اقبال بعد میں مسلم ریاست کے نظریہ کی لغویت کو محسوس کرتے ہوئے اس سے منحرف ہو گئے تھے۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی خود مختار مسلم ریاست کسی قابل قبول ہندو مسلم مفاہمت کی بنیادوں پر ہندوستان کے وفاق، برطانوی دولت مشترکہ کے اندر قائم ہو سکتی تھی۔ اور اس کا علیحدہ طور پر ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے قائم ہونے کا امکان اسی صورت میں تھا، جب ہندو مسلم مفاہمت کی کوئی امید نہ رہے۔ لیکن چودھری رحمت علی کی پاکستان اسکیم کا مقصد شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن قائم کرنا تھا۔ اقبال

کی مسلم ریاست کے قیام کی تصور میں آبادیوں کے تبادلے کی ضرورت نہ تھی، مگر چودھری رحمت علی کے تصور پاکستان میں آبادیوں کا تبادلہ لازمی تھا۔''[1]

جاوید اقبال نے اقبال کی آخری وصیت کا بھی ذکر کیا ہے، اس وصیت میں اقبال کے مذہبی عقائد کا بھی بیان ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

''میرے مذہبی اور دینی عقائد سب کو معلوم ہیں۔ میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں، نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں۔ عملی اعتبار سے حضرت امام ابو حنیفہ کا مقلد ہوں۔''[2]

جاوید اقبال نے زندہ رود کے علاوہ اقبال پر تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ یہ مضامین 'مئے لالہ فام' کے نام سے شائع ہوگئے ہیں۔ اس کے اندر اقبال کے فکر و فن کے علاوہ سوانحی مضامین بھی ہیں۔ وہ اقبال کے صاحب زادے ہیں اس وجہ سے انہیں اقبال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ایک مضمون میں اقبال کی پدرانہ شفقت پر روشنی ڈالی ہے۔ جاوید اقبال ایک مرتبہ ساتویں جماعت میں فیل ہوگئے۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'' مجھے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ باغ و بہار (قصہ چہار درویش) حاتم طائی، طلسم ہوشربا اور عبد الحکیم شرر کے سب ناول پڑھ ڈالے تھے۔ ساتویں جماعت کے امتحان کے قریب میرے ہاتھ الف لیلہ لگ گئی، اور اس کتاب سے میں اس قدر مسحور ہوا کہ رات گئے تک اسے پڑھتا رہتا۔ امتحان سر پر آ گئے لیکن میں نے الف لیلہ کو نہ چھوڑا بلکہ رات کو امتحان کی تیاری کرنے کی بجائے الف لیلہ پڑھتا رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساتویں جماعت کے امتحان میں ناکام رہ گیا۔ جب اباجان کو علم ہوا کہ میں الف لیلہ میں منہمک ہونے کی وجہ سے امتحان میں ناکام رہا ہوں تو برہم نہ ہوئے، کہنے لگے ''اگر تم امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد الف لیلہ پڑھتے تو تمہیں اور بھی لطف آتا''۔[3]

---

1 زندہ رود ج ۳ ص ۴۱۹۔ ۴۲۰

2 زندہ رود ج ۳ ص ۵۵۸

3 اقبال: ایک باپ کی حیثیت سے، مشمولہ مئے لالہ فام، جاوید اقبال

جاوید اقبال نے اقبال کی سوانح کے ساتھ اقبال کے ہم عصر اصحاب اور ملکی و بین الاقوامی سیاست کی ایسی تصویر بیان کی گئی ہے کہ اس زمانے کا متحدہ ہندوستان ہمیں جیتا جاگتا نظر آجاتا ہے۔ڈاکٹر سیعہ خان لکھتی ہیں:

زندہ رُوْد میں اقبال کی سوانح تاریخی، سیاسی، ر غدیساتی حائق کے ساتھ پیش کی گئی ہے ان کا اسلوب اول تا آخر ادبی رہاہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کہیں پر بھی اکتاہٹ نہیں محسوس کرتا۔ جاوید اقبال نے اقبال کی شخصیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ اقبال کی فکری ارتقا کا جائزہ ۱۹۷۷سے ۱۹۳۸تک کے عہد میں رکھ کر لیاہے۔اور ساتھ ہی ستر سالوں پر مشتمل اس دور کی سیاسی تاریخ اور سماجی داستان بھی بیان کی ہے۔ جس کے لیے انہوں نے ایک اچھے سوانح نگار کی طرح تمام مستند کتب سے استفادہ کیا ہے۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ جاوید اقبال نے اس سلسلہ کتب میں بعض باتیں بیان کی ہیں، جن کا ذکر ان سے پہلے کسی سوانح نگار نے نہیں کیا تھا۔''[1]

جاوید اقبال کی اس کاوش کو اردو کے اہم ناقدین نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اردو کے اہم ناقد پروفیسر اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

'' ڈاکٹر اقبال کے ذاتی حالات کے سلسلے میں بہت سی سوانح عمریاں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں لیکن ہمارے طریقۂ کار کی ایک مشترک خامی ان سب میں کم بیش کھٹکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم بالعموم نہ متعلقہ مواد کی پوری طرح جانچ پڑتال اور چھان بین کرتے ہیں اور نہ معروضی انداز میں اپنی تحقیق و تفتیش کے نتائج کو پیش کرنے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ بلکہ اس عمل میں ر عصبات اور تاثرات کو بیش از بیش دخیل ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ جاوید اقبال کی زندہ رود اس معاملے میں ایک استثنائی حیثیت رکھتی ہے۔''[2]

بحیثیت مجموعی جاوید اقبال ایک کامیاب سوانح نگار ہیں۔ ان کی کتاب 'زندہ رود' اقبال کی ایک مکمل سوانح عمری ہے۔انہوں نے اس کتاب کے ذریعہ اقبال کے شیدائیوں پر سے اقبال کی سوانح کا قرض اتار دیاہے۔

1 ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات؛از ڈاکٹر سیعہ خان ص ۳۲۰

2 زندہ رود (تبصرہ) شمارہ نقدونظر ۱۹۸۲، اقبال نمبر ا ج ۴ شمارہ ۲ علی گڑھ

# رفیع الدین ہاشمی

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا شمار ہم عصر اقبال شناسوں میں ہوتا ہے۔ اقبال تنقید کی عالمی پیش رفت پر ان کی گہری نظر ہے۔ یہی ان کا اختصاص ہے۔ آپ کی چالیس سے اوپر تصانیف اردو زبان وادب کے حوالے سے تحقیقی و علمی سطح پر بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ اقبالیات پر ان کی اکیس (۲۱) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔'' اقبال کی طویل نظمیں'' (1974ء) ان کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ انہوں نے پی ایچ ڈی کا مقالہ ''تصانیف اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ'' کے عنوان سے وحید قریشی کی نگرانی میں کیا۔

پورے اقبالیاتی سرمائے پر گہری نظر ہونے کی وجہ سے اقبالیات میں ہو رہی پیش رفت پر ان کی گہری نظر ہے۔ انہیں سب سے شدت سے اقبال کی مستند سوانح عمری کی کمی کا احساس ہے۔ انہوں نے ایک سے زائد مضامین میں اس مسئلہ کو اٹھایا لیکن کوئی ایسی سوانح عمری سامنے نہیں آئی جو ان کے معیار پر پوری اترتی اس وجہ سے انہوں نے خود اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان کی کتاب 'اقبال شخصیت اور فن' اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے لکھی گئی کتاب ہے۔ یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود ایک مستند سوانح ہے۔

رفیع الدین ہاشمی نے اس سوانح کو اقبال کی متداول سوانح عمریوں کی خامیوں کی نشاندہی کے لیے لکھا ہے اس وجہ سے انہوں نے متداول سوانح عمریوں کی خامیوں کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھا۔ یہ اس کتاب کی سب اہم خصوصیت ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد اقبال کی سوانح عمریوں میں پائی جانے والی خامیوں کی نشاندہی ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس اسلوب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ایک خالی الذہن طالب علم کا ذہن تمام اختلافات سے پاک سوانح عمری کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ جس میں مناظرتی رنگ نہ ہو۔ اس سے کتاب میں جابجا مناظراتی رنگ کتاب کے تسلسل میں مانع ہوتا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی کو بھی اس کا احساس تھا اس وجہ سے انہوں نے ایسے مباحث کو عموماً حواشی میں لکھا ہے تاکہ عام قاری کو ان مباحث سے الجھن نہ ہو۔

رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کی سوانح لکھتے ہوئے عناوین شاعرانہ رکھے ہیں۔ مثلاً آبا میرے لاتی و مناتی، وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی، سودائے علم، دیدۂ بینائے قوم، آسودگی نہیں ملتی، شراب علم کی لذت۔۔۔ ر فہ ی م بہ تماشائے خرابات فرنگ وغیرہ یہ شاعرانہ عناوین اگرچہ رفیع الدین ہاشمی کے تحقیقی مزاج سے مختلف ہیں لیکن انہیں اس نظر سے دیکھا جاسکتا ہے کہ انہوں نے قلم کا ذائقہ بدلنے کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا ہے۔

چوبیس ابواب پر مشتمل اس سوانح عمری کو اس طرح سے مرتب کیا گیا ہے کہ ہر باب کو دوسرے سے مربوط رکھا گیا ہے تا کہ ایک باب بڑھنے کے بعد قاری کا دل دوسرے باب کو پڑھنے کی طرف راغب ہو۔ ہر باب کے شروع میں اس کا خلاصہ ایک ایسی چیز ہے جو تحقیقی کتابوں کے لیے قابل تقلید ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا ہے کہ اس سوانح میں اقبال کے تعلق سے بہت ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رفیع الدین ہاشمی نے اس سلسلے میں خاص توجہ دی ہے۔ مثلاً علامہ اقبال کی پہلی بیوی اور آفتاب اقبال کی ماں کے حوالے سے 'مظلوم اقبال' جیسی کتابوں کے ذریعہ جس قسم کی فضا تیار کی جارہی ہے اس کا رفیع الدین ہاشمی نے سخت نوٹس لیا ہے۔ انہوں نے دلائل کے ذریعہ الزامات کا رد کیا ہے۔

رفیع الدین ہاشمی نے کیمبرج کالج میں تعلیمی دور کی پر لطف مجلسوں کے تعلق سے روایات کے بارے میں بھی تردد کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی راوی عطیہ فیضی ہیں۔ اس وجہ سے عطیہ فیضی کے بیانات کو من و عن قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح صہبا لکھنوی کی اس رائے کی بھی تردید کی ہے کہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف اپنے مشہور مضامین دوسری بار قیام بھوپال کے دوران لکھے۔ انہوں نے لکھا کہ آخری مضمون ISLAM AND AHMADISM کے علاوہ سبھی مضامین دوسری بار جانے سے پہلے لکھ چکے تھے۔[1]

---

1 اقبال شخصیت اور فن از رفیع الدین ہاشمی ص ۲۳۷

پرفیسر رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کی اعلی تعلیم کے لیے ہندوستان واپسی کی تاریخ ۲۳ جولائی کی شب یا ۲۵ جولائی کی صبح قرار دیا ہے۔[1]

علامہ اقبال کے بارے میں تقریباً سبھی سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ اقبال کو میٹرک میں کامیابی کی اطلاع بذریعہ تار ۴ مئی کو ملی۔ اس وقت آپ شادی کے گھوڑے پر سوار تھے۔ رفیع الدین ہاشمی نے اس پر سوال کھڑا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ تار کس نے بھیجا، اور کہاں سے بھیجا؟[2]

کتاب میں کئی مقامات ایسے بھی آئے ہیں جہاں انہوں نے سید نذیر نیازی کی طرح سوانح اقبال کے بعض خلا کو تخیل کے ذریعہ پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً

''تمام طلبہ بشمول محمد اقبال، مارچ ۱۸۹۳ء کے تیسرے ہفتے گجرات پہنچے بہار کے خوش گوار موسم میں گندم کی لہلہاتی فصلوں کے درمیان ریل کا یہ سفر لڑکوں کو اچھا لگا ہوگا۔۔۔ امتحان ختم ہوا اور لڑکے دل و دماغ کا سار بوجھ اتار چکے تو واپسی کا سفر ان کے لیے بالکل ایک تفریحی ثابت ہوا۔ دلچسپ اور پر لطف۔ ہنستے، مسکراتے، گیت گاتے اور ایک دوسرے سے چہلیں کرتے واپس آئے ہوں گے۔''[3]

اسی طرح یورپ سے واپسی کے بعد ان کی والدہ کے رویہ کو بھی تخیل سے پر کرنے کی کوشش کی ہے۔:

''گھر پہنچتے ہی والدہ نے انہیں لپٹا لیا اور منہ چوما ہوگا۔''[4]

اس قسم کی اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں لیکن اس کے کتاب کے استناد پر کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ یہ وہ امور ہیں جو عموماً پیش آتے ہیں۔ اسکول یا کالج کے طلبہ گروپ میں جاتے ہوئے ہنسی مذاق کرتے ہی ہیں۔ گھر واپسی پر ماں اپنے بیٹے کو

---

1 ایضاً ص ۹۰

2 ایضاً ص ۳۶

3 ایضاً ص ۳۳

4 ایضاً ص ۸۳

کلیجے سے لگاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ ان کا تعلق کسی اہم حقیقت سے نہیں ہے جس کے لیے کسی مآخذ کی ضرورت پڑے۔

ڈاکٹر خالد ندیم کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

'کتاب کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد برملا کہا جاسکتا ہے کہ 'عام قاری' کے لیے تحریری کی گئی اقبال کی ی سوانح اپنے مندرجات کی سند محقق کی جستجو اور جہد مسلسل کا احساس دلاتی ہے اور مستقبل کے سوانح نگار کے لے اسلوب اور معیار کی قابل تقلید مثال پیش کرتی ہے۔ غرض یہ کہ استناد واقعات اور اخذ نتائج کے اعتبار سے اس تالیف کو بہت سی علمی کاوشوں پر تفوق حاصل ہے۔[1]

'اقبال کی نثر میں ان کی ولادت سے لے کر بڑھاپے تک کی نادر معلومات ملتی ہیں۔ ان کی صحت اور بیماریوں اور علاج معالجے پر چوں مرگ آید؟ کے نام سے جو کتاب دستیاب ہے، وہ بیشتر اقبال کی نثر اور خطوں ہی سے تیار کی گئی ہے۔ اسی طرح حیاتِ اقبال کے دیگر پہلو بھی نثر اقبال کے ذریعے سامنے آتے ہیں، مثلاً حصول تعلیم کے لیے انگلستان و جرمنی کا سفر، والدین سے ملاقات کے لیے سیال کوٹ کے سفر، بڑے بھائی شیخ عطاء اللہ سے ملاقات کے لیے ایبٹ آباد، کیمبل پور اور کوئٹے کے سفر، وکالت کے سلسلے میں سری نگر، جھنگ، لکھنؤ اور متعدد دوسرے شہروں کے سفر، گول میز کانفرنسوں میں شرکت اور ضمناً پیرس، ہسپانیہ، روم، مصر اور بیت المقدس کے سفر، افغانستان کا سفر، سرہند شریف کا سفر اور علاج معالجے کے لیے دہلی اور بھوپال کے اسفار کی تفصیلات نثر کی مدد کے بغیر مکمل نہیں کی جاسکتیں۔ نثر میں ہمیں اقبال کے اپنے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے وابستگان اور متعلقین (آباء واجداد، والدین، اساتذہ، اعزہ، بیگمات اور بچوں کے حالات) کے بارے میں بھی بہت کچھ معلومات ملتی ہیں۔[2]

بلاشبہہ یہ کتاب اقبال کے سوانحی سرمائے میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے اقبال پر سوانحی کتابوں کی جس کم مائیگی کا احساس اپنے مضامین میں کیا تھا اس کتاب کے ذریعہ اس کمی کو انہوں نے پورا کر دیا ہے۔

---

1 اقبالیات اردو، جنوری ۲۰۱۰، ص ۱۴۱

2 رفیع الدین ہاشمی، نثر اقبال کا تنوع علامہ اقبال ڈاٹ کام سے ماخوذ

اقبال کی شاعری اور فن پر رفیع الدین ہاشمی نے اکیس کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں کچھ ان کی اپنی تصانیف ہیں ، کچھ مضامین کے مجموعے ہیں۔ زیادہ تر کتابیں اقبالیات پر تحقیق کا درجہ رکھتی ہیں: ذیل میں ان کی کتابوں کی فہرست اور ان کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔

1) اقبال کی طویل نظمیں[1] ۱۹۷۷

یہ اقبالیات پر رفیع الدین ہاشمی کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے ان مضامین کو شامل کیا ہے جو مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں اقبال کی نو طویل نظموں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شکوہ جواب شکوہ، شمع وشاعر، والدہ محترمہ کی یاد میں، خضرراہ، طلوع اسلام، ذوق وشوق، مسجد قرطبہ شامل ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی نے ان میں سے ہر ایک نظم کا فنی اور فکری تجزیہ کرنے کے ساتھ نظم کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو بڑی خوش اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے وقار عظیم لکھتے ہیں:

''طالب علمانہ مذاق کی نفاست وپاکیزگی اور محققانہ نظر کی گہرائی اور گیرائی نے اقبال کی طویل نظموں کے اس تجزیے اور تبصرے کو اس عظیم مفکر اور شاعر کے فکر وفن کے سفر کی دل آویز داستان بنادیا ہے۔ 'اقبال کی طویل نظمیں' اقبال کی تفہیم وتحسین کے باب میں ایک نمایاں اضافہ ہے۔''

2) کتب اقبال[2] ۱۹۷۵

اس کتاب میں اقبالیات پر شائع کتابوں اور تراجم کی فہرست ہے۔ یہ اقبالیات پر ببلیوگرافی ہے۔ اس میں ۱۹۶۵ سے ۱۹۷۵ تک شائع ہونے والی کتابوں کے حوالے درج کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اقبالیات پر کام کرنے والوں کے لیے مفید ہے۔

3) خطوط اقبال[1] ۱۹۷۶

---

1 مطبوعہ: گلوب پبلی کیشنز، لاہور

2 مطبوعہ: تاج بکڈپو، اردو بازار، لاہور

اس کتاب میں اقبال کے ایسے ۱۱۱ غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی نے اس میں اقبال کے خطوط ہی کو شامل نہیں کیا ہے بلکہ اقبال کے پورے مکاتیب پر ایک تنقیدی نوٹ بھی لکھا ہے۔ اس سے پیشتر اقبال کے خطوط کو مرتب کرنے والوں سے جو فر گزاشتیں ہوئیں ان کا تعاقب بھی کیا ہے۔ یہ خطوط اردو، عربی، اور انگریزی تینوں زبانوں میں ہیں۔ علامہ کے ہاتھ سے لکھا ہوا واحد عربی خط جو انہوں نے جامع الازہر کے شیخ مصطفی المراغی کے نام لکھا تھا عربی متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہے۔ خطوط اقبال کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ رفیع الدین ہاشمی نے ہر خط سے پہلے مرسل الیہ کے مختصر احوال و کوائف کو اس کتاب میں درج کر دیا ہے۔

4) اقبال بحیثیت شاعر[2] ۱۹۷۷

رفیع الدین ہاشمی کی کتاب ''اقبال بحیثیت شاعر'' ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اقبال کی شناخت بحیثیت شاعر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، رفیع الدین ہاشمی خود ماہر اقبالیات ہیں۔ انہوں نے اس کے اندر مشہور اور مستند ناقدین اقبال کے مضامین کو جگہ دی ہے۔ رفیع الدین ہاشمی نے اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت سامنے آجائے بلکہ اقبال کے بارے میں ان ناقدین کی رائے اور نقطۂ نظر بھی سامنے آجائے۔ عام طور اقبال ناقدین نے اقبال کے فکر پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ایسے میں اقبال کے فن پر یہ مجموعہ اس کمی کی تلافی کی ایک کوشش ہے۔

5) کتابیات اقبال[3] ۱۹۷۷

یہ کتاب اقبالیات پر شائع کتابوں کی فہرست ہے۔ اس میں انہوں نے کتابوں کو موضوعات کے حساب سے ترتیب دیا ہے۔ ساتھ ہی کتاب کے مشمولات کو بھی پیش کر دیا ہے۔

---

1 مطبوعہ: خیابان ادب، لاہور

2 یہ کتاب مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوئی۔

3 مطبوعہ : اقبال اکادمی پاکستان

### 6) تصانیف اقبال کی تحقیقی و توضیحی مطالعہ[1] ۱۹۸۲

یہ دراصل رفیع الدین ہاشمی کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس پر انہیں ۱۹۸۱ میں ڈگری تفویض کی گئی۔ اس میں انہوں نے اقبال کی اردو فارسی نظموں اور اردو انگریزی اور فارسی کے نثر پر مشتمل علامہ اقبال کی تحریروں کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبد المغنی لکھتے ہیں:

''اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے اقبالیات کے کمالات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں تمام تصانیف اقبال کا احاطہ کیا گیا ہے اور دنیا کے سب سے بڑے شاعر نیز عصر حاضر کے ایک عظیم ترین مفکر کی ہر قسم کی تحریروں اور تقریروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بعض گم شدہ یا غیر معروف چیزوں کی دریافت کے ساتھ ساتھ پیش رو محققین کی متعدد غلطیوں یا غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے۔''[2]

### 7) اقبال بچوں اور نوجوانوں کے لیے[3] ۱۹۸۵

یہ طلبہ کے لیے لکھی گئی کتاب ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں رفیع الدین ہاشمی کے علاوہ خواجہ حمید یزدانی، محمد ریاض اور ڈاکٹر رحیم بخش شاہین بھی شامل ہیں۔ کتاب میں اقبال کی تیرہ نظموں کے علاوہ اقبال کی کتابوں میں وارد قصوں کو آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ کل کہانیوں کی تعداد ۳۶۱ ہے۔ اور آخر میں جاوید نامہ کی ایک نظم خطاب بہ جاوید کا مفہوم شامل ہے۔

### 8) ۱۹۸۵ کا اقبالیاتی ادب[4] ۱۹۸۶

رفیع الدین ہاشمی ۱۹۷۳ سے قارئین کے لیے اقبال پر شائع ہونے والی کتابوں کا سال بہ سال شائع ہونے والی کتابوں کا جائزہ پیش کرتے رہے ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی نے اسکتاب میں 1985 میں شائع ہونے والی اقبالیاتی ادب کا جائزہ لیا ہے۔

---

1 ط: اقبال اکادمی پاکستان

2 ڈاکٹر ظہور احمد مخدومی، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی: حیات اور ادبی خدمات، ص ۷۷

3 ط: اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

4 ط: اقبال اکادمی پاکستان

خواہ اس کا تعلق تحقیقی مقالوں سے ہو کتابوں کے متعلق ہو۔ یہاں تک مختلف پرچوں میں شائع مضامین کا بھی انہوں نے جائزہ لیا ہے۔اس طرح یہ کتاب ایک طرح سے 1985 کے اقبالیاتی ادب کا مختصر ہی سہی احاطہ کرنے کی کوشش ہے۔

رفیع الدین ہاشمی نے اس کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ متن اقبال سوانحی کتابیں تشریحات اقبال، فکری وتنقیدی مباحث متفرق مطبوعات، جامعات کے امتحانی مقالے، مجلات واخبارات کی خصوی اشاعتیں اورآخری میں کتابیات اقبال جس میں 1985 میں شائع ہونے والے اقبالیات پر مضامین اور کتابوں کی فہرست ہے۔

رفیع الدین ہاشمی نے اس کتاب میں ہر کتاب کو اس کا واجبی حق دیا ہے اور اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ معاصرین اور موجودین کے بارے میں اتنی بے باک رائے دینا رفیع الدین ہاشمی کا ہی حوصلہ ہے۔یقینی طور پر یہ مختصر کتاب اقبالیات پر ایک مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۸۶کا اقبالیات ادب ایک جائزہ[1] ۱۹۸۸

یہ بھی سابقہ کی کتاب کی طرح ہے۔

9) اقبال شناسی اور محور [2] ۱۹۸۹

''اقبال شناسی اور محور'' ایسی ہی ایک کتاب ہے جس میں رفیع الدین ہاشمی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے علمی وادبی مجلہ ''محور'' کے شماروں میں اقبالیات پر شائع مضامین کو ایک جگہ شائع کر دیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے اقبال کا گہرا تعلق رہا ہے، یہیں پر اقبال بی اے عربی کے طالب علم رہے اور بطور ریڈر انہوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ''محور'' کی خاص بات یہ تھی کہ ابتدا میں اس میں صرف طلبہ کے مضامین ہی شائع ہوا کرتے تھے مگر بعد میں یہ پابندی ہٹالی گئی۔ ''محور'' نے اگرچہ

---

1 ط۔ اقبال اکادمی پاکستان

2 ط: بزم اقبال لاہور

اقبالیات پر کوئی خاص نمبر نہیں شائع کیا مگر اپنے ابتداء(1959 ) سے لیکر بند ہونے کے سال(1982ء)تک اس مجلہ نے اقبالیات پر گراں قدر تنقیدی و تحقیقی مضامین شائع کئے۔

زیر نظر کتاب میں سات مضامین ہیں لکھنے والوں میں سید عبد اللہ، اسعد گیلانی، رفیع الدین ہاشمی جیسے اہل قلم قابل ذکر ہیں۔ چند مضامین اپنی ندرت اور انداز تحریر کی وجہ سے خاص طور پر قابل توجہ ہیں مثلاً اقبال کے فلسفۂ خودی کا اسلامی پس منظر از شاہدہ ارشد، اقبال اور رجائیت از اختر پرویز، اقبال کے تعلیمی خیالات از سید عبد اللہ۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض مضامین اقبالیات کے دوسرے مجموعوں میں مل جائیں مگر کسی ایک مجلہ میں شائع اقبالیات کے مضامین کو یکجا کرنے کی رفیع الدین ہاشمی کی یہ کوشش لائق ستائش ہے۔

10) اقبال شناسی اور جرنل ریسرچ[1] ۱۹۸۹

یہ کتاب بھی پنجاب یونی ورسٹی کے جرنل آف ریسرچ (فنون) کے ان مضامین کا انتخاب ہے جو اقبالیات پر شائع ہوئے۔

11) اقبالیاتی جائزے[2] ۱۹۹۰

یہ اقبال تنقید کے جائزوں پر مشتمل ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں ان میں مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو انہوں نے ۱۹۷۵سے ۱۹۹۰تک اس موضوع پر لکھے ہیں۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہور احمد مخدومی نے لکھتے ہیں:

> ''ان جائزوں اور تبصروں کے مطالعہ کے بعد ایک عام قاری کو اقبالیات پر مختلف جگہوں اور زبانوں میں لکھی جانے والی کتابوں تک بہت جلد آگاہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس کتاب کے مطالعے سے اقبالیاتی ادب کی تاریخ کا بیک منظر کا مکمل ادراک حاصل ہو گا۔ اور یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہو جائے گی کہ علامہ اقبال پر اب

---

1 ط: بزم اقبال لاہور

2 ط:گلوب پبلی کیشنز، لاہور

تک کتنا کام ہو چکا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس اس کی ترقی و ترویج کے لیے کیا اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔"[1]

12) علامہ اقبال منتخب کتابیات[2] ۱۹۹۲

یہ کتاب بھی اقبالیات پر شائع کتابوں کی فہرست پر مشتمل ہے۔

13) اقبالیات کے تین سال ۱۹۸۷ تا ۱۹۸۹[3] (۱۹۹۳)

ان تین سالوں میں اقبالیات پر شائع کتابوں کا جائزہ ہے۔

14) علامہ اقبال اور میر حجاز[4] ۱۹۹۴

اقبال اور عشق رسول پر لکھا گیا ایک کتابچہ ہے جس کو انہوں نے اورینٹل کالج لاہور کی میگزین کے لیے لکھا تھا۔ بعد میں اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ ایک مختصر کتاب ہے لیکن اپنے موضوع پر اہم ہے۔

15) تحقیق اقبالیات کے مآخذ[5] ۱۹۹۶

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے میں اقبال پر تحقیق کرنے والوں کی رہنمائی کے لیے بنیادی مآخذ کا ذکر ہے۔ اس میں اقبال کی اردو فارسی اور انگریزی سبھی مآخذ کا تفصیلی بیان ہے۔ دوسرے حصے میں علامہ اقبال کی شاعری اور فن شائع

---

1 ظہور احمد مخدومی، رفیع الدین ہاشمی، حیات اور ادبی خدمات ص ۹۱

2 ط: مقتدرہ قومی زبان، پاکستان

3 ط: حرا پبلی کیشنز لاہور

4 ط: بزم اقبال لاہور

5 ط: اقبال اکادمی لاہور

اہم کتابوں کا ذکر ہے جن سے طلبہ اور اسکالر فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ یہ کتاب ان سبھی لوگوں کے لیے مفید ہے جو اقبالیات پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔

### 16) اقبالیات کے سو سال[1] ۲۰۰۲

پاکستان نے ۲۰۰۲ کو سال اقبال کے طور پر منایا اس موقع پر اکادمی ادبیات پاکستان نے اقبالیات کے سو سال کے نام سے ۱۹۰۱ سے ۲۰۰۰ تک شائع ہونے والے اہم مضامین کا انتخاب شائع کرایا۔ اس کے مرتبین میں رفیع الدین ہاشمی کے علاوہ محمد سہیل عمر اور وحید اختر عشرت بھی تھے۔ اس مجموعے کا تعارف کرتے ہوئے مرتین نے لکھا ہے:

> ''زیر نظر انتخاب میں اقبال کے فکر و فن کے اہم تر موضوعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیشتر صدی کے نمایاں اقبال شناسوں اور نقادوں کی تحریریں ہیں۔ چوں کہ یہ مضامین کسی سکیم یا باقاعدہ منصوبے کے تحت نہیں لکھے یا لکھوائے گئے، اس لیے ان میں کہیں کہیں تکرار کا احساس ہو گا، لیکن اس تکرار میں بھی ایک تنوع موجود ہے۔ بسا اوقات مختلف لکھنے والے، ایک ہی نکتے کی تعبیر و توضیح اپنے اپنے زاویۂ نظر کے مطابق اور اپنے اپنے انداز میں کرتے ہیں، (فکری مباحث میں اس کی گنجائش ہوتی ہے، اور جواز بھی) اسی سے تکرار کا جواز نکلتا ہے۔''[2]

اقبالیات کے سو سال' کے نام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں اقبالیات پر گذشتہ ایک صدی میں جو کچھ بھی لکھا جا چکا ہے اس کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہو گا مگر اس کتاب ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ گذشتہ ایک صدی میں اقبال پر جو اچھا کچھ لکھا گیا ہے ایک بہترین انتخاب دے دیا گیا ہے اس طرح جہاں ایک طرف ہمیں اقبال فہمی میں مدد ملے دی وہیں مختلف ادوار میں ناقدین نے اقبال کو کس نظر سے دیکھا اور پرکھا اس کی بھی معرفت ہو جائے گی۔ گویا کہ فکر اقبال کے ساتھ یہ کتاب ناقدین کے فکر کا بھی مطالعہ کرنے کا موقع فراہم کر رہی ہے۔

---

1 ط: اکادمی ادبیات پاکستان

2 مقدمہ اقبالیات کے سو سال

اقبالیات پر مضامین کے مجموعے تو بہت شائع ہوئے مگر اتنے بڑے پیمانے پر اب تک ناقدین اقبال کے مضامین کا انتخاب شائع نہیں ہوا۔ ایک اچھی بات یہ کہ پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک کے مضمون نگاروں کے مضامین کو بھی جگہ دی ہے اس طرح یہ انتخاب ملکی سطح سے اٹھ کر عالمی پیمانے پر ہو گیا۔ اس انتخاب میں موجود تقریباً سبھی مضامین معیاری اور معلوماتی ہیں خصوصاً اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے از ممتاز حسن، توازن اقبال کی شاعری کا ایک پہلو از پروفیسر محمد منور، اقبال کا نظریۂ شعر از احمد ندیم قاسمی، کلام اقبال میں خون جگر کی علامتی حیثیت از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، کلام اقبال پر عربی ادب کے اثرات از پروفیسر محمد منور، فلسفہ اقبال کے ماخذ و مصادر از وحید اشرف۔

یہ انتخاب اس معنی میں اہم ہے کہ اس سے اقبال تنقید کی سو سالہ پیش رفت سامنے آجاتی ہے۔ اس میں اقبال کے رفقا کے مضامین کے ساتھ ہم عصر ناقدین اقبال کے مضامین بھی شامل ہیں۔

17) اقبالیات: تفہیم و تجزیہ ۲۰۰۴

یہ کتاب اقبال پر مصنف کے ذریعہ لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں کئی اہم مضامین شامل ہیں جو اقبالیات کی سمت و رفتار کے بھرپور جائزہ پر مشتمل ہیں۔ اقبال صدی پر شائع ہونے والی سوانح عمریوں کا تنقیدی جائزہ، اور اقبال سے منسوب ایک فرضی کتاب تاریخ ہند کی حقیقت ایسے وقیع مضامین ہیں جو اس کی اہمیت وافادیت کو چار چاند لگاتے ہیں۔

18) علامہ اقبال: شخصیت اور فن ۲۰۰۸

اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ اوپر گزر چکا ہے۔

اس طرح علامہ اقبال کی شخصیت شاعری اور فن پر کل ۲۰ کتابیں رفیع الدین ہاشمی نے لکھی ہیں۔ اگر اس کے اندر سید عبداللہ کے اقبال پر لکھے گئے مضامین کے مجموعے کو شامل کر لیا جائے جس کو رفیع الدین ہاشمی نے مرتب کیا ہے تو یہ تعداد اکیس تک پہنچ جاتی ہے۔ اقبالیات پر اتنی زیادہ اور اہم اور تحقیقی کتابیں لکھنے والے رفیع الدین ہاشمی نے اقبالیات میں اپنے آپ کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں اقبالیات پر کام کرنے والا کوئی بھی شخص ان کو نظر انداز کر کے آگے نہیں جاسکتا۔

رفیع الدین ہاشمی کا مزاج تحقیقی ہے۔ اقبال پر لکھی گئی ان کی کتابیں بھی اسی زمرے میں آتی ہیں۔ انہوں نے اس میں اقبال تنقید کی پیش رفت اور کتابیات اقبال کو خاص طور پر اپنا موضوع بنایا ہے۔ ہم نے چوں کہ اقبال کے محققین کا

موضوع اپنے مقالے میں نہیں رکھا ہے ان کی تحقیقی کتابوں میں چونکہ سب سے مفصل اور جامع کتاب سوانح اقبال ہے اس وجہ سے ان کو ایک سوانح نگار کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

رفیع الدین ہاشمی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اقبالیات کے ان گوشوں کو اپنی تحقیق کے لیے چنا جن کی دشواریوں کو دیکھ کر عام طور پر لوگ کتراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالیات میں انہوں نے جو بھی لکھا ہے وہ موضوع اور مواد کے لحاظ سے اس نوعیت کی ہیں کہ ان سے ہمیشہ اہل علم اپنی علم کی شمع روشن کرتے رہیں گے۔

# عبدالمجید ساجد

عبدالمجید کا شمار اقبالیاتی ادب میں ان کی کتاب 'اقبال۔ حیات عصر' ۱۹۹۴ کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ علامہ اقبال پر ایک مکمل سوانح ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پنجابی زبان میں علامہ اقبال پر ایک کتاب ''اقبال دی حیاتی'' اور اقبال کی چند نظموں کا پنجابی میں منظوم ترجمہ 'دلاں دا چانن' کے نام سے کیا ہے۔ اقبال کی سوانح پر ان کی کتاب کافی معلوماتی ہے۔ اس کی ترتیب میں انہوں نے اقبال پر شائع ہونے والی تقریباً سبھی سوانحی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اگرچہ انہوں نے کتاب کے آخر میں علامہ کے فکر کے حوالے سے بھی مضامین شامل کیا ہے لیکن اس کتاب کی حیثیت بنیادی طور پر علامہ اقبال کے سوانح کی ہے۔

عبدالمجید ساجد کا اسلوب تحقیقی ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ وہ جب بھی کوئی بات کہتے ہیں تو بہت تحقیقی انداز میں کہتے ہیں۔ عبدالمجید ساجد کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ ان سے پہلے اقبال کی سوانح پر کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ذکر اقبال سے لے کر زندہ رود تک اقبال کے سوانحی ذخیرہ پر ان کی نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اقبال کی زندگی کے واقعات کی کڑیاں ملانے میں ان پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو عبدالمجید سالک، سید نذیر نیازی اور جاوید اقبال کو اٹھانی پڑی۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ عبدالمجید ساجد کو بنا بنایا کیک میں مل گیا تھا جسے انہوں نے تھالی میں پروس دیا۔ انہوں نے سبھی موجودہ سوانحی سرمائے کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ گزشتہ سوانح نگاروں سے جہاں کہیں بھی لغزش ہوئی اپنی کتاب میں اس کی تردید کی۔ اس طرح ان کی کتاب سابقہ سوانحی سرمائے کا ایک تنقیدی مطالعہ بھی ہے۔

علامہ کی تاریخ پیدائش پر تقریباً تمام ناقدین نے اتفاق کر لیا ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۱۹۷۷ تسلیم کی جائے۔ لیکن عبدالمجید ساجد اس سے مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء رکھی ہے۔[1] اس سلسلے

---

1 عبدالمجید ساجد، اقبال۔ حیات عصر، ص ۳۴، ادارہ تحقیق ادب، ملتان، ۱۹۹۴

میں وہ میونسپل کمیٹی کے ریکارڈ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں زندہ رود میں جاوید اقبال نے تفصیلی بحث کی ہے۔ اس ثابت کیاہے کہ میونسپل کمیٹی میں جو اندراج ہے وہ اقبال کا نہیں کسی اور کا ہے۔ یہ بحث عبدالمجید ساجد کی نظر سے بھی گزری ہو گی۔ انہوں نے پڑھا بھی ہو گا۔ اس کے باوجود اگر وہ اس سے متفق نہیں ہوئے ہیں تو ہر ایک کو اپنی بات کہنے اور پیش کرنے کا اختیار ہے۔

کتاب میں علامہ اقبال پر وارد الزامات کا مدلل جواب بھی دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال پر ایک طوائف پر قتل کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ بعض ناقدین نے اقبال پر اس تعلق سے کڑی تنقید کی ہے۔ جس میں اقبال کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس حوالے سے تقریباً سبھی شارحین نے اقبال کا دفاع کیا ہے۔ عبدالمجید ساجد نے بھی اس حوالے سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''علامہ اقبال ہر ایک طوائف کے قتل کا الزام بھی ہے۔ نہ اس کا ذکر کسی کتاب میں کیا گیا ہے اور نہ ہی لاہور کے پولیس ریکارڈ میں یہ واقعہ درج ہے اور جب تک کوئی بات لکھائی میں نہیں آتی مستند نہیں ہوتی۔ پھر کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ علامہ اقبال نے قتل کیا ہو گا۔ علامہ اقبال کے خاندان کے لوگوں کے منہ سے بھی ایسی بات سننے میں نہیں آئی۔ جب علامہ اقبال کو ۱۹۲۳ میں سر کا خطاب ملا تو دوست و دشمن کچھ حسد کچھ دشمنی کی وجہ سے پرائے ہو گئے۔ اس وقت علامہ اقبال پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے لیکن یہ الزام اس وقت بھی نہ لگایا گیا۔ پھر ۱۹۲۶ الیکشن پر کھڑے ہوئے ایسے حالات میں اچھے اچھے اشخاص کے کچے چٹھے کھول دیے جاتے ہیں لیکن اس وقت بھی کسی نے آپ پر یہ الزام نہ تھوپا، معلوم نہیں کہاں سے یہ آواز آئی۔ اسے سینہ گزٹ سمجھ لیجئے، یہ فعل سرزد ہوتا تو ایسے مواقع پر لوگ معاف نہیں کرتے۔''[1]

اس تحریر سے عبدالمجید ساجد کے طرز استدلال کا بھی علم ہوتا ہے۔ انہوں نے بجائے اس کے کہ اس کے بارے میں کوئی شہادت پیش کریں کہ فلاں نے کہا ہے کہ اقبال نے ایسا نہیں کیا۔ یہ پیش کیا کہ اگر اس قسم کا معاملہ پیش آیا ہوتا تو الزامات عائد کرنے کے مقامات فلاں فلاں تھے۔ ان موقعوں پر اگر الزام نہیں عائد کیا گیا تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

---

[1] عبدالمجید ساجد، اقبال۔ حیات عصر، ص ۴۹۳۔۴۹۲

ڈاکٹر سلیم احمد کے علامہ کی نجی زندگی پر رکیک حملوں پر علامہ کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر سلیم احمد لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اپنے ذاتی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے شاعری کا استعمال کیا۔ پرائیویٹ نظمیں لکھیں جو ضائع کر دی گئیں۔ اس بات سے سلیم اختر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔ ہر شاعر اپنے مجموعہ کلام میں منتخب اشعار کتابی صورت میں لاتا ہے۔ اور کئی غزلیں اور نظمیں اشاعت کے قابل خیال نہیں کرتا تاکہ معیاری چیزیں پیش کی جاسکیں۔ ضروری تو نہیں کہ قابل اعتراض یا پرائیویٹ کلام کو باہر نکالا جاتا ہے۔ کمزور خیالات اور کمزور بند شیں بھی قابل اشاعت نہ سمجھ کر شاعر انتخاب نہیں کرتا ہے۔۔۔۔ اس کے علاوہ کلام کا وہ حصہ جو عام الناس کی دلچسپی کا موجب نہ ہو یا فائدہ نہ پہنچا سکے تو وہ بھی مصنف قابل اشاعت خیال نہ کرتے ہوئے مجموعہ کلام سے خارج کر دیتا ہے۔''[1]

عبدالمجید ساجد کا اسلوب سیدھا اور آسان ہے۔ مطالعہ وسیع ہے۔ بات کو مدلل کہتے ہیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے یہ کتاب اقبال کے سوانحی سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہے۔

---

[1] عبدالمجید ساجد، اقبال۔ حیات عصر، ص ۵۱۰

# خرم علی شفیق

علامہ اقبال کی یہ خوش بختی ہے کہ ہر زمانہ میں ان کے فکر و فن کے شیدائی اپنی کاوشوں کے ذریعہ ان کے افکار کو عام کرنے کے لیے کتابیں تحریر کرتے رہے ہیں۔ ان کی زندگی ہی سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ علامہ کے فکر و فن پر تو بہت سارے ناقدین اقبال نے خامہ فرسائی کی۔ ایک سے ایک عمدہ کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ لیکن سوانح اقبال کا کام ابھی تک تشنہ ہے۔ علامہ اقبال کے صاحب زادے 'جاوید اقبال' نے اس سلسلے میں کسی حد فرض کفایہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ایسی سوانح کی ضرورت تھی جو اقبال کی زندگی کے تمام گوشوں کو شامل ہو۔ سوانح کے ساتھ اقبال کے فکری و فلسفیانہ اساس کو بھی سوانح سے مربوط کرکے دیکھا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت تفصیل طلب ہے۔ جو کئی جلدوں کی کتاب کا متقاضی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اب بھی اقبال شناسوں کی فہرست میں ایسے لوگ ہیں جو یہ کام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ خرم علی شفیق ایسے ہی ایک اقبال کے عاشق ہیں جنھوں نے اقبال کی ایک مکمل سوانح لکھنے کا کام کیا۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اقبال کی سوانح کو ایک مشن مان کر پورا کیا۔ سوانح اقبال کے علاوہ اقبالیات پر ان کی کتابیں ہیں ''ارتباط حرف و معنی' (بال جبریل کے نظم معنوی پر ایک نظر)، 'انداز محرمانہ' (اقبال کی شاعری ایک نئے تناظر میں) اور 'روشنی کی تلاش'۔ وہ 'اقبال' کے مقدمہ میں کہتے ہیں:

> ''میں نے سوانح نگاری کے اس بینادی اصول سے انحراف کیا ہے جو بیسویں صدی کے شروع میں رائج ہوا تھا اور جسے عام طور پر دنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ یعنی 'سوانح نگار کا پہلا فرض یہ ہے کہ اس کا دلکش اختصار ہر اس بات سے گریز کرے جو توجہ کے لائق نہیں ہے۔ اور ہر ایسی بات کو شامل کرے جو توجہ کے لائق ہے۔ میں نے اس کے برعکس مسلمان سوانح نگاروں کا راستہ اپنایا ہے جن کا خیال تھا کہ جب وہ کسی کی سوانح لکھتے ہیں تو اس کی ہر بات توجہ کے قابل ہوتی ہے خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی۔ سوانح نگار کسی صحافی کی مانند ہوتا ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ

پوری معلومات دیانت داری اور سلیقے کے ساتھ پیش کر دے۔ یہ فیصلہ کرنا قاری کا حق ہے کہ اس میں سے کون سی بات لائق توجہ ہے اور کون سی نہیں''[1]

خرم علی شفیق کا کہنا ہے کہ 'اقبال اور اقبالیات کے بارے میں معلوم ہر بات جو آج تک تحریر میں آئی ہے اسے اس کتاب میں شامل کیا جائے گا۔' اس سے ظاہر سی بات ہے کہ کتاب کافی ضخیم ہو جائے گی۔ اسی لیے یہ کتاب کل چھ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ مصنف نے کتاب میں مسلمانوں کے طریقۂ کار کا حوالہ دیا ہے کہ ان کے طریقہ کے مطابق اس کتاب کو لکھا جائے گا۔ مسلمانوں اور عربوں کا طریقہ کار معلومات اکٹھا کرنے میں یکساں نہیں تھا۔ ان کی کتابوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم ان کتابوں کی ہے جو مراجع کے لیے لکھی گئیں ہیں۔ ایسی کتابوں میں ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر قسم کی معلومات جو کتاب لکھی جانے تک مصنف کے علم میں ہو ان کو حوالوں کے ساتھ جمع کر دیا جائے۔ چنانچہ حدیث کی کتابوں میں ضعیف اور موضوع روایات کو بھی اسی وجہ سے درج کر دیا گیا تاکہ بعد میں آنے والے ان پر تحقیق کر سکیں۔ البتہ وہ کتابیں جو عام قاری کے استفادے کے لیے لکھی جاتی تھیں ان میں اخذ ورد کا اصول وہ بھی اپناتے تھے۔ سیرت نبوی پر لکھی جانے والی بیشتر کتابیں اسی زمرہ میں آتی ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ کوئی بھی مصنف اخذ ورد کے اصول سے بے نیاز ہو کر کتاب نہیں لکھ سکتا۔ جہاں تک صحافی کی بات ہے تو صحافی سے زیادہ اختصار نویس کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ہے۔ خبریں اس کے اردو گرد بکھری رہتی ہیں لیکن ان میں سے کسی ایسی بات کو وہ خبر بناتا ہے جو اہم ہو۔ ٹرین کا اسٹیشن سے اپنے ٹائم پر چھوٹ جانا بھی ایک خبر ہے لیکن کوئی صحافی کبھی ایسی خبر نہیں بناتا کہ آج فلاں ٹرین ٹائم پر اسٹیشن سے روانہ ہو گئی۔

خرم علی شفیق کی اقبال کی سوانح کی اب تک تین جلدیں آچکی ہیں۔ پہلی جلد ابتدائی دور ۱۹۰۴ تک، دوسری جلد تشکیلی دور کے نام سے ۱۹۰۵ سے ۱۹۱۳ تک اور تیسری جلد وسطی دور کے نام سے ۱۹۱۴ سے ۱۹۲۲ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ باقی کی جلدیں جو ان کے منصوبہ میں شامل ہیں وہ اس طرح ہیں:

دور عروج ۱۹۲۳ سے ۱۹۳۰ تک

---

1 اقبال ابتدائی دور از خرم علی شفیق ص :مقدمہ ، ناشر : اقبال اکادمی پاکستان، اشاعت اول : 2008

اختتامی دور ۱۹۳۱ سے ۱۹۳۸ تک

اقبالیات ۱۹۳۸ کے بعد

اگر یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو اپنے آپ میں ایک ایسا کام ہو گا جو اقبال پر بعد میں کام کرنے والوں کے لیے بھی مرجع کی حیثیت رکھے گا۔

خرم علی شفق نے اس سلسلے میں معلومات جمع کرنے تک اکتفا کیا ہے۔ چونکہ انہوں نے پہلے ہی اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ مسلمانوں کی قدیم روایت کو سامنے رکھتے ہوئے تمام معلومات کو ایک جگہ جمع کر دیں گے۔ اس وجہ سے رطب ویابس کی چھانٹ پھٹک کی ذمہ داری انہوں نے دوسروں کے ذمہ رکھ دی ہے۔ اقبال کی سوانح پر اس قسم کی کتاب کی ضرورت تھی۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ اقبالیات پر کام کرنے والوں کو مواد ایک ہی جگہ مختلف حوالوں سے دستیاب ہو جائے۔ بعد میں محققین ان حوالوں کی روشنی میں مواد کی صداقت کی جانچ پرکھ کر لیں گے۔

لیکن اس کے ساتھ ایک بات اور بھی ہو سکتی تھی کہ حاشیہ وہ میں کم از کم اس بات کی وضاحت کر دیتے کہ اقبال کے تعلق سے مذکورہ روایت صداقت کے اصولوں پر پوری اترتی ہے یا نہیں۔ اس لیے کہ قارئین کی اکثریت اقبالیات کے ماہرین کی نہیں ہے۔ وہ کتاب کی سبھی باتوں کو بغیر تحقیق کے سچ مان لیں گے۔

خرم علی شفیق کو غیر جانب داری کا دعویٰ بھی نہیں ہے ان کا ماننا ہے کہ اگر وہ 'غیر جانبدار' ہوتے تو اقبال کے علاوہ کسی اور کی سوانح لکھتے۔ ان کی اس بات میں صداقت ہے کہ آدمی اس کے بارے میں زیادہ لکھتا ہے جس کو وہ بہت زیادہ محبت یا نفرت کرتا ہے۔ وہ اقبال کے لیے اپنے دل میں ایسا جذبہ پاتے ہیں جو کسی اور ادبی شخصیت کے اندر نہیں پاتے ہیں۔

پہلی جلد کے موضوعات کچھ اس طرح ہیں:

باب ۱: زمین و آسمان

باب ۲: ماں کی آغوش وسعت

باب ۳: خاندان مرتضی کی بارگاہ

باب۴: گجرات کا قید خانہ

باب۵: حکیموں کا بازار

باب۶: مشرقی کالج

باب۷: ہمالہ

باب۸: سورج کے سامنے

باب۹: امیر کا صنم خانہ

اور آخر میں حاشیہ اور منتخب کتابیات ہے۔

اس طویل فہرست سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے اقبال کی زندگی سے متعلق ہر قسم کی معلومات کو اس کتاب میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ طوالت سے بچنے کے لئے انہوں نے ہر نئی بات کو ایک نئے نمبر کے ساتھ شروع کیا ہے۔ مختصر طور پر معلومات درج کرکے اس کا حوالہ دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ خرم علی شفیق کا طویل مباحث کو کم سے کم جگہ میں سمیٹنے کا یہ طریقہ بہت کار آمد ہے۔

نمبر تین کے تحت علامہ اقبال کے جد امجد بابالول حج کے اسلام قبول کرنے کے واقعہ کو انہیں نے اس طرح بیان کیا ہے۔

''پندرہویں صدی میں ایک سپرو نے اسلام قبول کیا۔

برہمن رشتہ دار ان کے دشمن ہوگئے مگر یہ منحرف نہ ہوئے۔ بیوی سے تعلقات اچھے نہ تھے جو آنکھوں کے بھینگے پن اور تیڑھے پیروں پر ہنستی تھی۔ ایک روز یہ پہاڑوں سے نیچے اتر گئے اور بارہ سال تک واپس نہ آئے کئی بار حج کیا۔ کئی ملک دیکھے۔ واپس آئے تو لوگ اصل نام بھول کر انہیں بابالول حج کہنے لگے۔ یہ ایک صوفی کے مرید ہوئے۔ اور بقیہ عمر

مرشد کے پاس ہی گزاری۔ مرتے ہوئے ہدایت کی کہ قبر کے سرہانے ان کا عصا گاڑ دیا جائے۔ وہ عصا ایک سرسبز درخت بن گیا۔"

اس کے بعد نمبر چار لکھ کر لکھتے ہیں ''اٹھارہویں صدی کا آغاز ہوا''۔ اس کے بعد اقبال کے خاندان سے متعلق ضروری معلومات فراہم کیا ہے کہ:

'بابالول حج کی نسل سے شیخ محمد اکبر ایک صوفی کے مرید تھے۔ مرشد کے انتقال کے بعد کچھ عرصے مریدوں کی ذمہ داری بھی اٹھائی۔ مرشد کے خاندان ہی میں ان کی شادی ہوگئی۔'

خرم علی شفیق نے کئی جگہوں پر خود سے سوال قائم کر کے خود سے جواب دیا ہے۔ پہلے باب میں گیارہ نمبر پر وہ اقبال کے والد کے بارے میں یہ سوال کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بیٹے اقبال کو سب سے پہلے میر حسن کی درسگاہ میں کیوں نہیں داخل کیا۔ اس کے بعد وہ خود سے اس کا جواب دیتے ہیں۔

> 'اس کا جواب یہی سمجھ میں آرہا ہے کہ نور محمد صوفی تھے۔ جس بیٹے کو اسلام کی یا دوسرے الفاظ میں تصوف کی خدمت کرنی تھی اسے ایک ایسے شخص کے حوالے نہیں کر سکتے تھے جو سرسید جیسے مشہور وہابی اور نیچری کی تقلید کرتا ہو۔"

ہر انسان کی اپنی پسند ہوتی ہے اور اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ بھی۔ نور محمد اگرچہ صوفی تھے لیکن ان کے تعلقات میر حسن سے اچھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میر حسن نے جیسے اقبال کو اپنی درسگاہ میں لینا چاہا نور محمد نے منع نہیں کیا۔ اس کی پوری تفصیل نیازی، سالک، اور جاوید اقبال نے فراہم کی ہے۔ اس کے مطابق میر حسن دینیات، عربی اور فارسی اور کے ادب اور عصری علوم کی بھی تدریس ہوتی تھی لیکن نور محمد اقبال کو خالص دینی تعلیم دلانا چاہتا تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے اقبال کو میر حسن کی درسگاہ میں ڈالا۔ سرسید کو کو نیچری بھی مان لیں، وہابی بھی تسلیم کر لیں لیکن میر حسن کو سرسید کا مقلد کہنا میر حسن ہی کی توہین نہیں بلکہ اقبال کے ایسے استاد کی توہین ہے جس نے اقبال کو اقبال بنایا۔ جس کو اقبال زندگی کے آخری لمحہ تک فراموش نہیں کر سکے۔

تحقیق کی زبان بہت واضح ہونی چاہئے اس کے اندر قطعیت ہونی چاہئے۔ لہٰذا ایسی لفظیات سے پرہیز کرنا چاہئے جس سے شک کی بو آتی ہو۔ مثال کے طور پر خرم علی شفق کی یہ تحریر:

''جس روز اقبال نے قاعدے میں پہلے الف پر انگلی رکھی ہو گی ان کی زندگی میں وہ دن اتنا ہی اہم رہا ہو گا جتنا کائنات کی تاریخ میں وہ دن جب سورج وجود میں آیا تھا یا وہ دن جب ایک زبردست بھونچال کے ساتھ زمین کے سپاٹ سینے پر ہمالیہ پہاڑ نمودار ہوا تھا۔ عقل کے ساتھ وہ مضبوط تعلق جسے اقبال کبھی توڑ نہ سکے۔ علم کی شراب کا وہ نشہ جو ان کے سر سے اتر نہیں سکا اور کتابوں کے اوراق سے وہ محبت جس نے بالآخر انہیں دنیا کے کسی کام کے لائق نہ رکھا، سب اسی پہلے الف کے ساتھ شروع ہوئے جو اقبال نے اس وقت سیکھا جب ان کی عمر شاید چار سال چار ماہ رہی ہو گی۔''[1]

اس عبارت میں قطعیت کا فقدان ہے جو کسی بھی تحقیقی کتاب کی پہچان ہوتی ہے۔ یہ افسانوی نثر ہے جو حیات اقبال کی کڑیوں کو جوڑنے کے لیے انہوں نے تخیل کی بنیاد پر پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

''یہ تو معلوم نہیں کہ اس ابتدائی دور میں غزل کہتے ہوئے اقبال کس کیفیت سے گزرے تھے مگر اولین غزل جو دستیاب ہے اسے دیکھتے ہوئے کچھ اندازے لگائے جاسکتے ہیں۔''

پھر انہوں اندازے کی بنیاد پر اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

'غزل کہنے سے پہلے قوافی اکٹھے کیے گئے ہوں گے۔ لیکر، کوثر، بستر، مرمر، محشر، سکندر۔ پھر جو تصورات ذہن میں آئے وہ اکثر داغ سے متاثر تھے وہیں خیال کی بلندی کے لیے غالب کے سحر میں گرفتار بھی تھے چنانچہ موت، قبر اور قیامت کے تصورات جنہیں غالب نے بڑے دلچسپ انداز میں استعمال کیا تھا وہ بھی پسندیدہ موضوعات ٹھہرے۔ غالب کے نزدیک عشق میں لطف جب تھا کہ محبوب کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوئے کوئی ایسی بات کہہ دی جائے کہ محبوب کو عاشق سے چھٹکارا پانے کے بعد بھی سکون نصیب نہ ہو۔ ان کی آوارگی موت پر ختم نہیں ہو جاتی تھی بلکہ قبر، قیامت اور جنت میں بھی جاری رہتی تھی۔ موت محض ایک ادا اور محبوب کا دل جیتنے کی کوشش کا نام تھا۔ قیامت گناہ ور ثواب کے فیصلے سے زیادہ محبوب سے سرعام ملاقات کا بہانہ تھی جس میں نہ صرف خدا بلکہ تمام

---

1 اقبال ابتدائی دور۔ خرم علی شفیق، ص ۴۱۔ ۴۲

مخلوق یہ تماشا دیکھنے کے لیے موجود ہوتی۔ داغ سنجیدہ شاعر نہ تھے اور حسن کے سارے جلوے آج ہی سمیٹ لینے کے قائل تھے۔۔۔۔'

یہاں بھی خرم علی شفیق نے اپنے تخیل کا سہارا لے کر شاعری کی ابتدائی کوششوں کو بیان کیا ہے۔ داغ اور غالب کا موازنہ ایک اچھی کوشش ہے مگر یہ کہنا کہ داغ سنجیدہ شاعر نہیں تھے داغ کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ ان کی شاعری میں بھی فکر کی گہرائی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ غالب کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکے۔

مجموعی طور پر خرم علی شفیق ایک اچھے سوانح نگار ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنی ساری توجہ اقبال کے سوانحی سرمایہ پر ہی توجہ دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا اس لیے کہ خرم علی شفیق نے ان ہی جگہوں پر ٹھوکر کھائی ہے جہاں انہوں نے سوانحی سرمائے پر تنقید کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں معلومات اکٹھا کرنے کی صلاحیت ہے لیکن وہ ان معلومات سے کسی نتیجہ تک پہنچنے میں ناکام رہتے ہیں۔

# باب دوم

# اقبال کی فکر و فلسفہ کے نقاد

# عبدالرحمٰن طارق

اقبال شناسوں نے عام طور پر اقبال کی شاعری سے زیادہ ان کی فکر پر توجہ دی ہے، عبدالرحمن طارق بھی ان ہی لوگوں میں ایک ہیں۔ انہوں نے اقبالیاتی ادب میں پیام اقبال، معارف اقبال، روح اقبال، رموز فطرت، ملفوظات اقبال[1]، جہان اقبال[2] اور جوہر اقبال[3] لکھ کر ہمیشہ کے لیے ماہر اقبال کی حیثیت سے اپنی جگہ بنالی ہے۔ عبدالرحمن اقبال کے اولین ناقدین میں ہیں۔ ان کی تنقید کی خاص بات ان کا وہ منفرد لہجہ ہے جس کو تنقید کے بجائے تخلیقی ادب کا نمائندہ مانا جاتا ہے جس میں انہوں نے اقبال سے زیادہ خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ عبدالرحمن طارق اقبال کی فکر میں حرکت و عمل اور فلسفۂ سخت کوشی کو نمایاں جگہ دیتے ہیں۔ اقبال کا فلسفۂ حرکت و عمل انہیں سبھی جگہوں پر نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب پیام اقبال کے شروع میں 'حمد وثناء' اور کتاب کے آخر میں 'وقت کا فیصلہ' شامل کیا ہے۔ ان دونوں بظاہر کتاب سے غیر متعلق مضامین کے حوالہ سے انہوں کے اقبال کے فلسفۂ حرکت و عمل کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ 'حمد وثنا' بھی اقبال کے شکوہ کی طرح دلیری کا نمونہ ہے۔ وہ خود اس حوالے سے کہتے ہیں:

> 'یہ حمد وثنا ایک ایسے انوکھے انداز میں لکھی گئی ہے کہ ناظرین اسے دیکھ کر شاید متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے لیکن آپ حضرات کو یاد رہے کہ اس میں تعجب کے ساتھ صداقت اور واقعیت کا رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا، بنی آدم کی غیر متناہی قوتوں کا ذکر ہے۔ اس میں مبالغہ کو ذرہ برابر دخل نہیں، اکثر جگہ بیان گو شکایت آمیز ہے

---

1 یہ سبھی کتابیں ملک دین محمد اینڈ سنس، اشاعت منزل، لاہور سے شائع ہوئی ہیں۔

2 مطبوعہ: ملک دین محمد اینڈ سنس، اشاعت منزل، لاہور، (سال اشاعت ۱۹۴۷ء)

3 ناشر اشاعت منزل، لاہور، (سال اشاعت: ۱۹۵۳ء)

لیکن اس شکایت میں بھی انس والفت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جرأت اور حوصلہ افزائی کی روسے بھی تلقین و تادیب کا اس سے بہتر پیرایہ ناممکن تھا۔'[1]

اس سے بہتر پیرایہ ممکن تھا یا نہیں اس بحث میں پڑے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کتاب میں اس کو شامل کرنے کی کوئی مناسب وجہ نہیں ہے۔ اس حمد و ثنا میں کس قسم کی مناجات ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

''اے خدا! رحم بے شک ایک اچھی شے ہو گا لیکن میں تو تیرے قہر کو اس سے بھی کہیں زیادہ مفید پاتا ہوں!''[2]

''میرے حال پر مہربانی فرما، اور ان بھیڑ کے بچوں سے مجھے محفوظ رکھ، گیدڑوں کو مجھ سے دور لے جا، جو چیز میرے دل کو زندہ اور بیدار رکھتی ہے وہ بپھرے شیروں کی لرزا دینے والی گرج ہے اس لیے میرے کھیل کود کے لیے تو فقط شیروں کی ٹولیاں فراہم کر!''[3]

اس سے غالباً انہوں نے یہ پیغام دینا چاہا ہے کہ اقبال کے کلام میں اسی فلسفۂ سخت کوشی کی تعلیم دی گئی ہے۔ انہوں نے کتاب کے آخر میں 'وقت کا آخری فیصلہ' کے عنوان سے بھی ایک مضمون لکھا ہے جس میں ڈرامائی انداز میں وقت کو حاکم کی کرسی پر دکھایا گیا ہے جس کے سامنے قوموں کے اعمال پیش کیے جارہے ہیں۔ اس سے بھی انہوں نے اقبال کے فلسفۂ عمل کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

عبدالرحمن طارق اقبال کے فلسفۂ حرکت و عمل پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ انہیں ہجر و صال، معراج روح اور اسلامی اخوت میں بھی یہی فلسفہ نظر آتا ہے۔ وہ اسلامی اخوت کے تحت لکھتے ہیں:

''اخوت اسلام کا ایک وصف امتیازی ہے اور اس سے افکار و اعمال کی وحدت اور قوی تقویت مقصود ہے۔''[4]

---

1 پیام اقبال، عبدالرحمن طارق، ص ۱۴، ط۔ چمن بکڈپو، اردو بازار، دہلی، (۱۹۳۸)

2 پیام اقبال ص ۱۴

3 پیام اقبال ص ۱۵

4 پیام اقبال، ص ۲۲۶

اقبال کی بدنصیبی یہ رہی کہ انہیں شاعر کے بجائے پیغمبر مان لیا گیا۔ اقبال کی عقیدت میں ڈوب کر لکھی گئی اکثر تحریریں اسی وجہ سے انتقادی معیار سے عاری ہیں کہ کسی 'پیغمبر' کے کام کے ساتھ انصاف ممکن نہیں۔ عبدالرحمن طارق بھی ان ہی ناقدوں میں ایک ہیں۔ بلکہ انہیں ان ناقدوں سے شکایہے جنہوں نے اقبال کو پیغا . رمبر کی حیثیت سے نہیں دیکھا:

''یہ قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ لوگ اقبال کی مصلحانہ اور پیغمبرانہ شان سے اب تک بے خبر ہیں، بلکہ وہ اس تعلیم کے عملی اور اخلاقی مقاصد کا تجزیہ بھی نہیں کر سکے گا۔''[1]

اس وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ 'جہاں عقیدت کا یہ رخ ہو وہاں تفہیم پورے طور پر نہیں ہو سکتی' [2] ان کی پوری کوشش رہی ہے کہ اقبال کے فکر کو قرآن اور حدیث سے مستنبط ثابت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عموماً اقبال کے کلام کی تعبیر و تفہیم میں قرآنی آیات اور احادیث کا سہارا لیتے ہیں۔ وطنیت، مساوات اور حقیقت موت و حیات میں انہوں نے خاص طور پر قرآنی آیات کو جابجا پیش کیا ہے۔ وہ اقبال کے فلسفۂ موت پر کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال زندگی کی ابدیت کے قائل ہیں، دنیاوی موت فنا کا نام نہیں بلکہ اخروی زندگی کی ایک کڑی ہے۔ انسانی عظمت زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔

اقبال کے فلسفۂ خودی پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ اس فلسفہ کے بارے میں انہوں نے بھی تفصیلی گفتگو کی ہے لیکن ایک اہم بات جو انہوں نے پیش کی ہے وہ ان چیزوں کا بیان ہے جو خودی کو کمزور کرنے والے ہیں۔ اس کے اندر انہوں نے خوف کو خودی کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے دشمنان خودی میں انہوں نے نسب پرستی، دست سوال دراز کرنا یعنی گداگری، دوسروں کی نقالی، تقلید، دنیا سے حد سے زیادہ محبت اور غلامی کو شمار کرایا ہے۔ یہ نکات واقعی لائق قدر ہیں۔ عبدالرحمن طارق نے ان چیزوں کو شمار کرنے کے ساتھ کلام اقبال سے ان کے حوالے بھی پیش کیے ہیں جو ایک عمدہ چیز ہے۔

---

1 پیام اقبال ص ۲۳

2 ہم اقبال، ڈاکٹر غلام قدوس، ص ۱۲۳

عبد الرحمن طارق کی تنقید پر اگرچہ بہت سی جگہوں پر اقبال سے بے حد عقیدت کی وجہ سے اکہرے پن کا احساس ہوتا ہے لیکن اقبالیاتی تنقید میں ان کی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ انہوں نے اس وقت اقبالیات پر قلم اٹھایا ہے جب اقبال پر مولوی احمد دین کے علاوہ کسی نے مکمل کتاب نہیں لکھی تھی۔ اس وجہ سے ان کو اقبالیات کے بانیوں میں شمار کیا جانا چاہیئے۔ اقبال کی عظمت جن بنیادوں پر قائم ہے اس کو قائم کرنے میں عبد الرحمان طارق کا بہت بڑا رول ہے۔

# یوسف حسین خاں

اقبالیاتی ادب کے ڈھیر میں سے اگر چند ایسی کتابوں کا انتخاب کرنا ہو جو لائق اعتبار ہوں تو ان میں سے ایک کتاب یقینی طور پر پروفیسر یوسف حسین خاں کی 'روح اقبال' ہو گی۔ روح اقبال کو ناقدین اقبال نے ہمیشہ ایک اہم مرجع کے طور لیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور، خلیفہ عبدالحکیم اور دوسرے ناقدین اقبال نے روح اقبال کو سراہا ہے اور اسے اعتبار بخشا ہے۔

آپ ایک ایسے علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس نے علم وادب کی کے میدان میں نمایاں کام کیا۔ یوسف حسین اردو، انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان وادب کے ماہر تھے۔ انہوں نے ان صلاحیتوں کو اردو کی تعمیر وترقی کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کی پیدائش ۱۸/ ستمبر ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد دکن میں ہوئی، تعلیم اٹاوہ اور علی گڑھ میں حاصل کی ۱۹۲۹ء میں انہوں نے سوربوں یونیورسٹی، پیرس سے 'ازمنۂ وسطی کے ہندوستان میں ہندو مسلم تصوف' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کیا۔ آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۵ء وائس چانسلر رہے۔ روح اقبال (۱۹۴۲ء) کے بعد اقبالیات پر ان کی کتاب 'حافظ اور اقبال' (۱۹۶۷ء) آئی۔ ۱۹۷۷ء میں جشن اقبال کے موقع پر آپ نے غالب انسٹی ٹیوٹ میں 'غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات' کے عنوان سے ایک وقیع خطبہ دیا تھا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ آپ کا انتقال ۲۱/ فروری، ۱۹۷۹ء میں ہوا۔

یوسف حسین خاں کو ماہر اقبالیات کی حیثیت سے شہرت دلانے میں انکی کتاب "روح اقبال" کا بہت بڑا کردار ہے جو پہلی بار ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔[1] روح اقبال کی خاص بات یہ ہے کہ یہ اقبال پر مستقل کتاب ہے۔[1] 'روح اقبال' اقبال کی

---

1 ڈاکٹر شفیق عجمی کے مطابق یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۳ء کے بعد ۱۹۴۴ء، ۱۹۵۲ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۲ء میں بھی شائع ہوئی، پاکستان میں یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ سلسلہ آج میں ہندوپاک میں جاری ہے۔ اقبال شناسی عالمی تناظر میں ص ۱۲۳، ط پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، سن اشاعت: ۲۰۱۱۔

وفات کے محض چار سال کے بعد شائع ہوئی اس طرح اس کتاب کو اقبالیات کی ان چند کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے جو اس فن پر سب سے پہلی لکھی گئیں۔

یوسف حسین خاں تاثراتی تنقید کے قائل ہیں۔ وہ تنقید کو ادب عالیہ میں شمار کرتے ہیں ان کا ماننا ہے کہ تنقید میں اگر تخلیق نہ ہو تو وہ خلوص سے عاری ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب تک نقد و نظر کرنے والا اپنی فکر کو شعر کی طرح تخلیق نہ بنالے وہ اپنے فرض سے عہدہ بر آ نہیں ہو سکتا، ضرور ہے کہ اس پر بھی کم و بیش اسی قسم کی قلبی واردات گذر چکی ہو جس سے شاعر کو شعر کہتے وقت گزرنا پڑا تھا۔۔ تنقید تخلیق ہونی چاہئے اس واسطے اس کا مقصود و منتہا ان کیفیات کی باز آفرینی ہے جو شاعر پر گزری تھیں۔ تجزئے میں جب تک تخلیقی عنصر شامل نہ ہو نقد و نظر کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔''[2]

یقینا یہ ایک مشکل امر ہے، اس سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے یوسف حسین خاں جیسا شخص چاہئے، لیکن اس کے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی در پیش ہو گا ان کیفیات کے ساتھ تنقید لکھنے والا شخصیت اور فن کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا کیوں کہ اس میں ایک خاص قسم کی شخصیت پرستی پیدا ہو جائے گی اور شخصیت پرستی تحقیق و تنقید کی سب سے بڑی قاتل ہے۔

یوسف حسین خاں نے کتاب کو تین اہم حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا 'اقبال اور فن' دوسرا 'اقبال کا فلسفۂ تمدن' اور تیسرا حصہ 'اقبال کا فلسفۂ مذہب' ہے۔ یوسف حسین خاں نے اقبال کے فکر و فن کے سبھی اہم مباحث کو ان تینوں ابواب میں خوبصورتی سے سمو دیا ہے۔ گویا کہ ان کی یہ کتاب روح اقبال تک پہنچنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔[3]

---

1 اقبالیاتی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ مضامین کے مجموعوں پر مشتمل ہے۔ کچھ مجموعے کسی ایک مؤلف کے ہوتے ہیں تو کئی ایک مجموعے متفرق قلم کاروں کی محنت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں کتاب میں وحدت مفقود ہوتی ہے۔ یوسف حسین خاں کی 'روح اقبال' اقبال کے فکر و فن پر ایک مستقل کتاب ہے۔

2 روح اقبال، یوسف حسین خان، ص ۱۵-۱۶، ط مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۵۷ء

3 ڈاکٹر شفیق عجمی کے مطابق اس کا پہلا حصہ آرٹ سے متعلق رسالہ اردو انجمن ترقی اردو کے اقبال نمبر (۱۹۳۸ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ روح اقبال کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مصنف کی طرف سے برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔

یوسف حسین خاں، اقبال کے شاعرانہ اور مفکرانہ دونوں حیثیتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کی ابتدا 'اقبال اور فن' سے کی اور اقبال کے فنی کمالات کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ:

''اقبال کی شاعری میں جذبہ، وجدان کی چھلنی میں چھن کر نغمے کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس نے صاف صاف بتایا ہے کہ اس کی شاعری کا مقصد انسانی فلاح وترقی ہے۔ وہ انسان کو اس کے بلند مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس کی شاعری جزو پیغمبری ہے۔''[1]

دراصل اقبال کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کو فلسفہ سے الگ نہیں کرسکتے۔ وہ ایک مربوط فلسفہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے اسی فلسفہ کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا۔ یہ اقبال کا کمال ہے کہ اس کے ساتھ ہی وہ فن کے اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں دوسرے انہیں رشک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ اقبال پہلے شاعر ہیں پھر فلسفی۔

اقبال کے کلام میں حرکت و عمل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یوسف حسین خان، اقبال کے تصور حسن میں حرکت و عمل کے عناصر دیکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

'' اقبال کا تصور حسن بھی سکوتی نہیں بلکہ اس میں حرکت اور قوت کی آمیزش موجود ہے۔ جو شعر وادب میں ایک نیا نقطۂ نظر ہے۔ اس کو اس کا احساس ہے کہ بغیر جلوۂ حسن، وہ شعری تخلیق نہیں کر سکتا۔ اگر حسن نہ ہو تو شاعر اس ساز کے مثل ہے جس کے سب تار ٹوٹ گئے ہوں۔ حسن کے تصور میں بھی اقبال کے پیش نظر اجتماعی مقاصد پسندی ہے فلاح وخیر پر محیط ہے۔''[2]

وہ مزید لکھتے ہیں:

---

1 روح اقبال ص ۳۱،

2 روح اقبال ص ۳۲

''اقبال اپنے فن میں کمال اور تناسب کا اتنا خواہاں نہیں جتنا کہ زندگی کی حرکت اور شورش کا کی اسی لیے ے . یہاں پیکر متحرک اور بے سکون ہوتے ہیں۔''[1]

یہ سچ ہے کہ اقبال نے شاعری کو اپنے افکار کے ابلاغ کا وسیلہ بنایا ہے۔ لیکن اقبال کا کمال فن یہ ہے کہ پڑھنے والا اس کی نغمگی میں کھو جاتا ہے۔ وہ خشک طریقے پر وعظ نہیں کرتے۔ وہ اخلاقی موضوعات کو اتنی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا پہلے اس کے نغمے سے محظوظ ہوتا ہے پھر اس کے مضمون پر توجہ کرتا ہے۔

یوسف حسین خاں اقبال کے نظریۂ فن کو ان کی خودی کے تابع قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے یہاں فن، انفرادیت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں عشق کی دعوت دی ہے۔ مختلف ناقدین اقبال نے اقبال کے تصور عشق کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے اقبال کے تصور خودی کی طرح اقبال کا تصور عشق بھی عام شاعروں سے مختلف ہے۔ اقبال نے عشق کو بہت وسیع معنی میں استعمال کیا ہے۔:

''عشق سے اقبال کی مراد وہ جوش وجدان ہے جو ایک قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ اس کی بدولت انسان تکمیل ذات کے لیے جذب و تسخیر پر عمل پیرا ہوتا اور ہر قسم کے موانع پر قابو پاتا ہے۔''

عشق کے مقابلے میں اقبال نے عقل کا استعمال کیا ہے۔ اقبال کی شاعری پڑھنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عقل کے مخالف ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ عقل کی اہمیت وافادیت کے قائل ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو اپنی حد میں رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبال کو عقل سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اس کے اندر جرأت رندانہ کی کمی ہے۔ اقبال جیسا شاعر جس کا فکر وفلسفہ ہی حرکت و عمل ہو عقل کی بالادستی کو کیسے تسلیم کرسکتا ہے۔ یوسف حسین خاں نے ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ: ''اقبال عقل اور عشق دونوں کو ایک دوسرے کا حریف نہیں بلکہ ایک دوسرے کا ہمدم و ہمنوا دیکھنا چاہتا تھا۔''[2]

---

1 روح اقبال ص ۳۵

2 ایضاً ص ۵۶

یوسف حسین خاں اقبال کی شاعری میں رومانیت اور علامتی رمزیت کے عناصر کو خاص طور پر اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اقبال کی شاعری کا کمال اسی رمزیت کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کی رمزیت مغربی رمزیت سے اس معنی میں مختلف ہے کہ اقبال نے اپنا رشتہ قدیم ادبی روایات سے باقی رکھا۔ یوسف حسین خاں نے 'اقبال اور شاعرانہ مسلک' میں اقبال کی شاعری میں رمزیت اور رومانیت کے عناصر کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مختلف نظموں کے حوالے سے انہوں نے اقبال کی رمزیت کو مغرب سے بر آمد شدہ رمزیت سے الگ قرار دیا۔

یوسف حسین خاں رومانیت کو عقلیت کے خلاف ایک تحریک بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اقبال کا مقصد بھی یہی تھا اس وجہ سے وہ اس سے متاثر ہوئے۔ ان کی شاعری میں اسلام کے ماضی کا بیان اور جذباتیت کی کارفرمائی اسی رومانیت کی وجہ سے ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اقبال کے یہاں ماضی کی قدردانی کے ساتھ زندگی کے امکانات پر یقین بھی ملتا ہے۔ اسی طرح جذباتیت اگرچہ ان کی شاعری میں ہے لیکن انہیں جذبات کو قابو میں رکھنے کا ہنر بخوبی آتا ہے۔

آل احمد سرور کی طرح یوسف حسین خاں بھی اپنی تنقید میں اقبال کے اشعار کا ترجمہ اس طرح سمو دیتے ہیں کہ ان کے کلام میں رنگینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح تنقید، تنقید نہ رہ کر تشریح کے دائرے میں پہنچ جاتی ہے۔ اس کی بنیاد پر یوسف حسین خاں کی بعض تحریروں پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ یہ تنقید کی زبان نہیں ہے۔

یوسف حسین خاں، 'مسجد قرطبہ' کو جدید اردو ادب کا شاہکار مانتے ہیں۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر فن فلسفہ اور تاریخ کو اقبال نے بہت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ اقبال اس نظم میں تاریخ کے تفصیلی مباحث میں نہ جاتے ہوئے اصل حقیقت تغیر اور انقلاب کی طرف آتے ہیں۔ اقبال کا ماننا ہے کہ اس دنیا میں تغیر اور انقلاب کی زد سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ صرف عشق ہی کو وہ ایک ایسا عنصر مانتے ہیں جس کو فنا نہیں ہے۔

اقبال کی دیگر نظموں کو بھی یوسف حسین خاں نے اپنے تجزیاتی مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ یہ مطالعے بلاشبہ اقبال کی روایتی شروحات سے زیادہ جامع اور موئثر ہیں۔

اقبال کی شاعری کی فنی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے یوسف حسین خاں نے ان کی شاعری میں پیکر تراشی، محاکات، محاورے اور زبان کے استعمال جیسے امور کو سامنے رکھتے ہوئے عالمانہ گفتگو کی ہے۔ وہ اقبال کی ایک بڑی خوبی تجریدی تصورات کو جاندار اور جیتی جاگتی شکل میں بنا کر پیش کرنا قرار دیتے ہیں۔[1]

اقبال نے اس صنف سے بہت کام لیا ہے انہوں نے بعض دفعہ انہیں بے جان کیر کٹر کی مدد سے وہ بات بھی کہی ہے جو وہ خود کہنا چاہتے تھے۔ گویا کہ انہوں نے ان کیر کٹر کو ایک وسیلہ کے طور پر برتا ہے۔ اس کی واضح مثال ان کی نظم 'تصور حسن' اور 'بزم انجم' ہے۔ اقبال پرانی روش پر چلنے کے روادار نہ تھے وہ خود اپنا راشتہ آپ تلاش کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے غزل میں طبع آزمائی کی اور نظم میں بھی۔ مگر اقبال نے ان اصناف کو اپنے مطلب کی بر آوری کے لیے کچھ تبدیلیاں کیں۔ جنہیں مثبت تبدیلی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی جو اقبال نے کی ہے وہ غزل اور نظم کی سرحدوں کو ملانے کی ہے۔ یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

> ''ان غزلوں میں اقبال نے ایک نئی فنی روایت کی داغ بیل ڈالی ہے۔ غزل اور نظم کو اس طرح ملایا ہے کہ ان کی ہیئت کی دوئی باقی نہیں رہی۔ اس کی مسلسل نظم نما غزل میں ریزہ کاری کا عیب نہیں اور تصورات کو مسلسل بیان کرنے کی خوبی ہے۔ اس کے ساتھ غزل کی رعنائی بھی باقی رکھی ہے۔''[2]

'اقبال اور فن' میں یوسف حسین خاں نے انہیں مباحث کو جگہ دی ہے جو خالص فنی نوعیت کے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی تحریروں سے صاف جھلکتا ہے کہ وہ اقبال کے فن میں بھی فکر تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اقبال کا تصور حسن ہو یا تصور فن یوسف حسین خاں کی نظر میں فن، فکر سے خالی نہیں رہا ہے۔ ہر جگہ فکر اقبال مقدم ہے۔ یہی اقبال کا اعجاز ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

یوسف حسین خاں کا خاص میدان غزل تنقید ہے، اس لحاظ سے انہوں نے اقبال کی غزلوں کو بھی خصوصی مطالعہ کا موضوع بنایا ہے اور اقبال کی غزلوں کو فن کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ یوسف حسین کا ماننا ہے کہ غزل گو شاعر کی حالت ایک

---

1 روح اقبال، ص: ۱۰۲

2 روح اقبال، ص: ۱۱۸

خواب دیکھنے والے کی ہوتی ہے۔ یہ تشبیہ بہت ہی معنی خیز ہے اس وجہ سے کہ غزل کے اشعار بھی اسی طرح سے بے ربط ہوتے ہیں جس طرح سے خواب ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اس کے ساتھ تغزل کی مکمل کیفیت کے لیے تحیر اور مستی کے اضافہ کی بات کرتے ہیں۔ جس کو اقبال کی شاعری میں قلندری کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے[1] وہ لکھتے ہیں:

''اقبال کی غزل میں چاہے عشق و محبت کی معاملہ بندی ہی کیوں نہ ہو، ایک طرح کی قوت و تازگی کا اظہار ملتا ہے۔ پھر چونکہ اس کی نظر زندگی کے متعلق نہایت وسیع ہے اس لیے لازمی طور پر اس کے رمز و کنائے میں ایک جہان معانی پنہاں ہوتا ہے۔ معانی کے علاوہ محاسن کلام کے ظاہر انداز یعنی لفظی رعایتوں کو برتنے پر بھی اسے پوری قدرت حاصل ہے اس کے ہاں شاعرانہ رمز نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں'' [2]

اقبال کی شاعری کی ایک اہم فنی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے بحروں کے انتخاب میں فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے، یوسف حسین خاں اقبال کی اس خوبی کے قائل ہیں وہ لکھتے ہیں:

''اقبال ایسی بحریں اور زمین منتخب کرتا ہے جو تغزل کے لیے خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب وزن منتخب کرنے سے شاعر اپنے کلام میں بے پایاں دل فریبی اور دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔''[3]

اقبال نے صرف بحرون اور زمینوں کو اپنے موضوع کے مطابق نہیں چنا ہے بلکہ تشبیہوں اور استعاروں کو بھی اپنی مرضی کا منتخب کیا ہے۔ اردو شاعری میں گل و بلبل، گلاب کے پھول جیسی تشبیہیں رائج ہیں، شعراء نے ان سے خوب خوب خوشہ چینی کی ہے لیکن اقبال کا معاملہ الگ ہے، انہوں نے اپنے مقصد کے لیے انہیں ناکافی سمجھا اور اس کی جگہ شاہین، باز، صحرائی لالہ کو اپنی تشبیہوں اور استعاروں میں جگہ دی۔ اس لیے کہ اقبال جس حرکت و عمل کی تعلیم دیتے تھے اس کے لیے یہی مناسب تھا۔[4]

---

1 روح اقبال ص ۱۰۵۔۱۱۰

2 روح اقبال ص ۱۱۱

3 روح اقبال ص ۱۱۳

4 روح اقبال، ص ۱۲۳

یوسف حسین خاں نے 'روح اقبال' کا دوسرا باب 'اقبال کا فلسفۂ تمدن' رکھا ہے۔ یوسف حسین خاں کا ماننا ہے کہ اقبال کا فلسفۂ تمدن، اسلامی فلسفۂ حیات کا رہین منت ہے۔ اقبال فرد اور جماعت کے رشتے کو اس طرح تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایسی اجتماعیت کے خلاف ہیں جس میں فرد کی خودی کو پروان چڑھنے کا موقع نہ ملے۔ اقبال کا یہ فلسفۂ تمدن اصل میں اسلامی فلسفہ کا ہی خلاصہ ہے جس میں فرد اور جماعت دونوں کی انفرادیت کو یکساں طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اقبال کے فلسفۂ تمدن میں سب سے اہم ان کا فلسفۂ خودی ہے۔ خودی کا فلسفہ کیا ہے؟ مختلف ناقدین اقبال نے اس کی توجیہ اپنے انداز سے کی ہے۔ سب کا لب لباب عرفان نفس ہے۔ یوسف حسین خاں نے خودی کی توجیہ بہت عمدہ پیرائے میں کی ہے۔:

> '' خودی فطرت اور ماورائے فطرت کو جوڑنے والی کڑی ہے۔ وہ موضوع بھی ہے اور معروض بھی۔ شعور کا سارا انحصار شعور ذات پر ہے۔۔۔۔۔ اقبال کے نزدیک موضوع اور معروض کی دوئی قابل قبول نہیں اس لیے کہ خودی کے اندر دونوں موجود رہتے ہیں۔''[1]

اقبال کا تصور خودی صوفی کے تصور خودی سے الگ ہے۔ صوفیوں کے یہاں خودی ایک منفی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے خودی کی نفی ان کے یہاں ہے۔ جبکہ اقبال کی ساری تعلیم کا خلاصہ خودی کا اثبات اور استحکام ہے۔ یوسف حسین خان، اقبال کے خودی کے فلسفے کی جڑیں نطشے اور برگساں جیسے مغربی مفکروں میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> میرا خیال ہے کہ خودی کے تصور میں اقبال نے جرمن مفکروں کا اثر قبول کیا ہے۔ خاص کر نطشے اور برگساں کا۔''[2]

یوسف حسین کی طرح اور بھی ناقدین اقبال نے فلسفۂ خودی کی جڑیں مغربی مفکرین کے یہاں تلاش کی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے دوسرے فلسفیانہ افکار کی طرح فلسفۂ خودی کا سرچشمہ بھی قرآن اور اس کی تعلیمات ہیں۔ اس بات کا اعتراف خود یوسف حسین خاں نے بھی دوسری جگہوں پر کیا ہے:

---

1 روح اقبال، ص ۱۳۱

2 ایضاً

اسلام کے تمام تر خیالات کا سرچشمہ اسلامی تعلیم ہے۔ وہ انسانی تمدن کے کسی شعبے کے متعلق جب کبھی اظہار خیال کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی اسلامی اصول ہوتا ہے جس کی کسوٹی پر وہ جدیدی تمدن کے اداروں کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔"[1]

یوسف حسین خاں کی یہ تحریر خود ان کے اس دعوے کے خلاف ہے جو انہوں نے اقبال کے خودی کے فلسفہ کے تعلق سے کہی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری میں ہندوستانی عناصر پر کم توجہ دی گئی۔ انہیں شاعر پاکستان اور شاعر اسلام کے طور پر پیش کرنے کی روش رہی ہے۔ یوسف حسین خاں نے اقبال کی شاعری کے ان عناصر پر بھی توجہ فرمائی ہے۔ لیکن وہ اسے اقبال کی ابتدائی شاعری مانتے ہیں:

"اپنی شاعری کے اور فکر کے ابتدائی دور میں اقبال نے ہندوستان کی متحدہ قومیت کے مسئلے پر بھی غور کیا تھا۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہندوستان مسلمانوں کا بھی سی طرح سے وطن ہے جس طرح اس ملک کے دوسرے بسنے والوں کا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں اس ملک کو اپنا وطن بنایا اور یہیں بس گئے۔ انہوں نے اس کی حفاظت میں چھ صدیوں تک اپنا خون بہایا اور بعض اوقات خود اپنے ہم مذہبوں سے ہندوستان کی خاطر جنگ کی۔ چنانچہ اقبال اس زمانے کی بعض نظمیں وطن دوستی کے جذبات سے مملو ہیں اور اردو ادب میں اب تک اپنی نظیر آپ ہیں۔ 'تصویر درد' 'ترانۂ ہندی'، 'نیا شوالا' اور ہندوستانی بچوں کا گیت اسی رنگ میں ہیں"[2]

حقیقت یہ کہ اقبال کی شاعری میں آخر تک حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار تھے۔ حب الوطنی سے وہ کبھی دست بردار نہیں ہوئے۔ البتہ ان کے نظریہ میں ایک بڑا فرق یہ آیا کہ انتہا پسندانہ قومیت سے دست بردار ہوگئے۔ وہ رنگ و نسل کی بنیاد پر بھید بھاؤ کو ناپسند کرتے تھے۔ یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

---

1 روح اقبال، ص: ۲۶۴

2 روح اقبال، ص: ۲۹۳

''اقبال نے اپنے آخری زمانے کے کلام میں بھی ہندوستان سے اپنی محبت اور اس کی آزادی کے متعلق ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ محبت اسی فطری جذبے پر مبنی ہے جو انسانیت کی قدر مشترک ہے، یہ محبت اس واسطے نہیں کہ دوسروں سے نفرت کی جائے۔''[1]

انہوں نے مثال کے طور پر 'شعاع امید' کو پیش کیا ہے جس میں اقبال نے شوخ کرن سے اپنی امیدیں وابستہ کی ہیں۔ اسی سرزمیں کو اپنی امیدوں کا محور بتایا ہے۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ہر ایک کو مخاطب کر کے آزادی کی تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جمہوریت پر اقبال کی تنقید مشہور و معروف ہے۔ وہ کہتے ہیں:

جمہوریت اک ایسی حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اقبال کی یہ تنقید بہت ہی بامعنی ہے۔ اس کا اعتراف دور حاضر کے دانشور بھی کرتے ہیں مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کو اور متبادل نہیں ہے جس کو جمہوریت کی جگہ اپنایا جائے اس وجہ سے ہزار خرابیوں کے باوجود جمہوریت ہی بہتر طرز حکومت ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس کا حل ہے۔ وہ اسلامی جمہوریت میں اس مسئلہ کا حل تلاش کرتے ہیں۔ یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

''اقبال نے مغربی جمہوریت پر جو تنقید کی ہے وہ سامراجی جمہورت کی حد تک بالکل حق بجانب ہے۔ لیکن اس کی تنقید کا اطلاق موجودہ جمہوریتوں پر نہیں ہوتا۔ اس نے اسلامی جمہویت کو سراہا ہے۔ لیکن یہ واضح نہیں کیا کہ اس کے عملی خدوخال کیا ہوں گے؟''

یوسف حسین خاں نے یہ واضح نہیں کیا کہ 'موجودہ جمہوریتوں' سے ان کی مراد کیا ہے۔ سامراجی جمہوریت اور موجودہ جمہوریت میں کیا فرق ہے۔ اقبال کی تنقید بہت واضح ہے۔ وہ کسی ایسے نظام کو پسند نہیں کرتے جہاں فرد کی انفرادی صلاحیتوں کی قدردانی نہ ہو۔ جمہوریت میں سبھی برابر ہیں خواہ وہ عالم ہوں یا جاہل۔

---

1 روح اقبال، ص: ۳۰۴

یوسف حسین خاں نے اقبال کے مابعدالطبیعاتی فلسفہ پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے 'اقبال اور فلسفۂ مذہب' کے تحت اقبال کے مذہبی افکار کو موضوع بحث بنایا ہے۔ یوسف حسین خاں نے بھی عام ناقدین کی طرح اقبال کے مابعدا لطبیعی نظام کو اقبال کی کتاب ''اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل'' کے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل تشکیل جدید الٰہیات اقبال کی اگرچہ ایک خالص علمی اور تحقیقی کتاب ہے مگر مابعدا لطبیعاتی نظام کے مباحث اقبال کے اردو اور فارسی کے کلام میں بھی بکثرت ملتے ہیں۔ یوسف حسین خاں ''اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل'' سے آگے نہیں پہنچ سکے ہیں۔

زمانۂ قدیم سے خدا اور بندے کے رشتے کے بارے میں فلاسفہ گفتگو کرتے آرہے ہیں۔ ہر ایک نے اپنا نقطۂ نظر رکھا ہے۔ اقبال کا ماننا ہے کہ انسان ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ انسان کی کاملیت کیا ہے اس تعلق سے اقبال کہتے ہیں:

> ''فرد جس قدر خدا کے نزدیک ہوگا اسی قدر کامل ہوگا۔ قربِ الٰہی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہوجائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کو اپنے اندر جذب کرلے۔''[1]

اقبال کی کتاب ''اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل'' اس معنی میں اہم ہے کہ انہوں نے اسلامی فلسفہ کی نئی تعبیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر بعض معاملات میں وہ اسلام کے اصل مآخذ سے براہ راست استفادہ نہ کرنے کی وجہ سے اسلام کی اصل تعبیر سے الگ راہ اختیار کرلی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال عربی زبان سے واقف تھے۔ مگر اسلامی علوم سے واقفیت کے لیے صرف عربی کا واقف ہونا ضروری نہیں۔ اقبال کے اسلامی فلسفہ پر لکھتے ہوئے کم ہی ناقدین نے اقبال کی ان فروگزاشتوں کی طرف توجہ دی ہے۔ اکثر ناقدین اقبال کی ان فلسفیانہ بھول بھلیوں ہی میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ یوسف حسین خاں بھی انہیں میں سے ایک ہیں۔

ان معمولی فروگزاشتوں کے باوجود یوسف حسین خاں ایک اہم ماہر اقبال ہیں۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے یوسف حسین خاں کی کتاب روح اقبال پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے: ''یہ کتاب اپنی جامعیت اور صحت فکر و نظر کے اعتبار

---

1 روح اقبال، ص ۳۵۷ بحوالہ ''اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل''

سے اس قابل ہے کہ اس کو اقبالیات میں سر فہرست جگہ دی جائے۔''[1] بلاشبہہ اقبال کی تفہیم میں ان کی کتابیں ایک اہم مرجع کے طور پر دیکھی جائیں گی۔

1 اقبالیات کا تنقیدی جائزہ قاضی میاں اطہر ص ۹

# عزیز احمد

اقبال شناسی کی روایت کو فروغ دینے میں جن شخصیات کی حصہ داری رہی ہے ان میں ایک اہم نام ترقی پسند تحریک کے سرخیل عزیز احمد کا بھی ہے۔ عام طور پر ترقی پسندوں نے اقبال سے دوری بنائے رکھی۔ اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ ترقی پسند خیالات اور ادب برائے اصلاح کے علم بردار ہونے کے باوجود اقبال کی شاعری ترقی پسندوں کی مقرر کردہ خطوط پر نہیں ہے۔ اقبال کا رجحان اسلامی تعلیمات کی طرف تھا جب کہ ترقی پسندیت کا مطلب مذہب سے بیزاری تھا۔ یہی وہ اہم فرق ہے جس کی وجہ سے اقبال اور ترقی پسندوں کے درمیان ہم آہنگی نہ پیدا ہو سکی۔ مجنوں گورکھ پوری اور سردار جعفری کی تنقیدوں کو بھی اس تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ دراصل ترقی پسندوں کو اقبال کی حجازی لے راس نہ آئی۔ ترقی پسندوں میں سب سے پہلے عزیز احمد نے اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا۔ ان کی کتاب 'اقبال۔ نئی تشکیل' اقبالیات کے بنیادی مآخذ میں شمار کی جاتی ہے۔ انھوں نے اقبالیات پر کئی مضامین بھی لکھے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ طاہر تونسوی نے آپ کے مضامین کا ایک انتخاب 'اقبال اور پاکستانی ادب' (۱۹۷۷) کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں شامل مقالے یہ ہیں: اقبال اور پاکستانی ادب، اقبال کی شاعری میں حسن و عشق کا عنصر، اقبال کا رد کردہ کلام، کلاسیکی نظریات پر اقبال کی تنقید، اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ[1]، اقبال کا نظریہ پاکستان، اقبال کا نظریہ فن، کلام اقبال میں خون جگر کی اصطلاح۔ یہ سبھی مضامین کافی اہم ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی کتاب 'برصغیر میں اسلامی جدیدیت'[2] (اردو ترجمہ جمیل جالبی) میں اقبال: مفکرانہ نوجدیدیت، اور تخلیق پاکستان میں اقبال کے مذہب تفکر، اور اقبال کے نظریہ پاکستان کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح ترقی پسندی کے محدود دائروں سے نکل کر اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اگر ترقی پسندوں نے اس روایت کو باقی رکھا ہوتا تو ترقی پسند تحریک زوال کا شکار نہ ہوتی۔

---

1 کتاب میں شامل ایک مضمون 'اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ' عزیز احمد کا نہیں ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ہیں۔

2 برصغیر میں اسلامی جدیدیت، عزیز احمد، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ط دوم ۱۹۷۷ء ص ۲۰۵۔ ۲۴۷

عزیز احمد کا آبائی وطن کاکوری، اتر پردیش ہے۔ ان کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۱/ نومبر ۱۹۱۳ء میں ہوئی، ۱۹۲۸ء میں میٹرک کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ سے ایف اے اور ۱۹۳۴ء میں انگریزی ادب میں امتیاز کے ساتھ بی اے آنرس کی ڈگری حاصل کی۔ انگریزی کے علاوہ انہوں نے اردو اور فارسی میں بھی آنرس کی ڈگری حاصل کی۔ اسکالرشپ پر ۱۹۳۷ء میں انگلینڈ گئے جہاں انہوں نے لندن یونیورسٹی سے ۱۹۳۸ء میں بی اے آنرس کیا۔ لندن یونیورسٹی نے انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے بھی سرفراز کیا۔ تعلیم کے بعد جامعہ عثمانیہ میں ۱۹۴۲ء میں پروفیسر کے طور پر تقرری حاصل کی، کچھ سال نظام حیدرآباد کے یہاں بطور سکریٹری کام کیا۔ آزادی کے بعد وہ پاکستان چلے گئے جہاں اطلاعات ونشریات کی وزارت میں ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۵۷ء میں لندن گئے اور اپنے مادر علمی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے، بعد ازاں انہوں نے ٹورنٹو یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت تاحیات کام کیا۔ درجنوں چھوٹے بڑے ناولوں کا خالق اور 'ترقی پسند ادب' اور 'اقبال نئی تشکیل' جیسی تنقیدی کتابوں کا لکھنے والا ۱۶/ دسمبر ۱۹۸۲ء میں انتقال کر گیا۔ ان کے ناولوں میں 'لندن کی ایک رات' ؛ 'ایسی بلندی ایسی پستی' اور 'گریز' نے انہیں اردو کے بہترین ناول نگاروں کی صف میں انھیں کھڑا کر دیا۔[1] اس موقع پر ان کا تذکرہ اقبالیات میں ان کی اہم کتاب 'اقبال۔ نئی تشکیل' کے لیے کیا جارہا ہے۔

ناقدین اقبال کے عام رویے کے مطابق عزیز احمد نے اقبال کے فن کے بجائے فکر پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریر میں شاعر یا مفکر اقبال کا مسئلہ اٹھایا ہی نہیں، انہوں سیدھے سادے الفاظ میں اقبال کے کلام کی تفہیم پیش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عزیز احمد کی اقبال تنقید کا ایک بڑا حصہ کلام اقبال کی شرح کے زمرے میں آتا ہے۔

عزیز احمد نے اقبال کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:

1. وطن پرستی کا دور۔
2. اسلامی شاعری کا دور۔
3. انقلابی شاعری کا دور۔

---

1 عزیز احمد بحیثیت ناول نگار، ڈاکٹر محمد اسلم آزاد، ص ۹۔ ۱۰، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۸ء

یہ تقسیم زمانے کے بجائے موضوعات کے اعتبار سے ہے۔ اگرچہ موضوعات کے اعتبار سے تقسیم میں بھی اقبال کی شاعری کی زمانی تحدید ناگزیر ہو جاتی ہے، لیکن اس تقسیم سے انہوں نے پیغام دینا چاہاہے کہ اقبال کو زمان و مکان میں قید نہیں کیا جاسکتا، وہ ایک پیغام رکھتے تھے، اس وجہ سے اگر ان کی شاعری کو ادوار میں تقسیم کرنا ہے تو ان موضوعات کے اعتبار سے کیاجائے جو شاعری کے مختلف ادوار میں ان کی شاعری پر حاوی رہے۔

عزیز احمد نے اقبال سے پہلے کی شاعری میں حب الوطنی کی روایت پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کا سرچشمہ کسی فارسی شعر سے مستعار مانا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "انگریزی اور یورپی عروج کا راز دریافت کرتے کرتے حالی اور آزاد کو قومیت کی اس قدر کا علم ہوا جس کو ان دونوں نے "حب وطن" کا نام دیا ہے۔ دونوں نے حب وطن پر مثنویاں لکھیں۔ یہ لفظ غالباً دونوں یا ان دونوں کے محرک نے اس فارسی مصرعے سے مستعار لیا۔ 'حب وطن از ملک سلیماں خوش تر" اور محمد حسین آزادؔ نے تو اپنی مثنوی 'حب وطن' کی ابتدا ہی اس فارسی شعر کی ترکیب جدید کی (کذا) ہے:
>
> ہے قولِ جملہ تجربہ کاران فارسی
> اور کہتے ہیں یہ نظم نگاران فارسی
> حب وطن ز ملک سلیمان نکوتر است
> خار وطن ز سنبل وریحاں نکوتر است"[1]

عزیز احمد کا ماننا ہے کہ حب الوطنی کی روایت اردو شاعری میں سرسید اور ان کے رفقاء کار کے ذریعہ اردو میں انگریزی شاعری کے زیر اثر رائج ہوئی۔ اس کے پیچھے محرک یہ رہاہے کہ سرسید، حالی اور آزاد نے اپنی قوم کی پستی کے علاج کے لیے قدیم نسخوں کے بجائے انگریزی تعلیم سے نئے نسخے دریافت کئے۔ ان کا ماننا تھا کہ انگریزوں کی ترقی کے اسباب میں حب الوطنی ایک اہم سبب ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے حب الوطنی کی روح اردو شاعری میں پھونکنا شروع کر دیا۔ اس کے

---

1 اقبال نئی تشکیل، عزیز احمد ص ۱۱۔ ۱۲ ناشر کتب خانہ تاج آفس کراچی سن اشاعت مذکور نہیں۔ یہ نسخہ یونی ورسٹی آف ٹورنٹو کی لائبریری سے اسکین کیا ہوا ہے۔ جو ARCHIVE.ORG پر دستیاب ہوا ہے۔

لیے کون سی اصطلاح استعمال کی جائے اس کی تلاش میں ان کی نظر ایک فارسی شعر کی طرف گئی اور آزاد نے اسے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔

تعجب ہے کہ عزیز احمد جیسا شخص جس کی نظر مشرق و مغرب کے ادبیات پر ہے وہ اس قسم کی غلطی کر سکتا ہے۔ حب الوطنی کی اصطلاح سب سے پہلے 'حب الوطن من الایمان' میں ملتی ہے۔ یہ اگرچہ حدیث نہیں ہے مگر عوام میں حدیث کے نام سے بہت مشہور ہے۔ اس وجہ سے اس کو ان مشہور احادیث نبویہ میں شمار کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ بلاشبہہ یہ حدیث اس فارسی شعر سے زیادہ مشہور اور زبان زد عام ہے۔ اس وجہ سے یہ بات قرین قیاس نہیں کہ ان شعرائے کرام کی نظر اس حدیث کو چھوڑ کر اس فارسی شعر کی طرف گئی ہو گی۔ خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ آزاد نے اس محولہ بالا مصرعہ فارسی شعر میں ردوبدل کر کے استعمال کیا ہے۔ بعینہ وہی استعمال نہیں کیا ہے۔

حالی نے 'حب وطن' لکھی اور محمد آزاد نے بھی 'حب وطن' کے نام سے نظم لکھی۔ عزیز احمد کا ماننا ہے کہ حالی کے مقابلے میں آزاد کے یہاں انتشار زیادہ ہے۔ لیکن حالی نے جہاں اپنی نظم میں حب وطن کی مثالوں میں رام جی کا بن باس اور حضرت محمد ﷺ کی ہجرت کے واقعات بطور حوالہ پیش کیا ہے۔ حالی کی حب الوطنی میں ہندو مسلم کی تفریق نہیں ہے وہ ہندو مسلم انتشار کو ملک کی آزادی کے لیے سم قاتل مانتے ہیں۔ اس کے باوجود اس انتشار کے اسباب گناتے ہوئے وہ انگریزوں کے لیے بہت محتاط انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔:

"کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا
کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا
کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر میں لے گئی بازی
ایک شائستہ قوم مغرب کی"[1]

---

1 اقبال نئی تشکیل ص ۱۴

آزاد نے بھی 'حب وطن' میں مختلف حوالوں سے کام لیا ہے۔ حضرت آدم کے قصے سے لے کر ایرانی روایات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ دونوں کے یہاں قدرے مشترک بات یہ ہے کہ دونوں کے یہاں حب وطن سے مراد حب اہل وطن ہے۔ ان دونوں کی روایت حب الوطنی کو اقبال نے آگے بڑھا کر جغرافیائی حب الوطنی کا نظریہ پیش کیا۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

'اقبال نے پہلی مرتبہ جغرافیائی اور خالص ہندوستانی وطن پرستی کا تصور سب سے پہلے اردو شاعری میں پیش کیا۔"[1]

'بانگ درا' کی پہلی نظم 'ہمالہ' کو وہ جغرافیائی حب الوطنی پر مبنی نظم مانتے ہیں۔ اقبال کے یہاں اس حب الوطنی کا سب سے بڑا محرک 'اتفاق' ہے۔ اتحاد و اتفاق کے لیے وہ کس حد تک جانے کو تیار تھے اس کا اندازہ ان کی نظم 'نیا شوالہ' پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے۔ کلام اقبال کی تفہیم ان کے فارسی کلام کو سامنے رکھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ 'جاوید نامہ' اور 'پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق' کے خصوصی حوالوں سے عزیز احمد نے اقبال کی ہندوستانی شخصیات سے محبت اور لگاؤ کو پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" جوں جوں سیاسی وطنیت سے اقبال کا انکار بڑھتا جاتا تھا، اسی اندازے سے اپنے وطن ہندوستان کے غیر اسلامی تمدن کی عظمت کے مختلف پہلو ؤں کا اثر بھی اقبال پر بڑھتا جاتا تھا۔ جاوید نامہ، کی یہ مثالیں اس کا ثبوت ہیں۔ منافرت تو ایک طرف کبھی خفیف سی ذہنی غیرت بھی کہیں نظر آتی (کذا)۔ اس کے برعکس اقبال کو ہندو تہذیب، ثقافت الٰہیات اور مذہب میں جابجا ایسے عناصر ملتے ہیں جو ان کی اسی فکر کے ارتقاء میں بے حد معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جس طرح ہندو تمدن اور فکر کا اثر بڑھتا جاتا تھا اسی طرح 'از ملک سلیماں خوشتر 'نوعیت کا غیر سیاسی حب وطن بھی ان کے کلام میں آخر تک باقی رہا۔"[2]

اقبال کی وطنی شاعری کے زمانے میں بھی اسلامی عناصر موجود تھے اسی طرح ملی شاعری کے دور میں بھی وطن سے محبت اور لگاؤ کے عناصر موجود تھے۔ یہ تبدیلی کس قسم کی تھی اس سلسلے میں عزیز احمد لکھتے ہیں:

---

1 اقبال نئی تشکیل ص ۱۸

2 اقبال نئی۔۔۔ ص ۴۸

''جو تبدیلی ہوئی وہ یہ نہیں تھی کہ قبال نے قومی شاعری کی جگہ اسلام کی شاعری کو اپنا خاص موضوع بنایا، اسلام کی شاعری تو ان کے کلام میں پہلے بھی شامل تھی اصل تبدیلی یہ ہے کہ انہوں نے سیاسیات کو وطن سے علیحدہ کر کے مذہبی تمدن سے منسلک کر دیا یہ تبدیلی بڑی اہم تھی اور آج بھی ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی تصورات کا بڑی حد تک اسی پر دارو مدار ہے۔۔۔۔ اقبال کی شاعری کی 'جذباتی' سطح پر وطن اور مذہب دونوں اپنی اپنی جگہ قائم رہے۔ صرف سیاسیات نے ایک سے قطع تعلق کر کے دوسرے سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا''[1]

عزیز احمد کا یہ قول بہت اہم ہے۔ اقبال کے مکمل کلام کا مطالعہ کیے بغیر بہت سے ناقدین نے یہ غلط فہمی پھیلائی ہے کہ اقبال نے ایک خاص زمانے تک وطنی شاعری کی ہے اور اس کے بعد وہ وطنی شاعری سے دست بردار ہو کر ملی شاعری کرنے لگے حالانکہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری میں شروع سے لے کر آخر تک یہ دونوں عناصر موجود رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ

'سیاسیات نے ایک سے قطع تعلق کر کے دوسرے سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔'[2]

عزیز احمد ان ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ اس وجہ سے عزیز احمد کی ترقی پسندی دوسرے تمام ترقی پسندوں سے زیادہ راسخ ہے۔ وہ ہر چیز کو ترقی پسندی کی عینک سے دیکھنے کے قائل ہیں۔ اس کے باوجود عزیز احمد راہ اعتدال نہیں چھوڑتے۔ ایک ایسے وقت میں جب ترقی پسندی اور اقبال مخالفت ایک ہی سکہ کے دو پہلو مانے جاتے تھے انہوں نے اقبال کو ترقی پسند ہوتے ہوئے متعارف کرانے کی جسارت کی۔ بعد میں سردار جعفری نے بھی 'اقبال شناسی' لکھ کر کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن عزیز احمد کی کتاب 'اقبال۔ نئی تشکیل' کا درجہ علی سردار جعفری کی کتاب کو نہیں مل سکا۔

اقبال کے سیاسی نظام کے تصور میں انہیں ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

1 اقبال نئی تشکیل ص ۵۵

2 ایضاً

''ہندوستان کے مسلمانوں کی حد تک کم سے کم اسلامی شاعری کے ابتدائی دور میں اقبال نے جس بین الاقوامیت کا ایجاب کیا ہے وہ اشتمالی نہیں بلکہ اسلامی ہے گو رفتہ رفتہ ان کی اس بین الاقوامی اسلامیت کے تصور کا معاشی نظام اشتراکی ہوتا گیا۔۔۔۔۔ ان کے نزدیک اسلامی بین الاقوامیت ہندوستانی وطنیت سے بہتر سیاسی بدل ہے۔ اقبال پھر یورپ ہی میں کلیسا اور سلطنت کے فرق سے اپنی بحث شروع کرتے ہیں۔''[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے اپنی شاعری میں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جس کا متبادل آج تک اشتراکی نظریہ کے حامل شعراء بھی نہ پیش کر سکے۔ جیسے کہ اقبال کا یہ شعر:

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روٹی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ترقی پسندوں میں یہ شعر اتنا مشہور ہوا کہ یہ ان کا نعرہ بن گیا۔ لیکن اس کے باوجود اقبال اور ترقی پسندوں کے درمیان جو نظریاتی اختلاف ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک مذہب کا نمائندہ دوسرے کا دھرم ہی مذہب بیزاری ہے۔ البتہ انسانی قدروں اور مزدوروں اور دبے کچلے عوام کی ہمدردی میں دونوں یکساں ہیں۔ لیکن اس معاملے میں ان کا سرچشمہ اسلامی تعلیمات ہے۔ اس وجہ سے اس کو 'اشتراکی' کہنا مناسب نہیں ہو گا۔

عزیز احمد نے اقبال کے تصور وطنیت پر بے جا اعتراض کرنے والوں کو مثبت جواب دیا ہے وہ لکھتے ہیں۔:

''چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا' سے یہ ہر گز مراد نہیں کہ دنیا کو بزور تیغ فتح کر کے اپنا وطن بنانا مسلمانوں کا فرض ہے بلکہ یہ کہ بحیثیت بود و باش کے ساری دنیا مسلمانوں کا یا سارے انسانوں کا وطن ہے اس میں کسی ملک کی قید نہیں جس طرح 'الارض للہ' کی رو سے ساری زمین خدا کی ملکیت ہے اور انفرادی ملکیت کسی صورت میں امانت سے بڑھ کر نہیں، اسی طرح کسی ملک کی ساسی ملکیت جس پر سیاسی مملکت قائم ہو محض ایک ہنگامی اور غیر اصل سی چیز ہے۔ ساری دنیا وطن بن سکتی ہے، لیکن وطن کے معنی 'سیاسی وطن' کے نہیں ہیں۔''[2]

---

1 اقبال نئی تشکیل ص ۵۹

2 اقبال نئی تشکیل ص۶۶

عزیز احمد نے اقبال کے سیاسی فلسفہ کو خاص طور پر اہمیت دی ہے اور اس مسئلہ کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ 'یہ اقبال کے ساتھ بڑی ناانصافی ہو گی اگر کہا جائے کہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کو انہوں نے ہندوستانی وطنیت سے بیزار کرنے کی کوشش کی۔ ان کی یہ نصیحت دنیا بھر کے ہر ملک کے مسلمان کے لیے ہے' اس تفصیلی مطالعہ میں ان کا رویہ معروضی رہا ہے۔ وہ کہیں بھی اقبال کے بے جا مؤید یا ان کے مخالف کے رول میں نظر نہیں آتے ہیں۔

اسی طرح عزیز احمد نے اقبال کے اوپر لگائے گئے دوسرے الزامات کا تشفی بخش جواب دیا ہے۔ مثلاً ماضی پرستی کا الزام، تحفظ رایات، تقلید وغیرہ عزیز احمد تقلید کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

''اسلام میں جس قدر تقلید کی اقبال نے ضرورت محسوس کی ہے وہ محض نظریہ توحید ہے۔:

نقش بر دل معنیٔ توحید کن
چارۂ کارِ خود از تقلید کن

اقبال کی ساری عمر ساری شاعری سارا فلسفہ ایک محور کے گرد گھومتا ہے، اس محور کے ایک سرے پر اجتہاد یعنی مسلسل ذہنی انقلاب ہے اور دوسرے سرے پر معاشی انقلاب، اس لیے رموز بے خودی کے اس حصے میں جس اجتہاد کی انہوں نے مخالفت کی ہے وہ لازمی طور پر رجعت پسند ملاؤں کا اجتہاد ہے اور یہ نکتہ انہوں نے محض ہماری خیال آرائی کے لیے نہیں چھوڑا بلکہ صاف صاف اس کا ذکر کیا ہے۔''[1]

عزیز احمد نے اقبال کے اوپر عائد الزامات کا جہاں جواب دیا ہے وہاں پر ان کی زبان سائشتہ اور علمیت سے بھرپور ہے۔ بے جا لفاظی اور عام طور پر حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا ان کا شیوہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے کم الفاظ میں بہت پتے کی بات بول جاتے ہیں۔ ن۔ م۔ راشد نے اپنی شاعری میں اقبال پر طنز کیا ہے۔:

جہاں غریب کو نان جویں نہیں ملتی
وہاں حکیم کے درسِ خودی کو کیا کیجئے

---

1 اقبال نئی تشکیل ص ۱۷۵۔۱۷۶

یہاں پر سید ھا طنز اقبال اور ان کے فلسفیانہ اشعار پر ہے جس میں خاص طور پر انہوں نے فلسفۂ خودی کو نشانہ بنایا ہے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں۔:

"ن۔م۔راشد سے اعلی چوک جو ہوئی ہے، وہ یہ ہے، کہ انہوں نے نہیں دیکھا کہ حکیم کے درس خودی کے پیچھے نان جویں کا مسئلہ بھی ہے۔ دراصل اقبال کی شاعری کا ایک سرا اگر درس خودی ہے تو دوسرا نان جویں"

اس ایک جملے میں انہوں نے ن۔ م۔ راشد کے اس اعتراض بلکہ طنز کا نہایت مثبت جواب دے دیا۔ عزیز احمد کی کتاب 'اقبال نئی تشکیل' اس قسم کی مثالوں سے پر ہے۔

اقبال کی شاعری کا اسلامی دور کب سے کب تک ہے اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"اقبال کی خالص اسلامی شاعری کا دور ۱۹۰۵ اور ۱۹۰۸ کے درمیانی زمانے سے شروع ہو کے 'خضر راہ' تک باقی رہتا ہے اور خضر راہ سے بنیادی انقلابی اور معاشی محرکات ان کے کلام میں اس قدر اساسی طور پر جاگزیں ہو جاتے ہیں کہ اس کے بعد سے لے کر 'ارمغان حجاز' تک ان کی ساری شاعری اور اکثر بیشتر تحریریں خالص اسلامی سے زیادہ انقلابی رنگ رکھتی ہیں، اور اس زمانے میں اسلامی اشتراکیت کا تصور مکمل کرتے ہیں۔"[1]

اقبال کی اس شاعری پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ شاعری اگرچہ عمدہ ہے خیالات اعلی وارفع ہوں لیکن اس سے غیر مسلموں کو کیا واسطہ ہو سکتا ہے اس تعلق سے عزیز احمد کی رائے یہ ہے کہ ان کے سامنے دو راستے ہیں پہلا سر تیج بہادر کا ہے جو نہ اردو کو مسلمانوں کی زبان مانتے ہیں اور نہ اقبال کو مسلمانوں کا شاعر۔ شاعر کے اپنے خیالات مختلف ہو سکتے ہیں لیکن جس طرح ہم ان کی اور دانتے کے خیالات سے اتفاق نہ رکھنے کے باوجود ان کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہی رویہ اقبال کے بارے میں بھی اپنایا جانا چاہئے۔

دوسرا نقطۂ نظر فراق گورکھپوری کا ہے۔ انہیں اقبال کا حجازی لے پسند نہیں آیا اس وجہ سے انہوں اقبال کی شاعری میں گروہ بندی اور رجعت پسندی نظر آنے لگی۔ وہ لکھتے ہیں:

---

1 اقبال نئی تشکیل ص۱۷۸

''ان کی شاعری کے مابعد ا لطبیعی اسلامی عنصر سے الگ کر کے دیکھیں تو شاید انہیں یہ شکایت باقی نہ رہے گی۔
کیوں کہ اقبال نے دراصل مذہب کو جدید ترین اشتمالی معاشی تصورات کے حمایت کے لیے استعمال کیا ہے۔
اسلامی مذہبی وجدانیات کا زور دینے سے ہندو یا بدھ یا عیسائی مذہنی وجدانیات کا بطلان ثابت نہیں ہوتا۔''[1]

دراصل اقبال کو ایک جدید معاشی نظام کی تلاش تھی۔ جیسا کہ انہوں نے ر ب کلاسن کے نام لکھے ایک خط میں اس کی وضاحت کی ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ وہ ایک ایسے نظام کو نظر انداز نہیں کرسکتے جس نے رنگ و نسل کی تفریق کو مٹا کر سارے انسانوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔

عزیز احمد 'خضر راہ' کو انقلابی شاعری کی ابتدا مانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''خضر راہ سے پہلے طبقاتی کشمکش معاشی آزادی اور دوسرے اشتراکی مسئلوں کا ذکر اقبال کے کلام میں شاذو نادر ہی کہیں ہوا ہو، اگرچہ کہ اسلامیت باقی رہتی ہے مگر اس کا رجحان، اس کا موضوع اور اس کے محرکات بڑی حد تک بدل جاتے ہیں۔ خضر راہ میں سب سے پہلے اسلام اور اشتراکیت کا امتزاج ملتا ہے۔ اشتراکیت کے تجزئے تک تو وہ غالباً مارکس ہی کے ر . . قط ٔ نظر سے پہنچے ہیں۔ لیکن خضر کی زبانی ان حقائق کا بیان کرنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسلام کا اجتہاد بھی ان معاشی تجزیوں کی پوری پوری تائید کرتا ہے۔''[2]

اشتراکیت یا ترقی پسندی کی اصل اثاث اس کا معاشی نظام ہے جو کارل مارکس نے پیش کیا۔ اقبال کے ذریعہ پیش کیا گیا اسلامی معاشی نظام چند مماثلوں کی وجہ سے کارل مارکس کے نظام سے میل کھاتا ہے اسی وجہ سے اقبال پر لکھنے والے مارکسی نقادوں نے اقبال کے ان خیالات کا رشتہ کارل مارکس سے جوڑ کر پیش کیا ہے۔ مارکسی نقاد اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ کارل مارکس نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس سے بہت پہلے ابوذر غفاری نے عملی طور پر پیش کیا تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ انسانی ضرورت سے زائد فرد کی ملکیت سے خارج ہے۔ وہ عوام کی ملکیت ہے۔ وہ اسی کو اسلام کا نظام مانتے تھے۔ ان لوگوں پر تنقید کرتے تھے جو اپنی ضرورت سے زائد سرمایہ کو اپنے پاس رکھتے تھے۔

---

1 اقبال نئی تشکیل ص: ۱۷۸۔۱۷۹

2 اقبال نئی تشکیل ص ۱۸۵

اس طرح دیکھیں تو مار کسواد کے نظریات کو سب سے پہلے اسلامی معاشرہ میں نبی اکرم کے صحابی ابوذر غفاری نے رکھی۔ اس وقت تک کارل مارکس کا وجود بھی نہ تھا۔اس وضاحت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اقبال کے ان معاشی افکار کو جن کا سرچشمہ اسلامی تعلیمات ہے جزوی مناسبت کی وجہ سے کارل مارکس سے جوڑنے کے بجائے اسلامی تعلیمات سے کیوں نہ جوڑا جائے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ترقی پسندی سے متاثر ہو کر اس کی مخصوص لفظیات سے فائدہ اٹھایا ہو۔ جیسے بندۂ مزدور، سرمایہ اور محنت کش وغیرہ لیکن یہ کہنا کہ یہ سب مارکس وادی تحریک کی دین ہے۔اقبال کے ساتھ زیادتی ہو گی۔

اقبال کی شاعری میں جگہ جگہ عشق کا حوالہ ملتا ہے۔لیکن اقبال کا عشق عام شاعروں کے عشق سے مختلف ہے۔ عزیز احمد اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اقبال کا 'عشق' وہ عشق نہیں، جو جوش کی رندانہ شاعری کا موضوع ہے، اقبال نے تو برگساں سے ذرا اختلاف کر کے عشق کا نیا وجدان اور عقل میں ایک طرح کی بنیادی ہم اصلی ایک طرح کا اشتراک تلاش کیا ہے۔ وہ ذوق نگہ جو عشق یا وجدان کی خصوصیت ہے، عقل میں بھی موجود ہے۔ لیکن عقل میں جرأت رندانہ کی کمی ہے۔''[1]

> 'جگنو کا مقام پروانے سے افضل اس لیے ہے کہ جگنو کی آگ میں سوز نہ سہی، لیکن وہ اس کی اپنی خودی کی پروردہ ہے، پروانہ پرائی آگ کا دلداہ ہے اس میں حرکت کی طاقت ضرور ہے مگر وہ اسے اپنی خودی سے ہٹا کے فنا کی طرف لے جاتی ہے، پروانہ کا یہ تصور مشرقی شاعری کی ہزار سال پرانی ڈگر سے برا انقلابی انحراف ہے۔ جب پروانہ کہتا ہے کہ:
>
> پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
> کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو
>
> تو اس کو جواب ملتا ہے کہ 'دریوزہ گر آتشِ بیگانہ نہیں میں۔''[1]

---

1 اقبال نئی تشکیل ص۳۱۳

''اقبال کا شاہین کافوری، میر وسلطان کا پالا ہوا باز ہر گز ہر گز نہیں ہو سکتا، جو اپنی رفعت پرواز چھوڑ کر، پھر سے اپنے مالک کے پاس اَور آب دانے کے پاس آبیٹھتا ہے، جو محض میر وسلطان کے اشارے پر طیور کا شکار کرتا ہے، اقبال کے شاہین کافوری کے لیے آزادی انتہائی ضروری ہے، دریاوصحرا تو ایک طرف آسمان بھی اس کے زیر پر ہیں''[2]

عزیز احمد اقبال کے مداح ہیں، لیکن انہوں نے عقیدت کا ایسا چشمہ نہیں پہنا تھا جس سے اقبال کی تصویر اُبھری نظر آرہی ہو انہوں نے کتاب کے اختتامیہ میں جو لکھا ہے اس میں ان کے عقیدت میں توازن نظر آتا ہے:

''یہ سطریں اپریل ۱۹۴۷ء کو لکھی جارہی ہیں، علامہ اقبال کی رحلت کو نو سال ہو چکے ہیں، ۱۹۳۰ء میں انہوں نے جو مسئلہ چھیڑا تھا وہ آج نہ صرف ہندوستان بلکہ شاید پورے ایشیاء کا سب سے اہم اور سب سے پیچیدہ مسئلہ بن چکا ہے۔ تاریخ اس کا فیصلہ کرے گی کہ اقبال کا تجزیہ اور ان کا حل مسلمانوں، ہندوستانیوں اور انسانوں کے لیے کس حد تک مفید تھا اور کس حد تک مضر۔ ہمیں چاہئے کہ اقبال کے پیغام کو مجموعی طور پر دیکھیں۔ اور میرے علم میں کوئی اور مثال ایسی نہیں ہے کہ کسی شاعر نے کسی قوم کے مستقبل پر ایسا گہرا ایسا دیرپا اثر ڈالا ہو؛''[3]

عزیز احمد اقبال کی علمیت کے قائل ہیں، دوسرے شاعروں کے برعکس اقبال کو پڑھنے کے لیے اطراف اقبال کو بھی پڑھنا پڑتا ہے، اس سلسلے میں عزیز احمد کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

اقبال کا پورا کلام پڑھنے کے بعد اقبال کے اطراف بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے، رومی، بیسے، برگساں، فطے۔۔۔ یونانی فلسفے، اسلامی فلسفے، قدیم ہندو فلسفے، جدید یورپی فلسفے، جرمن اطالوی انگریزی شاعری، فارسی غزل، اردو غزل سب کچھ پڑھنے کے بعد پھر اقبال کو پڑھئے تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ابھی اور بہت کچھ پڑھنا ہے۔ اور ہمیشہ ہر مرتبہ اقبال کے حقائی خیالات تصورات، اس کی حرکیت سے پیدا ہونے والے امکانات کی نئی شاہراہیں راستے

---

1 اقبال نئی تشکیل ص۲۵۷

2 ایضاً ص: ۳۶۳

3 اقبال نئی تشکیل ص ۵۹۱، ۵۹۲۔

گلیاں گوشے نظر کے سامنے پھیلتے ہی جاتے ہیں، ناظر پریشان ہو کر رہ جاتا ہے، کہ ابھی تک وہ اقبال کے فکر و شعر کے ساحل پر خزف چینی ہی کر تارہا، سمندر کا پانی تو اور آگے سے شروع ہوتا ہے۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباس کو مداحی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہ اقبال فہمی کے ان زاویوں پر روشنی ڈالتا ہے جن کے بغیر اقبال کی تفہیم ناممکن ہے۔ اقبالیوں کے یہاں پائی جانے والی بے اعتدالیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اطراف اقبال پر نظر ڈالے بغیر اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اکثر معاملوں میں اقبال کو پڑھے بغیر صرف اقبال تنقید کو بنیاد بنا کر 'کام چلانے' کی کوشش کی گئی ہے، ایسے میں تنقید کس رخ پر جائے گی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ عزیز احمد کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ مشرق مغرب کے علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کی تنقید بین العلومی تنقید ہے ۔ اقبال کے کلام کو سمجھنے کے لیے بین العلومی تنقید ہی کارگر ہو سکتی ہے۔

1 اقبال نئی ۔۔۔ ص ۵۹۲

# سہ چدانند سنہا

اقبال پر لکھنے والوں کو تین خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو اقبال پر لکھتے ہوئے توصیفی اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ اقبال کی توصیف میں اس حد تک تجاوز کر جاتے ہیں کہ اقبال کے خلاف ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کرتے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اقبال کے بارے میں منفی رخ اختیار کرتے ہیں۔ انہیں اقبال کی اچھائیاں بھی خامیوں کی شکل میں نظر آتی ہے۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اقبال کے بارے میں مثبت فکر رکھتے ہوئے اعتدال کا دامن نہیں چھوڑتے۔ یہ قسم اقبال ہی کے بارے میں نہیں بلکہ تقریباً ہر بڑے شاعر اور ادیب کے بارے میں ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بے جا توصیف سے نہ کسی شاعر کا قد بڑھا ہے اور نہ بے جا تنقید سے کسی کا قد چھوٹا ہوا ہے۔ خود اس قسم کے ناقدین نے ہر زمانے میں اپنا اعتبار کھویا ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اقبال تنقید پر لکھنے والے اولین ناقدین میں ایک ڈاکٹر سہ چدانند سنہا نے اقبال پر اپنی انگریزی کتاب 'Iqbal: the poet and his message(1947)'[1] میں اقبال پر لکھتے ہوئے وہی اسلوب روا رکھا ہے جو منفی تنقید کا ہے۔ یہ کتاب چونکہ اقبال پر لکھی جانے والی اولین کتابوں میں سے ہے اس وجہ سے اس کا ذکر ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر سہ چدانند سنہا دراصل ایک سیاست داں ہیں، کتاب کے شروع میں مصنف کے تعارف کے طور پر جو معلومات درج ہیں اس کے مطابق ان کی پیدائش ۱۰ر نومبر ۱۸۷۱ء میں ہوئی۔ پٹنہ کالج اور سٹی کالج کلکتہ سے تعلیم پائی۔ پیشے سے وکیل تھے۔ صحافی کی حیثیت سے انہوں نے ہندوستان ریویو کے بانی ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۶ء تک وہ بہار

---

1 ڈاکٹر سہ چدانند سنہا کی یہ کتاب رام نرائن پبلیشر اینڈ بک سیلر، الہ آباد سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اس طرح یہ کتاب آزاد ہندوستان میں اقبال پر شائع ہونے والی سب سے پہلی انگریزی کتاب ہے۔

اور اڑیسہ حکومتوں میں وزیر خزانہ اور وزیر قانون بھی رہے۔ ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں انہیں الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔

پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب میں انہوں نے اقبال کے اسلامی فکر و فلسفہ کو تنقید بناتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ عالمی ادبی منظر نامہ میں کہیں بھی نظر نہیں آتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال پر اب تک صرف توصیفی کتابیں لکھی گئی ہیں اس وجہ سے ان کے کلام کو حقیقی معنوں میں تنقیدی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے۔ اس حد تک معاملہ تو ٹھیک تھا لیکن انہوں نے اقبال کے بارے میں جو لہجہ اختیار کیا ہے اس کو کوئی بھی اہل علم پسند نہیں کرے گا۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے ان کی تنقید پر لکھا ہے:

> ''سنہا صاحب نے اپنا تمام زور قلم اس بات کے ثابت کرنے پر صرف کیا ہے کہ اقبال نہ تو فلسفی تھے نہ شاعر، سیاست داں، بلکہ ایک متعصب مسلمان قوم پرست جنہیں صرف اپنی قوم اور اپنے ہم مذہبوں سے ہمدردی تھی۔ وہ اپنے اسلاف کی عظمت کا راگ الاپتے رہے اور دنیا پر مسلمانوں کے تسلط اور اقتدار کا خواب دیکھتے رہے۔''[1]

ڈاکٹر سنہا کی تنقید کے جواب میں کچھ لوگوں نے سنہا سے بھی زیادہ سخت جملوں کا استعمال کیا ہے جو کہ مناسب نہیں ہے۔ بحیثیت مجموعی سنہا اقبال کی عظمت کے قائل ہیں۔ لیکن اقبال کے فکر و فلسفہ کے اس حصہ سے وہ اتفاق نہیں کرتے جو مسلم قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کے بقول انہوں نے جس وقت یہ کتاب لکھی تھی اس وقت پورا برصغیر ہندو مسلم منافرت کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ اس کی کچھ آنچ اس کتاب میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔[2]

---

1 اقبالیات کا تنقیدی مطالعہ، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، ص ۱۵۷

2 اقبال کے کچھ غیر ملکی مداح، سید عبداللہ، صحیفہ (اقبال نمبر) ص ۱۵۔۱۶، بحوالہ اقبال شناسی عالمی تناظر میں۔

سنہا نے اقبال کی تنقید اس وجہ سے بھی کی ہے کہ انہوں نے اردو سے زیادہ فارسی میں اشعار کہے ہیں۔ حالانکہ یہ اعتراض ان پر بھی وارد ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبال پر کتاب لکھتے وقت مادری زبان میں لکھنے کے بجائے انگریزی کا انتخاب کیا۔[1]

خوش آئند بات یہ ہے کہ اقبال پر لکھی جانے والی یہ اولین کتاب بعد میں لکھنے والوں کو متاثر نہ کر سکی۔ اس لیے کہ اقبال پر ہندوستان میں جو بھی کتابیں بعد میں آئیں ان پر اس کے اثرات نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ڈاکٹر سنہا کی اس کوشش کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انہوں نے اقبال کو ہندوستان کے انگریزی داں طبقہ میں متعارف کرایا۔

---

1 ڈاکٹر سنہا کی اقبال پر تنقید کے خلاف کئی لوگوں نے قلم اٹھایا، پروفیسر میاں محمد شریف نے سنہا کے نام 'AN UNFINISHED LETTER' کے نام سے ایک تفصیلی خط لکھ کر سنہا کا مدلل جواب دیا ہے۔ ان کا یہ خط 'اقبال کا شعری پیام' (ڈاکٹر سنہا کی کتاب پر تنقید) کے عنوان سے مقالات شریف، مطبوعہ بزم اقبال لاہور، ۱۹۹۴ء میں شامل ہے۔ (ص ۹۳۔۱۰۳)

# دیانرائن نگم

دیانرائن نگم ایک مشہور صحافی ہیں۔ آپ کی پیدائش کانپور میں ہوئی۔ کرائسٹ کالج کامن پور سے ۱۹۰۳ء میں بی اے کرنے کے بعد ماہنامہ زمانہ کی ادارت سنبھالی۔ انہوں نے طالب علمی کے دور سے ہی 'مخزن' لاہور میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ تقریباً چالیس سال تک اس رسالہ سے وابستہ رہے۔ ماہنامہ 'زمانہ' اردو کا معیاری رسالہ تھا اس میں صف اول کے ادیبوں کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں کانپور سے ہفت روزہ 'آزاد' نکالا جس کو کچھ دنوں تک انہوں نے روزنامہ کے طور پر بھی شائع کیا۔ یہ ہفت روزہ بھی ان کی وفات تک جاری رہا۔[1]

دیانرائن نگم کا شمار باضابطہ اقبال ناقدین میں نہیں ہوتا۔ انہوں نے اقبال پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی ہے۔[2] وہ اقبال کے ہم عصر تھے۔ اقبال کے کلام سے متاثر تھے۔ وہ اقبال کو ایسا وسیع المشرب شاعر قرار دیتے ہیں جس کے یہاں تنگ نظری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اقبال کے یہاں موضوعات کا جو تنوع ہے وہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ اس کی اصل وجہ ان کا وسعت مطالعہ تھا۔ وہ مشرق و مغرب کے فلسفہ سے واقف تھے۔ عربی، اردو فارسی کے علاوہ سنسکرت زبان کا بھی انہیں علم تھا۔ اقبال کی انہی خوبیوں نے دیانرائن نگم کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ وہ اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "اقبال کا کلام قوم کے سنجیدہ اور فلسفیانہ تخیلات کا عکس ہے۔ قوم کی موجودہ پستی ہر وقت بے چین اور بیقرار کیے رہتی ہے اور اُس کی حالت بالکل ایک اجڑے ہوئے گلستان کے بلبل نالاں کی سی ہے۔ اس کی آزردگی قوم کی روحانی پستی کے باعث ہے۔ اُسے قوم کی اخلاقی ترقی کی فکر دامنگیر رہتی ہے۔ حسنِ ازل کے عاشق کی حیثیت سے وہ زندگی میں ازلی حسن اور ابدی تکمیل کی جھلک دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اخلاق کے Beauty and

---

1 بیسوی صدی کے اردو مصنفین، ج ا، ص ۱۴۵-۱۴۹، ط: خود مصنف، ۲۰۰۴

2 انہوں نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ رسالہ زمانہ کی ادارت میں اداریہ کے علاوہ انہوں نے چند مضامین بھی لکھے۔

Perfection اعلیٰ ترین معیار پر عام عمل درآمد کا آرزومند ہے۔ وہ قوم میں خود داری کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے، جیسا کہ خود اس کے دل میں خود داری کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ اقبال دُنیا اور دُنیا والوں کی خامیوں سے اس درجہ متاثر ہے کہ ملک کا اور کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے۔ اس کا کلام روح کی کشمکش کا ایک ثبوت ہے"[1]

اس اقتباس میں دیانرائن نگم نے اقبال کے فکر و فلسفہ کا نچوڑ بیان کر دیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اقبال کی ساری کوشش یہی رہی ہے کہ قوم خواب غفلت سے بیدار ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے اردو و فارسی میں اشعار کہے، خطبات دیے ، اور نثری مضامین بھی لکھے۔

اکبر اور اقبال ہم عصر تھے۔ دونوں کے لہجے میں فرق تھا لیکن مقصد ایک تھا۔ دیانرائن نے دونوں کی شاعری کا بہترین موازنہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'اکبر اور اقبال کی شاعری کی دُنیا ایک دوسرے سے بالکل جدا اور نرالی ہے۔ اکبر قومی معاشرت کا مصلح اور اقبال روحانی شانتی کا منادّ ہے۔ اکبر مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کا مضحکہ اڑاتا ہے، وہ ہنسی ہنسی میں تنبیہ کرتا ہے تاکہ ہمارے طرزِ معاشرت اور تہذیب کا اصلی اور وطنی جوہر مفقود نہ ہونے پائے۔ وہ محبِ وطن ہے اور جب دیکھتا ہے کہ قومی معاشرت اصلیت اور مشرقیت سے خالی ہو رہی ہے تو کراہنے لگتا ہے۔ اکبر کی تمام عمر اسی کوشش میں گزری ہے کہ ہمارے جسدِ قومی پر مغربیت کا ملمع نہ چڑھنے پائے۔ وہ محکومیت کی ذلت کو محسوس کرتا ہے، اس لیے کہ اُن سے غلط معیارِ زندگی کو نمود حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ غیر ملکی اثرات ناقص کے خلاف جدوجہد میں مصروف پیکار رہتا ہے۔ اور گو مغرب کے بہترین اوصاف جذب کرنے کے لیے تیار ہے، تاہم دل پر مشرقی اوصاف اور قومی ڈھانچے میں ہندی وضع قطع کے سوا اور کسی کو دخل دلانا نہیں چاہتا۔ اقبال کا نقطۂ خیال اس سے بھی بلند ہے۔ اس کی دُنیائے شاعری بالکل نرالی ہے۔ مجاز اور حقیقت کے امتیاز سے اس کی آنکھیں ہر وقت پرنم رہتی ہیں'[2]

اکبر اور اقبال کی شاعری کا یہ موازنہ اس معنی میں اہم ہے کہ انہوں نے دونوں کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ دنوں شاعروں کی اہم خصوصیات کو اہمیت دی ہے۔

---

1 اُردو شاعری اور شعرائے حال از دیانرائن نگم ، مشمولہ نقدِ اقبال، حیات اقبال میں ، مرتبہ تحسین فراقی۔ بزم اقبال لاہور، ۱۹۹۲ء

2 ایضاً

دیانارائن نگم کے اعزاز کے لیے یہی کافی ہے کہ اقبال کی کئی نظمیں پہلی دفعہ ان کے رسالہ 'زمانہ' میں شائع ہوئیں۔ ترانۂ ہندی بھی انہیں نظموں میں سے ہے۔ اس نظم کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے اقبال کے ایک مصرعہ میں ترمیم بھی کی تھی۔ یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

'یہ ترانہ اقبال نے ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا اور ۱۰/ اگست ۱۹۰۴ء کو کانپور اترپردیش کے مشہور اردو رسالہ 'زمانہ' کے ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم کو اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ اس میں آخری مصرعہ یوں لکھا تھا: (معلوم ہے ہمیں کو درد نہاں ہمارا!) لیکن بعد میں انہوں نے (منشی دیانرائن نگم) نے اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے یوں کر دیا: 'معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا' اس میں شک نہیں کہ لفظ کسی نے مصرعہ میں سوز و گداز کی کیفیت میں اضافہ کر دیا ہے۔''[1]

قابل ذکر بات یہ کہ اقبال نے بھی اس اصلاح پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کو باقی رکھا۔ اس سے جہاں دیانرائن کی علمی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اقبال سے انکے تعلقات کی نوعیت کا بھی۔ اس لیے کہ اقبال کے شعر میں دانستہ ردوبدل کی جرأت کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔

دیانرائن نگم کے مضامین کو بھی اسی وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ وہ اقبالیات کے ابتدائی نقوش ہیں۔

---

1 بانگ درا مع شرح یوسف سلیم چشتی ص ۲۰۳

# صلاح الدین احمد

مولانا صلاح الدین احمد کی پیدائش ۲۵ مارچ ۱۹۰۲ء میں گمٹی بازار لاہور کے پاس کوچہ ہنومان (کوچہ فاروقیہ) میں ہوئی۔ آپ کے دادا نے اسلام قبول کر کے اپنا نام رام سنگھ چوہان سے حسین احمد رکھ لیا تھا۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے گھر پر اور بھاٹی دروازہ کی اونچی مسجد میں حاصل کی۔ اس کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول چوتھی جماعت میں داخل ہوئے، اسلامیہ کالج سے ایف اے اور لاہور کے ایک کالج سے بی اے کیا۔ انہوں نے اسلامک لٹریچر کمپنی، اکادمی پنجاب، کی بنیاد رکھی اور ادبی دنیا کو جس کو تاجور نجیب آبادی نے ۱۹۲۹ء میں جاری کیا تھا، انہوں ۱۹۳۳ء میں خرید لیا۔ اکادمی پنجاب کی جانب سے انہوں نے ایک طرف علمی وادبی کتابوں کی اشاعت کی تو دوسری طرف ادبی دنیا سے انہوں نے ادبی خدمات انجام دیں۔ مولانا صلاح الدین احمد کو علمی وادبی شہرت دلانے میں ادبی دنیا کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اس رسالے پر مولانا صلاح الدین احمد کی وفات ۱۹۶۴ء تک کئی مرحلے آئے لیکن آزادی سے پہلے اور بعد کے حالات میں بھی وہ پوری شان وشوکت سے نکلتا رہا۔ مولانا صلاح الدین کے علمی وادبی کارناموں کا اکثر حصہ وہی ہے جو ادبی دنیا کے صفحات پر مختلف وقتوں میں شائع ہوتا رہا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مولانا کی زندگی میں ان کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے مضامین کو جمع کر کے 'صریر خامہ' کے نام سے جمع کیا گیا۔ اس کی پہلی جلد 'تصورات اقبال' کے نام سے ہے جو اقبال کے بنیادی افکار پر ایک جامع اور بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔[1]

مولانا صلاح الدین احمد کی خوش نصیبی ہے کہ انہیں اقبال کی صحبت ملی۔ وہ اقبال کے معاصرین میں سے تھے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں مولانا صلاح الدین احمد بھی باقاعدگی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ مولانا کا ادبی ذوق پختہ تھا۔ کلام اقبال سے مزاج کی موافقت کی وجہ سے گہری دلچسپی لیتے تھے۔ اقبال پر تنقیدی مضامین اسی کا ثبوت ہیں۔

---

1 مولانا صلاح الدین احمد احوال وآثار، ڈاکٹر طارق ہاشمی، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۱ء ص: ۹۔۲۴۔

مولانا صلاح الدین احمد کو بطور اقبال شناس شہرت دلانے کے لیے صریر خامہ کی پہلی جلد تصورات اقبال ہی کافی ہے۔ مولانا نے اقبال کے فن کے بجائے فکر سے زیادہ سروکار رکھا ہے۔ اقبال کا تصور مملکت ، تصور شاہین، تصور معاشرت، تصور فقر جیسے مضامین مطالعہ کا حصہ رہے۔ انہوں نے پوری کوشش کی کہ اقبال کے پیغام کو عمدہ پیرائے میں عام کیا جائے۔ اقبال کس قسم کے مرد مومن کو اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں؟ وہ نوجوانوں کو کیا پیغام دیتے ہیں؟اقبال کے یہاں وطن اور قوم کے درمیان کی کشمکش کس نوعیت کی ہے؟اس قسم کے بنیادی سوالات کا حل انہوں نے اقبال کی کلام کی روشنی میں دیا ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد کو اقبال سے گہری عقیدت تھی۔ یہ عقیدت ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''کلام اقبال سے لطف و سرور کا حصول اور علم وحکمت کا اکتساب ایام جوانی ہی سے اس فقیر کا وظیفۂ زندگی رہا ہے اور امید ہے کہ دم آخر تک یوں ہی باقی وبر قرار رہے گا۔ کوئی چالیس بیالیس برس کی بات ہے میں اور میرے عزیز ترین دوست منصور احمد مرحوم سر شام کنارہ راوی تک جاتے اور راستہ بھر کلام اقبال ہی موضوع سخن رہتا۔ انہی دنوں سوء اتفاق سے ایک پڑھے لکھے ہندو نوجوان نے خودکشی کرلی۔ اس شام میں نے منصور احمد مرحوم سے کہا کہ کاش پریم پرکاش، اقبال اور گفتۂ اقبال سے آشنا ہوتا، پھر وہ خودکشی کبھی نہ کرتا۔ آپ جانتے ہیں، مرحوم نے اس کا کیا جواب دیا؟ کہنے لگے کہ میں اکثر اس بات پر حیران ہوتا ہوں کہ جن لاکھوں لوگوں کی زندگانی میں شعر اقبال کو دخل نہیں وہ زندہ کیوں ہیں اور خودکشی کیوں نہیں کر لیتے۔''[1]

اس تحریر سے جہاں ایک طرف مولانا کی اقبال سے گہری دلچسپی کا پتا چلتا ہے وہیں اقبال سے ان کی دلچسپی کی وجہ کا بھی علم ہوتا ہے۔ وہ اقبال کو اس لیے پسند کرتے تھے کیوں کہ اقبال کی شاعری میں دلوں کو زندگی دینے کا پیغام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقبال کی شاعری کے فنی پہلو سے زیادہ فکری پہلو پر توجہ دی۔

---

1 صریر خامہ، جلد اول تصورات اقبال، ص ۳۷۳، ادارہ ادبی دنیا، لاہور، ۱۹۶۵ء

ڈاکٹر سید عبداللہ 'تصوراتِ اقبال' کے مضامین پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[1]

''اقبال کے اِن مضامین پر نظر ڈالنے سے یہ راز کھلتا ہے کہ صلاح الدین احمد کا مطالعۂ اقبال کتنا وسیع اور غائر تھا۔ وہ کس طرح کلامِ اقبال کی باریکیوں کی معرفت رکھتے تھے اور اِنھیں اِس اَمر پر پوری قدرت حاصل تھی کہ کسی مسئلہ خاص پر اقبال کے پورے کلام سے استشہاد کر سکیں۔''

مولانا فکر اقبال پر گفتگو کرتے وقت اقبال کے افکار کو سماجی اور تہذیبی حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسانی مسائل کا حل وہ اقبال کی شاعری اور اس کے فلسفہ میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں اقبال ایک شاعر ہی نہیں بلکہ مسیحا بھی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:[2]

''مولانا صلاح الدین احمد کے اقبالیاتی مطالعے میں سب سے پہلے اِس بات کا ذِکر ضروری ہے کہ انھوں نے اقبال کو صرف شاعر کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ انھوں نے اقبال کو ایک مفکر اور ایک قومی رہنما کی حیثیت دی اور انھیں دانائے راز کے طور پر قبول کیا۔۔۔ ایک دانائے راز کی حیثیت میں مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال کی سیاسی ماحول میں پروان چڑھنے والی اقبال مندی کو اہمیت نہیں دی بلکہ اُن کی فکر بلیغ کے معرکہ آرا مروج کا راز اُن کی خلوت نشینی میں تلاش کیا اور انھیں ایک ایسے ناظر کی حیثیت دی جو خود شریکِ دغا نہیں ہوتا بلکہ ایک بلند ٹیلے پر بیٹھا سارے کارزار کا نقشہ دیکھتا رہتا ہے۔''

---

1 دیباچہ صریر خامہ (جلد دوم، تصورات اقبال) ص ۲

2 مولانا صلاح الدین احمد ۔ ایک مطالعہ، اسلام آباد اکادمی ادبیات، ۱۹۹۱ء، ص ۱۸۳

فکر اقبال پر گفتگو کرتے وقت انہوں نے اقبال کے شعری اسلوب کو بھی اس سے آہنگ کیا ہے۔ اس موقع پر بھی ان کے مطمح نظر اقبال کا پیغام ہی ہوتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں کوہ وصحرا کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:[1]

''عجمی شعرا نے صحرا کو صرف جنون کی پرورش کے لیے اپنے شعر میں استعمال کیا ہے اور یہی روایت فارسی سے اُردو نے ورثے میں پائی لیکن اقبالؔ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمیں صحرا کی صورت میں اپنی آرزوؤں کی تگ و تاز کے لیے ایک وسعت بے نہایت اور اپنی رُوح کی تسکین کے لیے ایک خلوت بے کنار عطا فرمائی۔ کم و بیش کچھ ایسی ہی صورت کوہ و کُہسار کی ہے۔ عجمی شاعری میں پہاڑ کا زیادہ سے زیادہ استعمال فقط اِتنا ہے کہ فرہاد اس سے جوئے شیر لانے کی کوشش میں اپنی زندگی تمام کر دے اور پھر اپنا سر پھوڑ کر مر جائے۔ اُردو میں آ کر اس پر محض اِتنا الم آفریں اضافہ ہوا:

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درونِ کوہ سے نکلی صدائے واویلا

لیکن دیکھیے اقبالؔ نے کوہ اور اس کے تصورات سے کیسا عجیب و غریب کام لیا ہے اسے رفعت وسطوت کا پیکر بنا کر اس کی چٹانوں کو قوت و کردار کا مظہر قرار دیا۔ اسے فقر و بے نیازی اور حرکت و حرارت کے ایک مجسمہ

---

1 تصورات اقبال (صریر خامہ جلد دوم) ص ۲۴۰۔ ۲۴۱

شاہین کی صورت عطا کی جو اسی کی چٹانوں پر بسیرا کرتا اور اپنا رزق آسمان کی فضاؤں میں تلاش کرتا ہے۔ شاہین کے سوا اقبالؔ کے مردِ کوہستان کو دیکھیے کہ غیرت وصلابت کا ایک پیکر ہے اور اپنے کردار کی مضبوطی وسختی اپنے کُہستانی مسکن ہی سے حاصل کرتا ہے۔''

مولانا صلاح الدین نے اقبالیات پر جو بھی لکھا ہے وہ متفرق مضامین کی صورت میں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے اندر یکسانیت اور فکری ہم آہنگی ہے۔ انہوں نے اقبال کے تمام فکری مباحث کو ان مضامین میں سمیٹ لیا ہے۔ اقبال کے فکر کو سمجھنے کے لیے یقینی طور پر ان کے مضامین معاون اور کارآمد ثابت ہوں گے۔

# خلیفہ عبدالحکیم

اقبال تنقید میں اگر صرف تین کتابوں کا انتخاب کرنا ہو تو بھی اس میں ایک کتاب یقینی طور پر خلیفہ عبدالحکیم کی 'فکر اقبال' شامل ہو گی۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال پر صرف دو کتابیں لکھی ہیں: ایک فکر اقبال اور دوسری 'اقبال اور ملا' لیکن ان کی دونوں کتابیں ان کو اقبال شناسوں میں اعلی مقام دلانے کے لیے کافی ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم یکم جولائی ۱۸۹۳ء لاہور میں پیدا ہوئے۔ سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی سے بی اے اور ایم اے کیا۔ ایم اے میں آپ کا مضمون فلسفہ تھا۔ پھر لاہور لا کالج سے ایل ایل بی کیا۔جرمنی سے رومی کی مابعد الطبیعاتی فلسفہ پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آپ ملک وبیرون ملک مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں سے وابستہ رہے۔ آپ کی مستقل تصانیف کی تعداد آٹھ ہے۔ جن میں 'فکر اقبال' اور 'اقبال اور ملا' اقبالیاتی ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔[1]

خلیفہ عبدالحکیم بھی ان خوش قسمت افراد میں سے ہیں جنھوں نے اقبال کی صحبت پائی۔ انہوں نے اقبال کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ وہ اقبال کی شاعری اور فکر دونوں کے شیدائی ہیں لیکن انہوں نے اقبال کے فکری مباحث پر توجہ دی ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اقبال خود اپنی شاعری کو بحیثیت فن اہم نہیں سمجھتے تھے وہ اپنی شاعری کے فکری پہلو پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اس کے باوجود خلیفہ عبدالحکیم کا ماننا ہے کہ:

> 'علامہ اقبال کے احتجاج کے باوجود یہ ناممکن ہے کہ بحیثیت شاعر ان پر نظر نہ ڈالی جائے لیکن شعر اقبال بحیثیت فن اقبال کے فلسفۂ حیات سے ایک الگ اور مستقل موضوع ہے'[2]

---

11 سیدہ خاتون، بیسوی صدی کے اردو مصنفین، ج ۱، ص ۲۶۰۔۲۶۴، ط: خود مصنف، ۲۰۰۴

2 فکر اقبال، خلیفہ عبدالحکیم ،ص ۱۴، ایجوکیشنل بک ہاؤس ، علی گڑھ ۱۹۷۷ء

گویا کہ وہ اقبال کی فنی حیثیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اس وجہ سے اس جانب توجہ نہیں دے سکے کہ وہ ایک الگ موضوع ہے۔ جس پر الگ سے تفصیلی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اقبال کی شاعری اور نثر میں موجود فکری مباحث کو مختلف عنوانات کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ کتاب بنیادی طور پر اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اقبال کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال پر مشرق و مغرب کے حکما اور شعراء کے اثرات کی نشاندہی کی ہے لیکن ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ اقبال محض مقلد نہیں ہیں۔ انہوں نے داغ کی شاگردی اختیار کی لیکن جلد ہی داغ کے رنگ سے خود کو آزاد کر لیا۔ غالب کے تخیل کے وہ آخر تک قدرداں رہے۔ مغربی فلاسفہ میں آرنلڈ جو کہ ان کے استاد تھے، سے بھی اثر قبول کیا۔ ان سب کے باوجود اقبال کہیں بھی مقلد نظر نہیں آتے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے ۱۹۰۵ء تک کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "۱۹۰۵ء تک اقبال ایک علی الاطلاق شاعر ہے زندگی اور فطرت کے جس منظر اور جن حوادث سے متاثر ہوتا ہے ان کو اپنے حسن بیان کا جامہ پہنا دیتا ہے تقلیدی اور روایتی شاعری سے اس نے بہت جلد چھٹکارا حاصل کر لیا۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے اس نے کمال پیدا کر لیا۔ کہیں داغ سے فیضیاب ہے اور کہیں غالب کے تخیل کا قدرداں۔"[1]

خلیفہ عبدالحکیم کا ماننا ہے کہ اقبال نے ۱۹۰۵ء تک اصلاح ملت اور تبلیغ کو اپنا مقصد نہیں قرار دیا تھا۔ اس زمانے کی شاعری میں حب وطن اور مناظر فطرت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اقبال کی شاعری کا یہ دور بعد کے ادوار سے اس معنی میں مختلف ہے کہ بعد کے ادوار میں ان موضوعات کی صرف جھلکیاں رہ جاتی ہیں۔ اس حوالے سے خلیفہ عبدالحکیم نے جغرافیائی وطنیت، اور یورپ میں کہی گئی نظموں میں عشق مجازی کا ذکر کیا ہے جو بعد کے ادوار میں ملی شاعری کی وجہ سے غائب ہو جاتی ہے۔

اقبال نے قیام یورپ کے دوران نظمیں کم کہی ہیں اس کی وجہ وہاں تعلیم کی مصروفیات رہی ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے وہاں جو نظمیں کہی ہیں ان میں ایک شان ہے۔ وہاں کی شاعری کی سب اہم خصوصیت خلیفہ عبدالحکیم کے

---

1 فکر اقبال ص ۲۱

نزدیک عشق مجازی ہے۔ البتہ اس دور کی شاعری میں بعد کے ادوار کے نقوش کھل کر سامنے آئے ہیں۔ ان نظموں میں اقبال کے یہاں سیاسی شعور بیدار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وطنی شاعری سے ملی شاعری کی طرف مراجعت نظر آتی ہے۔ انہوں نے یورپ کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہاں کی تہذیب اور کلچر کی اچھائیوں اور برائیوں سب پر اقبال کی نظر تھی۔ اقبال نے مغربی شاعری کے ہیئتوں کو بھی مشرقی رنگ میں اپنا کر ان میں جدت پیدا کی۔ یورپ سے واپسی کے بعد سب سے پہلی نظم خلیفہ عبدالحکیم 'بلاد اسلامیہ' قرار دیتے ہیں جو مخزن میں شائع ہوئی۔ اس دور میں اقبال کے یہاں جو فکری تبدیلیاں ہوئیں اس کے نتیجہ میں اقبال نے 'ترانہ ہندی' کی جگہ 'ترانہ ملی' لکھا۔ خلیفہ عبدالحکیم کے مطابق ۱۹۰۸ء کے بعد سے آخر تک کی شاعری کا کم از کم تین چوتھائی حصہ اسلامی اور ملی شاعری کا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کی فکر پر لکھتے ہوئے مختلف ادوار میں ان میں آئی ہوئی تبدیلیوں کو اس طرح بیان کیا کہ وہ اقبال کی فکر کی سرگزشت بن گئی ہے۔ اقبال کے فکر کا اس نہج پر مطالعہ اقبال کے فکری ارتقا کو سمجھنے میں زیادہ کارآمد ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے فکر اقبال میں کئی اہم فکری مباحث کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً شاعری میں کسی عقیدے کی وابستگی کا مسئلہ، فن کو پرکھنے کے لیے فنی پیمانے ہی کافی ہیں یا دیگر معیارات کی بھی ضرورت ہے۔ اول الذکر کے بارے میں خلیفہ عبدالحکیم کی رائے یہ ہے کہ ادب عالیہ عقائد سے مجروح نہیں ہوتا، شاعر کے عقائد سے چاہے کوئی اختلاف کرے یا اتفاق اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

علامہ اقبال کا نظریہ حدیثوں کے تعلق سے عام محدثین سے مختلف تھا۔ ان کے نزدیک بعض وہ احادیث جو بالاتفاق صع . یف ہیں معتبر تھیں، علامہ نے ان سے استشہاد کیا ہے اور اپنی شاعری میں انہیں جگہ بھی دی ہے اس حوالے سے خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا ہے:

> ''بہت سے مسلمان صوفیہ اور حکماء کا بھی اس سے قبل یہی رویہ رہا ہے۔ مثنوی مولانا روم میں بعض اعلیٰ درجے کے اشعار ان ہی احادیث کی شرح میں ہیں جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں۔ یہی حال امام غزالی جیسے بالغ نظر عالم اور حکیم صوفی کا ہے۔''[1]

---

1 فکر اقبال ص ۸۷

خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال پر لگائے ہوئے الزامات کا جواب بھی دیا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں تین اہم اعتراضات کی جانب توجہ دی ہے۔ پہلا اعتراض جو اقبال کے فلسفہ پر کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اقبال کا فلسفہ خودی اور شاہینی ، طاقت و قوت، حرکت و عمل اور جنگ و جہاد کا حامی ہے جو موجودہ تمدن کے خلاف خونریزی کی تعلیم ہے۔ خلیفہ نے اقبال کے خطوط اور ان کے اشعار کے حوالوں سے اقبال کے اس فلسفہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کا پیغام قوت وشوکت، مغلوب و مظلوم و مفتوح ومایوس افراد و اقوام کے لیے ہے۔یہی پیغام اخلاقی ضعف اور امراض ملی کا علاج ہے۔ اگر خودی کا یہ پیام قوت وشوکت کے حصول سے مزین نہ وہ تو مسکینی کی تلقین مرض میں اضافہ کر دیگی۔ [1]

اقبال پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے مخاطب صرف مسلمان ہیں۔ ان کی شاعری ہر قوم اور طبقہ کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ علامہ پر اس دوسرے الزام کے بارے میں خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا کہ

> ''محض اسلام کے نام لیواؤں کی ملت اس کے نزدیک وہ نصب العینی ملت نہیں۔ اسلام ایک زاویہ نگاہ ہے جس میں بھی وہ پیدا ہو جائے وہ مسلم ہے۔ ملتوں میں تفریق محض نظریہ حیات سے پیدا ہو سکتی ہے۔ باقی تمام تفریقیں یونہی تفرقہ ہیں۔'' [2]

ایک تیسرا اعتراض اقبال کے کلام پر یہ کیا جاتا ہے کہ اقبال کے کلام میں تضاد ہے۔ ہر کوئی اپنے مطلب کا مواد اقبال کے کلام میں پا سکتا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ جس کو تضاد کہا جاتا ہے وہ دراصل اقبال کی فکر کی ارتقائی شکل ہے۔ ہر انسان کے فکر میں وقت کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اگر اقبال کی شاعری میں بھی ایسا ہے تو اس میں مضائقہ کیا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم اقبال کے اندھے مداح نہیں ہیں انہوں نے اقبال کی مداحی میں دوسروں کے افکار سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں انہوں نے جہاں بھی اقبال کی فکر کو جادۂ اعتدال سے ہٹا ہوا محسوس کیا اس کی تنقید

---

1 فکر اقبال ص ۴۳۷

2 فکر اقبال ص ۴۴۰

بھی کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اقبال پر اعتراضات کا جواب دینے والے اور اقبال کا دفاع کرنے والے خلیفہ ان افکار کی وجہ سے خود اقبال کے مداحوں کی زد میں آ گئے۔

خلیفہ عبدالحکیم کا ماننا ہے کہ اقبال نے افلاطون کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ کیونکہ مارکس، لینن، مسولینی اور ہٹلر جیسے معاشرتی انقلاب کے آرزومند اور اپنے عمل سے دنیا کو تہ وبالا کرنے والے خواہ اس کا نتیجہ تخریب ہو یا تعمیر افلاطون ہی کی کتاب سے کچھ کچھ ورق اڑاتے رہے ہیں۔[1]

اس کے علاوہ اقبال کی فرنگ سے بیزاری پر بھی انہوں نے اقبال پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ فرنگ کے متعلق اقبال کی بیزاری انہیں جادۂ اعتدال سے ہٹا دیتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اقبال کو خلق خدا کے لیے زندگیاں وقف کرنے والے فرنگ میں کیوں نظر نہیں آتے۔[2]

خلیفہ عبدالحکیم کا یہ بھی خیال ہے کہ جس قسم کا انقلاب روس میں ہوا اس سے ملتا جلتا انقلاب اقبال ملت اسلامیہ میں بھی دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس کا محرک ان کے یہاں اسلام ہونا چاہئے نہ کہ الحاد۔ بلکہ توحید ہی اس انقلاب کا محرک ہو۔[3]

خلیفہ عبدالحکیم کے ان نظریات کی تنقید بھی کی گئی لیکن وحید عشرت نے اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے عمرانی تصورات کا تقابل کرتے ہوئے اقبال کے فلسفہ کو نظری اور خلیفہ کے فلسفے کو عملی قرار دیا ہے۔ کیوں کہ اقبال کا دور مسلمانوں کی غلامی کا دور تھا۔ اور اقبال کا مقصد مسلمانوں کا نشاط ثانیہ تھا۔ ان کے سامنے جو بھی تھا وہ نظری طور پر تھا جب کہ خلیفہ کے سامنے ایک مسلم ریاست تھی اس کے مسائل اور چیلنجز تھے اس وجہ سے ان کا فلسفہ عملی ہے۔[4]

---

1 فکر اقبال ص ۴۰۹

2 فکر اقبال ص ۳۶۰

3 ایضاً

4 علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے عمرانی تصورات، وحید عشرت، بزم اقبال لاہور، ص ۹، ۱۰، ۱۴، ط: ۱۹۸۱ء

حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ عبد الحکیم نے جو بھی لکھا ہے وہ اپنے مطالعہ کی بنیاد پر لکھا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ انہیں اقبال سے عقیدت نہیں تھی۔ اقبال کی عقیدت میں لکھی گئی ان کی نظم جو فکر اقبال کے شروع میں ہے اقبال سے ان کی عقیدت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے جو بھی لکھا ہے وہ اقبال ہی کے طریقے کی پیروی کی ہے۔ اقبال کا طریقہ اجتہاد کا تھا۔ خلیفہ نے بھی اسی طریقہ کو اپنایا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اقبال تنقید میں اس روش کو بھی برداشت نہیں کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں اقبالیات میں یا تو مکمل مدحیہ قسم کی تنقید لکھی گئی ہے یا دوسری قسم اس تنقید کی ہے (جو اگرچہ تعداد میں کم ہے لیکن پھر بھی مثبت کے مقابل میں منفی باتیں زیادہ دور تک سنی جاتی ہیں) منفی تنقید کے زمرے میں آتی ہے۔

خلیفہ عبد الحکیم نے فکر اقبال کے تقریباً سبھی مباحث کو اپنی کتاب میں سمیٹ لیا ہے۔ اس طرح ان کی یہ کتاب اقبالیاتی ادب میں دریا میں کوزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے آخر میں پوری کتاب کا خلاصہ ۲۷ نکات کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ یہ حصہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اقبال کی تفہیم میں نہایت کارآمد ہے۔

اقبال پر خلیفہ عبد الحکیم نے ایک دوسری کتاب 'اقبال اور ملا' بھی لکھی ہے۔ ملا سے مراد اقبال کی شاعری میں اسلام کی ظاہر پرستی اور دین کی غلط تعبیر ہے۔ اقبال ملا سے اس لیے نالاں ہیں کہ اس کے یہاں دین کا شعور نہیں ہے۔ وہ محض دین کے نام پر جنگ وجدال کو ہی دین کا حصہ سمجھ رہا ہے۔ خلیفہ عبد الحکیم نے اس کتاب میں اقبال کی ملا پر تنقیدوں کا جائزہ لیا ہے۔ اور اس حوالے سے اقبال کا موقف واضح کیا ہے۔

خلیفہ عبد الحکیم کی اقبال شناسی دیگر اقبال شناسوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر ہے۔ ان کے پیش نظر اقبال کا پورا سرمایہ ہے۔ خواہ وہ نثر کی شکل میں ہو یا نظم کی شکل میں۔ وہ نہ اقبال کے موید بن کر سامنے آتے ہیں اور نہ اقبال شکن۔ انہوں نے اقبال کے بارے میں جو بھی رائے پیش کی ہے وہ ان کے گہرے مطالعہ اور فکر کا حصہ ہے۔

# اسد ملتانی

اسد ملتانی اقبال ناقدین کی اولین پیڑھی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خود بھی شاعر ہیں اور علامہ اقبال کے مداحین میں سے ہیں۔ ان کا خاص کارنامہ حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال کے تنازعہ کے وقت یہ ہے کہ انہوں نے علامہ کی حمایت میں نظمیں لکھیں۔ انہوں نے ملتان میں اقبالیات کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اقبال کی حمایت میں لکھی ان کی یہ نظم کافی مشہور ہوئی۔:

بگفت حضرت اقبال شعر پاک وبلند
کہ عین مظہر عشق محمد ﷺ عربی است[1]

انہوں نے اقبال کی وفات کے بعد جون ۱۹۳۸ء میں 'مرثیہ اقبال' کے نام سے ایک مرثیہ بھی لکھا تھا۔ جس کا دیباچہ غلام پرویز نے لکھا تھا۔ اس کے دیباچہ میں غلام پرویز نے مرثیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔:

''اقبال کا مرثیہ در حقیقت عالم اسلام کی بے کسی اور یتیمی کا مرثیہ ہے۔ اور اسے وہی شخص لکھ سکتا تھا جس کی انگلیاں نبض ملت پر نگاہیں رفتار زمانہ پر ہوں۔ جس کا دماغ حقائق قرآنی سے منور اور قلب درد ملی سے لبریز ہو، یہ توفیق حلقۂ اقبال کے کسی رند سرشار کا حصہ تھی اور ظاہر ہے کہ جناب اسد سے بڑھ کر اس سعادت کا مستحق اور کون ہو سکتا تھا۔''[2]

اسد ملتانی کا ایک مضمون مئی ۱۹۴۱ میں ماہنامہ 'طلوع اسلام' میں 'فیضان اقبال' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں علامہ سے ملاقات کی روداد ہے۔ اس لیے اس کی نوعیت سوانحی ہے۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں 'اقبال، انا اور تخلیق' کے نام سے

---

1 ملتان میں اقبال شناسی، اسد فیض، ص ۱۶

2 ملتان میں اقبال شناسی، ص ۱۶، ۱۷،

معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے 'زبور عجم' کے بعض اشعار کی شرح کی ہے۔ اسد ملتانی چونکہ ایک شاعر ہیں۔ دوران طالب علمی علامہ اقبال نے ان کے کلام کی اصلاح کی تھی۔ یہ اعزاز ان کے عمر بھر کا سرمایہ ہے۔ انہوں نے روح اقبال کے مصنف یوسف حسین خاں پر بھی تنقید کی ہے کہ انہوں نے زبور عجم کے بعض اشعار کی شرح عمدگی سے نہیں کی ہے۔

# سید عبداللہ

اقبال پر کام کرنے والے اہم ناقدین میں سید عبداللہ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اقبالیات پر ان کے مضامین کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:1۔ مقاماتِ اقبال[1]،2۔ طیفِ اقبال[2]،3۔ سہلِ اقبال[3]،4۔ مسائلِ اقبال[4]،5۔ شیخ اکبر اور اقبال[5]،6۔ مقاصدِ اقبال[6]،7۔ مطالعۂ اقبال کے چند نئے رخ[7]،8۔ رمزِ اقبال[98]

---

1 ناشرین لاہور، 1959ء،

2 لاہور اکیڈمی لاہور، 1964ء

3 مکتبہ خیابانِ ادب لاہور، 1969ء

4 مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، 1974ء

5 مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، 1979ء

6 علمی کتاب خانہ لاہور، 1981ء

7 بزمِ اقبال لاہور، 1984ء

8 اسرار بک ڈپو دہلی

9 یہ کتابیں سید عبداللہ نے خود سے ترتیب نہیں دی ہیں بلکہ دوسرے اہل قلم نے جمع کیا ہے۔

سید عبد اللہ کی اقبالیات پر سب سے مشہور کتاب 'مقامات اقبال' ہے۔ مرزا ادیب جو کہ خود نقد ادب کی دنیا میں نقد میر کی وجہ سے اپنی پہچان بنا چکے ہیں، انہوں نے اقبال پر سید عبد اللہ کے متفرق مضامین کو یکجا کر کے 'مقامات اقبال' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ سید عبد اللہ اردو تنقید کا ایک معتبر نام ہے ان کی تنقیدی بصیرت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ہے۔ ان کی تنقید کی سب سے اہم خصوصیت ان کے یہاں پائی جانے والی قطعیت ہے۔ دوسرے ناقدین کے بر خلاف وہ اپنی رائے کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ ان کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے دلائل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

سید عبد اللہ کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں دانشور اقبال اور شاعر اقبال دونوں کی کشمکش جاری ہے۔ وہ کسی ایک پہلو کو دوسرے پر فوقیت دینے پر راضی نہیں ہیں۔ 'مقامات اقبال' میں شامل مضامین کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبال کے دونوں پہلوؤں پر لکھا ہے:

- ✓ اقبال کی فطرت نگاری — فن
- ✓ اقبال شیدائے فطرت یا حریف فطرت — فن
- ✓ مطالعہ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام — فکر
- ✓ اقبال اور صوفی، خودی سے بے خودی تک — فکر
- ✓ اقبال اور حافظ کے ذہنی فاصلے — فکر
- ✓ اقبال شعرائے فارسی کی صف میں — فکر رفن
- ✓ اقبال کا ایک ممدوح۔ نظیری — فکر
- ✓ غالب پیشرو اقبال — فکر
- ✓ اقبال کی زبان — فن
- ✓ اقبال کا سیاسی تفکر — فکر
- ✓ اقبال آج ہی یا کل بھی — فکر
- ✓ یوم اقبال۔ ہجوم یا عکاظ علم و فن — اقبالیات
- ✓ تشریح اقبال — فن
- ✓ اقبال ایک ادبی فن کار — فن

اس طرح ہم دیکھ رہے ہیں کہ پندرہ مضامین میں صرف پانچ 'فن' پر ہیں باقی 'فکر' پر ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جو فن اور فکر دونوں کو محیط ہیں۔ یہی حال ان کی دوسری کتابوں میں شامل مضامین کا بھی ہے۔ اقبالیات کے سرمائے میں سے فکر و فن کو الگ کرنا یوں بھی ایک مشکل امر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کے یہاں فکر اور فن باہم اس قدر مربوط ہیں کہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ بات فن کی ہوتی ہے تو اس کا ایک سرا فکر سے جاملتا ہے۔ یہی حال اقبال کی فکر کے ساتھ بھی ہے۔ اس طرح فکر اور فن کے دھوپ چھاؤں میں اگر کمیت کا اعتبار کیا جائے تو سید عبد اللہ کے یہاں بھی شاعر اقبال پر دانشور اقبال غالب ہے۔

مرزا ادیب نے 'مقامات اقبال' کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> ''اقبال کے جہان شعر کی مختلف منزلوں پر شعر و بصیرت کے قافلے رواں دواں ہیں مگر ابھی چرخ نیلی فام سے پرے اس کی شاعرانہ اختراعات فائقہ کے ایسے دور از چشم جزیرے بھی موجود ہیں جو بدستور دیدہ انتظار وا کیے تازہ دم قافلوں کی راہ دیکھ رہے ہیں اور سید صاحب کی اقبال کے سلسلے میں یہ انتقادی کوشش ایک کاروان سبک گام کا نقشہ پیش کرتی ہے جو راہ و رسم منزلہا سے واقف بھی ہے اور جس کا منتہائے نظر نئے جزیروں کی تلاش بھی ہے۔''[1]

دراصل اقبال جیسے فن کار پر لکھنے کے لیے کسی معذرت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اقبالیات کے اتنے گوشہ ہیں جن پر حقیقی معنوں میں ابھی تک کام ہوا ہی نہیں ہے۔ سہل پسند طبیعت کی وجہ سے اکثر ناقدین انھی گوشوں کو منتخب کرتے ہیں جن پر کام کرنا آسان ہوتا ہے۔ تحقیق کے شیدائیوں کے لیے ابھی بھی اقبال کے یہاں بہت کچھ ہے جو 'دیدۂ انتظار وا کئے' کسی محقق کا منتظر ہے۔

سید عبد اللہ نے اپنے مضمون 'اقبال کی فطرت نگاری' میں فطری مناظر کی عکاسی میں اقبال کی مہارت کا ذکر کیا ہے۔ سید عبد اللہ نے پانچ ایسی نظموں کا ذکر کیا ہے جن میں کسی مخصوص جغرافیائی مقام کی جھلک ملتی ہے۔ وہ مقامات ہیں: ہمالہ،

---

1 سید عبد اللہ ،مقامات اقبال، ص ۲، مرزا ادیب کا مقدمہ ص ۲۔

کنار راوی، کشمیر، ہائڈل برگ، دریائے نیکر اور کوہ سر بن۔ اقبال نے اپنی نظموں میں بے جان مناظر کی پیکر تراشی کر کے ان میں جان ڈالنے کی جو کوشش کی ہے اس کا جواب اردو شاعری میں نہیں ہے۔ سید عبد اللہ نے کلام اقبال سے مثالوں کے ذریعہ ان کی فنی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔

اسی موضوع پر سید عبد اللہ کا ایک مضمون اقبال کے فن کو فکر سے جوڑ کر دیکھتا ہے۔ 'اقبال شیدائی فطرت یا حریف فطرت' میں انہوں نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اقبال ابتداء میں فطرت کے شیدائی تھے لیکن بعد میں ان کے یہاں مقصدیت کا غلبہ آگیا اور وہ تسخیر فطرت کے راستے پر چل پڑے۔ اس طرح وہ شیدائی فطرت سے حریف فطرت بن گئے۔

اقبال اور رومی کا تقابلی مطالعہ دونوں کے فکر اور فن کے نظریوں میں باہمی اتحاد و افتراق کے کئی اہم مباحث کو شامل ہے۔ ہمارے ناقدین کی زیادہ تر کوشش تقابلی مطالعہ میں اقبال کے یہاں رومی سے اخذ و رد کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ سید عبد اللہ نے اپنے مقالہ 'مطالعہ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام' میں ایک نئے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اقبال نے رومی سے استفادہ کیا ہے۔ رومی کا اقبال پر ایک بڑا احسان ہے۔ لیکن اس احسان کا بدلہ اقبال نے اردو میں رومی شناسی کی بنیاد رکھ کر کی۔ اقبال نے رومی کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ان کے افکار کو اردو طبقہ کے درمیان رائج کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ کہنا شاید غلط نہیں ہو گا کہ اگر رومی نے اقبال کے فکر کو چار چاند لگائے ہیں تو اقبال نے بھی رومی کے افکار عالیہ کو بڑی عزت و شان سے دنیا میں متعارف کرایا۔''[1]

'اقبال اور صوفی' اور 'خودی سے بے خودی تک' میں سید عبد اللہ نے تصوف سے متعلق اقبال کے نظریہ اور اقبال کے نظریہ خودی اور بے خودی کا جائزہ لیا ہے۔ دیگر ناقدین کی طرح سید عبد اللہ بھی اس کے قائل ہیں کہ اقبال پہلے وحدت الوجود کے قائل تھے مگر بعد میں انہوں نے اس نظریہ کو ترک کر دیا تھا۔

اس مجموعہ کا ایک اہم مقالہ 'اقبال اور حافظ کے ذہنی فاصلے' ہے۔ 'اسرار خودی' کے دیباچہ میں حافظ کی مخالفت کی وجہ سے اقبال کی مخالفت اور موافقت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ سید عبد اللہ کے یہاں دونوں شخصیتیں محبوب ہیں انہوں

---

1 سید عبد اللہ، مقامات اقبال، ۴۲، چمن بکڈپو، دہلی ۶

نے دونوں کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں کے ذہنی ابعاد کو پیش کیا ہے جس سے اس مسئلہ کی تفہیم ہو جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اقبال اور حافظ کے جھگڑے میں پڑنا اور ان عظیم تلمیذان ربانی کے درمیاں ثالثی کی کوشش کرنا بڑا نازک بلکہ خطرناک کام ہے ایک طرف حافظ ہیں جو صدیوں سے الہام اور تغزل کا سکہ بٹھائے ہوئے ہیں تو دوسری طرف اقبال ہیں جن کے فکر نے ازل کو ابد سے ملانے کی ٹھانی ہے ان سے متعلق مجھ ایسے ہیچمدان کا کچھ کہنا بڑی جسارت ہے، مگر میں دونوں کی عقیدت کا چراغ روشن ہاتھ میں لے کر اس بحر ظلمات میں اترتا ہوں۔''[1]

'غالب پیشرو اقبال' میں انہوں نے اقبال اور غالب میں پائی جانے والی مشابہتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ غالب زمانی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ فکری اعتبار سے بھی اقبال کے پیشرو تھے۔ انہوں نے جن مماثلتوں کو دونوں شاعر کے درمیان دکھایا ہے وہ یہ ہیں: برجستہ اور جوش انگریز اسلوب، ارتقائے حیات کے لیے سخت کوشی اور خاراشگافی، جذبہ و تفکر کا اجتماع، جنوں و اشفتگی کا ایک خاص انداز، خود کا شعور۔ انہوں نے دونوں کی شاعری سے مثالیں پیش کر کے دونوں کے فکر اور فن کی مشترک اور غیر مشترک خصوصیات کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ابھی حال ہی میں رفیع الدین ہاشمی نے سید عبد اللہ کے ان مضامین کو مذکورہ بالا کتابوں میں شامل نہیں ہیں ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ علامہ اقبال: مسائل و مباحث (اقبال کے فکر و فن پر ڈاکٹر سید عبد اللہ کے مقالات)[2] کے نام سے مرتب اسکتاب میں جن مضامین کو شامل کیا گیا ہے وہ ہیں:

شاعر مشرق، علامہ اقبال [فکرِ اسلامی کا علم بردار]، نوائے شاعرِ فردا، نوجوان اور مطالعۂ اقبال، اقبال اور رومی، اقبال کی اردو شاعری، اقبال کی تصانیفِ نظم و نثر میں سائنسی موضوعات، اقبال فہمی کے بنیادی اصول، کچھ تمثیل کے بارے میں (بحوالہ فکرِ اقبال)، مطالعۂ اقبال: چند ضروری پہلو، اقبال [شاعری اور فکر و فن]

---

1 مقامات اقبال، ص ۷۰۔

2 یہ کتاب اقبال اکادمی لاہور سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی ہے۔

نومبر 1974ء سے 8نومبر 1975ء تک پاکستان میں سالِ اقبال منایا گیا۔ ہفت روزہ 'چٹان' لاہور جو شورش کاشمیری کی زیر ادارت شائع ہونے والا اپنے وقت میں مشہور مجلہ تھا اس میں ہر ہفتے سید عبداللہ کا علامہ اقبال پر ایک مقالہ شائع ہوتا رہا۔ کتاب میں مقالاتِ سالِ اقبال کے عنوان کے تحت 46 مقالات شامل کیے گئے ہیں۔ ہر مقالے کے آخر میں مقالے کی تاریخ اشاعت درج کر دی گئی ہے۔ اس حصے میں جو مقالات شائع کیے گئے ہیں ان کے عنوانات درج ذیل ہیں:

مکمل اور حقیقی اقبال کی تلاش میں، ملّی وجود کے تین دشمن، کلام اقبال میں افرنگ کی حیثیت، غلبۂ افرنگ کے تین محاذ، فرنگی سیاست کے معنی؟، فرنگ کے سیاسی نظریے، فرنگی معاشرت: اقوامِ مشرق کی موت، فرنگ کا تیسرا محاذ: فکر و حکمت، فرنگی حکمت کا نقشِ زیبا، کلام اقبال کا مصور: عبدالرحمن چغتائی، حکمتِ افرنگ، فرنگی حکمت کے تاریک پہلو، فرنگ دل کی خرابی... خرد کی معموری، ذکر و فکرِ اقبال کو عام کیجیے، حکمتِ فرنگ کی ایک اور محرومی، مغرب کے سیاسی فکر پر اقبال کی تنقید۔1، مغرب کے سیاسی فکر پر اقبال کی تنقید۔2، پنجاب یونی ورسٹی میں علامہ اقبال کے چند عقیدت مند، اقبال پر ایک کتاب، کلام اقبال بہ ترنم، قومی اقبال کمیٹی کی مجلس عاملہ کی خدمت میں چند مشورے۔1، قومی اقبال کمیٹی کی مجلس عاملہ کی خدمت میں چند مشورے۔2، نظریۂ خودی کی سہل ترین تشریح۔1، نظریۂ خودی کی سہل ترین تشریح۔2، نظریۂ خودی کی سہل ترین تشریح۔3، نظریۂ خودی کی سہل ترین تشریح۔4، دو دن شہر اقبال میں، نظریۂ خودی کی سہل ترین تشریح۔5، خودی کا استحکام: تعلیم و تربیت، خودی کے استحکام میں عقل کا مقام، رموزِ بے خودی یا اجتماعی خودی، ملّت اسلام میں تمدن کی بنیادیں، خودی کا ضعف، اقبال کی خودی... صوفیوں کی بے خودی۔1، اقبال کی خودی... صوفیوں کی بے خودی۔2، نقوشِ اقبال: ایک نیا نقطۂ نظر، ''فلسفہ زدہ سید زادہ'' اور اقبال، اسرارِ معراج اقبال کی نظر میں، عجم و عجمیت اقبال کی نظر میں۔1، عجم و عجمیت اقبال کی نظر میں۔2، عجم و عجمیت اقبال کی نظر میں۔3، اقبال در راہِ مولوی، اقبال و تصوف، علامہ اقبال اور تصوف، اقبال کے معاشی تصورات۔1، اقبال کے معاشی تصورات۔2

علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر ہر ہفتہ ایک مضمون لکھنا ایک مشکل امر ہے اس کو سید عبداللہ جیسا شخص ہی انجام دے سکتا ہے۔ ان مضامین میں جو تنوع اور فکر کی رنگارنگی ہے وہ سید عبداللہ کا ہی خاصہ ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی اقبال شناسی پر روشنی ڈالتے ہوئے کتاب کے مقدمہ میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی رقمطراز ہیں:

> ''ڈاکٹر سید عبداللہ کا تعلق اقبال شناسوں کے اُس گروہ سے تھا جس میں سر عبدالقادر، غلام رسول مہر، خلیفہ عبدالحکیم، یوسف حسین خاں، نذیر نیازی، خواجہ عبدالوحید، بشیر احمد ڈار، عزیز احمد اور ممتاز حسن جیسے سربر آوردہ

مشاہیر ادب شامل تھے۔ سید صاحب اپنے مذکورہ بالا معاصرین میں اس لیے بھی ممتاز و منفرد مقام رکھتے تھے کہ انہوں نے فکرِ اقبال کو نہ صرف قرطاس و قلم کے ذریعے اجاگر کیا، بلکہ ایک طویل عرصے تک وہ اپنے عالمانہ اور دل نشیں لیکچروں کے ذریعے تعلیماتِ اقبال کو اپنے سیکڑوں اور ہزاروں طلبہ وطالبات کے دل ودماغ میں اتارتے اور انہیں اقبال آشنا کرتے رہے... انہوں نے اقبال کے فکر وفلسفے اور شاعری پر صرف مضامین اور کتابیں ہی نہیں لکھیں، اقبالیاتی کانفرنسوں اور جلسوں کا اہتمام بھی کیا، اقبال پر تقریریں کیں، اقبال میموریل لیکچر دیے، اقبالیاتی نصابات مرتب کرکے فکر وشعر اقبال کو جامعاتی سطح پر تدریسِ اردو اور تدریسِ فارسی کا حصہ بنایا،۔۔۔۔انہوں نے خود بھی سالہا سال تک ایم اے اردو جماعتوں کو اقبالیات کا درس دیا۔ طلبہ و طالبات سے بعض اقبالیاتی موضوعات پر تحقیقی مقالات تیار و رقم کرائے۔ جب کبھی اور جہاں کہیں اقبال پر کوئی اعتراض وارد ہوا، سید صاحب نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بڑی حکمت کے ساتھ محکم اور قوی دلائل کے ذریعے ان اعتراضات کو رفع کردیا... غرض پایانِ عمر وہ اقبالیات کے علم بردار کے طور پر ایک شارح اور مبلغ و مفسر کا کردار ادا کرتے رہے۔"[1]

سید عبداللہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ ان کی کتابیں اقبالیاتی ادب میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

1 ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال :مسائل و مباحث (اقبال کے فکروفن پرڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالات) کا مقدمہ

# میکش اکبر آبادی

میکش اکبر آبادی کا شمار اہم ترین ناقدینِ اقبال میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب 'نقد اقبال' کو بوجوہ اقبالیات میں شہرت حاصل ہے۔ اصل میں اس شہرت کی وجہ اس کے اندر اقبال کے تعلق سے پیش کیے گئے خیالات کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے اس سے پہلے یہ خیالات آج کل میں یکم فروری اور ۱۵ فروری ۴۶ کے شماروں میں ''علامہ اقبال کے متضاد نظریے'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ جس کا جواب محمد دین تاثیر مرحوم نے مئی اور جون کے شماروں میں دیا۔ اس مباحثے میں غلام محمد بٹ اور بشیر مخفی القادری اور مسعود حسین نے بھی حصہ لیا تھا اور اس کا جواب آج کل میں ہی دیا۔[1]

میکش اکبر آبادی کہتے ہیں کہ انہیں اس جواب سے تسلی نہیں ہوئی اس وجہ سے انہوں نے ایک مفصل کتاب لکھنی چاہی تا کہ اقبال کے تضادات کو پیش کیا جاسکے۔ ان کی نظر میں اقبال کے شارحین اور ناقدین کے یہاں پائے جانے والے اختلافات کی وجہ خود اقبال ہیں۔ دراصل خود اپنے نظریات کے بارے میں تضادات کے شکار تھے۔ کبھی کچھ کہتے تھے اور کبھی کچھ۔ میکش اکبر آبادی نے خاص طور پر اقبال کے فلسفۂ تصوف کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے اقبال کے کلام، خطوط اور خطبات کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال نے اگرچہ شروع میں بے زاری کا اظہار کیا تھا مگر وہ بعد میں اس کے قائل ہوگئے تھے۔ تصوف کی حمایت میں اقبال کے حوالوں کو درج کرنے کے بعد کہتے ہیں:

> ''وحدۃ الوجود کے متعلق علامہ کے خیالات آپس میں متضاد معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ علامہ اپنے ابتدائی دور میں وحدۃ الوجود کے مخالف تھے۔ جسے اسرار خودی کا زمانہ کہنا موزوں ہوگا۔ اس وقت ان کا خیال تھا کہ تصوف اور خصوصاً وحدۃ الوجود کا عقیدہ نفی خودی کا مترادف ہے۔ اور جب انہوں اپنے خیال کے خلاف واقعہ ہوئے کا علم ہو گیا تو انہوں نے صراحت سے وحدۃ الوجود کی تائید فرمائی۔ تاریخی ترتیب سے بھی وحدۃ الوجود کی

---

1 نقد اقبال، میکش اکبر آبادی، ص ۱۲، نیز پروفیسر عبدالحق اقبال کے ابتدائی افکار ص ۲۹،۳۰،

موافقت وحدۃ الوجود کی مخالفت سے مؤخر ہے جو اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ علامہ نے اپنے پہلے خیالات سے رجوع فرمالیا ہے۔'' [1]

اس خیال کا اظہار کرنے والے میکش اکبر آبادی اکیلے نہیں ہیں۔ اقبال کے متصوفانہ افکار کا مطالعہ کرنے والوں پر یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اقبال کی شاعری میں تصوف کی حمایت اور مخالفت دونوں قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں۔ لیکن ایک فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اقبال نے جس شدت سے تصوف کے خلاف لکھا ہے اس کی حمایت میں کبھی نہیں لکھا۔ تصوف کی حمایت میں اقبال کے جو بھی اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں وہ علامہ اقبال کے تصوف کی حمایت میں کوئی بیان نہیں ہے۔ بلکہ ان کے کلام میں تصوف کے اثرات کی تلاش ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ اقبال نے جب تصوف کے خلاف اتنے سخت جملے کہیں ہیں کہ 'تصوف کا وجود اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے' تو اس سے رجوع کی صورت میں کہیں تو اقبال اپنے رجوع کا اعلان کرتے۔ یا تصوف وجودی اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ جہاں تک اقبال کے اشعار اور خطبات سے اقتباسات جمع کرنے کی بات ہے تو یہ اقبال پر تصوف وجودی کے اثرات ہیں۔ اقبال جنہوں نے ابتدائی شاعری میں تصوف کے اثرات کی وجہ سے شاعری کی ہو۔ بعد کے زمانہ میں بھی اس کے اثرات غیر محسوس طریقے پر ان کے یہاں آ گئے ہوں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اقبال کا نظریہ تصوف کے حوالے سے وہی مانا جائے گا جو انہوں نے صراحت کے ساتھ اسرار خودی کے دیباچہ میں بیان کیا ہے۔ اس وجہ سے میکش اکبر آبادی اور وہ ناقدین جو اقبال کے بارے میں رائے رکھتے ہیں کہ وہ بعد پھر تصوف وجودی کی طرف چلے گئے تھے نا قابل قبول ہے۔

پروفیسر عبدالحق میکش اکبر آبادی کی کتاب پر نقد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''نقد اقبال' ایک خیال افروز کتاب ضرور ہے۔ مگر اقبال کی غلط تاویلات کا مجموعہ بھی ہے۔ دور از کار توجیہات کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ وحدت الوجود کے مخالف ہونے باوجود آخر میں اس کے قائل ہوئے اور خدا کی مطلقیت پر زور ختم ہو گیا۔ حالاں کہ دونوں باتیں غلط ہیں خدا کی مطلقیت پر ان کا ایقان بڑھتا گیا۔ جس کی غلط تعبیر کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی۔'' [2]

---

1 نقد اقبال ص ۲۶

2 فکر اقبال کی سرگزشت ص ۱۴۱

میکش اکبر آبادی سے متاثر ہو کر بعد کے ناقدین نے بھی یہ رائے پیش کی ہے۔ سعید اکبر آبادی نے اس حوالے سے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اقبال تصوف وجودی کے پہلے موافق تھے۔ پھر مخالف ہوئے اور آخر میں اس کے موافق ہوئے۔ یہی نظریہ یوسف سلیم چشتی نے بھی بیان کیا ہے۔

میکش اکبر آبادی کی کوشش اس لحاظ سے ستائش کی مستحق ہے کہ انہوں نے پہلی بار اقبال کی شاعری اور فلسفہ میں پائے جانے والے تضادات کو تحقیقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ جس کے نتیجہ میں اقبال ناقدین کا گروہ اس جانب متوجہ ہوا کہ ان تضادات کی توجیہ پیش کرے۔ اقبال کے تضادات پر پہلے بھی لکھا گیا تھا۔ مگر اس طرح سے منظم انداز میں پہلی کوشش تھی۔ اس وجہ سے اس کی آواز دور تک سنائی دی۔

# علی سردار جعفری

علی سردار جعفری کا شمار ترقی پسند ناقدین میں ہوتا ہے۔ وہ ابتدا سے لے کر زندگی کے آخری پڑاؤ تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ سردار مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ ترقی پسند تنقید کے علاوہ ان کی شاعری بھی ترقی پسندی کی معراج سمجھی جاتی ہے۔ دیگر ترقی پسندوں کی طرح سردار کو بھی اقبال سے کئی شکایتیں تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب 'ترقی پسند ادب' میں اقبال کے فکر وفلسفہ کی سخت تنقید کی ہے۔ ان کے یہ اعتراضات کوئی نئے نہیں ہیں اس سے پہلے بھی ناقدین نے اقبال پر یہ اعتراض کیا ہے۔ لیکن سردار جیسے عبقری ناقد کے قلم سے نکلی اس تنقید کی گونج دور تک سنائی دی۔

انہوں نے اقبال کے شاہین پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اقبال کا شاہین بہادر بھی ہے اور خوں خوار بھی۔ درویش بھی ہے اور بگلا بھگت بھی"[1]

وہ اقبال اور مسولینی کے فکر میں یکسانیت پر لکھتے ہیں:

" اقبال کا بھی وہی خیال ہے جو مسولینی کہا کرتا تھا۔"
'جنگ لہو گرم رکھنے کا اک بہانہ ہے" [2]

وہ مزید لکھتے ہیں:

---

1 ترقی پسند ادب از سردار جعفری ص ۱۱۳

2 ترقی پسند ادب ص ۴۹

''اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور کی ابدالی نپولین کی اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا اور اقبال کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو آخری شکل میں فاشسٹ وڈکٹیٹر کا روپ دھار لیتا ہے۔۔۔۔۔۔۔'' [1]

سردار کے ان خیالات کی ترقی پسند تحریک کے اندر اور باہر مخالفت ہوئی۔لوگوں نے اس پر تنقیدیں لکھیں۔ترقی پسند نقاد سید احتشام حسین نے بھی اس کا جواب دیا ہے،وہ لکھتے ہیں:

''فاشزم کی پیدائش سے بہت پہلے اقبال نے اپنے خودی کا تصور اور مرد کامل کا نظریہ مکمل کر لیا تھا۔اقبال کے بعض خیالات اور فاشزم میں جو ایک قسم کی یکسانیت پائی جاتی ہے اس کا سبب دونوں کے پیش کردہ سماجی نظام کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے میں نہیں ڈھونڈنا چاہیے بلکہ وہ چیز انحطاط پذیر نظام زندگی میں روح پھونک کر زندہ و برقرار رہنے کی کشش میں ملے گی۔انہیں قوت اسلئے پسند نہ تھی کہ وہ فاشسٹ تھے بلکہ اس لیے کہ وہ مسلم قوم میں اتنی طاقت دیکھنا چاہتے تھے کہ انہیں اپنی آزادی کے ساتھ اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی اور اپنے تمدن کی تشکیل کرنے پر قدرت حاصل ہو'' [2]

اقبال کے بارے میں سردار کے یہ متشددانہ افکار بعد میں اقبال کی شاعری کے اعتراف کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔انہوں نے اس کا کفارہ اقبال شناسی لکھ کر کیا۔یہ سردار جعفری کا اقبال کی شاعری اور فکر وفلسفہ کے بارے میں یوٹرن (U turn) نہیں ہے۔اصل میں انہوں نے جن امور میں اقبال کی سخت تنقید کی ہے ان میں سے اکثر کو انہوں نے اپنی کتاب میں چھیڑا ہی نہیں ہے۔انہوں نے اقبال کے ان پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے جو ان کی نظر میں اقبال شناسی میں مثبت اہمیت کی حامل ہیں۔البتہ جن باتوں پر انہیں اعتراض ہے یا تو اسے اس کتاب میں بیان نہیں کیا ہے یا پھر ضمنی طور پر اس سے گزر گئے ہیں۔مثلاً اقبال کے یہاں پائے جانے والے تضاد کو انہوں نے بیان کیا ہے۔لیکن ساتھ میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ان کا موضوع نہیں ہے:

---

1 (ترقی پسند ادب ص ۱۱۴

2 روایت اور بغاوت ص ۱۰۸

''شاعر مشرق کی فکر میں بہت تضادات ہیں جو ان کے عہد کی دین ہیں ان کا مطالعہ میری پیش نظر کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان تضادات سے اقبال کی عظمت اور اہمیت میں کمی نہیں ہوئی۔ اس قسم کے تضادات طا اسطائی کے یہاں بھی ملتے ہیں جن کی طرف لینن نے اشارہ کیا ہے اور اقبال کے عظیم ہم عصروں کے یہاں بھی عام ہیں۔ لیکن ان پر کام نہیں کیا گیا ہے۔''[1]

انہوں نے 'اقبال شناسی' کا مقصد 'ان ترقی پسند پہلوؤں کی نشاندہی' قرار دیا ہے جن کے بغیر اقبال کو سمجھنا مشکل ہے۔ وہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'اقبال کو ان کے عہد نے پیدا کیا تھا لیکن وہ اپنے عہد سے بڑے تھے۔ وہ مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو اور ٹیگور کے ہم عصر تھے۔ لیکن اپنے عہد سے بڑے تھے۔ ان چاروں کی بلند قامت پر چھائیاں مستقبل کی صدیوں پر پڑ رہی ہیں۔ جب ہندستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش میں اشتراکیت اور جمہوریت کا مکمل جشن منایا جائے گا تو ہماری کھیتیاں ان بزرگوں کے فکری آبشاروں سے سیراب ہو کر لہلہائیں گی۔'[2]

سردار نے لوگوں پر سخت تنقید کی ہے جو اقبال کو فرقہ پرست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کو عالمی شاعر قرار دیا ہے 'کیوں کہ ہندوستان اور ایشیا کی مسلم بیداری عالم انسانیت کی بیداری کا ایک حصہ ہے'۔ اس وجہ سے اقبال کو فرقہ پرست نہیں کہا جا سکتا۔ سردار نے عہد اقبال میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں پائی جانے والی بیداری اور ان کے اسباب و عوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال نے بھی اگر اس وقت مسلم قوم کی بیداری کا بیڑا اٹھایا تو اس میں غلط کیا ہے۔

اقبال شناسی میں سردار کا تحقیقی ذہن بھی سامنے آتا ہے۔ لفظ انقلاب کو اس کے مخصوص معانی میں استعمال کرنے کے پس منظر پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ اقبال نے سب سے پہلے روسی انقلاب کے بعد ۱۹۱۷ء میں زبور عجم میں استعمال کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اقبال کے یہاں مستعمل تین الفاظ فرنگ، مغرب اور یورپ کے بارے

---

1 اقبال شناسی، ص ۱۲ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۶ء

2 اقبال شناسی، ص ۲۰،

میں اپنی تحقیق پیش کی ہے کہ یہ تینوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے مراد اقبال کے یہاں مغربی اقدار واصاف کے پیکر مراد ہیں انہیں وہ بعض جہتوں سے ناپسند کرتے تھے۔

سردار نے اقبال کی شاعری کے مغربی سرچشموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے اقبال کے استاد آرنلڈ سے لے کر گوئٹے اور ٹینی سن تک کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اقبال اور ان مغربی شعرا کے حوالے پیش کر کے ان کے درمیان مماثلت اور افکار و نظریات کی ترسیل کا ذکر کیا ہے۔

اقبال کے تصور وقت کے متعلق سردار کا کہنا ہے کہ اس کے تین عناصر ہیں: پہلا عنصر اسلامی ہے جس کی بنیاد دو حدیثیں اور امام شافعی کا قول ہے، دوسرا قدیم ایران ہے، یہ عنصر جاوید نامہ میں ملتا ہے۔ تیسرا عنصر برگساں کے فلسفے کا ہے۔ جس کا اثر 'بال جبریل' کی نظم ساقی نامہ میں ملتا ہے۔[1]

اقبال شناسی اگرچہ ایک مختصر کتاب ہے لیکن اس کے باوجود اپنے مشمولات اور اقبالیات پر اس سے پڑنے والے اثرات کی وجہ سے ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ سردار نے تین الگ الگ موضوعات پر مضامین کو جمع کیا ہے۔ شاعر مشرق، اقبال اور فرنگی اور اقبال کا تصور وقت۔ اگر دیباچہ کو بھی ایک مضمون مان لیا جائے تو اس ایک سو گیارہ صفحات کی کتاب کے مضامین کی تعداد چار ہوتی ہے۔ اس میں اگر پہلے دو مضامین میں تسلسل تلاش کر لیا جائے کہ ایک میں سردار نے اقبال کو ایشیائی اور مسلم بیداری کے شاعر کے طور پر پیش کیا ہے تو دوسرے میں انہوں نے اقبال کی مغرب سے اخذ و رد کی روداد بیان کی ہے۔ لیکن ان کا تیسرا مضمون الگ نوعیت کا ہے۔ اس کے لکھنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سردار کی نظر میں اقبال کے فکر و فلسفہ کو سمجھنے کے لیے اقبال کے تصور زمان و مکان کو سمجھنا ضروری ہے۔

علی سردار جعفری ایک ترقی پسند ناقد ہیں وہ ادب کو اسی عینک سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں کلام اقبال میں اشتراکی عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

1 اقبال شناسی ص ۱۰۵، ۱۰۶

''اقبال شاعر تھے اور شاعر کی حیثیت سے انقلاب روس جیسے عظیم تاریخی واقعے سے جذباتی طور پر متاثر ہو جانا کوئی حیرت ناک بات نہیں ہے، لیکن انقلاب روس اور کمیونزم میں اقبال کی دلچسپی وقتی نہیں تھی یہ ہوا کا گزرتا ہوا جھونکا نہیں تھا جس کو شاعر نے ایک لمحے میں محسوس کر کے فراموش کر دیا ہو۔ یہ نظام فکر اقبال کے تخیل کو مسلسل مہمیز کرتا رہا، انھوں نے اس کے حق میں بھی جادو بیانی کی اور اس کے بر خلاف بھی اظہار خیال کیا لیکن 1917ء کے بعد 1938 تک وہ کبھی اس کی طرف سے بے اعتنائی کا انداز اختیار نہ کر سکے، اقبال کی عمر کے یہ آخری اکیس سال ان کی شعری اور تخلیقی زندگی کے سب سے زیادہ بار آور اور ثمر بار سال رہے ہیں۔''[1]

سر دار جعفری نے اقبالیاتی تحقیق پر زیادہ نہیں لکھا ہے لیکن جو بھی لکھا ہے اس میں ان کا محکم تنقیدی شعور جھلکتا ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبال کو بھی ترقی پسندی کے خول میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال دراصل انہیں اسی لیے پسند آئے کہ ان کا لہجہ بعض معاملوں میں ترقی پسندوں سے بھی زیادہ کھرا ہے۔

---

1 اقبال اور مغرب مرتبہ سرور ص 127

# سید شوکت سبز واری

شوکت سبز واری اردو کے محقق و ناقد کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ وہ ایک ساتھ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور سنسکرت زبانوں کی معرفت کی وجہ سے ان کا رجحان لسانیات کے تقابلی مطالعہ کی طرف ہوا۔ انھوں نے اقبالیات پر کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اقبالیات پر ان کا جو بھی سرمایہ ہے وہ مضامین کی شکل میں ہے۔ جو ان کی تنقیدی کتابوں 'معیار ادب' اور نئی پرانی قدروں' میں موجود ہے۔

شوکت سبز واری اقبال کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اقبال کی مختلف الجہات شخصیت کو تسلیم کرتے ہوئے اقبال کی کسی ایک حیثیت کے انکار کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ اقبال کو قومی شاعر قرار دینے والے کچھ ناقدین نے ان کو ملی شاعر ماننے سے انکار کیا ہے۔ وہ اقبال کو بحیثیت مجموعی مطالعہ کا موضوع بنانے کی افادیت پر زور دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کی یہ رائے اپنے آپ میں توجہ کے قابل ہے لیکن اقبال کا جزئیاتی مطالعہ کرنے والوں میں سے کم ہی لوگ ایسے ہیں جو اقبال کی دوسری حیثیتوں کے منکر ہیں۔ ایسا ضرور ہوا ہے کہ جن لوگوں نے اقبال کی قومی شاعری پر لکھا ہے تو انھوں نے اقبال کی ملی شاعری کو وہ توجہ نہیں دی۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اس بات کا انکار کر رہے ہیں کہ اقبال کی شاعری کا ایک پہلو ان کی ملی شاعری بھی ہے۔ شاعر اور شعر کی پسند اور ناپسند میں ہر شخص کے اپنے ، ، عصبات ہوتے ہیں۔ کسی کو اقبال اس وجہ سے اچھے لگتے ہیں کہ انھوں نے وطن کا نغمہ گایا تو کسی کو اس لیے کہ ان کا ملی شعور سے ہم آہنگ ہے۔ یہ ، ، عصبات تنقیدی تحریروں میں ترجیحات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تنقید کی دنیا میں اس کی گنجائش ہے اور رہے گی۔

شوکت سبز واری کی نظر میں اقبال کے فلسفہ حیات کی روح توازن ہے۔ وہ اقبال کو ایک آفاقی شاعر مانتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون 'اقبال: آفاقی شاعر' میں اقبال کی آفاقیت کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اقبال اس وجہ سے آفاقی شاعر نہیں ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کو ملک کی سرحدوں سے آزاد وسیع تر مفہوم میں ملت کو لیا ہے بلکہ:

''وہ اپنے وسیع بالاتر اور بلند تر نقطۂ نگاہ کے اعتبار سے آفاقی ہے۔ ملک و ملت کے رنگارنگ استوار رشتوں کے باوجود اقبال نے وحدت انسانیت کا خواب دیکھا۔ اس نے اپنے ملک کو بھی چاہا۔ اپنی ملت سے بھی لو لگائی اور انسان سے بھی استوار رہا۔''[1]

شوکت سبزواری اقبالیات پر توجہ نہیں دے سکے اس کے باوجود ان کی تحریروں کو اقبالیات کے ابتدائی نقوش کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے۔

1 بحوالہ خیابان اقبال، پشاور، مرتبہ: محمد طاہر فاروقی، خاطر غزنوی، ۱۹۶۶ء

# آل احمد سرور

علی سردار جعفری نے اپنی کتاب 'اقبال شناسی' کے شروع میں آل احمد سرور کا ایک شعر لکھا ہے:

ہماری فکر بھی اقبال کے شعلے سے روشن ہے

اسی کے فیض سے روشن ہمارے خون کی لالی

سرورؔ اس واسطے سردارؔ سے مجھ کو محبت ہے

کہ ہم دونوں ہیں گو مجرم مگر مجرم ہیں اقبالی

آل احمد سرور نے اس شعر میں بڑے فخر سے خود کو 'اقبالی مجرم' کہا ہے۔ اس سے علامہ اقبال سے ان کی عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال پر لکھنے والوں نے اپنی تحریروں کی ابتدا اقبالیاتی ادب کے ایک بڑے حصے کے غیر معیاری ہونے کے شکوہ کے ساتھ کیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان شکوہ کنان کی بھی بیشتر تحریریں تمام دعووں کے باوجود اسی زمرے میں رکھنے کی قابل ہیں۔ اگر اقبالیاتی ادب کو چھلنی سے چھانا جائے اور اس کے اندر سے کار آمد مواد کو الگ کیا جائے تو یقینی طور پر ان میں ایک اہم نام پروفیسر آل احمد سرور کا بھی ہوگا ۔ آل احمد سرور نے یوں تو اقبالیات پر بہت زیادہ نہیں لکھا۔ چند مضامین ہیں جن کو انہوں نے ایک مجموعے میں ' دانشور اقبال ' کے نام سے جمع کر دیا ہے۔ لیکن یہ مجموعہ مضامین اقبالیات کی ضخیم کتابوں پر اپنی افادیت اور ہمہ گیریت کے لحاظ سے فائق ہے۔ اس کے علاوہ 'اقبال کے مطالعے کے تناظرات ' کے

نام سے بھی اقبالیات پر ان کے کچھ مضامین ہیں۔ زہرا معین نے 'عرفان اقبال' کے نام سے سرورؔ کے مضامین اقبال کو ۱۹۷۷ء میں جمع کر کے شائع کیا ہے۔[1]

آل احمد سرور نے اپنی تحریروں میں اقبال کی فکر اور فن دونوں کو اہمیت دی ہے۔ لیکن ان کا رجحان اقبال کے فکری پہلو کی طرف زیادہ ہے۔ اپنے مجموعۂ مضامین کا نام 'دانشور اقبال' رکھنے میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔اس کے باوجود انہیں اس بات کا احساس ہے کہ اقبال کے فن پر گفتگو کم ہوئی ہے اس وجہ سے یہ موضوع بھی ان کی نظر میں توجہ طلب ہے۔

وہ' دانشور اقبال' کے' ابتدائیہ 'میں اقبالیاتی ادب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'اقبال سے اس قدر شغف میں اقبال شناسی کی لے کس حد تک ہے اور اقبال کو کھونٹی بنا کر اپنی قبا ٹانگنے کا رویہ کس قدر؟ میرا خیال ہے کہ اردو تنقید میں چونکہ ابھی تک تشریح یا تحسین یا پھر تنقیص کا رویہ زیادہ عام ہے اس لیے اقبال کا حق ابھی تک ادا نہیں ہوا۔ کسی بڑے شاعر کے مطالعے میں پہلی چیز یہ دیکھنی ہوتی ہے کہ وہ کیا لکھتا ہے اور کس طرح کہتا ہے۔ اس جملے کے پہلے پر زیادہ ہی توجہ ہوئی ہے۔ مگر دوسرے پر [illegible] کم دھیان دیا گیا ہے۔''[2]

وہ مزید لکھتے ہیں:

''جہاں تک ان کے فلسفے کا سوال ہے، اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اسے اقبال کی دانشوری کو سمجھنے اور ان کی شاعری کے لیے سمت اور ایک منزل کو دریافت کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اقبال ایک اہم فلسفی ہیں۔ مگر انہیں بڑا مفکر نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن بلاشبہہ وہ بڑے شاعر ہیں اور ان کی جگہ میر وغالب کی صف میں ہے۔''[3]

---

1 ان کتابوں میں بھی تقریباً وہی مضامین ہیں جو سرور نے خود دانشور اقبال کے نام سے شائع کیا ہے۔

2 دانشور اقبال ص ۶ آل احمد سرور ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ اشاعت ۲۰۰۲ پہلی اشاعت ۱۹۹۴

3 دانشور اقبال ص ۸

گویا کہ ان کی توجہ فلسفی اقبال سے زیادہ شاعر اقبال پر ہے۔ وہ اقبال کے فلسفے کو ان کی دانشوری کی تفہیم کا ایک وسیلہ سمجھتے ہیں۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ 'دانشور اقبال' میں خالص فنی مباحث کو موضوع بحث بنانے والے مضامین ہی شامل کیے گئے ہیں۔ مثلاً 'خطابت شاعری اور اقبال' ؛ 'اقبال کا کارنامہ اردو غزل' ؛ 'غزل کی زبان اور اقبال کی غزل کی زبان' اور 'اقبال کا فن ایک عمومی جائزہ' وغیرہ۔ کچھ مضامین انہوں نے اقبال کی نظموں کے تجزیاتی مطالعہ کے لیے بھی خاص کیا ہے۔ جیسے: 'خضر راہ' اور 'اقبال ہمالہ سے شعاع امید تک'۔ ان مضامین سے ایک بات واضح ہے کہ آل احمد سرور اقبال کی شاعری پر بھی اتنی ہی توجہ دیتے ہیں کہ جتنی کہ ان کے فن پر۔ وہ اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے اکہرے پن کا شکار نہیں ہوتے۔

آل احمد سرور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے یہاں قطعیت کی کمی ہے۔ وہ ایک جگہ جو بات کہتے ہیں بعد میں اسی کی تردید کرتے ہیں۔ کلیم الدین احمد نے آل احمد سرور پر اس وجہ سے سخت تنقید کی ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''آل احمد سرور پر ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ' کوئی بات واضح اور دوٹوک نہیں کہتے، وہ ایک ہی سانس میں ہاں اور نہیں دونوں کہہ جاتے ہیں۔، چنانچہ ایک جملہ میں 'اقبال شاعر تھے، فلسفی نہیں تھے۔' کہتے ہیں تو دوسری جگہ خود اس کے مخالف بات کہتے ہیں۔ 'میں کہہ چکا ہوں کہ اقبال فلسفی تھے۔'[1]

آل احمد سرور پر یہ الزام کلیم الدین احمد نے لگایا ہے۔ لیکن کسی بھی ناقد کی دو الگ الگ تحریروں کو ان کے سیاق سے الگ کرکے ایک جگہ رکھ کر یہ الزام عائد کیا جاسکتا ہے۔

اقبال پر سرور نے بھی مضامین لکھے اور کلیم الدین احمد نے بھی ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ لیکن ان دونوں کی اقبال پر لکھی گئی تنقید میں جو فرق ہے وہ ان کے تنقیدی نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ سرور فن پارہ کو آپریشن ٹیبل پر رکھی بے جان لاش نہیں مانتے ہیں۔ وہ اس کو ایک زندہ جسم مان کر اس کے روح میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آل احمد سرور کا دفاع کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

---

1 آل احمد سرور۔ ایک ناقد کامل، کتاب نما آل احمد سرور نمبر ص ۳۶، ۳۷

'آل احمد سرور، کلیم الدین احمد کے بر خلاف ادبی تنقید میں فتوے اور فیصلے کو صحیح نہیں سمجھتے، وہ سختی سے ڈانٹنا نہیں چاہتے، لطیف طریقے سے سمجھا دینا کافی خیال کرتے ہیں اور اصلاح مذاق اور پرورش ذوق کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔۔۔۔ پھر سرور صرف اصلاح کے علم بردار ہیں، کلیم الدین احمد کی طرح ان کا نصب العین کوئی انقلاب نہیں۔''[1]

آل احمد سرور قدر شناسی کے قدیم اصولوں کو رد کرتے ہوئے اقبال کی تحریروں کے ساتھ انصاف کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کا معاملہ اقبال کی پرستش نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں خود ان اصولوں کی پاسداری نہیں کر پاتے ہیں جس کی وہ دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ اقبال کی دانشوری پر گفتگو کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اقبال نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی ایک حساس، بیدار مرتب اور منظم ذہن کا لافانی نقش چھوڑا۔ اس کی قدر تو بہت ہوئی مگر اس کا عرفان عام نہ ہو سکا۔ کیونکہ برصغیر میں وہ ذہن جو ہندوستانی مسلمانوں کی پونجی ہے اور وہ تہذیبی میراث جو اردو ادب کے ذریعہ عام ہوئی ہے، ابھی تک پرستش کی دلدادہ ہے، عرفان کی نہیں، تحسین کی قائل ہے تجزئے کی عادی نہیں، ساحل سے نظارہ کرتی ہے اور سمندر میں نہیں اترتی، اسے صدف سے مطلب ہے گہر سے نہیں۔''[2]

آل احمد سرور کے مذکورہ اقتباس پر گفتگو کرتے ہوئے ابوالکلام قاسمی رقمطراز ہیں:

''اس بیان میں بیان کا لطف ضرور موجود ہے۔ پورے مصـ ـون میں خود بھی تجزیہ اور تحلیل سے سروکار نہیں رکھا گیا ہے۔ سرور صاحب اقبال کے افکار کا ذکر تو بار بار کرتے ہیں، لیکن اسرار خودی، رموز بے خودی، جیسی نظموں اور شاعرانہ فکر سے آگے جانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ سرور صاحب خود بھی اقبال کی مابعد الطبعیاتی فکر اور خطبات کی طرف مشکل سے متوجہ ہوتے ہیں۔''[3]

---

1 احمد سرور۔ ایک ناقد کامل، کتاب نما آل احمد سرور نمبر ص ۳۶

2 دانشور اقبال آل احمد سرور ص:

3 معاصر تنقیدی رویے از ابوالکلام قاسمی ص ۱۳۷، ۱۳۸ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

سرورؔ کی اقبال تنقید کو پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اقبال کی شاعری سے ہی زیادہ سروکار رکھتے ہیں۔ اقبال کے خطوط اور دوسری نثری تحریروں کو وہ مقام نہیں دیتے ہیں۔ حالانکہ اقبال کی فکر کی تفہیم کے لیے ان کی نثری تحریریں زیادہ کار آمد ہیں۔

دوسرے ناقدوں کی طرح آل احمد سرور بھی اقبال کے تصور عشق کے تعلق سے خلط مبحث کا شکار معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کبھی اقبال کے عشق کو اردو اور فارسی شعرا سے مختلف بیان کرتے ہیں کبھی اسے غیر جنسی کا نام دیتے ہیں اور بعض دفعہ اس کا سرچشمہ بعض صوفی شعرا کو قرار دیتے ہیں۔

حقیقی بات یہ ہے کہ اقبال کا تصور عشق اردو اور فارسی کے شعرا سے مختلف ہے۔ اس لیے اس عشق کے سرچشموں کے لیے صوفیانہ اور مجازی تصور سے الگ سیاق وسباق میں دیکھنا ہوگا۔

آل احمد سرور کی تنقید کی خامی کہہ لیں یا خوبی جس پر تنقید کی جاتی رہی ہے وہ ہے ان کی شاعرانہ تنقید۔ اس تعلق سے قاسمی لکھتے ہیں:

> '' یہ باتیں شاعرانہ اس لیے نہیں معلوم ہوتیں کہ یہ سرور صاحب کی اپنی اختراع نہیں بلکہ یہ تمام نکات اقبال کے مختلف اشعار کو نثری شاعری بنا کر پیش کرنے کی مثالیں ہیں۔ سرور صاحب کی تنقید میں جس آرائشی رائے زنی کو متعدد نقادوں نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے اس کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ بسا اوقات اچھے اشعار کی تعین قدر کے بجائے وہ اپنی نثر میں شعری خیالات کو تبدیل کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرق کار کو ادبی تنقید کا نعم البدل سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔'' [1]

اس زمرہ میں صرف سرورؔ ہی نہیں بلکہ یوسف حسین کی تنقید کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اگر غور سے اقبال ناقدین کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں 'یہ عیب' بڑی شدت سے محسوس کیا جائے گا۔ سچ پوچھیں تو یہ عیب نہیں ہے۔ ناقدین اقبال نے اسی طریقے پر اقبال کے کلام کی تشریح کی ہے۔

---

1 معاصر تنقیدی رویے ص ۱۴۲

اقبال کی سیاسی زندگی پر بہت ساری گفتگو کی گئی ہے۔ کئی ناقدین نے انہیں ایک بڑا سیاست داں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جاوید اقبال نے 'زندہ رود' میں اقبال کی سیاسی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی تفصیل سے بیان کرکے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ وہ ایک کامیاب سیاست داں تھے۔ مگر آل احمد سرور نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اقبال بڑے شاعر تھے، ممتاز فلسفی تھے، مگر جیسا کہ عظیم حسین نے اپنے والد سر فضل حسین پر کتاب میں لکھا ہے، سیاست کے مرد میدان نہ تھے۔"[1]

آل احمد سرور اقبال کو پاکستان کا بانی نہیں مانتے۔ یہ مسئلہ اقبال کے ماہرین کے یہاں ہمیشہ سے نزاع کا باعث رہا ہے۔ آل احمد سرور نے ٹامسن کے نام اقبال کے اس خط کا حوالہ دیا ہے جو انہوں نے ۱۹۳۴ء میں لکھا تھا۔ اس میں اقبال نے لکھا ہے "وہ شمال مغربی ہندوستان کی ایک ریاست جو مسلم اکثریت پر مشتمل ہوگی، ہندوستان کے وفاق کے اندر چاہتے ہیں۔"[2] لیکن اس کے ساتھ آل احمد سرور اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ان خطوط کی اصل موجود نہیں ہے۔ البتہ نذیر نیازی کی کتاب 'اقبال کے حضور' میں ایک حوالہ ملتا ہے کہ اقبال سے نیازی نے ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ اس سے مراد پاکستان تو نہیں ہے تو اقبال نے کہا تھا کہ 'پاکستان ہی سمجھ لو۔'[3] آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ 'پاکستان کا لفظ اقبال کی تحریروں میں شاید ہی ملے۔'[4]

آل احمد سرور اقبال کو ایک اسلام پسند اور نئی مشرقیت کا علم بردار شاعر مانتے ہیں۔ اقبال مکمل طور پر جمہوریت کے مخالف نہ تھے۔ ان کی مخالفت صرف اس وجہ سے تھی کہ جمہوریت میں اکثریت کی آمریت کا خطرہ رہتا ہے۔

---

1 دانشور اقبال ص ۱۰

2 دانشور اقبال ص ۹

3 دانشور اقبال ص ۱۰

4 دانشور اقبال ص ۱۰

آل احمد سرور، اقبال کو سرسید تحریک کی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ سرسید ہی کی تحریک تھی جس نے ماضی کی گرفت سے آزاد ہونے اور حال سے آنکھیں چار کرنے کا ہنر سکھایا۔ سرسید کے بعد برپا ہونے والی ہر تحریکیں کہیں نہ کہیں سرسید سے متاثر ہے۔ سرسید نے اردو دنیا اور مسلمانوں کو حالی اور شبلی جیسے دانشور دیئے۔ آل احمد سرور کی اس بات میں جزوی سچائی ہے کہ ''سرسید اور حالی نہ ہوتے تو اقبال نہ ہوتے ''[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی تربیت جس نہج پر ہوئی تھی اور انہیں جن اساتذہ کی رہنمائی ملی تھی اس سے بہت ممکن ہے کہ سرسید نہ بھی ہوتے تو اقبال انہیں خطوط پر اپنا کام کرتے۔ ان کی شخصیت میں خاص ردوبدل نہ ہوتی۔

آل احمد سرور اقبال کی دانشوری کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''دانشوری، میرے نزدیک روشن خیالی کا دوسرنام ہے اور اس کے لیے فن کار کی خلوص اور سماج کی انجمن دونوں پر نظر رکھنا ہے۔ اقبال نہ بنیاد پرست ہیں نہ طاقت پرست۔ وہ خدامست اور انسان پرست ہیں اور ایک اخلاقی اور آسمانی شعور کے ذریعہ سے انسانیت کی بیداری اور جمعیت اقوام کے بجائے جمعیت آدم پر زور دیتے ہیں۔''[2]

آل احمد سرور نے 'عصر حاضر میں قدروں کا بحران اور اقبال' میں اقبال کی اخلاقی تعلیمات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال کو اسلامی معاشرے میں پائے جانے والے جمود کا احساس تھا۔ وہ اس کی اصل وجہ تقلید قرار دیتے ہیں۔

علامہ اقبال اور تصوف کا موضوع کافی متنازع فیہ رہا ہے۔ اقبال کی زندگی میں ہی اسرار خودی میں اقبال کے حافظ پر ریمارکس کی وجہ سے علماء کا ایک طبقہ علامہ اقبال کے خلاف صف آرا ہو گیا تھا۔ اس تعلق سے علامہ اقبال کی خواجہ حسن نظامی اور دوسرے اہل علم سے خط وکتابت اور بحث و مباحثے بھی ہوئے۔ اقبال کی موت کے بعد بھی یہ سلسلہ برقرار رہا۔ اقبال کے تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ اقبال کو تصوف پر نہیں بلکہ خانقاہیت پر اعتراض تھا:

---

1 دانشور اقبال ص ۱۹

2 دانشور اقبال ص ۲۵

''اقبال کو تصوف کی روایت ورثہ میں ملی تھی، انگلستان جانے سے پہلے وہ حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضر ہوئے تھے، بزرگوں اور درویشوں سے انہیں بڑی عقیدت تھی اور ان کی زندگی میں باوجود نشیب و فراز کے ایک درویشانہ بے نیازی ملتی ہے انہیں تصوف پر نہیں بلکہ خانقاہیت پر اعتراض تھا''۔[1]

آل احمد سرور کی خوش بختی ہے کہ انہیں اقبال کا زمانہ نصیب ہوا۔ اقبالیات سے دلچسپی ان کے یہاں اقبال کے زمانے ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ انہوں نے اقبال سے خط و کتابت بھی کی تھی۔ ان کا ایک خط ماہ نو کراچی میں ۱۹۴۹ء میں ان کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے اس خط کا خلاصہ بھی لکھا تھا جو مندرجہ ذیل ہے:

''بارہ سال کا عرصہ ہوا جب میں نے اقبال کو ایک خط لکھا تھا۔ اس خط میں بہت سے سوالات تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اول تو اشتراکیت اور فاشزم سے متعلق ان کی رائے دریافت کی تھی۔ دوسرے بعض نظموں میں جو تضاد نظر آتا ہے اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ تیسرے خاص طور پر 'بال جبریل' میں مسولینی پر جو نظم ہے اس پر اعتراض کیا تھا اور اس کا مقابلہ ضرب کلیم کی نظموں سے کرکے دونوں کا فرق ظاہر کیا تھا، اس زمانے میں میرا ادبی شعور خاصا خام تھا۔ اقبال کا کلام بہت پڑھا تھا، مگر شروع سے آخر تک باقاعدہ مطالعہ نہ کیا تھا ان کے لکچر نہ دیکھے تھے۔ اقبال کا قائل ہونے کے باوجود ان کے یہاں فاشزم کے اثرات جابجا نظر آتے تھے۔ اس لیے یہ خط لکھا گیا تھا۔''[2]

آل احمد سرور کا یہ اعتراف ان اقبال شناسوں کے لیے باعث عبرت ہے جو اقبال کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کیے بغیر نہ صرف اقبال پر لکھنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں بلکہ اقبالیاتی ادب کو ہر قسم کی رطب و یابس تحریروں سے گدلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبالیاتی ادب کی ایک بڑی مقدار کے غیر معیاری ہونے کی وجہ یہی سہل پسندی ہے۔ اقبال کی جملہ تحریریں خواہ وہ خطبات کی شکل میں ہوں، خطوط کی شکل میں ہوں، یا فارسی اور اردو شاعری کی شکل میں ہوں۔ ان کا مطالعہ کیے بغیر پورے اقبال کا ادراک ناممکن ہے۔ اقبالیاتی ادب کی اکثر تحریریں اسی وجہ سے اکہرے پن کا شکار ہیں۔

---

1 اقبال اور تصوف ص 204

2 نئے تنقیدی رویے ص ۱۳۴، ۱۳۵

پروفیسر آل احمد سرور کی یہ خط وکتابت اقبال کی وفات سے ایک سال پہلے کی ہے۔ جواب میں اقبال نے ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء کے جوابی خط میں انہیں اپنے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کو کہا اور چند ضروری مباحث کی وضاحت بھی کی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آل احمد سرور نے اس کے بعد اقبال کی تحریروں کو از سر نو پڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی تحریروں میں پایا جانے والا تشکیک ختم ہو گیا اور بعد کی تحریروں میں ایک خاص قسم کا اعتماد اور حسن نظر آتا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اقبال کی شاعری کو فنی لحاظ سے جانچنے کے لیے اس کا موازنہ میر وغالب سے کیا ہے۔ وہ اقبال کے اسلوب کو غالب سے قریب مانتے ہیں:

> ''اقبال کا اسلوب میر کے اسلوب سے مختلف ہے اور اسے میر سے نہ بہتر کہا جا سکتا ہے اور نہ کمتر، دونوں کی حیثیت، مزاج اور تجربے میں فرق ہے۔ یہ غالب کے اسلوب سے مماثلت رکھتا ہے کیوں کہ اردو شعراء میں اقبال غالب سے سب سے زیادہ قریب اور ایک معنی میں ان کے سچے خلیفہ ہیں، گو انہوں نے بیعت حالی سے کی اور حالی کے مقصدی، اصلاحی اور پیامی نقطۂ نظر سے اثر قبول کیا۔''[1]

آل احمد سرور اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے اپنی چیئر مین شپ میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اقبال پر کئی اہم سمینار کرائے۔ یہ سبھی سمینار اقبال تنقید کو نئی پیش رفت دینے میں معاون ثابت ہوئے۔ ان سمیناروں کی خاص بات یہ رہی ہے کہ ان میں اہم ناقدین اقبال کو مقالہ کے لیے دعوت دی گئی۔ مقالات کے بعد ان پر گفتگو بھی ہوئی۔ بعد میں ان سبھی مقالوں کو مقالات پر مباحث کے ساتھ شائع کیا گیا۔ ان مقالات کو مرتب میں کرنے میں آل احمد سرور نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ سمینار کے مقالوں پر مشتمل کتابیں جو آل احمد سرور نے مرتب کی ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں:

---

1 سرور، اقبالیات ص 32

'تشخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال' ، 'اقبال اور تصوف'، 'اقبال اور اُردو نظم'، 'جدیدیت اور اقبال'، 'اقبال کا نظریہ شعر اور شاعری'، 'اقبال کے مطالعے کے تناظرات'، 'اقبال اور مغرب' اور 'عرفانِ اقبال'۔ آخر الذکر کتاب کی ترتیب میں زہرہ معین نے بھی آل احمد سرور کے ساتھ تعاون کیا۔[1]

اقبال اور مغرب کے تعلق سے بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض لوگ اقبال کی ہر فکر کا رشتہ مغرب سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہیں ایک طبقہ اقبال کو مغرب بیزار اور ہر مغربی فکر پر نقد کرنے والا ثابت کرنے پر آمادہ ہے۔ آل احمد سرور اس سلسلے میں ایک معتدل رائے پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں:

''اقبال کی اہمیت اور معنویت آج اس لیے زیادہ ہے کہ وہ مغرب پرستی کی رو میں مغرب پر تنقیدی نظر بھی ڈالتے ہیں۔ مانگے کے اجالے کے بجائے اپنے ہی تجلی زار سے مشرق کے سیہ خانے کو روشن کرنا چاہتے ہیں۔''[2]

علامہ اقبال کے مغرب کے تئیں رویے پر اظہار خیال کرتے ہوئے پرفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''مغرب کے تئیں اقبال کا رویہ سطحی یا یک رخی نہیں، بلکہ متضاد اور پیچیدہ رہا ہے، یہ ایک ایسے زندہ شاعر کا رویہ ہے، جو کٹرپن سے پاک ہے جو صدیوں کی تہذیبی اور اخلاقی قدروں کا پروردہ ہے، اور جسے جدید مغرب کے نام نہاد جمہوریت، قومیت، اشتراکیت اور فسطائیت جیسے بسیار شیوہ اظہارات کا سامنا ہے، لیکن وہ مغرب سے حذر نہیں کرتا، بلکہ تخیل کی عبادت کے ساتھ ساتھ ایک دانشور اور مصلح کے فرائض بھی انجام دیتا ہے، ایلیٹ نے کہا ہے کہ سچی شاعری یقیناً تمدن کی صحت کی طرف متوجہ ہوتی ہے، اقبال بھی تمدنی بحالی کے خواب دیکھتے ہیں، وہ ان خوابوں کی شکست کا دکھ بھی سہتے ہیں، لیکن خواب دیکھنے کے عمل سے باز نہیں آتے۔''[3]

آج کی اس تیز رفتار زندگی میں جب ہر طرف لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا مسئلہ در پیش ہو تو ایسے میں مذہبی اور لسانی تشخص سے بڑا مسئلہ انسانی تشخص کا ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں اسلامی تشخص پر کافی زور دیا ہے۔ اس کا

---

1 یہ سبھی کتابیں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر سے شائع ہوئی ہیں۔ اس میں شامل سرورؔ کے سبھی مقالے دانشور اقبال میں شامل ہیں۔

2 آل احمد سرور اقبال اور مغرب ص 6

3 اقبال اور مغرب ص 20

مطلب یہ نہیں کہ وہ انسانی تشخص کے مسئلہ پر زور نہیں دیتے، وہ اسلامی تشخص اور انسانی تشخص کو ہم معنی سمجھتے تھے ۔اقبال کی نظر میں اسلامی تشخص کی قربانی دے کر زندگی گزارنا موت کے برابر ہے۔ تشخص کی تلاش اور اس کی بقا کے لیے جدوجہد کو علیحدگی پسندی نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ کثرت میں وحدت ہندوستانی سماج کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اقبال اسی کی تعلیم دے رہے ہیں۔جب مسئلہ تشخص کا ہوگا تو اقبال کے ہم عصر مولانا آزاد کا نظریہ بھی تشخص کے سلسلہ میں زیر غور ہوگا۔اس لیے کہ اس زمانہ میں یہی دونوں شخصیات ہندوستانی مسلمانوں کے دل و دماغ کی رہنمائی کررہی تھیں۔ پروفیسر آل احمد سرور دونوں کے نظریۂ تشخص میں فرق کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''مولانا آزاد اور اقبال دونوں میں اسلامی تشخص پر اصرار مشترک ہے اور اس تشخص کو کسی طرح مجروح کرنے یا مدھم کرنے کی بھی دونوں مخالفت کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اقبال اسلام کے روحانی اور اخلاقی مشن کی تکمیل کی خاطر اس ملک یا اس ملک کے علائق یا اس کے سماجی خیر کے تقاضوں کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ وہ ایک آفاقی مشن کو ایک مخصوص علاقے کی سماجی مشن پر فوقیت نہیں دیتے ہیں۔ مولانا آزاد کے نزدیک دونوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے اور دونوں بیک وقت اور یکساں قوت کے ساتھ بروئے کار رہ سکتے ہیں۔''[1]

آل احمد سرور کے نزدیک مولانا آزاد کے یہاں تشخص خاص کر اسلامی تشخص پر وہ زور نہیں ملتا جو اقبال کے یہاں ملتا ہے۔

آل احمد سرور ان اقبال شناسوں میں ہیں جنہوں نے اقبال پر بہت کم لکھا ہے۔ ان کی اکثر تحریریں سمینار کے ریسرچ پیپر ہیں۔ لیکن وہ جب بھی لکھتے ہیں تو موضوع کا مکمل احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے اکثر مضامین اپنے آپ میں ایک مکمل کتاب کا درجہ رکھتے ہیں۔ اقبال پر ہی نہیں بلکہ انہوں نے مستقل طور پر کوئی تنقیدی کتاب نہیں لکھی۔ ان کا کل سرمایہ چند مضامین کا مجموعہ ہیں جو انہوں نے مختلف سمیناروں میں پڑھے یا پھر مختلف مواقع پر لکھے۔ بعد میں ان مضامین کو یکجا کرکے 'دانشور اقبال'، 'اقبال کے مطالعے کے تناظرات' اور 'مسرت سے بصیرت تک' کے نام سے شائع کردیا گیا۔ اسی وجہ سے آل احمد سرور پر یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ وہ مکمل ناقد نہیں ہیں کیوں کہ ان کی کسی خاص موضوع پر مستقل تصنیف نہیں ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے آل احمد سرور کا دفاع کرتے ہوئے انہیں اردو کا ٹی۔ایس۔ ایلیٹ قرار دے ڈالا:

---

1 تشخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال مرتب آل احمد سرور، 1984ص 10

''سرورؔ نے ٹی، ایس، ایلیٹ کی طرح اپنے مضامین و مقالات ہی سے وہ کام کر ڈالا ہے جو دوسرے لوگ کتابیں اور تصنیفیں مرتب کر کے نہیں کر پائے ہیں۔ کسی بھی کام میں اصل اہمیت مقدار کی نہیں، معیار کی ہے، جو سرورؔ نے نہ صرف اپنی تنقید میں پیش کیا ہے بلکہ اردو ادب میں قائم کیا ہے۔''[1]

پروفیسر عبد المغنی چاہے جتنا دفاع کر لیں، آل احمد سرور کو خود اس بات کا احساس تھا کہ انہوں نے کوئی ٹھوس علمی کام نہیں کیا ہے۔ قدرت نے انہیں جو صلاحیتیں اور مواقع دیئے تھے اس کے مقابل ان کا علمی سرمایہ بہت قلیل ہے۔ عمر کے آخری پڑاؤ میں پہنچ کر جب انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو 'خواب ابھی باقی ہیں'[2] میں انہیں اپنے کارنامے گنانے کے لیے زیادہ چیزیں نہیں ملیں۔

اس کے باوجود آل احمد سرور نے اقبالیات پر جو کچھ بھی لکھا ہے اس کے اندر ان کی عبقریت کی چھاپ واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اردو میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کو لوگ اس کثرت سے کوٹ کرتے ہوں۔

---

1 آل احمد سرور۔ ایک ناقد کامل کتاب نما آل احمد سرور نمبر ص ۳۵، دسمبر ۱۹۹۲

2 آل احمد سرور کی خود نوشت سوانح حیات۔

# منشی عبدالرحمان

منشی عبدالرحمن ایک عالم دین اور داعی ہیں۔ انہوں نے دینی موضوعات کے علاوہ اقبالیات پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی کتاب 'اقبال اور مسٹر' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی جس میں انہوں خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب 'اقبال اور ملا' کا جواب دیا ہے۔ انہوں نے اقبال کی نظموں، مکاتیب اور کتابوں کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم نے علماء کے بارے میں جو بھی لکھا ہے وہ ان کی اپنی رائے ہے، علامہ کا اس کے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''خلیفہ صاحب جس نظریہ کو اقبال کا نظریہ ظاہر کر رہے ہیں وہ فی الحقیقت اقبال کا نظریہ نہیں بلکہ وہ خود خلیفہ صاحب کا نظریہ ہے جسے وہ اقبال کی آڑ میں پیش کر رہے ہیں۔ علماء جن اصولوں پر پاکستان کی بقا و تہذیب کے خواہاں ہیں انہی اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی اقبال بھی دعوت دیتے ہیں۔''[1]

انہوں نے علامہ پر مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کے مضامین کی خاص بات یہ ہے کہ یہ دفاعی نوعیت کے ہیں یا اقبال پر لکھی گئی بعض تحریروں کی تردید کی ہیں۔ اپنے مضمون 'مظلوم اقبال' میں انہوں نے مجلہ 'طلوع اسلام' سے علامہ اقبال کے تعلق اور غلام احمد پرویز کے عقائد کے بارے میں پائے جانے والے ابہام کو رفع کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے مختلف اہل قلم کے مضامین کو 'اقبال کی کردار کشی' کے عنوان سے جمع کر کے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ ان مضامین میں ان افراد اور اداروں کا محاکمہ کیا گیا ہے جو اقبال کے نام پر اپنی روٹیاں سینکتے ہیں یا اقبال کی کردار کشی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے سلیم احمد پر بھی کڑی تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سلیم احمد نے 'اقبال ایک شاعر' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جو اس نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ اقبال نے جو کچھ لکھا یا کہا وہ ان کی ذاتی زندگی کی ناکامیوں، بے عملی، جذبہ کی کمی اور مستقل خواہشات کی کمی کا نتیجہ ہے اور اپنے ترکش کا

---

1 اقبال اور مسٹر، عبدالرحمن منشی، ص ۱۶، گوشہ ادب لاہور، ۱۹۵۵ء

آخری تیر علامہ اقبال کی عظمیت واہمیت کو داغ دار کرنے کے لیے یہ چھوڑا کہ اقبال جنس اور جبلت سے خائف تھا۔"[1]

اس کے بعد وہ سلیم احمد کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علامہ اقبال قدرت کا ایک عطیہ تھے جو اکثر وبیشتر ایسے وقت میں ملتا ہے کسی قوم کے قوی واعضاء مضمحل اور مفلوج ہو جاتے ہیں۔ اس میں از سر نو ایک نئی روح پھونکنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال کو شروع سے فکر رساعطا ہوئی تھی۔ ارباب قضاوقدر شروع سے ان کی نگرانی کر رہے تھے کیوں کہ اس سے تعمیر ملت کا کام لیا جانے والا تھا۔ آپ کو متوازن طبیعت عطا ہوئی تھی۔ آپ کی فکر و نظر میں کوئی افراط و تفریط نہ تھی۔"[2]

سلیم احمد کے اعتراضات اپنی جگہ، عبدالرحمن منشی نے اس کا جواب جس انداز میں دیا ہے وہ کسی بھی صورت میں علمی نہیں ہے۔ علامہ اقبال ایک انسان تھے یہ تحریر ان کو انسانیت سے اٹھا کر نبیوں کی صف میں بٹھانے کی کوشش ہے۔ اس کو لائق ستائش نہیں کہا جاسکتا ہے۔

اقبالیات پر ان کی دونوں کتابیں دفاعی نوعیت کی ہیں۔ اقبالیات میں جہاں اقبالیات کے تفہیم و تجزیہ پر مشتمل کتابوں کی ضرورت ہے وہیں کچھ ایسی کتابوں کی بھی ضرورت ہے جو اقبال پر اٹھنے والے اعتراضات کا جواب بھی دیں۔ یہ کتابیں اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے ہیں۔

---

1 علامہ اقبال کی کردار کشی، عبدالرحمن منشی، ص ۱۸، جاوید اکادمی، ملتان، ۱۹۸۸ء

2 علامہ اقبال کی کردار کشی، ص ۱۸

# سید ابوالحسن ندوی

سید ابوالحسن علی میاں ندوی ایک عالم دین اور مذہبی رہنما کی حیثیت سے عالم اسلام میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ وہ عابد خشک نہیں بلکہ ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ وہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی ادبی روایت کے امین ہیں۔ ان کی تحریروں اور تقریروں کی اثر انگیزی کا راز جذبہ کے خلوص کے علاوہ ادبیت بھی ہے۔

سید ابوالحسن ندوی کی اقبال میں دلچسپی دونوں کے مزاج میں یکسانیت کی وجہ سے ہوئی۔ اقبال نے امت کی جس نشاط ثانیہ کی کوشش کی تھی وہ وہی تھے جس کے علم بردار سید ابوالحسن ندوی بھی تھے۔ اسی ذہنی یگانگت کی وجہ سے انہوں نے سولہ سال کی عمر میں اقبال سے ۱۹۲۹ء میں ایک شائق اقبال کی حیثیت ملاقات کی تھی۔ وہ 'میرا تعلق اقبال اور ان کے فن سے' میں لکھتے ہیں:

> "اقبال کو پسند کرنے کے اسباب بہت ہوسکتے ہیں اور ہر شخص اپنی پسند کے مختلف وجوہ بیان کر سکتا ہے، انسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے دل کی زبان پانے لگتا ہے، انسان بہت خود بین اور خود پسند واقع ہوا ہے۔ اس کی محبت اور نفرت تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور بڑی حد تک اس کی ذات ہی ہوتی ہے، اس لیے اسے ہر وہ چیز اپیل کرتی ہے، جو اس کی آرزوؤں کا ساتھ دے سکے اور اس کے احساسات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ میں بھی اپنے کو اس کلیہ سے الگ نہیں کرتا میں نے کلام اقبال کو عام طور پر اسی لیے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اترتا اور میرے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ میرے فکر و عقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بلکہ اکثر میرے شعور اور احساسات کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے۔
>
> سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے، جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہی تینوں کا دخل پاتا ہوں، میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیار بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر انفس و آفاق کے لیے ابھارتا ہے جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت و

ابدیت پر ایمان لاتا ہے۔میری پسند اور توجہ کا مرکز اسی لیے ہیں کہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گزشتہ کے لیے سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت ووطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت واسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔''

مذکورہ بالا اقتباس میں مصنف نے اقبال سے اپنی ذہنی وجذباتی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔یہ صرف اقبال کی پسندیدگی کا اظہار ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اقبال کی شاعری کی خصوصیات کا بھی بیان ہے۔اس تحریر سے مولانا کا خطیبانہ اسلوب بھی کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ ایک مقرر کی طرح اپنی بات کو مختلف پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ خطیبانہ اسلوب کی سب سے اہم خاصیت مترادفات کا کثرت سے استعمال ہے جو مولانا کہ اس تحریر میں واضح ہے۔سید ابوالحسن ندوی کو اقبالیات کے ماہر کی حیثیت سے شہرت ان کی عربی کتاب 'روائع اقبال' کی وجہ سے ملی جس کا اردو ترجمہ شمس تبریز نے 'نقوش اقبال' کے نام سے کیا ہے۔اس کتاب کو لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'ہمیں یہ بات کھٹکتی تھی کہ ٹیگور، اقبال کے مقابلے میں بلاد عربیہ میں زیادہ روشناس ہیں، اور مصر وشام وغیرہ کے عرب ادیب ان کے عام طور پر گرویدہ ہیں، ہم اس صورت حال کو اپنی ہی کوتاہی کا نتیجہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اقبال کو متعارف نہیں کرایا عربی ۔مجلات میں ٹیگور وغیرہ پر جب کبھی ہم تعریفی مقالات دیکھتے تو اقبال کے عربی ترجمہ کا عزم تازہ ہوجاتا اور اسے اپنے ذمہ قرض سمجھنے لگتے۔''[1]

مولانا کا مقصد روائع اقبال سے علامہ اقبال کے پیغام سے عرب دنیا کو متعارف کرانا تھا، اس میں شامل سبھی مضامین اقبال کے فکر وفلسفہ کا احاطہ کرتے ہیں۔ مولانا نے اقبال کے کلام کے ان حصوں کی تشریح کو زیادہ اہمیت دی جو ان کے مزاج اور پیغام سے زیادہ مطابقت رکھتے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کے پورے پیغام کا خلاصہ امت مسلمہ کو خواب سے بیدار کرنا تھا۔ وہ کبھی نوجوانوں کو خطاب کرتے ہیں، کبھی علماء سے اور کبھی کسی مخصوص طبقہ کو بھی انہوں نے اپنے کلام میں مخاطب کیا ہے۔عالم عرب سے اقبال کا خطاب اسی قسم میں آتا ہے۔ عرب چونکہ اردو زبان سے نابلد ہیں اس وجہ سے اقبال کا کلام ان تک پہنچانے کی ذمہ داری اسی طبقہ کی ہے جو عربی اور اردو دونوں زبانوں سے واقف ہونے کے

---

1 نقوش اقبال، مولانا سید ابوالحسن ندوی، ص ۳۴، مجلس نشریات اسلام ، کراچی، پاکستان، طبع چہارم

ساتھ دونوں زبانوں کا ادبی ذوق بھی رکھتا ہو۔ بلاشبہ اس شرط پر سید علی میاں ندوی پورے اترتے ہیں۔ انہوں نے مختلف مواقع پر عربی میں اقبال پر جو مضامین اور سمینار پیپر لکھے اس کو انہوں نے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''یہ کتاب ان مضامین اور خطبات کا مجموعہ ہے، جو عرب نوجوانوں، اور عرب ممالک کے فضلاء، اور اقبال کے نادیدہ قدر دانوں، اور ان کے کلام کے شائقین کے لیے تیار کیے گئے تھے، اور ان کا مقصود ان لوگوں کو کلام و پیام اقبال سے آشنا کرنا تھا، جو فارسی، اردو سے نابلد ہیں، اور جن کے لیے عربی زبان کے سوا افہام و تفہیم کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔''[1]

نقوش اقبال کی حیثیت ادبی سے زیادہ دعوتی ہے۔ یہ اس کتاب کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔ کیوں کہ اقبال کا مقصد بھی یہی تھا۔ وہ اپنے کلام کی مقصدیت پر اصرار کرتے تھے۔ فاضل مترجم نے بھی کتاب کی اسی حیثیت کا اعادہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ کتاب اقبالیات میں کوئی اہم اضافہ تو نہیں لیکن اقبال کے شائقین کی دلچسپی کی چیز ضرور ہے اور اپنے بعض پہلوؤں خصوصاً دعوتی طرز فکر کی صحت اور ذوق کی اسلامیت کے لیے ممتاز ہے، ویسے بھی اقبال کے سلسلے میں کوئی حرف آخر کہنے کا دعویٰ کیا بھی نہیں جاسکتا۔''[2]

سید ابوالحسن ندوی سے پہلے کلام اقبال کا عربی ترجمہ عبدالوہاب عزام نے بھی کیا۔ یہ ترجمہ بھی عمدہ تھا۔ مولانا کشادہ دلی سے اس کی افادیت کے قائل ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ انہیں اس ترجمہ سے تشنگی کا احساس ہوا۔ اصل میں انہوں نے اقبال کے کلام کا منظوم ترجمہ کرنا چاہا تھا، منظوم ترجمہ کی اپنی حد بندیاں ہیں۔ اس کی وجہ سے کلام اقبال کی مکمل ترسیل عربی میں نہ ہو سکی۔ مولانا چاہتے تو کلام اقبال کا صرف عربی ترجمہ کر دیتے لیکن انہوں نے کلام اقبال کا ترجمہ کرنے کے بجائے کلام اقبال کے روح کو عربوں کے دلوں میں بٹھانے کی کوشش کی۔ اس میں انہیں کامیابی بھی ملی۔ 'روائع اقبال' کا تعارف کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

---

1 نقوش اقبال ص ٦

2 نقوش اقبال ص ٣٠۔

''روائع اقبال" کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس کے اولین مخاطب عرب تھے اور یہ انہیں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی، اس لیے اس میں اقبال کے کلام کے وہ حصے خصوصیت سے لیے گئے تھے جو عربوں سے متعلق تھے، مثلاً "بلاد عرب کے نام" پس چہ باید کرد" کی نظم، "حرفے چند باامت عربیہ" کا ترجمہ ہے، مسجد قرطبہ، ذوق وشوق، طارق کی دعا، ابو جہل کی نوحہ گری، جاہلیت کی بازگشت بھی عربوں سے متعلق ہے، لیکن عجم کے صاحب ذوق بھی ان سے پورالطف اٹھاسکتے ہیں۔''[1]

'روائع اقبال' کا اردو ترجمہ شمس تبریز نے کیا ہے۔ یہ محض ترجمہ ہی نہیں ہے اس کے اندر انہوں نے خود سے بھی تھوڑا بہت اضافہ کیا ہے۔ یہ اضافہ دو نوعیت کا ہے۔ پہلا: علامہ کے اشعار سے بعض مثالوں کو انہوں نے اپنی صواب دید کے مطابق زائد کر دیا ہے۔ دوسرا اضافہ انہوں نے کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے تین مضامین کو شامل کر لیا ہے۔ 'روائع اقبال' کے ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ کتاب پڑھنے والے کو کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اصل کتاب نہیں پڑھ رہا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''اس موقعہ پر اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ لائق مترجم نے (جو دبستان اقبال کے ایک لائق طالب علم اور تربیت یافتہ ہیں) اشعار کی مناسب تشریح، اور جابجا کچھ نئے اشعار کا اضافہ کر کے کتاب کی تاثیر و دل آویزی میں اضافہ کر دیا، اور اس کے حسن کو بڑھا دیا ہے۔'' [2]

گویا کہ 'نقوش اقبال'، 'روائع اقبال' کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے اسے اردو داں طبقہ کے لیے قابل قبول بنایا گیا ہے۔ مکمل 'نقوش اقبال' شمس تبریز کا ترجمہ نہیں ہے۔ اس میں کچھ مضامین کا ترجمہ دوسرے مترجمین کی کاوشوں کا بھی نتیجہ ہیں۔ چنانچہ "انسانِ کامل اقبال کی نظر میں" اور "شخصیت اقبال کے تخلیقی عناصر" کا ترجمہ جناب طیب صاحب عثمانی ندوی نے کیا ہے، جو ان کی کتاب "حدیثِ اقبال" سے لیے گئے ہیں، "اقبال درِ دولت پر" کا ترجمہ مولانا محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی" کے قلم سے ہے جو "کاروان مدینہ" سے لیا گیا ہے۔

---

1 نقوش اقبال ص ۲۹

2 نقوش اقبال ص ۷

اقبال کی شخصیت کے تشکیلی عناصر پر مولانا نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا اقبال کے اساتذہ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن ان کا ماننا ہے کہ اقبال کی شخصیت سازی یونیورسٹی اور کالج سے زیادہ جس ادارے میں ہوئی 'وہ دل کا مدرسہ اور ضمیر ووجدان کا دبستان ہے۔ وہ ایک ایسا مدرسہ ہے جہاں روحانی پرداخت اور الٰہی تربیت ہوتی ہے۔'[1] گویا کہ وہ اقبال کی وجدانی صلاحیتوں کے زیادہ معترف ہیں، وہ اقبال کے پانچ تخلیقی عناصر بتاتے ہیں:

''وہ تخلیقی عناصر جنہوں نے اقبال کی شخصیت کو بنایا بڑھایا اور پروان چڑھایا وہ دراصل اقبال کو اپنے داخلی مدرسہ میں حاصل ہوئے۔ یہ پانچ تخلیقی عناصر ہیں جنہوں نے اقبال کی شخصیت کو 'زندہ جاوید' بنادیا۔''[2]

ان پانچ عناصر کے تفصیلی بیان میں مولانا کی اقبال فہمی کا جوہر کھل کر سامنے آتا ہے انہوں نے کلام اقبال کا مطالعہ کر کے ان کی شخصیت کے جن تشکیلی عناصر کی نشاندہی کی ہے وہ ہیں: ایمان ویقین، قران مجید، عرفان نفس، آہ سحر گاہی اور مولانا رومی کی مثنوی معنوی۔ یہ صرف پانچ تخلیقی عناصر کا بیان نہیں ہے بلکہ اقبال کی ان سرچشموں کی دریافت ہے جس نے اقبال کو اقبال بنایا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اقبال کے فکری مآخذ میں عام طور پر قرآن اور مغربی فلسفہ کو ترجیحی طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ مولانا نے قرآن سے بھی زیادہ ایمان ویقین کو حیثیت دی ہے۔ اس لیے کہ ایمان ویقین کے بغیر قرآن سے استفادہ ممکن نہیں۔ ایمان ہی وہ سرچشمہ جو انسان کو ذات وصفات، کائنات اور کلام پاک میں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ مولانا مغربی فلسفہ کو اقبال کے فکری سرچشمہ کے طور پر بیان نہیں کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال نے مغرب سے جو استفادہ کیا ہے وہ الگ نوعیت کا ہے۔ انہوں نے مغربی افکار کو اسلامی فلسفہ کے ترازو میں تول کر ان ہی امور کو اپنایا ہے جو ان کی نظر میں اسلامی روح کے عین مطابق ہے۔ اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال نے مغربی اساتذہ اور مغربی فلسفہ سے خوشہ چینی نہیں کی ہے۔ فنون لطیفہ کے بارے میں اپنے نظریات یا اسلامی نظریات کے بجائے اقبال کے کلام سے استشہاد کیا ہے۔ یہ کتاب اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ادب کو ادب کی طرح ہی دیکھتے ہیں۔ نہ کہ اس کو زبردستی اسلامیانے کی کوشش کرتے ہیں۔اقبال اور فنون لطیفہ کے بارے میں لکھتے ہوئے انہوں

---

1 نقوش اقبال ص۵۴

2 نقوش اقبال ص ۵۵

نے اقبال کا نظریہ بیان کیا ہے کہ وہ جمال کے ساتھ جلال کے قائل ہیں، اقبال نے تمثیل کی اس لیے تنقید کی ہے اس میں انسان کی خودی مجروح ہوتی ہے۔

'نقوش اقبال' دراصل ایک تنقیدی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ اقبال کے افکار وخیالات کی آسان الفاظ میں تشریح ہے۔ اس کے بیان میں انشاپرداز اور مقرر ندوی کے قلم کا حسین امتزاج ہے۔ اقبال کے اسلوب کے بارے میں بھی یہ بات ثابت آتی ہے، ان کا اسلوب بھی خطیبانہ ہے، مولانا ایک مبلغ کی حیثیت سے دینا میں متعارف ہیں، انہوں نے اس کتاب میں اقبال کے کلام کے حوالے سے وہی کام لیا ہے۔

اقبال کا تصور انسان کامل ایک ایسا موضوع ہے جس پر ترقی پسندوں کو سب سے زیادہ اعتراض تھا، اقبال ایک نظام قائم کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی کو آئیڈیل کے طور پر پیش کریں، بغیر کسی نمونہ کے کسی نظام کی تبلیغ بے معنی تھی، اقبال نے اس کے لیے انسان کامل کا نظریہ پیش کیا، ندوی صاحب نے انسان کامل کی تشریح سچے مسلمان سے کی ہے،مولانا نے اقبال کے اس نظریہ کی روشنی میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ایک سچے مومن کے اوصاف کھل کر سامنے آجاتے ہیں، اس مقام پر آکر مولانا نے تنقید اور تبلیغ دونوں کو آپس میں ملا دیا ہے۔رشید احمد صدیقی نے نقوش اقبال کے دوسرے ایڈیشن میں اپنے گراں قدر دیباچہ میں مولانا کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا کی ان خصوصیات کا ذکر کیا ہے: [1]

---

1 نقوش اقبال ص ۲۱

سید صاحب کے ایک متبحر اور روشن خیال عالم دین اور شعر و ادب کے بصیر ہونے کی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، موصوف نے اقبال کی تائید و ترجمانی جس خوبی سے کی ہے، اس سے میرے ایک دیرینہ خیال کی تصدیق ہوتی ہے، کہ اقبال کا کلام ہمارے لئے اس صدی کا علم کلام ہے، جو ایک نامعلوم اور طویل مدت تک تازہ کار رہے گا، اس لئے کہ وہ ایک عظیم شاعری میں ڈھل چکا ہے، اسلامی عقائد، شعائر اور روایات کا جس عالمانہ، عارفانہ اور شاعرانہ انداز سے اپنے بے مثل کلام میں اقبال نے وکالت کی ہے، اس سے مسلم معاشرہ حیرت انگیز طور پر متاثر ہوا ہے، ایسی صحت مند اور بامقصد بیداری کا امتیاز شاید ہی کسی اور عہد کے علم کلام کے حصہ میں آیا ہو۔

مولانا ندوۃ العلماء کی ذمہ داریوں کی وجہ سے تعلیم و تعلم سے منسلک تھے۔ اس وجہ سے اقبال کے کلام کے دعوتی پہلوؤں کے علاوہ انہوں جس اہم پہلو پر توجہ دی ہے وہ تعلیم ہے۔ انہیں نے اقبال کے فلسفۂ تعلیم اور نظریۂ تعلیم پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ 'اسلام اور عصری نظام تعلیم' میں انہوں مغربی تعلیم پر اقبال کی تنقیدوں کو بیان کر کے اس نظام کے کھوکھلے پن کی نشاندہی ہے۔ جبکہ ایک دوسرے مضمون 'اقبال کا نظریۂ علم و فن' میں انہوں نے اقبال کے فلسفۂ تعلیم پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کے نظریۂ تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اقبال کے خیال میں موجودہ نظام تعلیم اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہا ہے اور وہ ایسی نسل کو تربیت نہیں دے سکا ہے کہ جو اپنی معلومات سے فائدہ اٹھاتی اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک صالح معاشرہ کی بنیاد رکھتی، بلکہ اس کے برعکس وہ افریقہ اور قطب شمالی کی نامعلوم سرزمین سے واقف اور حیوانات ونباتات سے آگاہ ہے لیکن انسانیت کی پہچان اور خودی کے عرفان سے قطعاً غافل! برق و بخارات ایٹمی اور جوہری توانائی اور نیوکلیائی طاقت کا پتہ اس نے لگایا لیکن اپنی طاقت کا اندازہ اسے نہیں ہوا ہے۔ دنیا کو مسخر کر لیا لیکن اپنے اوپر قابو نہیں پا سکا وہ ہوا میں اڑتا اور پانی پر تیرتا ہے، لیکن زمین پر انسان کی طرح چل نہیں سکتا۔''[1]

---

1 نقوش اقبال ص ۱۰۱۔

دراصل اقبال کی نظر میں تعلیم وہی معتبر ہے جو نفس کی تربیت کرے۔ جس سے انسان اپنی خودی کو پہچانے اور اس کے اندر کا جوہر کھل کر سامنے آئے۔ اعداد و شمار کی جمع و ترتیب کو وہ مفید علم نہیں تصور کرتے تھے۔

مولانا کا مقصد چونکہ اقبال کو عرب دنیا میں متعارف کرانا تھا اس لیے انہوں نے اقبال کی چند اہم اور مشہور نظموں کی تشریح بھی کی ہے۔ ان نظموں کے انتخاب اور ان کی تشریح میں بھی انہوں نے اپنے دعوتی مقصد کو ملحوظ رکھا ہے۔ مولانا نے جس انداز میں ان نظموں کی تشریح کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک بہترین شارح اقبال ہیں۔ قارئین کو اگرچہ مولانا کے خطیبانہ لب ولہجہ کی وجہ سے ان کی تحریروں میں بے جا طوالت نظر آئے لیکن اصل بات یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے اس کے لیے اس طوالت کو انگیز کیا جاسکتا ہے۔

مجموعی طور پر نقوش اقبال مولانا سید ابوالحسن ندوی کو ایک ماہر اقبال کی حیثیت سے باقی رکھنے کے لیے کافی ہے۔ مولانا نے اگرچہ اقبالیاتی ادب میں کوئی نیا کام نہیں کیا ہے لیکن انہوں نے اقبال کے کلام کی تفہیم کا جو اسلوب اختیار کیا وہ اقبالیاتی ادب میں نیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے لہجہ کی کھنک دور تک سنی گئی۔ اس میں کچھ مولانا کے اسلوب کا کمال ہے تو کچھ اقبال اور مولانا کے مزاج کی ہم آہنگی کا بھی دخل ہے۔ اقبالیاتی تنقید میں مولانا ایک وسیع القلب ناقد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ ان کی کتاب ایک مستقل تنقیدی کتاب نہ ہوتے ہوئے بھی اقبالیاتی ادب میں ہمیشہ مرجع کی حیثیت رکھے گی۔

# صابر کلوروی

صابر کلوروی کا تعلق اقبال کے ناقدین کے اس زمرے میں آتا ہے جنہوں نے اقبال کے فکر و فن کے گمشدہ اوراق کو اپنی محنت و لگن سے جمع کر کے ہمیشہ کے لیے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ان کی کتابیں یاد اقبال (۱۹۷۷شرح)، 'اشاریہ مکاتیب اقبال' (۱۹۸۷) ،'کلیات باقیات شعر 'اور'اقبال کے ہم نشین'(۱۹۸۵) اقبال ان کو ایک محقق اقبال کے طور پر پہچان دلانے کے لیے کافی ہیں۔ باقیات شعر اقبال گیان چند جین اور دوسرے ناقدین نے بھی مرتب کیا ہے۔ لیکن صابر کلوروی کے مرتب کردہ باقیات میں جو جامعیت ہے وہ کسی دوسرے کے مرتب کردہ باقیات میں نہیں ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اقبال کے متروک کلام کو مرتب کیا ہے بلکہ کلام اقبال کے موجودہ نسخوں سے موازنہ کر کے ان اشعار کو بھی درج کر دیا ہے جن میں علامہ نے ترمیم کیا ہے۔ ایک محقق کو باقیات اقبال کی ترتیب میں کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ صابر کلوری کو ہے۔ اس لیے کہ وہ اسی میدان کے شہسوار ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون ''شعری باقیات کی تدوین نو''میں شعری باقیات کی تدوین کے مسائل اور طریقۂ کار کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور باقیات کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ صابر کلوروی لکھتے ہیں:

> ''باقیات شعر اقبال'' نہ صرف علامہ کے نظریات کا پس منظر فراہم کرتے ہیں بلکہ عوام کے نظریۂ فن پر بھی کما حقہ روشنی ڈالتے ہیں۔ شاعر اپنے کلام کا بہترین ناقد نہ سہی لیکن اپنے کلام کے فن اور فکری پہلوؤں پر اس کی اچھی خاصی نظر ہوتی ہے۔ کسی شعر کو ترک کرنے یا اس میں اصلاح کرنے کے عملی پہلو کے پیچھے شاعر کا زبردست تنقیدی شعور کارفرما ہوتا ہے۔ وہ اپنے کلام کو نظریاتی اور فنی دونوں پہلوؤں سے دیکھتا ہے پرکھتا ہے۔ شاعر کا شعری ذوق اس مرحلے پر اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ رد و قبول کی بھٹی سے اپنے کلام کو گزار کر وہ ہمارے سامنے اپنی تخلیق پیش کرتا ہے۔ جتنا بڑا شاعر ہو گا اتنا ہی اس میں تنقیدی شعور بھی زیادہ ہو گا۔ ترمیم و تنسیخ کے عمل کا آغاز عام طور پر اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے جب کوئی خیال، جذبہ یا واقعہ شاعر کے ذہن میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ جو تخلیق اس ارتعاش کے نتیجے میں عالمِ وجود میں آتی ہے وہ ذہن کے پر اسرار گوشوں سے گزر کر صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر تمام تخلیقی عمل کو پوری طرح سمجھ لینا ہمارے بس کی بات

نہیں۔ لہٰذا اس پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ لیکن جب کوئی تخلیق زینتِ قرطاس بنتی ہے اور پھر اس کی نوک پلک درست کی جاتی ہے تو یہ تبدیلیاں اس لمحے میں شاعر کی تمام نفسیاتی کیفیتوں کا مظہر ہوتی ہیں۔" [1]

صابر کلوروی کا ماننا ہے کہ باقیات کبھی بھی کلیات اقبال کے متداول نسخے کی جگہ نہیں لے سکتے۔ علامہ نے ان کا نوے فیصد حصہ خود سے ترک کر دیا تھا اس وجہ سے باقیات کے اشعار کو محفلوں میں پڑھنا، یا ریڈیو وغیرہ پر گانا مناسب نہیں ہے۔ البتہ تحقیق و تنقید کے لیے اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی باقیات کا حوالہ ضرور دیا جائے تا کہ متداول کلام سے التباس نہ ہو۔

صابر کلوروی بنیادی طور شارح اقبال ہیں۔ ان کی شرح یاد اقبال کا درجہ اقبال کی شرحوں میں اعلی وارفع ہے۔ انہوں نے 'اقبال کے ہم نشیں' میں اقبال کی صحبت میں بیٹھنے والوں کے بارے میں اور اقبال سے ان کی صحبتوں کو بڑے خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔ اسی کتاب کا ایک اقتباس ہے:

"اقبال کے ایک دوست ایک مشہور ایڈووکیٹ تھے، فارسی میں ایک غزل کہہ کر لائے۔ زمین تھی ع

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ایڈووکیٹ صاحب کے پاؤں میں لنگ تھا۔ اسی کی رعایت سے اقبال نے برجستہ داد دی

گرچہ در قانون فلک پیما شدی
بر زمینِ شعر لنگانی ہنوز" [2]

صابر کلوروی کی خدمات اقبالیاتی ادب میں بیش بہا اضافہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

---

1 دیباچہ کلیات باقیات اقبال، صابر کلوروی، ص ۹، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۴

2 اقبال کے ہم نشیں۔ ص۔190

# غلام مصطفی خان

ڈاکٹر غلام مصطفی خاں کو اقبالیات سے دلچسپی کب ہوئی اس کے بارے میں انہوں نے خود اپنی کتاب 'اقبال اور قرآن' (۱۹۷۷ء) کے مقدمہ میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کے ہم سبق جناب حمید جالندھری کی وجہ سے ان کو اقبالیات سے لگاؤ ہوا۔ ڈاکٹر غلام مصطفی خاں اردو کے اہم اسکالر ہیں، وہ ناگ پور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو بھی رہے۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ سے فراغت حاصل کی۔ اس طرح وہ علی گڑھ کے اولین فارغین میں سے ہیں۔[1] اقبالیاتی ادب میں اپنی کتاب 'اقبال اور قرآن' کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے اقبال کی قرآن سے شغف اور کلام اقبال میں وارد اشعار کے قرآنی مآخذ اور قرآنی تلمیحات پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب کی ترتیب کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> ''میرے کام کی تقسیم یہ ہے کہ 'تبصرۃ وذکری' کے ذیل میں قرآن سے متعلق علامہ اقبال کے خیالات، نظریات اور واقعات درج کر دئے گئے ہیں، اور 'لکل عبد منیب' کے تحت ان کے ہر مجموعہ کلام کے قرآنی مضامین کو حتی الامکان جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآنی آیات کا ترجمہ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، مولا اشرف علی تھانوی اور مولانا احمد رضا خاں سے لیا گیا ہے اور بعض مقامات پر خود بھی کر دیا ہے۔''[2]

اس طرح اگر دیکھا جائے تو انہوں نے اپنی کتاب کو صرف دو ابواب میں سمیٹ دیا ہے لیکن ایک ہزار سے بھی زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب میں انہوں نے اقبال کے مجموعۂ کلام کے نام سے الگ الگ عنوانات قائم کیا ہے۔ اس طرح کتاب سے استفادہ کافی حد تک آسان ہو گیا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو صرف قرآن تک محدود رکھا ہے حالانکہ بہت

---

1 ڈاکٹر غلام مصطفی خان، اقبال اور قرآن، مقدمہ صفحہ ب، ط۔ اقبال اکادمی، لاہور، طبع اول ۱۹۷۷، طبع چہارم ۱۹۹۸

2 اقبال اور قرآن، مقدمہ صفحہ ج

سارے اشعار میں اقبال کے یہاں احادیث سے استفادہ کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ اس وجہ سے احادیث کو بھی اگر وہ ساتھ لے کر چلتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔

علامہ اقبال کا قرآن سے شغف اور لگاؤ ظاہر کرنے کے لیے اقبال کے معاصرین کے حوالے سے کئی واقعات بیان کیے ہیں، سید سلیمان ندوی کے حوالے سے انہوں نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ اقبال کے والد نے ان سے کہا کہ 'جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمہارے قلب پر بھی اسی طرح اترتا ہے جیسا محمد ﷺ کے قلب اقدس پر نازل ہوا تھا، تلاوت کا مزا نہیں۔'' اسی طرح ایک دوسرا واقعہ بھی انہیں کے حوالے سے درج کیا ہے کہ اقبال کے والد نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ 'میں نے تمہاری پڑھائی پر جو خرچ کیا ہے تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں' وہ معاوضہ کیا تھا؟ ایک عرصہ کے بعد انہوں نے بتایا کہ 'میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ اسلام کی خدمت کرنا۔'[1]

یہ دونوں واقعات اقبال کے قرآن سے شغف کو ظاہر کرتے ہیں۔ اقبال کے والد کی اس تربیت کا ان کی زندگی پر کافی اثر پڑا، انہوں نے خدمت دین کو اپنا نصب العین بنالیا۔ اقبال عربی زبان سے واقف تھے اس وجہ سے انہوں نے براہ راست قرآن کا مطالعہ کیا۔

علامہ اقبال نے خود اپنی شاعری میں وارد قرآنی تلمیحات کی وضاحت بعض مقامات پر کی ہے، چنانچہ انہوں نے اسرار خودی میں وارد تلمیحات کو حاشیہ میں بیان کر دیا ہے۔ لیکن اکثر مجموعوں میں انہوں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ البتہ انہوں نے اسرار خودی میں کہا ہے کہ

> 'اگر میں قرآن کے علاوہ کچھ اور کہوں تو مجھے ختم کر دیا جائے اور قوم کو میرے شر سے محفوظ رکھا جائے۔ نیز مجھے قیامت میں رسوا کیا جائے اور اپنی پابوسی سے محروم کر دیا جائے۔'[2]

---

1 اقبال اور قرآن، ص ۸۔۱۰

2 اقبال اور قرآن، ص ۵

حقیقت بھی یہی ہے کہ اقبال کے کلام میں قرآن سے استفادہ کی مثالیں بے شمار ہیں۔ اس معاملے میں اقبال کا مقابلہ کسی بھی شاعر سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

غلام مصطفی خاں کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ معلومات قاری تک پہنچائیں، وہ مکاتیب اقبال کے حوالے سے اگر کسی کتاب یا نظم کے بارے میں کوئی بات معلوم ہوتی ہے جو اس کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے تو اسے بر محل بیان کرتے ہیں۔ مثلاً بانگ درا کے شروع میں لکھتے ہیں:

'بانگ درا کی بیشتر نظمیں میری طالب علمی کے زمانے کی ہیں۔' (مکاتیب ا/۲۹۹)[1]

یہ بیانات اس وجہ سے اہم ہیں کہ کلام اقبال کی تفہیم میں ان سے مدد ملتی ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفی خاں نے کلام اقبال کے ہم معانی آیات کی تلاش میں عموماً ایک ہی آیت کو درج کیا ہے،[2] حالانکہ کئی مقامات پر کلام اقبال کئی آیات کے مفاہیم کو جامع ہوتا ہے۔ مثلاً بانگ درا کے صفحہ نمبر ۲۰۴[3] پر درج شعر

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

کے ذیل میں آیت کریمہ منٰ اعرض عن ذکری فان لہ معیشہ ضیہ کا' لکھا ہے۔[4] حالانکہ یہ شعر قرآن کی آیت ولا تھنو اولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین' کو بھی شامل ہے۔ اسی طرح کتاب کے صفحہ نمبر ۲۶۱ پر بانگ درا کے شعر

---

1 اقبال اور قرآن، ص ۲۰۵

2 یہ معاملہ پوری کتاب میں یکساں نہیں ہے۔ انہوں نے بال جبریل کے اشعار کی مختصر تشریح اور ایک سے زائد آیات کا اندراج کیا ہے۔

3 ڈاکٹر غلام مصطفی خاں نے کتاب کے شروع میں وضاحت کر دی ہے کہ ان کے پیش نظر کلیات اقبال (فارسی) مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور، ط ۱۹۷۵ اور اردو کلیات ط ۱۹۷۳ء ہے۔ صفحات کے حوالوں کے لیے اسی کی طرف رجوع کیا جائے۔

4 اقبال اور قرآن، ص ۲۵۸

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اس شعر میں بھی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی ضمانت محبت رسول اور اطاعت رسول کو قرار دیا گیا ہے۔ اس کے ضمن میں آیت کریمہ یاایھاالرسول بلغ ما انزل الیک (سورۂ مائدہ) اور 'قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی' (آل عمران: ۲۱) لکھا ہے۔ یہاں پر 'یاایھاالذین آمنوا ان کنتم مومنین' ہونا چاہئے تھا۔ اس وجہ سے کہ مذکورہ دونوں آیتوں میں دنیاوی کامیابی کی بات نہیں کی گئی ہے۔

صفحہ ۲۶۳ پر بانگ درا کے صفحہ ۲۲۳ کا ایک شعر لکھا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اس شعر میں حق و باطل کے معرکہ کی طرف اشارہ ہے، جو روز ازل سے جاری ہے۔ یہاں شرار بولہبی باطل کی علامت کے طور پر آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہاں پر سورۂ لہب کو درج کر دیا ہے۔ حالانکہ یہاں صرف صرف ابولہب کا نام موجود ہے، شعر اور سورۂ لہب کے مفہوم میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ یہاں موقع کے مناسبت سے آیت کریمہ 'جاء الحق وزہق الباطل ان الباطل کان زہوقا' ہونا چاہئے تھا۔ کیوں کہ اس آیت میں حق و باطل کے معرکہ کا بیان ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اسی کے معاً بعد جو شعر انہوں نے درج کیا ہے وہ صدیق اکبر کے عشق رسول پر ہے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس

صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

اس کے تحت آیت درج کرنے میں انہوں نے اس کے برعکس اس آیت کو ذکر نہیں کیا جس میں صدیق اکبر کا ذکر ہے۔ 'ثانی اثنین اذ ہما فی الغار' اس کے برخلاف انہوں نے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ' اور سورۂ لیل کی آخری آیات ذکر کی ہیں۔

اسی طرح بہت ساری جگہوں پر انہوں نے ایسی آیتوں کو بھی درج کر دیا ہے جو مذکورہ اشعار سے مطابقت ہی نہیں رکھتیں۔ پوری کتاب میں اس کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ یہاں پر کچھ مثالوں کو درج کیا جاتا ہے:

بالِ جبریل کے ایک شعر:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا!

کے تحت لکھا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

آپ فرما دیں کہ بے شک میری نماز، میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو سب جہانوں کا رب ہے۔

حالانکہ دونوں کے مابین کوئی مماثلت نہیں ہے۔

اسی طرح ایک اور حوالہ دیکھیں:[1]

وہ سجدہ، روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!

سورۃ النسا: آیت ۳۶ میں ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا

اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ (نہ جاندار کو نہ بے جان کو، نہ اس کی ربوبیت میں اور نہ اس کی عبادت میں)۔

---

1 اقبال اور قرآن، ص ۵۸۹

ان فرو گزاشتوں کے باوجود ڈاکٹر غلام مصطفی خاں کا یہ کام لائق قدر ہے۔ اس نے اقبال کے مجموعی کلام اور خطبات کے قرآنی مآخذ کی طرف نشاندہی کی اور ماہرین اقبالیات کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ وہ کلام اقبال کے اس پہلو پر بھی غورو فکر کریں۔ انہوں نے اکثر مقامات پر آیات کا اندراج صحیح کیا ہے۔ کلام اقبال اور آیات کے درمیان باہمی موافقت ایک مشکل مرحلہ ہے جس پر کوئی ایسا شخص ہی مکمل طور پر قابو پاسکتا ہے جس کو دونوں پر مکمل عبور حاصل ہو۔ ساتھ ہی شان نزول اور آیات کی تفسیروں سے گہری دلچسپی ہو۔ ڈاکٹر غلام مصطفی خاں کی پریشانی یہ ہے کہ ان کا مطالعہٗ قرآن اردو ترجمہ پر منحصر ہے۔ انہیں قرآن کی اصلی زبان سے واقفیت نہیں اس وجہ سے بہت ساری غلطیاں ان کے یہاں آگئی ہیں۔

اقبال اور قرآن میں چونکہ کلام اقبال کے بیشتر اشعار پر تکلفاً کوئی نہ کوئی آیت چسپاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس وجہ سے بہت ساری جگہوں پر غلام مصطفی خاں غلطی کر گئے۔ اسی کی طرف توجہ کرتے ہوئے بعد میں ڈاکٹر فضل الٰہی عارف نے 'متاع اقبال'[1] میں ایک مضمون 'قرآنی آیات واحادیث' شامل کیا ہے۔ جس میں اقبال کے کلام میں پائی جانے والے ہم معنی آیات اور احادیث کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک مختصر مضمون ہونے کے باوجود اس موضوع پر ایک اہم مآخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد نے 'کلام اقبال میں قرآنی آیات واحادیث اور مذہبی اصطلاحات کا جائزہ'[2] نامی کتاب میں قلمبند کی ہے۔ یہ دراصل ان کے ایم فل کا مقالہ ہے جو انہوں نے پروفیسر مجاور حسین رضوی کے زیر نگرانی سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کے لیے لکھا تھا۔ اسی کو بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ اس مقالہ میں خاص بات یہ ہے کہ 'اقبال اور قرآن' کی طرح تقریباً ہر آیت کے ہم مضمون قرآنی آیت کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے کلام اقبال میں قرآنی آیات کے تحت قدرے تفصیل سے اسلام، قرآن اور اقبال اور قرآن کے رشتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈگری کے لیے لکھے گئے مقالات کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اس قسم کی تمہید اس کے لیے

---

1 متاع اقبال، ڈاکٹر فضل الٰہی عارف، شیخ غلام علی اینڈ پبلیشرز، اشاعت اول، ۱۹۷۷، حیدرآباد، کراچی

2 کلام اقبال میں قرآنی آیات و احادیث اور مذہبی اصطلاحات کا جائزہ، ڈاکٹر منظور احمد، ط۔ انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۹۵ء

ناگزیر ہوتے ہیں لیکن طباعت سے پہلے ان کی مناسب ایڈیٹنگ ضروری ہوتی ہے تاکہ صرف انہی چیزوں کو کتاب میں شامل کیا جائے جو متعلقہ موضوع کے لیے ضروری ہو۔ موصوف کو خود بھی اس بات کا احساس ہے کہ ان کے یہاں تمہید طویل ہوا کرتی ہے اس کا جواز انہوں نے یہ دیا ہے کہ وہ مشرقی قسم کے آدمی ہیں:

'میرا مزاج مشرقی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ تمہید کچھ طویل ہے۔۔۔۔'[1]

ڈاکٹر منظور احمد چونکہ حافظ قرآن ہیں اس وجہ سے وہ خود کو اس کام کا اہل سمجھتے ہیں۔[2] لیکن ان کی کتاب میں بھی بعض جگہوں پر ایسی غلطیاں رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے صرف حافظ قرآن ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کی تفسیر کا بھی علم ہونا ضروری ہے۔

'ابلیس کی مجلس شوریٰ' میں ایک جگہ اقبال کہتے ہیں:

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز

جس نے اس کا نام رکھا تھا جہان کاف ونوں

اس کے تحت وہ حروف مقطعات میں سے کٓہٰیٰعٓصٓ (سورہ مریم:۱) اور 'نٓ' (سورۂ القلم ۱) درج کیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ:

'قرآن مجید میں کاف ونوں (حروف مقطعات) کا علم سوائے ذات باری کے کسی کو نہیں ہو سکتا یا جس کسی کو اللہ یہ علم بخش دے۔'[3]

---

1 کلام اقبال میں قرآنی آیات و احادیث اور مذہبی اصطلاحات کا جائزہ، ص ۱۴

2 کلام اقبال میں قرآنی آیات و احادیث اور مذہبی اصطلاحات کا جائزہ، ص ۱۳

3 کلام اقبال میں قرآنی آیات و احادیث اور مذہبی اصطلاحات کا جائزہ، ص ۱۳۶۔۱۳۷

ڈاکٹر منظور احمد کو اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی۔ علامہ اقبال کی مراد 'کاف ونوں' سے 'کن' ہے جو سورۂ یٰسٓ میں ہے:
انما امرہ اذا اراد شیًا ان یقول لہ کن فیکون' یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ نے کائنات اور تمام چیزوں کو کلمۂ کن سے پیدا کیا۔

اسی طرح انہوں نے اقبال کے کلام میں شاہین کے تصور کو سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶۰ سے مستفاد مانا ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اللہ سے گزارش کی تھی کہ دکھادے کہ وہ مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ تو اللہ نے انہیں چار زندہ پرندوں کو پکڑ کر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کو چار پہاڑ کی چوٹیوں پر ڈالنے کو کہا تھا۔

اس آیت میں کسی مخصوص پرندے کا ذکر نہیں ہے، اس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی بھی چار پرندے لے کر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے الگ الگ مقامات پر ڈال کر اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرنا تھا کہ وہ کیسے ان میں جان ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر منظور نے اس سے اقبال کے شاہین کو تلاشنے کی کوشش کی ہے جو مناسب نہیں۔ اس طرح وہ خود اسی غلطی کے مرتکب ٹھہرے جو انہوں نے صاحب اقبال اور قرآن کے بارے میں کہا تھا۔

ڈاکٹر منظور نے اس کتاب میں کلام اقبال کے ہم معنی احادیث کو بھی بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کوشش کی ہے کہ ان کی اسنادی حالت بھی بیان کر دی جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اصل مآخذ سے استفادہ نہیں کیا ہے اس وجہ سے یہ حصہ بھی تشنہ ہے۔ البتہ انہوں نے رشید حسن خاں اور دوسرے محققین کے حوالوں سے اقبال کے کلام میں وارد بعض احادیث کی اسنادی کمزوریوں کو بیان کرنے میں تردد سے کام نہیں لیا ہے۔ پیش لفظ میں خلیق انجم نے اقبال کے تصور حدیث پر جو کچھ لکھا ہے وہ محل نظر ہے۔ اس تفصیل سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اقبال کو 'اہل قرآن' ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔[1] اس کی دلیل انہوں نے یہ دی ہے کہ اقبال کا ماننا تھا کہ تمام احادیث صحیح نہیں ہیں۔[2] اگر ایسی بات ہے تو پھر اقبال نے احادیث سے استفادہ کیوں کیا۔ اپنے کلام میں اور خطبات میں اسے کیوں بیان کیا؟

---

1 مسلمانوں کا ایک فرقہ جو صرف قرآن کو حجت مانتا ہے۔ اس کے یہاں حدیث رسول حجت نہیں ہے۔

2 کلام اقبال میں قرآنی آیات و احادیث اور مذہبی اصطلاحات کا جائزہ، ص ۸

اقبال کا حدیث کے تعلق سے اپنا ایک مخصوص نظریہ تھا، وہ احادیث کے باب میں روایت کے بجائے درایت کے قائل تھے۔ مطلب یہ کہ ان کے یہاں حدیث وہی صحیح ہے جو عقل کے مطابق ہو، اگرچہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہو۔ حالانکہ محدثین نے درایت اور روایت دونوں کا اعتبار کیا ہے۔

اس حوالے سے دیگر ناقدین اقبال نے بھی کوششیں کی ہیں۔ مثلاً محمد بدیع الزماں کی کتاب 'اقبال شاعر قرآن'[1] اور اقبال کے کلام میں قرآنی تلمیحات اور قرآنی آیات کے ترجمے'[2] عبد اللہ فاروقی کا مضمون 'کلام اقبال میں قرآنی تلمیحات'[3]

خاص طور پر 'اقبال کے کلام میں قرآنی تلمیحات۔۔۔' از بدیع الزماں اس سلسلے میں ایک معاون کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں کلام اقبال میں ستر قرآنی تلمیحات کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ کلام اقبال میں تقریباً ایک سو پچاس اشعار قرآنی آیات کا ترجمہ ہیں۔

یہ کتاب بہر حال اوپر کی دو کتابوں سے زیادہ مستند ہے لیکن جامع نہیں ہے۔ اس وجہ سے ابھی بھی ضرورت ہے کسی ایسے ماہر اقبالیات کی جو قرآنی علوم کا بھی ماہر ہو۔ تا کہ ہر قسم کی رطب ویابس جمع کرنے کے بجائے اصل حقیقت کو بیان کرے۔

---

1 مطبوعہ دانش بکڈپو، فیض آباد، یوپی، انڈیا، ط۔۱۹۹۷، مصنف کی دوسری کتابیں بھی اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ ان کے تفصیلی مضامین مجلہ آثار مئو میں شائع ہوتے تھے۔

2 مطبوعہ دانش بکڈپو، فیض آباد، یوپی، انڈیا، ط۔۱۹۹۵،

3 مشمولہ 'اقبال شناسی کے زاوئے' از ڈاکٹر سلیم ط۔ بزم اقبال لاہور ط ۱۹۸۵

# سید افتخار حسین شاہ

سید افتخار حسین شاہ کا شمار اقبال کے اہم ناقدوں میں ہوتا ہے۔ اقبال تنقید پر ان کے مضامین کا مجموعہ 'اقبال اور پیروی شبلی' کافی مشہور ہوا۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں چھوٹے بڑے کئی مضامین ہیں جن میں انہوں نے اقبال کے فکر و فن کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس مجموعہ کا سب سے اہم مضمون 'اقبال اور پیرویٔ شبلی ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اقبال اور شبلی کے مابین ذہنی قربت کی مختلف وجہیں دریافت کی ہیں، یہ مشابہت انفرادی زندگی سے متعلق بھی ہے اور اجتماعی زندگی سے بھی۔ دینی تعلیم، اردو و فارسی و عربی میں مہارت شاعری کی طرف میلان، پروفیسر آرنلڈ کی صحبت و قربت وغیرہ۔ اگر ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پروفیسر آرنلڈ اور عطیہ فیضی دو ایسی شخصیتیں ہیں جن کا تعلق اقبال اور شبلی دونوں سے تھا۔ اس طرح ان دونوں کے درمیان میں بھی مزاج اور خیالات کی ہم آہنگی کی وجہ سے دونوں کے درمیان مراسم بھی قائم ہو گئے تھے۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی ہوئی جس کی تفصیل سید افتخار حسین نے دی ہے۔ افتخار حسین نے خاص طور اقبال اور شبلی کے سیاسی نظریات کی یکسانیت پر توجہ دی ہے۔ مجموعی طور پر انہوں نے شبلی کو پیش رو اور اقبال کو شبلی کا پیرو قرار دیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا اہم مضمون 'علامہ اقبال محقق اور نقاد کی حیثیت سے' ہے اس کے اندر انہوں نے اقبال کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مصنف کا ماننا ہے کہ اقبال کے خطوط اور مضامین میں نادر و نایاب کتابوں کے حوالے جس قدر ملتے ہیں وہ کہیں اور نظر نہیں آتے۔ انہوں نے ان حوالوں اور کتابوں کی معلومات فراہم کی ہے۔ مصنف نے اقبال کی تنقید اور تحقیق پر الگ الگ سے لکھنے کے بجائے دونوں کو ایک ساتھ اس انداز میں لکھا ہے کہ اقبال کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کا خاکہ ذہن میں بیٹھ جائے۔ جس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہیں۔ افتخار حسین کا ماننا ہے کہ اقبال کی محققانہ اور تنقیدانہ صلاحیتوں پر اب تک خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ انہوں نے اسی جذبہ کے تحت اس مضمون کو لکھا ہے۔

افتخار حسین بعض دفعہ اقبال کی عقیدت میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن کو قبول کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً وہ آرنلڈ کے ذریعہ اقبال کو شاعری ترک نہ کرنے کا مشورہ دینے کو ایک سازش کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ آرنلڈ کی خواہش تھی کہ اقبال کو دوبارہ شعر و شاعری میں الجھا دیا جائے تاکہ وہ دوسرے علمی کام نہ کر سکیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے یقین کامل ہے کہ اگر شاعری ترک کر دیتے تو فقہ، اجتہاد، اور قرآن حکیم کے متعلق تمام مجوزہ کتب مکمل کر لینے کے علاوہ بعض دوسری ایسی تحقیقی معرکۃ الآراء تصانیف پیش کرتے کہ جن کی اہمیت کسی طرح بھی ان کے شعری مجموعوں سے کم نہ ہوتی۔''[1]

اقبال کو قدرت نے شاعر کا دل و دماغ دے کر پیدا کیا تھا۔ اگر وہ شاعری ترک کر دیتے تو وہ اپنے نفس اور پوری قوم پر ظلم کرتے۔ اقبال کے فکر و فلسفہ کی اہمیت اپنی جگہ، وہ اہم صرف اس وجہ سے ہیں کہ شاعری کے پیرائے میں ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے اقبال کے خطبات کا مطالعہ کیا ہے؟ یا ان کی کتاب تشکیل جدید الہیات کو پڑھا ہے۔ یہ کتابیں بہت اہم ہیں لیکن جب ان کو پڑھنے والے گنتی کے چند لوگ ہیں تو اگر اقبال شاعری میں اپنے فکر کو نہ پیش کرتے تو کیا یہی حال ان کتابوں کا نہ ہوتا؟

اس کتاب میں 'اقبال اور پیرویٔ شبلی' اور 'علامہ اقبال محقق اور نقاد کی حیثیت سے' کے علاوہ دوسرے مضامین بھی ہیں جو ضخامت اور اہمیت میں اس سے کم ہیں لیکن ان کے اندر بھی پروفیسر سید افتخار حسین کا تنقیدی ذوق جھلکتا ہے۔ ان مضامین میں، اقبال کی قرآن دوستی کا جائزہ، ساقی نامہ کا فکری اور فنی مطالعہ، اقبال حضور رسالت مآب میں، اقبال کا نظریۂ حیات، اقبال کا پیام تسخیر فطرت، اقبال کی اپنی نظر میں کلام اقبال، اقبال کی اردو نثر، اقبال اور کشمیر، کلام اقبال میں تلمیحات، کلام اقبال میں تشبیہات اور استعارے، اقبال کا ایک محبوب موضوع، تعلیم تربیت، اقبال دوستی کا تقاضا، وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے ہر مضمون معلوماتی ہے۔

اس کتاب کے علاوہ بھی ان کے مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ لیکن وہ کتابی شکل میں جمع نہیں ہو سکے ہیں۔ مثلاً مسجد قرطبہ (نیا راہی، کراچی، ۱۹۶۶ء) اقبال اور تندی باد مخالف (خیابان، دانائے راز نمبر ۱۹۷۷ء) اقبال اور

1 سید افتخار حسین، اقبال اور پیروی شبلی، ص ۶۴

بہبودیؔ آبادی (ادبی مجموعہ شعور، ملتان ۱۹۸۷ء) اقبالیات میں ملتان کا حصہ (سہ ماہی اقبال، لاہور ۱۹۹۲ء) ایمرسن اور اقبال (اقبالیات لاہور، ۱۹۸۹ء) وغیرہ[1]

پروفیسر افتخار حسین کی اقبال خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۷ء میں اقبال صد سالہ تقریبات میں انہیں اقبال میڈل سے نوازا گیا تھا۔ یقینی طور پر اقبال تنقید پر ان کے مضامین اہمیت کی حامل ہیں۔

1 ملتان میں اقبال شناسی، اسد ملتانی ص ۶۲۔ ۶۳، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔ ۱۹۹۹ء

# ممتاز حسن

ممتاز حسن اردو کے ایک اہم اسکالر ہیں۔ اقبالیات پر ان کی کتاب 'اقبال اور عبد الحق' ہے۔ ان کی یہ کتاب اردو کی دو عظیم شخصیات کے تعلقات کی ایک حسین روداد ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے ذریعہ مولوی عبد الحق کے ان نوادر کو محفوظ کر دیا جو اقبال پر انہوں نے لکھا تھا۔ بانگ درا کا دیباچہ سر عبد القادر نے لکھا ہے۔ بابائے اردو نے بھی اس کا ایک مقدمہ لکھا تھا جو کافی تفصیلی تھا۔ لیکن وہ ایک یا دو اشاعتوں کے بعد بھلا دیا گیا حالانکہ وہ مضمون معلومات سے پُر تھا۔ ممتاز حسن نے اس مقدمہ کو اور اقبال کی کتابوں پر عبد الحق کے تبصروں کو اس کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ عبد الحق رسالہ 'اردو' کی ادارت کرتے تھے۔ یہ وہ رسالہ ہے جس نے اقبال تنقید پر گراں قدر مقالات شائع کئے۔ ان مقالات کی فہرست سے جو ممتاز حسن نے مہیا کی ہے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال تنقید اقبال کی وفات کے معاًبعد اور پہلے کس سمت پر تھی۔

ممتاز حسن اقبال کے معاصرین میں سے تھے۔ اس وقت اقبال کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اقبال کے فکر و فن پر لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ممتاز حسن نے بھی 'اقبال اور عبد الحق' کے علاوہ اقبال پر کئی مضامین لکھے ہیں۔ انہوں نے ایک مضمون میں اقبال کی شاعری پر قیام یورپ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بڑی نفیس بحث کی ہے۔ ان کی نظر میں اقبال کی شاعری پر قیام یورپ کا سب سے بڑا اثر 'پیغمبرانہ شان' کا آغاز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ولایت کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اقبال کی 'پیغمبرانہ' شان کا آغاز ہے۔ اس سے پہلے کا اقبال شاعر محض ہے مگر اس کے بعد کا اقبال دنیا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً ایک حیات تازہ کا پیغام دینے کے لیے بیتاب ہے۔ اور اس پیغام کو ہزاروں طریق سے دہراتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اقبال ولایت نہ جاتا تو اس کی شاعری میں بلکہ اس کی زندگی کا رخ کچھ اور ہوتا۔''[1]

---

1 اقبال کی شاعری میں قیام یورپ کا اثر، ممتاز حسین، مشمولہ اقبال معاصرین کی نظر میں، وقار عظیم ص ۹۰

مجموعی طور پر وہ اقبال کے مداح ہیں۔ اقبال کی اسلامیت اور اصلاحی عناصر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا مضمون 'اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے' اقبال کی عقیدت میں ڈوب کر لکھا گیا مضمون ہے۔ اس میں انہوں نے اقبال کی شاعری کی پیغمبرانہ حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کا سارا کلام ان معنوں میں ''پیغمبری'' ہے جو ہم نے لیے ہیں۔ میں نے صرف یہی کہا ہے کہ اقبال کی اولین اور اہم ترین حیثیت ایک پیغمبر کی ہے، اور لوگ اس حیثیت کو سمجھنے سے عموماً قاصر رہتے ہیں۔ اقبال نے خود کہا ہے:

بہ خامہ کہ خط زندگی رقم زدہ است

نوشتہ اند پیامے بہ برگ گیہ م

جو لوگ نکتہ رس نہیں ہیں وہ اس ''برگِ رنگیں'' کی رنگینیوں میں محو ہو جاتے ہیں اور اس پیغام کو، جو خامہ قدرت نے اس پر لکھ رکھا ہے، نظر انداز کر دیتے ہیں؛ یعنی ''الفاظ کی خوبصورتی'' اور ''ترکیبوں کی چستی'' سے بحث کرتے ہیں اور اصل مقصد کو نہیں سمجھتے، ہندوستان ایسے لوگوں سے بھرا پڑا ہے اور اقبال ان کے ہاتھوں نالاں ہے۔''[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی شاعری اپنا ایک پیغام رکھتی ہے۔ لیکن ممتاز حسن کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ جو لوگ کلام اقبال کے فنی محاسن پر گفتگو کریں وہ نکتہ رس نہیں ہیں۔ اقبال ایک فلسفی شاعر ہیں اس وجہ سے ان کے فلسفہ ہی نہیں شاعری پر بھی گفتگو ہو گی۔ شاعری کی فنی گفتگو کرنے والے کو ہم اس بات کا مکلف نہیں بنا سکتے کہ وہ اقبال کے فن کے ساتھ فکر پر بھی لکھے یا صرف اقبال کے فکری مباحث پر گفتگو کرے۔

---

1 اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے، ممتاز حسین، بحوالہ اقبال معاصرین کی نظر میں، وقار عظیم، ص ۲۴، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۲ء

# حامدی کاشمیری

پروفیسر حامدی کاشمیری کا شمار اردو کے اہم ناقدین میں ہیں۔ تنقید میں وہ اپنے منفرد لب لہجہ کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ اقبال تنقید میں ان کی دو اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔'حرف راز اقبال کا مطالعہ' اور 'اقبال اور غالب'۔ حامدی کاشمیری نے اقبال کے فکر اور فن دونوں کو اہمیت دی ہے۔اس کے باوجود چونکہ ان کے یہاں اقبال کے فکری اور فلسفیانہ مباحث پر توجہ زیادہ ہے اس وجہ سے ان کو بھی مجموعی طور پر اقبال کی فکر کے ناقدین میں شمار کیا جاتا ہے۔

'' حرف راز - اقبال کا مطالعہ '' ان مضامین کا مجموعہ ہے جو پروفیسر حامدی کاشمیری نے وقتاً فوقتاً لکھا ہے،ان میں سے بھی اکثر مضامین اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر کے زیر اہتمام سمیناروں میں پڑھے جا چکے ہیں۔ تقریباً ہر چھوٹے بڑے تنقید نگار نے اقبال پر لکھا ہے اس کے باوجود اقبالیات کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ اب بھی بعض نئے گوشے سامنے آتے رہتے ہیں۔حامدی کاشمیری کے بقول:

> ''ان کے خالص تخلیقی شعور کے تجزیاتی مطالعہ پر خاطر خواہ توجہ مرکوز نہیں کی گئی ہے اس لیے نتیجتاً اقبال کی شعری حیثیت ان کی شخصیت کے فلسفیانہ اور اخلاقی پہلوؤں سے گڈمڈ ہو کر رہ گئی ہے۔''[1]

چنانچہ انہوں نے خاص طور پر اقبال کے تخلیقی حسیت پر توجہ دی۔حامدی کشمیری اقبال پر لکھی گئی تنقیدات کے معیار اور طرز تحریر سے نالاں ہیں،اسی وجہ سے انہوں نے اس کتاب میں ان سے الگ راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب بھی ہیں۔کل گیارہ مضامین پر مشتمل اس کتاب میں چند مضامین کافی اہم ہیں مثلاً 'اقبال کی شاعری میں عرفان ذات'،'اقبال کی شاعری میں تشخص کا مسئلہ'،'اقبال کی شعری زبان' اور 'اقبال اور نیا شعری ذہن'۔

---

1 حرف راز - اقبال کا مطالعہ، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ص ۱۵

علامہ اقبال کی شاعری کا خلاصہ خودی یا عرفان ذات ہے۔ اس کی تعبیر و تشریح مختلف ناقدین نے اپنے انداز سے کی ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری نے بھی اپنے ایک مضمون 'اقبال کی شاعری میں عرفان ذات' میں اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> 'اقبال کے یہاں شعری حدود میں ذات شناسی کا عمل خاصا فکر انگیز اور پہلو دار ہے، سب سے پہلے اس امر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان کی تخلیقات ذات نامہ بن کر نہیں رہ جاتیں، بلکہ ذات کی ماورائی صورت کو ابھارتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز حد درجہ شخصی اور انانیتی ہونے کے باوجود قبولیت اور اعتبار کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ نیطسے کے فوق البشر کے مماثل جوہر خودی سے متصف مرد مومن کی بات کرتے ہیں جو تمام رکاوٹوں کو روند کر ستاروں سے آگے کے جہانوں کے خواب دیکھتا ہے تو موجودہ سائنسی عقلیت سے آراستہ، قدروں سے بیگانہ اور مہلک ہتھیاروں سے لیس دنیا میں بھی ان کی آواز مصنوعی، جذباتی اور غیر منطقی معلوم نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ ان کے تیقن آفرینی اور استناد بنیادی طور پر شعری عمل کا مرہون ہے، جو ان کی ذاتی آواز کو انسانی خطاب میں بدل دیتا ہے"۔([1])

ان کے یہاں اقبال کا فلسفہ اگرچہ اہمیت رکھتا ہے لیکن اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ وہ خوبصورت شعری پیرایہ میں ہے۔ کاشمیری اقبال تنقید میں یک رخاپن کا شکار نہیں ہوئے وہ اقبال کی عظمت کو فکر و فن کے حسین امتزاج میں دیکھتے ہیں۔

دیگر ناقدین کی طرح غالب اور اقبال کا موازنہ پروفیسر حامدی کاشمیری نے بھی کیا ہے۔ انہوں نے اقبال اور غالب دونوں کے یہاں پائی جانے والی صوفیانہ فکر کا تنقیدی مطالعہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دونوں کے یہاں تصوف کی کارفرمائی ہے:

---

1 حرف راز - اقبال کا مطالعہ، ص 18

''اقبال اور غالب دونوں کے یہاں ذات کی آگہی خود ان کی ایک قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے اور ان کی اپنی شخصیتوں کی دریافت کا عمل ہے یہ صحیح ہے کہ غالب کے یہاں وہ تشکیک اور اقبال کے یہاں عشق (جو ادراک کا دوسرا نام ہے) کی صورت اختیار کرتی ہے لیکن دونوں کا مآخذ بہر حال تصوف ہی ہے''۔ ([1])

حامدی کاشمیری نے اقبال اور غالب کی ذہنی و فکری مماثلوں کو اپنی کتاب ' اقبال اور غالب ' میں پیش کیا ہے۔ اس میں انہوں نے دو عظیم شاعروں کی مماثلت اور مشابہت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے کتاب کو چار ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ نکتۂ چند، غریب شہر، دانائے راز، اور اختتامیہ جس میں سارے موضوعات کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ وہ اس پوری بحث سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ غالب کے یہاں معنویت حجابات فن میں مستور رہتی ہے۔ جب کہ اقبال کے یہاں معنویت گہری مطابقت قائم کرتی ہے۔ وہ اپنے عہد معاشرہ اور تہذیب سے شعوری اور شخصی رابطے کو اہمیت دیتے ہیں۔ غالب اپنی پوری شخصیت کو شعری تجربے کے سیل آتش کے حوالے کرتے ہیں اور شعری تجربہ ان کے یہاں شعر کی حد بندیوں کو توڑ کر اپنی راہ بناتا ہے۔[2]

حامدی کاشمیری نے ''اقبال کے ذہن پر مغرب کا اثر'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ:

''مغرب کے تئیں اقبال کا رویہ سطحی یا یک رخی نہیں، بلکہ متضاد اور پیچیدہ رہا ہے۔ یہ ایک ایسے زندہ شاعر کا رویہ ہے جو کٹرپن سے پاک ہے جو صدیوں کی تہذیبی اور اخلاقی قدروں کا پروردہ ہے ........... لیکن وہ مغرب سے حذر نہیں کرتا بلکہ تخیل کی عبادت کے ساتھ ساتھ ایک دانشور اور مصلح کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔'' ([3])

اس سلسلے میں حامدی کاشمیری کا رویہ یک رخا نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کے یہاں مغرب سے مثبت اثرات اخذ کرنے کا اعتراف ملتا ہے۔

---

1 حرف راز - اقبال کا مطالعہ ، ص 43

2 اقبال اور غالب، ادارہ ادب سری نگر، اشاعت اول، ۱۹۷۸ء

3 بحوالہ سرور، اقبال اور مغرب ص 20

حامدی کاشمیری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تنقید کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ کسی بھی فن پارے کی تنقید میں ان کا طریقہ متن کو اہمیت دینے کا ہے وہ خارجی شواہد سے زیادہ داخلی شواہد پر توجہ دیتے ہیں۔ انہوں نے اقبالیات پر جو بھی لکھا ہے وہ ان کے پختہ تنقیدی شعور کا پتہ دیتا ہے۔ وہ ایک نقاد کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔ اس وجہ سے ان کی تنقید میں بھی ادبیت کی چاشنی محسوس کی جاسکتی ہے۔

# محمد منور

پروفیسر محمد منور کا شمار ماہر اقبالیات میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ اردو فارسی عربی کے شاعر مترجم اور مقرر ہیں۔ اقبالیات سے انہیں بے پناہ لگاؤ تھا اس وجہ سے انہوں نے خود کو اقبالیات کے لیے وقف کرلیا تھا۔ ناظم اقبال اکیڈمی کی حیثیت سے پاکستان میں اقبالیات کے فروغ میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ محمد منور نے اقبالیات میں 'ایقان اقبال' (۱۹۷۷ء) 'برہان اقبال' (۱۹۸۲ء) میزان اقبال ۱۹۸۶ء اور 'قرطاس اقبال'، (۱۹۹۸ء) جیسی گراں قدر کتابوں کا اضافہ کیاہے۔ پروفیسر محمد منور کا مطالعہ وسیع ہے وہ بھی اقبال کی طرح مشرق ومغرب کے فلسفہ سے واقف ہیں۔ اس کا بھرپور استعمال وہ اقبال تنقید میں کرتے ہیں۔ وہ جابجا قرآنی آیات کا استعمال کرتے ہیں اور اس سے اپنے مطلوب کا استشہاد کرتے ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت ان کو دیگر ناقدین اقبال سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اقبال کی ایک اہم خصوصیت توازن پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> 'توازن کا احساس علامہ اقبال کے افکار و اشعار کا ایک اہم پہلو ہے۔ چنانچہ وہ ہر نظامِ فکر اور فلسفے کی اچھی چیزوں پر بھی نگاہ رکھتے تھے اور بری چیزوں پر بھی۔ مثلاً وہ جمہوریت کی اچھی باتوں کے قائل ہیں۔ مگر جب وہ استعماری روپ دھارتی ہے یا دو صد مغزِ خر کے شمار ہی کو معیارِ دانش قرار دے لیتی ہے تو وہ اسے معاف نہیں کرتے۔ وہ اشتراکیت کی اچھی باتوں کی تعریف کرتے ہیں مگر اس کی خدا ناشناسی اور احترامِ روحِ آدمیت سے ناآگاہی پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں۔ مسولینی کی شخصیت سے بہت متاثر تھے، مگر جب اس نے حبشہ کو پامال کیا تو علامہ اقبال نے مسولینی پر بھی اور اس سارے تمدن پر بھی لعن طعن کی، جس نے یورپ کی استعماری اور فسطائی روح کو جنم دیا تھا۔ -- ان کی ''خودی'' کو ''بے خودی'' کا سہارا میسر ہے۔ ان کا ''شکوہ'' بھی تنہا نہیں رہا، اسے بھی ''جوابِ شکوہ'' نے تقویت دے دی۔ اُن کے یہاں آزادیِ افکار کو تقلید اور تقلید کو آزادیِ افکار کی احتیاج ہے۔''[1]

---

1 میزانِ اقبال، پروفیسر محمد منور ،اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۲ء

یہ توازن اقبال کے یہاں ہر جگہ نظر آتا ہے وہ اپنے فن کو فلسفہ پر اور فلسفہ کو فن پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ وہ اپنے مطلب کی جو چیز جہاں پاتے ہیں اس کو اخذ کرتے ہیں اور جو ناپسند پاتے ہیں اس کو رد کر دیتے ہیں۔ اس اخذ ورد میں کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بادی النظر میں متضاد ہوتی ہیں۔ محمد منور اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

'' علامہ اقبال جو اثر قبول کرتے ہیں، وہ ان کے وسیع نظامِ فکر و خیال سے متصادم نہیں ہوتا، اُلٹا اس کی تعمیر کا حسین جزو بن جاتا ہے۔ جہاں بظاہر تصادم کا منظر جلوہ گر ہے، وہاں در حقیقت تدریج ہے یا پس منظر کی وسعتوں میں کوئی شے کسی دوسری سے فاصلے پر ہونے کی بدولت مربوط نظر نہیں آتی۔ پس منظر کی کلیت ذہن نشین ہے تو نہ بے ربطی ہے نہ تصادم--- کائنات کے تصادمِ بے نہایت میں تلخی و شیرینی، بلندی و پستی، شیری و روباہی، نور و ظلمت تصادم کا نام نہیں، وہ تو ایک سلسلے کے اجزاء ہیں جس سے خدا کی خلّاقی کے گوناگوں مظاہر وجود میں آتے ہیں:

سلسلۂ روز و شب تارِ حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

ہر وادیِ خیال میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والے شعراء ہی ہو سکتے ہیں جن کے پیشِ نظر کوئی مقصد یا مقصود نہیں ہوتا۔ ورنہ تلاش کہیں تو کوئی مثبت رُخ اختیار کرتی، اور آوارگی ہی مایۂ حیات بن کر نہ رہ جاتی۔''[1]

اقبال فارسی کے ساتھ عربی زبان سے بھی واقف تھے انہوں نے عربی کی تعلیم میر حسن سے حاصل کی تھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جس کو عربی کی تعلیم دیں اس کے اندر عربی ادب کا ذوق پیدا کر دیتے ہیں۔ اس وجہ سے اقبال کے بارے میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کے اندر عربی ادب کا گہرا ذوق تھا۔ محمد منور نے اقبال کی شاعری پر عربی زبان و ادب کے اثرات کا باریکی سے مطالعہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کے یہاں نہ صرف یہ کہ فکری لحاظ سے عربی شاعری کے اثرات ملتے ہیں بلکہ فنی لحاظ سے بھی انہوں نے عربی سے استفادہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کلامِ اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں تو متنبی، معری، عمرو بن کلثوم، بوصیری، کعب بن زہیر، زہیر بن ابی سلمیٰ، امرؤالقیس، معتمد وغیرہ شعرائے عرب کا ذکر یا نشان مل جاتا ہے۔ مثلاً ارمغانِ حجاز میں اقبال نے عمرو بن کلثوم کا یہ شعر اپنے قطعہ کا جزو بنا لیا ہے:

---

1 میزانِ اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۲ء

صدبہ بیب الکاس ّ بامّ عمرو

وکان الکاس مجراھا الی مینا

اگر ایں است رسمِ دوست داری

بدیوارِ حرم زن جام و مینا

(اے امِ عمرو ہم دائیں جانب تھے اور دستور کے موافق گردشِ ساغر کو دائیں جانب ہی سے شروع ہونا چاہیے تھا، مگر تو نے اسے الٹا چلا دیا۔ اگر طریقِ دوستداری یہی ہے تو پھر جام و مینا کو دیوارِ حرم پہ دے مار!)

مگر بعض جگہ عربی شعروں کا پرتو نظر آتا ہے، اور اس ضمن میں میرا خیال ہے کہ اگر متنبی، ابو تمام اور امرؤالقیس وغیرہ کے کلام کا بالتدقیق مطالعہ کیا جائے تو ممکن ہے ''زیادہ نشانات مل جائیں۔''

محمد منور اردو اور عربی دونوں زبانوں کے ادب سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے اقبال کے کلام پر عربی زبان کے اثرات کے بہت سارے نمونے پیش کیے ہیں۔ اقبال کا والدۂ محترمہ کی یاد میں لکھی گئی نظم کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

'' اقبال نے والدہ مکرمہ کا جو مرثیہ کہا تھا، اس کا آخری شعر ہے:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

دوسرے ممالک میں بھی ''لحد پر شبنم افشانی'' کی خواہش پیرایۂ دُعا ہو گی، لیکن عرب کی سرزمین تو ازلی تشنہ سرزمین ہے، لہٰذا عربوں کے یہاں یہ دُعا انتہائی خلوص کی مظہر تھی کہ تیری قبر گیلی رہے---ابو تمام نے اسی تصور کے تحت محمد بن حمید الطائی حاکم موصل کے مرثیے میں یہ مضمون پیدا کیا تھا:

وکیف احتمالی للعب یوث صنیعۃ

با ر سِقاھا قبراً وفی لحدہ البحر

(میں اس قبر کو سیراب کرنے والے بادلوں کا ممنون کیوں ہوں، جس قبر کی لحد میں خود سمندر سویا پڑا ہے۔)''

کلام اقبال کا موازنہ عربی شعر اسے وہی کر سکتا ہے جو دونوں زبانوں کے ادب سے واقف ہو۔ محمد منور بلاشبہ اس کے اہل ہیں۔ وہ جابجا قرآنی آیات اور عربی شعر اسے استشہاد کرتے ہیں۔اس حوالے سے ان کی ایک اہم کتاب 'برہان اقبال'[1] ہے جس میں انہوں علامہ اقبال کے یہاں قرآن سے استفادہ کے سلسلے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کے عنوانات یہ ہیں: قرآنی تصور تاریخ اور علامہ اقبال، علامہ اقبال۔ مرد یقین۔ قرآن کی تعلیمی جہت اور علامہ اقبال، علامہ اقبال اور کتاب زندہ، علامہ اقبال بحضور قرآن، جہان اقبال۔ جہان قرآن اور علامہ اقبال اور اجتہاد۔ اس کتاب کا ہر صفحہ اقبال اور قرآن کے رشتہ کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے۔اس سلسلے میں غلام مصطفی خان، اور محمد منظور عالم وغیرہ سے ان کا کام اس لحاظ سے بہتر ہے کہ انہوں نے اقبال کے ہر شعر کو زبردستی کسی آیت یا حدیث سے جوڑنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

ان کی دوسری کتاب 'ایقان اقبال'[2] میں سات متفرق مضامین ہیں۔ اقبال اور تعلیم آدمیت، علامہ اقبال کا تصور تقدیر، علامہ اقبال کا تصور ملت ، ماضی حال ۔ مستقبل، علامہ اور مرگ مجازی اور فکر کلام اقبال کی روشنی میں۔ اگرچہ یہ مضامین کسی ایک موضوع پر نہیں ہیں لیکن اقبالیات کے کسی نہ کسی اہم موضوع سے بحث کرتی ہیں۔

محمد منور کی کتاب 'قرطاس اقبال'[3] کی نوعیت سوانحی ہے۔اس میں انہوں نے اقبال کی عائلی زندگی اور ان کے اخلاق وعادات کو بیان کیا ہے۔

محمد منور نے اقبالیات میں جو بھی لکھا ہے وہ اقبال کی عقیدت میں ڈوب کر لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''علامہ اقبال کا کلام اور ان کا فکر محض براعظم کی وسیع و عریض حدود تک ہی محدود نہ رہا بلکہ وہ سیاسی جغرافیائی اور نسلی حدود کو عبور کر کے کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ آج علامہ اقبال کی حیثیت ایک بین الاقوامی مفکر اور معلم کی ہے اور یہ امر مسلم امت کے لیے اور پاکستان کے لیے لائق صد فخر ہے۔''[1]

---

1 ناشر گلشن پبلشرز، سری نگر، ۱۹۹۵ء

2 ناشر: اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۸۸ء

3 ناشر: اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۹۸ء

یہ عبارت اقبال سے ان کی گہری عقیدت اور لگاؤ کی غمازی کر رہی ہے۔ ضروری سی بات ہے کہ اس عقیدت کے ساتھ لکھائی سے تنقید میں اقبال کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں اقبال کے فکر و فن کے صرف مثبت پہلو ہی سامنے آئے ہیں۔ کسی بھی شخصیت کے ساتھ بھی یہ معاملہ ہو اس کو تنقیدی روش کے خلاف مانا جائے گا۔

پروفیسر محمد منور کی اقبال شناسی پر ایک کتاب بھی زبیدہ جبیں نے 'محمد منور بطور اقبال شناس' کے نام سے لکھی ہے جو اقبال اکادمی پاکستان سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔

---

1 میزان اقبال، ص ۱۳، ۱۴، اقبال اکادمی پاکستان، ط دوم ۱۹۹۲ء

# طاہر تونسوی

اقبالیاتی تنقید میں طاہر تونسوی (اصل نام: حفیظ الرحمن طاہر ایک بڑا نام ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت ادیب، شاعر، نقاد اور محقق ہیں۔ ان کا اہم کام اقبالیات پر متفرق مضامین کو جمع کر کے شائع کرنے کا ہے۔ اقبال کی صد سالہ تقاریب کے موقع پر ان کی تین کی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ 'اقبال اور پاکستانی ادب' میں انہوں نے عزیز احمد کے سات مقالوں کو جگہ دی ہے۔[1] یہ وہ مضامین ہیں جو مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں شامل مقالے یہ ہیں: اقبال اور پاکستانی ادب، اقبال کی شاعری میں حسن و عشق کا عنصر، اقبال کا رد کردہ کلام، کلاسیکی نظریات پر اقبال کی تنقید، اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ، اقبال کا نظریہ پاکستان، اقبال کا نظریہ فن، کلام اقبال میں خون جگر کی اصطلاح۔ یہ سبھی مضامین کتاب کی اہمیت اور افادیت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ دوسری کتاب 'حیات اقبال' ہے جس میں مختلف اہل قلم کے مضامین کو تین الگ ابواب میں جمع کیا گیا ہے۔ حالات و واقعات میں سوانحی مضامین، دوسرے حصے میں نفسیات کے عنوان سے اور تیسرے حصے میں تاثرات کے عنوان سے مضامین جمع کیا ہے۔ اسی سال شائع ہونے والی ان کی ایک اہم کتاب 'اقبال اور سید سلیمان ندوی' ہے۔ اس میں اقبال پر سید سلیمان ندوی کے ان مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی معارف میں اقبال پر شائع ہونے والے مضامین کی فہرست کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ طاہر تونسوی کی مرتب کردہ اقبالیات پر دوسری کتابیں ہیں: اقبال اور مشاہیر (۱۹۷۸) جس میں اقبال اور مشرق و مغرب کے دانشوروں کے تعلقات کی گرہ کشائی کی گئی ہے۔ 'اقبال اور عظیم شخصیات' (۱۹۷۹) میں انہوں نے دنیا کی عظیم شخصیات کے بارے میں اقبال کے تاثرات کے حوالے مضامین کو شامل کیا ہے۔ 'اقبال شناسی از نخلستان (۱۹۸۸) گورنمنٹ کالج ملتان کے مجلہ نخلستان میں اقبالیات پر شائع مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ اسی نوعیت کی ایک اور

---

1 کتاب میں شامل ایک مضمون 'اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ' عزیز احمد کا نہیں ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ہیں۔

اقبال شناسی اور ا [illegible] یل (۱۹۸۹ء) جس میں ولایت حسین کالج ملتان کے مجلہ ا [illegible] یل میں شائع اقبالیات پر مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔

طاہر تونسوی کی ترتیب کردہ ایک اور اہم کتاب 'اقبال شناسی اور نگار' (1998) ہے ماہنامہ نگار اردو کی ادبی دنیا میں نیاز فتحپوری کے ادارت میں نکلنے والا ایک ایسا ادبی رسالہ مانا جاتا ہے جس کے اندر مضامین کی اشاعت ہی اس کے مستند ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی، نگار میں علامہ اقبال کی فکر و فن پر بھی بیش بہا مضامین مستند اقبال شناسوں کے قلم سے شائع ہوئے ہیں۔ اس مجموعہ مضامین میں نیاز فتحپوری کے پانچ مضامین اور باقی ایک ایک مضمون پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر عبد القادر سروری، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر عبد المغنی، ڈاکٹر محمود حسنین اور ڈاکٹر سعید جعفری کے ہیں۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی اردو تنقید میں معتبر حوالہ ہیں، ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف اردو کی بڑی شخصیتوں نے کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے انہیں' سماجیاتی دبستان کا نقا'د قرار دیا ہے، ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے کہ 'تحقیق و تنقید اور اقبالیات میں ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے لیے جو نام اور مقام بنایا ہے وہ اس کی محنت کا ثمر ہے'، عرش صدیقی نے ڈاکٹر تونسوی کی تنقید کے حوالے سے رائے دی کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا تنقیدی اسلوب امتزاجی ہے'۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا کہنا ہے کہ' ڈاکٹر طاہر تونسوی اپنی تاریخی اہمیت کی بدولت مستقبل کے محققوں اور نقادوں کے لیے دلیل راہ ثابت ہو گا'۔ انیس اشفاق کا کہنا ہے کہ 'ڈاکٹر طاہر تونسوی کے تنقیدی تجزیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے مضامین میں لفظیات و اصطلاحات کی تکرار نظر نہیں آتی'۔ رام لعل کا کہنا ہے کہ' ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تنقید تجزیے اور تبصرے کی حدود کو پار کرتی ہوئی ایک نئے انداز کے ادبی مطالعوں کا سا لطف پیدا کر دیتی ہے'۔[1]

طاہر تونسوی نے اگرچہ اقبالیات پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی ہے لیکن انہوں نے نادر اور نایاب کتابوں کو جمع کر کے شائع کرنے کا جو کام کیا ہے اس سے یقینی طور پر اقبال کے شائقین کو مدد ملے گی۔

---

HTTP://M.HAMARIWEB.COM/ARTICLES/DETAIL.ASPX?ID=41920 1

# عتیق صدیقی

عتیق صدیقی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک کامیاب صحافی اور قلمکار تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور فکر بلیغ تھی۔ ان کے تنقیدی مضامین تنقید اور تحقیق کی آمیزش کا خوبصورت نمونہ ہیں۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے۔[1] اقبالیات پر انہوں نے اگرچہ ایک صرف ایک کتاب ''اقبال جادو گر ہندی نژاد'' (1980) کے نام سے لکھی ہے لیکن یہ کتاب دو وجوہات کی وجہ سے چرچہ میں رہی۔ پہلی وجہ یہ کہ انہوں نے دلائل کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال نے نظریہ پاکستان نہیں پیش کیا تھا۔ دوسری وجہ سر عبدالقادر کا وہ مضمون جو اقبالیات پر سب سے قدیم مضمون مانا جاتا ہے عتیق صدیقی نے تلاش کرکے اس کتاب میں شائع کر دیا ہے۔ ان کی اس کاوش کو اقبالیاتی ادب میں سراہا گیا اور رفیع الدین ہاشمی جیسے اقبال شناسوں نے اس مضمون کے لیے عتیق صدیقی کی تحقیق کا حوالہ دیا ہے۔

'اقبال جادو گر ہندی نژاد' اقبال کی سیاسی زندگی اور سیاسی زندگی کے بدلتے دھاروں پر روشنی ڈالتی ہے اس کتاب میں عتیق صدیقی نے علامہ کی زندگی کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالی ہے اوران کی سیاسی زندگی کا بھرپور جائزہ لیا ہے انہوں نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ کیسے اقبال طالب علمی کے زمانے سے ہی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے اور پھر کیسے انہوں نے خاک وطن کے ہر ذرے کو دیوتا مانا اور جب سیاست میں پختگی حاصل ہوئی تو کیسے انہوں نے سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔۔۔ کا پیام سنایا اور جب دنیا کا سفر کیا تو کیسے ان کے دھارے بدلے ان کے وطن پرستی کا تیور ٹوٹا اور کیسے ان کی سیاست کا محور اسلامی تعلیمات بن گئیں۔ عتیق صدیقی کا کہنا ہے کہ علامہ کو کسی ایک لقب میں محدود کرنا ان کے علم و فن و مرتبے کی توہین کے مترادف ہے وہ صرف شاعر اسلام نہیں ہیں بلکہ شاعر مشرق اور شاعر ہند بھی ہیں وہ قومی شاعر ہیں اور وطنی شاعر بھی ہیں، وہ پیغامی شاعر ہیں اور رومانی شاعر بھی۔ ان کے یہاں زندگی کے مختلف پہلو ہیں جو وقت کے دھاروں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ جہاں تک ان کی سیاست کا تعلق ہے تو ان کا سیاسی نظریہ بھی وقت کے ساتھ بدلتا رہا ہے۔

---

1 محمد ارشد نے ان کے تنقیدی اور صحافتی مضامین کو چار جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب کتاب کتابی دنیا سے ۲۰۱۲ میں شائع ہوئی ہے۔

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر

فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کی سحر کر

عتیق صدیقی کی تحقیق کے مطابق اقبال نے نظریہ پاکستان نہیں پیش کیا تھا۔ ان کی بات کا غلط مطلب نکالا گیا۔ اقبال کے نظریۂ پاکستان کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے:

> ''پنجاب کونسل کی ممبری کی نوعیت تو صوبائی سیاست کی تھی، لیکن اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (1930 ) کی صدارت کی 1930ء اور 1931ء میں دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں حصہ لیا اور 1932ء آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کی۔ ان کے مسلم لیگ کے خطبہ صدارت کو تو ہماری تاریخ میں بوجود غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اور آج تو تحریک پاکستان کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے، اگرچہ یہ محل نظر ہے، کیونکہ ''برطانوی ہند'' میں اقبال جس ''مسلم ہند'' کا قیام چاہتے تھے وہ پاکستان کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ زندگی کے آخری چند برسوں میں اقبال کے سیاسی افکار میں ایک اہم انقلاب رونما ہوا، سوشلزم اور سوویٹ یونین سے انہیں اس حد تک گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ لوگوں نے ان کے لیے 'اسلامی سوشلسٹ' کی اصطلاح وضع کر ڈالی، اقبال کی شاعری نیز دوسرے مآخذ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عصر حاضر کے انسان کے معاشی مسائل صرف سوشلزم ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں اور سوشلزم کو وہ عین اسلام سمجھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں سوشلسٹ پارٹی کا قیام ایک مستقل سیاسی پارٹی کی حیثیت سے عمل میں آئے اور جب ایسا نہیں ہو سکا تو اس کے خلاف شدید غم و غصے کا اظہار کیا''۔[1]

عتیق صدیقی کی اس تحقیق کا کہ اقبال برطانوی ہند میں مسلم ہند چاہتے تھے پاکستانی اقبال شناسوں نے سخت نوٹس لیا ہے۔ البتہ عمومی طور پر ہندوستانی اقبال شناسوں اس سلسلے میں عتیق صدیقی کا دفاع کیا ہے۔ عتیق صدیقی ایک تحقیق پسند آدمی تھے، وہ اپنی تحقیق کو بغیر کسی تردد کے پیش کر دیا کرتے تھے۔ اقبال کس قسم کی ریاست چاہتے تھے ؟ عتیق صدیقی کہتے ہیں کہ اقبال سوشلزم سے اس حد تک متاثر تھے کہ وہ سوسلسٹ ریاست کے قیام کے خواہش مند تھے، وہ لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اقبال کے ذہن نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ اس ملک کی بیشتر آبادی جو مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہے اس کے مسائل کی نوعیت وہی ہے جو انقلاب سے پہلے روس کی تھی۔ اسی

---

1 اقبال جادو گر ہندی نژاد عتیق صدیقی، ص 16

احساس کے پیش نظر انھوں نے سوویٹ روس کے معاشی تجربے کا دل چسپی سے مطالعہ کیا تھا اور اس سے وہ متاثر بھی ہوئے تھے، محمد دین تاثیر کے مطابق اقبال نے یہ بات متعدد بار واضح الفاظ میں کہی تھی کہ اگر مجھے کسی مسلم ملک کا سربراہ بنا دیا جائے تو وہ سب سے پہلے اسے سوشلسٹ ریاست بنائیں گے۔" [1]

عتیق صدیقی کے تحقیق کے نتیجہ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن انہوں نے جس طرح سے قدیم دستایز اور خطوط سے اپنے موقف میں دلائل کو پیش کیا ہے اس سے ان کے تحقیقی اور تنقیدی شعور کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

1 اقبال جادو گر ہندی نژاد ص 118

# عبدالقوی دسنوی

سرزمین ہند میں نامساعد حالات کے باوجود جن شخصیات نے اپنے خون جگر سے اقبالیات کی آبیاری کی اور اقبالیات کو فروغ دیا ان میں عبدالقوی دسنویکانام سرفہرست ہے۔ بھوپال میں سیفیہ کالج کو انہوں نے علم وعرفان کا گہوارہ بنادیا۔ انہوں نے اقبالیات میں 'اقبال انیسویں صدی میں'، بچوں کا اقبال'، 'اقبال اور دلی'،'اقبال اور دارالاقبال بھوپال'، 'ہندوستان میں اقبالیات' اور 'اقبالیات کی تلاش'، جیسی گراں قدر کتابیں اردو دنیا کو دی ہیں۔ ان کتابوں میں اقبال اور دلی اور اقبال اور بھوپال سوانحی نوعیت کی ہیں۔ ان میں اقبال کے ان شہروں سے تعلقات اور اسفار کی روداد ہے۔ عبدالقوی دسنوی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان شہروں سے اقبال کے تعلق تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ ان اشعار کی توضیح وتشریح بھی کی ہے جو ان نے شہروں میں کہے ہیں یا ان شہروں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس حوالے سے دہلی آمد پر اقبال کی نظام الدین اولیاء کے درگاہ کی زیارت اور اس موقع کی نظم 'التجائے مسافر' کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔ سفر دہلی کے حوالے سے ہی عبدالقوی دسنوی نے تصویر درد کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس حوالے سے اقبال کے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تعلق اور مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، اسلم جیراج پوری اور ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ سے تعلقات کی نشاندہی بھی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اقبال نے جب لاہور سے باہر قدم نکالا تو غالباً پہلا شہر دلی ہی تھا جہاں کی سرزمین نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور یہی آخری شہر بھی تھا جہاں سے لوٹنے کے بعد وہ کسی دوسرے شہر نہیں گئے۔[1]

اقبال اور بھوپال میں عبدالقوی دسنوی سلطان ٹیپو کا ذکر کرنا نہیں بھولے۔ اقبال نے جس طرح سے اس عظیم مجاہد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ اس عظیم مجاہد کے تئیں اقبال کے جذبۂ احترام کو واضح کرتا ہے۔

---

1 اقبال اور دلی، عبدالقوی دسنوی، ص ۸، اشاعت اول: ۱۹۷۸ء

عبد القوی دسنوی نے اقبال کی شاعری کے فکر و فن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اقبال تنقید میں انہوں نے فکر اور فن دونوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ تنقیدی مضامین میں انہوں نے عموماً ان موضوعات کا انتخاب کیا ہے جس کی طرف کم لوگوں نے توجہ دی ہے۔ ایسا ہی ان کا ایک مضمون اقبال کی مزاحیہ شاعری' کے بارے میں ہے جو ان کی کتاب 'اقبالیات کی تلاش میں شامل ہے۔ اقبال نے اکبر کے رنگ میں ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے مزاحیہ شاعری کی تھی۔ یہ اشعار بانگ درا کے آخر میں شامل کیے گئے ہیں۔ مزاحیہ شاعری کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جسے اقبال نے بانگ درا میں شامل نہیں کیا۔ اقبال اور اکبر کی مزاحیہ شاعری میں مماثلت کی وجہ سے بہت سارے لوگ اقبال کے اشعار بھی اکبر کی طرف منسوب کر کے لکھتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ بانگ درا کے اس حصہ کو عام ناقدین نے اقبال کے عام مزاق کے خلاف تصور کرتے ہوئے اپنی توجہ سے محروم رکھا۔ عبد القوی دسنوی اپنے مضمون میں اقبال کی اس نوع کی متداول اور متروک شاعری کا تفصیلی جائزہ لے کر وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

> "اقبال کی پوری شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کی آخری دور کی شاعری اس لیے بہت اہم ہے کہ قاری یا سامع اسے پڑھنے یا سننے کے بعد محض واہ واہ نہیں کرتا بلکہ آہ آہ کی منزل سے بھی گزرتا ہے۔ لیکن یہ آہیں محض وقتی نہیں ہوتیں بلکہ دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ اس لیے آج یہ کہنا بجا ہے کہ اقبال کی وہ ظریفانہ شاعری جو ۱۹۰۲ میں 'دین و دنیا' کی صورت میں شروع ہوتی ہے جس میں ہلکی سی تمسخر کی کیفیت بھی وہ دس بارہ سال کے لیے 'اکبری رنگ' اختیار کرتے ہوئے خالص طنز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کا سلسلہ ان کی زندگی کے تقریباً آخری دم تک رہتا ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا جائے کہ آخری زمانے کی شاعری کا خالص طنزیہ حصہ ان کے ابتدائی ظریفانہ کلام کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہے تو یہ بات اور زیادہ صحیح ہو گی۔"[1]

مذکورہ عبارت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں پہلی یہ کہ اقبال کی شاعری میں طنز و مزاح کا عنصر محض وقتی نہیں تھا۔ یہ کسی نہ کسی صورت میں آخر تک ان کے کلام کا حصہ رہا ہے۔ ابتدا میں وہ اکبری رنگ میں تھا بعد میں یہی طنزیہ لہجہ میں بدل جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ طنزیہ لہجہ پہلے کے ظریفانہ لہجہ سے عبد القوی دسنوی کے یہاں زیادہ قیمتی ہے۔

---

1 اقبال کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری، اقبالیات کی تلاش، عبد القوی دسنوی،

اقبالیات کی تلاش کے دوسرے مضامین میں اقبال کی زندگی، ۱۹۰۱ سے ۱۹۰۵ تک نظمیہ شاعری اور بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باقی کے پانچ مضامین سوانحی نوعیت کے ہیں جن میں اقبال کے سفر ممبئی، علی گڑھ، پانی پت کو بیان کیا گیا ہے۔ دو مضامین میں مختار احمد انصاری اور خواجہ حسن نظامی سے اقبال کے تعلقات کو بیان کیا گیا ہے۔

عبدالقوی دسنوی اردو زبان وادب کے معروف ناقد ہیں۔ انہوں نے اردو زبان وادب پر کم و بیش اٹھائیس کتابیں تحریر کی ہیں۔ انہوں نے اقبالیات میں جو بھی لکھا ہے وہ قابل قدر اور اقبالیات میں اضافہ کا باعث ہے۔

# سلیم اختر

سلیم اختر کی کتاب 'اقبال اور ہمارے فکری رویے' (1983) افکار اقبال پر ایک کامیاب کوشش ہے۔ یہ کتاب مصنف کے دو مقالوں پر مبنی ہے پہلا مقالہ ہے علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں" در حقیقت یہ مقالہ فراق گورکھپوری کے علامہ اقبال کے خلاف ایک مضمون کا جواب ہے۔ دوسرا مقالہ ہے 'اقبال شناسی کی بین الاقوامی روایت' ہے اس میں بین الاقوامی سطح پر اقبال شناسی کی روایت کے آغاز اور فروغ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے فراق گورکھپوری کے اعتراضات اور دوسرے ناقدین کے بے جا اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ مصنف نے اقبال کے متعلق جہاں بہت سی غلط فہمیوں کا جائزہ لیا ہے وہیں کچھ خوش فہمیوں کا بھی ازالہ کیا ہے۔ ساتھ ساتھ اقبال کے لسانی شعور پر بھی روشنی ڈالی ہے اقبال کے فکری زاویوں پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے، اور اقبال کا مطالعہ اقبال کے اساتذہ کی روشنی میں کیا گیا ہے تاکہ اقبال کے افکار و نظریات کے حقیقی مصادر کی جانکاری ہو سکے۔

مصنف نے اقبال شناسی کے کچھ نکات بیان کیے ہربرٹ ریڈ سید محمد محیط طباطبائی اور ، ۔ کلاسر ن جیسے اقبال شناسوں کا تذکرہ ان کی اقبال شناسی کی روشنی میں کیا ہے۔ سلیم اختر کی یہ کتاب مختصر سہی مگر اپنے موضوع پر ایک اچھی کتاب ہے۔

بزم اقبال کی طرف سے 1988 میں 'اقبال اور فنون' کے نام سے ڈاکٹر سلیم اختر کا ترتیب دیا ہوا مضامین کا انتخاب شائع ہوا۔ اس کتاب میں 1963 سے 1988 تک کے اقبالیات پر شائع مضامین کا انتخاب شامل ہے۔ 'فنون' کا اجراء احمد ندیم قاسمی نے لاہور سے 1963 میں کیا تھا۔ اس نے دسمبر 1977 میں اقبال پر خصوصی نمبر بھی شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ جولائی 1966، اپریل 1973 اور جون - جولائی 1974 کے شماروں میں اقبال پر خصوصی گوشہ شائع کیا تھا۔

زیر نظر کتاب میں ملک احمد نواز، ڈاکٹر سید عبد اللہ، سید وقار عظیم، احمد ندیم قاسمی اور محمد یوسف خاں وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ فنون کی مختلف فائلوں سے ان مضامین کی اشاعت سے یقیناً اقبال پر کام کرنے والوں کو سہولت ہو گی۔

'نقد اقبال کا تجزیاتی مطالعہ 'سلیم اختر کا مقالہ ہے اس میں اقبال تنقید پر اب تک کی پیش رفت اور اس کی سمت اور رفتار کا جائزہ لیا گیا ہے، سلیم اختر کا مقالہ اقبالیاتی ادب کے دور اول ہی کو شامل ہے، اس کے بعد کے ادوار کو نہیں چھیڑا گیا ہے مگر سلیم اختر کے بقول:

''یہ درست ہے کہ دور اول کی بعض تحریروں کی آج تنقیدی اہمیت نہ ہو گی لیکن جہاں تک ان کی تاریخی اہمیت کا تعلق ہے تو اردو تنقید میں بالعموم اور اقبالیات میں بالخصوص ان کی حیثیت کم نہیں ہو سکتی کہ آنے والے ناقدین کے لیے یہ جادہ تراش تھے۔''[1]

---

[1] فکر اقبال کے بعض اہم پہلو مرتب جگن ناتھ آزاد ص 371-372

# علی شریعتی

ڈاکٹر علی شریعتی فارسی زبان وادب کے مشہور عالم ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال کی شاعری اور فن پر فارسی میں ایک تقریر کی تھی یہ تقریر اتنی جامع تھی کہ اپنے موضوع پر ایک کتاب کا درجہ رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس تقریر کو فارسی میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا اور پھر کبیر احمد جائسی نے اس کا ترجمہ اردو میں ''علامہ اقبال مصلح قرن آخر"(1981) کے نام سے کیا۔ ڈاکٹر علی شریعتی اس زمانے میں پیدا ہوئے جب علامہ کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل گئی تھی۔ ایران میں علامہ کو بڑی عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ کبیر احمد جائسی کہتے ہیں کہ علی شریعتی قرآن و حدیث کے بعد اگر کسی چیز سے متاثر ہوئے تو وہ کلام اقبال ہے ۔اسی عقیدت و الفت کا نتیجہ ہے کہ یہ تقریر انہوں نے کی۔ اس کتاب میں علی شریعتی نے علامہ کی شاعری سے زیادہ بحث نہیں کی ہے بلکہ اقبال کے مصلحانہ پہلو پر زور دیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ کیسے اقبال قوم کو قول سے عمل کی طرف ناامیدی سے امید کی طرف لاتا ہے اور کیوں بار بار علی اسد اللہ، موسیٰ کلیم اللہ اور رومی کا تذکرہ کرتا ہے اقبال ہر لمحہ ہر آن ہر پل قوم و ملت کی اصلاح چاہتا ہے اور دنیا کو الفت و محبت اور اسلام کا گہوارہ بنانا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی کہتے ہیں:

> ''اقبال نے سب سے پہلے مشرق و مغرب دونوں کے فکر (Thought) کی تحلیل و تجزیہ کیا اور دونوں کے طرز زندگی اور تہذیب و تمدن کا موازنہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہونچے کہ مشرق نے حق کو تو دیکھا مگر دنیا کو نہیں دیکھا، مغرب نے دنیا کو دیکھا مگر حق سے گریزاں رہا، اس کے بعد وہ اعلان کرتے ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ذلت کا بھی فعل ہے اور مغرب کی غلامی کا بھی، اسی کے ساتھ ساتھ ان تمام چیزوں سے دست بردار ہو جانا بھی ہے جو مشرق کے پاس موجود ہیں اور عالم انسانیت ان چیزوں کی احتیاج مند ہے یعنی حق پرستی، ذوق و شوق، ماورائی عشق، (عالم) غیب کی تلاش، فضیلت حاصل کرنے کی تمنا، روح مشرق کا وہ دائمی

اضطراب جو تخلیق کا راز جاننے، حقیقت کلی کو سمجھنے اور معمائے ہستی کو جاننے (کے لیے بپا ہے) اور مغرب اور اس کے طرز تمدن سے گریز کرنا، عالم جمود میں آنے، کمزور و ناتواں ہونے حتیٰ کہ مغرب کی مطلق العنانیت کے با امقبال اسیر ہو کر رہ جانے کے مترادف ہے''۔[1]

مذکورہ اقتباس علی شریعتی کے اسلوب تنقید کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ یہ کتاب ان کی تقریر کا حصہ ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر خطیبانہ اسلوب کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ علی شریعتی کی یہ کتاب اس حیثیت سے اہم ہے کہ اس میں عالمانہ انداز سے اقبال کے پیغام کو بیان کیا گیا ہے۔

---

1 علامہ اقبال مصلح قرن آخر صفحہ 98

# سید مظفر حسین برنی

سید مظفر حسین برنی وہ مختلف انتظامی عہدوں پر فائز تھے۔ 1981 سے 1984 کے درمیان وہ ناگالینڈ، تری پورا اور منی پور کے گورنر رہے جب کہ 1987 سے 1988 کے درمیان ہماچل پردیش اور ہریانہ کے گورنر کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ وہ 1988 سے 1992 کے درمیان چوتھے اور پانچویں قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین بنائے گئے اور 1990 سے 1995 کے درمیان جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر کے عہدہ پر فائز رہے۔ ان ذمہ داریوں کے باوجود انہوں نے ادب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ انہوں نے اقبال پر متعدد کتابین تصنیف کیں۔ حُب وطن اقبال ([1])، اقبال اور قومی یک جہتی ([2]) کلیات مکاتیب اقبال ([3])

اقبالیات پر ان کی کتاب ''محب وطن–اقبال'' ان کی ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ یہ دراصل ایک سمینار میں پڑھا گیا کلیدی خطبہ ہے جس کو نظر ثانی کے بعد انہوں نے کتابی شکل میں شائع کرایا ہے۔

سید مظفر حسین برنی نے اقبال کی شاعری میں وطن پرستی، ہندوستانی فکر و فلسفہ کا اثر، تحریک آزادی، قومی یکجہتی، نجی زندگی کے آئینے میں، نیز اقبال اور پاکستان کے جیسے عنوانات سے اس کتاب کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کی ہے اقبال اور پاکستان کا مسئلہ اہل علم کے یہاں کافی تنازع کا باعث رہا ہے۔ سید مظفر حسین برنی نے ایک خط کے حوالے سے لکھا ہے کہ اقبال نظریۂ پاکستان کے بانی نہ تھے وہ متحدہ ہندوستان کے قائل تھے۔ وہ ایک قسم کی فیڈرل گورنمنٹ چاہتے تھے

---

1 ط: ہریانہ ساہتیہ اکادمی، 1984ء پنچکولہ، بار سوم 1990ء

2 باہتمام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1986ء

3 باہتمام: دہلی، اُردو اکادمی

جہاں مسلم صوبے متحدہ ہندوستان کے ماتحت رہیں۔ مجموعی طور پر ''محب وطن اقبال'' اقبال کو ایک محب وطن ثابت کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اور اقبال پر بہتان تراشی کرنے والوں کا منہ توڑ جواب ہے۔

اقبالیات پر مظفر حسین برنی کا ایک اہم کام 'کلیات مکاتیب اقبال' کی اشاعت ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا نہایت اہم کام ہے۔ اس میں اقبال کے خطوط کو اس کے عکس کے ساتھ شائع کر دیا گیا ہے تاکہ اقبال کے خطوط کا اصل متن محفوظ ہو جائے۔

مظفر حسین برنی اردو کے مجاہد اور اقبالیات کے داعی ہیں۔ اقبالیات میں ان کی کوششیں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

# رفیق زکریا

اقبال کے قاری کے لیے یہ بات اتنی اہم نہیں کہ وہ نظریۂ پاکستان کے بانی تھے یا نہیں۔ اس لیے کہ اس سے ان کی شاعری پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر جب ہندوستان میں بعض فرقہ پرست عناصر اقبال کے افکار کی من مانی تاویل کر کے ان کو فرقہ پرست اور تقسیم ملک کا ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں اقبال کو خود ان کے وطن میں اچھوت بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کا جواب دیا جائے۔

رفیق زکریا(۱۹۲۴ء۔۲۰۰۵ء) اقبال شاعر اور سیاست داں میں علامہ کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض ایسے تجزیوں سے اتفاق کرنا مشکل بھی ہے مثلاً ان کا کہنا ہے:

''اقبال نے مغرب کے خلاف اگرچہ غیر دانشمندی کے ساتھ ایک طوفان برپا کر دیا تھا بہر حال وہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے برطانیہ مخالف رد عمل کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے، انہیں ترکی کے سلطان خلیفہ عبد الحمید کی شخصی حکومت کے ساتھ بھی کوئی ہمدردی نہیں تھی۔'[1] 'اقبال نے نہ صرف بد دلی کے ساتھ وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا بلکہ سیاست میں بھی وہ کبھی کبھی ہی حصہ لیا کرتے تھے انہیں بلاشبہ قانون اور سیاست دونوں کے ساتھ دلچسپی تھی لیکن ان دونوں شعبوں میں ایک جذباتی لگاؤ سخت محنت اور سب سے زیادہ عوام کے ساتھ مستقل رابطے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کے پاس اس کام کے لیے نہ تو وقت تھا اور نہ رغبت، انہیں آرام کرسی پر بیٹھ کر سیاست کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ اپنے گھر کی چہار دیواری کے اندر سے احکامات جاری کر سکتے تھے، لیکن کسی تحریک میں سرگرم حصہ نہیں لیتے تھے۔ ایک فلسفی کی حیثیت سے وہ اپنے خیالی محل میں رہتے تھے، اور شعر کہتے تھے جس سے ان کی شہرت انتہائی بلندیوں تک پہنچ گئی ان کی پرجوش شعلہ فشاں نظموں کی وجہ سے انہیں شاعر انقلاب کہا جاتا تھا ان کے حامیوں اور قدر دانوں کو اس وقت صدمہ اور مایوسی ہوئی لیکن جب انہوں نے برطانوی حکومت

---

1 اقبال: شاعر اور سیاست دان، رفیق زکریا، ص 101

کی جانب سے جو خلافت عثمانیہ کے زوال کی سب سے زیادہ ذمے دار تھی پیش کردہ ''سر'' کا خطاب قبول کر لیا۔
اردو اخبارات نے اقبال کے اقدام کی کھل کر مذمت کی''۔[1]

رفیق زکریا نے ''اقبال شاعر اور سیاستدان'' میں ایک طرف ان لوگوں کا جواب دیا ہے جو اقبال کی حب الوطنی پر انگلی اٹھاتے ہیں دوسری طرف خود علامہ اقبال پر کچھ اس قسم کے ریمارکس کستے ہیں کہ اقبال کی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ بہر حال علامہ کی سیاسی زندگی اور ان کی ناتجربہ کاری پر ان کے علاوہ بھی لوگوں نے انگلیاں اٹھائی ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے ان کی زندگی میں ہی ہمدرد میں مضامین لکھ کر علامہ کے سیاسی نظریات کی کھل کر نکتہ چینی کی تھی۔ جہاں تک سر کے خطاب کو قبول کرنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں جاوید اقبال کی تشریح کو قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں جو انہوں نے زندہ رود میں اس تعلق سے لکھا ہے۔

ان فروگذاشتوں کے باوجود (اگر انہیں فروگذاشت کے زمرہ میں رکھا جائے) رفیق زکریا کی کتاب اپنے موضوع پر مدلل اور محقق ہونے کی وجہ سے دوسری کتابوں پر فائق ہے۔

---

1 اقبال: شاعر اور سیاست دان ص 106، ط: ۱۹۹۵ء

# عبدالحق

اقبال تنقید میں جن ہم عصر ناقدین کو سند مانا جاتا ہے ان میں ایک اہم نام پروفیسر عبدالحق کا ہے۔ گورکھپور یونیورسٹی سے آپ نے ایم اے کیا اور پھر وہیں سے پروفیسر محمود الٰہی کی نگرانی میں ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کیا۔ پروفیسر عبدالحق کی دلچسپی اقبالیات سے ہائی اسکول سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی ایم اے میں اقبال پر خصوصی پرچے کو انہوں نے بطور مضمون لیا۔ اتفاق سے ان کے ہم سبق ساتھیوں میں سے اس پرچے کا انتخاب کرنے والے آپ اکیلے تھے۔ یہ پروفیسر محمود الٰہی کے شوق دلانے کا نتیجہ تھا یا خود آپ کی لگن و محنت، آپ نے اقبالیات کی بیش تر کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس مطالعہ کے دوران آپ کو معلوم ہوا کہ اقبالیات کے نام پر رطب و یابس جمع کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ آپ نے اپنے پی ایچ ڈی کے لیے اسی موضوع کو چنا۔ اب تک اقبالیات پر ان کی آٹھ اہم کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں: اقبال کے ابتدائی افکار (۱۹۶۹)، تنقید اقبال اور دوسرے مضامین (۱۹۷۶)، بکھرے خیالات ( اقبال کی ڈائری کا ترجمہ) (۱۹۸۸)، اقبال کی فکری سرگذشت (۱۹۸۹)، اقبال شاعر رنگیں نوا (۲۰۱۰) اور اقبال اور اقبالیات (دوسرا ایڈیشن) (۲۰۰۹ )۔ اس کے علاوہ انہوں نے دو کتابیں اقبالیات پر دیگر ناقدین اقبال کے مضامین پر مشتمل ترتیب دی ہے۔ اقبال کے شعری اسالیب (۱۹۸۹) اور اقبال کی شعری و فکری جہات (۱۹۹۸)

'اقبال کے ابتدائی افکار' آپ کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا ایک باب ہے جس کو انہوں نے شرح و بسط کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

' باقیات اقبال کی اشاعت کے بعد ہم نے ضروری سمجھا کہ اقبال کے فکر و فن کو ان کے ابتدائی کلام کے آئینے میں دیکھا جائے اور اس آئینے کو بڑے فریم میں پیش کیا جائے تا کہ ان کا اصلی رنگ، روپ نکھر کر سامنے آئے۔ '[1]

اس کتاب میں اقبال کے ابتدائی کلام پر گفتگو کی گئی ہے ۔ اس طرح یہ کتاب اقبال کے کلام کے اولین نقوش کے لیے ایک مصدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'' یہ ابتدائی کلام ۱۹۰۵ء تک کے کلام پر مشتمل ہے اقبال کے یورپ جانے سے پیشتر کے افکار و نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے مگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ ابتدائی کلام سے مراد 'بانگ درا' حصہ اول کا کلام نہیں کیوں کہ 'بانگ درا' کو ۱۹۲۴ء میں ترتیب دیا گیا۔ اس ترتیب کے وقت اقبال نے اصلاحات بھی کیں اور اضافے بھی کئے۔ اس لیے باقیات اور غیر اصلاح شدہ کلام کے متون کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے تا کہ استخراج نتائج میں کسی قسم کی غلطی نہ ہو۔ ''[2]

اقبال ایک عظیم شاعر اور مفکر ہیں ان کی فکر کی گہرائی اور وسعت کو عبد الحق ان کے اسلوب اظہار کے دلآویز پیکر سے مربوط قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے تلاطم کے آگے ابلاغ کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ عبد الحق اقبال کے تصورات کو حرف آخر نہیں تسلیم کرتے ۔ خود اقبال کا بھی یہی خیال تھا وہ خدائے برتر کے علاوہ کسی کی بات کو بھی حرف آخر نہیں تسلیم کیا کرتے تھے۔ آپ اقبال کے فکر کی اساس کائنات کے ارتقائی نظام پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ اقبال اسی زاویہ پر کائنات کا مطالعہ کرتے تھے یہاں کہ ذات واحد کا مطالعہ بھی انہوں نے اسی نہج پر کیا ہے۔ ذات واحد کو قائم بالذات ہر قسم کے تغیر سے پاک مانتے ہیں اس کے باوجود اس کا ہر روز ایک نئی شان میں ظہور ہونا ایک اضافی کیفیت ہے۔

عبد الحق نے اقبال کے فکر و فن کا مطالعہ دقت نظری کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے مطالعہ اقبال کے لیے کچھ رہنما اصول مرتب کیے ہیں جن اصولوں کی پاسداری انہوں نے خود بھی کی ہے اور اقبال کے ناقدین سے بھی اس کی امید کرتے ہیں۔ عبد الحق کی بوطیقا میں کسی بھی شخصیت کے بات کو بغیر تحقیق و جستجو کے تسلیم کر لینا نہیں ہے۔ وہ ہر بات کو فن کی

---

1 اقبال کے ابتدائی افکار ص ۸

2 اقبال کے ابتدائی افکار ص ۸

کسوٹی پر پرکھتے ہیں اس کے بعد اعتدال و توازن پر مبنی اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ عبدالحق کا ماننا ہے کہ اقبال کی فکری سرگذشت کا اگر باریکی سے مطالعہ کیا جائے تو ناقدین اقبال کے بہت سارے اشکالات کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اقبال کے ادبی سرمایہ کا دقت نظری سے مطالعہ کر کے فکر اقبال کی سرگذشت مرتب کی ہے۔ یہ سرگذشت جہاں اقبال کے فکر کو ایک ارتقائی شکل میں سمجھنے میں مدد فراہم کرتی ہے وہیں عبدالحق کی اقبالیات پر گہری نظر کی بھی غمازی کرتی ہے۔ انہوں نے اقبال کے ابتدائی دور کے نثری اور شعری سرمایہ کو کھنگال کر ان اقبال کے افکار کی ایک ایسی مکمل تاریخ مرتب کی ہے جس میں فکر اقبال کی ساری پیچیدگیوں کو ختم کر دیتی ہے۔ عبدالحق اقبال کے ادبی سرمائے کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

> '' اقبال کا فکر و نظر ارتقاپذیر رہا، اس ارتقاپذیری کی راہیں اور رفتار مختلف سہی مگر فکر و نظر کا کارواں مجموعی طور پر رواں دواں آگے کی طرف بڑھتا رہا۔ اقبال صرف شاعر نہ تھے بلکہ مفکرانہ ذہن و فکر بھی رکھتے تھے اس ذہن و فکر میں غور و فکر تلاش و تنقید بھی شامل ہے۔ اسلئے وہ اپنے خیالات پر بھی تدبر و تفکر کی نظر ڈالتے اور دوسرے مفکرین کی افکار و آرا پر بھی تنقید و تحسین کے انداز میں غور و فکر کرتے رہے۔۔۔۔۔ اس غور و فکر میں وہ اپنے تصورات کا جائزہ لیتے اور ان پر عمیق غور و فکر سے نظر ثانی بھی کرتے رہتے۔ نظر ثانی میں ارتقائی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتیں اور اقبال رجوع کرتے رہتے۔ اس بنیادی حقیقت کو مان لینے کے بعد بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں وہ غلط فہمیاں جنہیں ناقدین اقبال نے بڑے زور و شور سے پیش کیے ہیں جنہیں وہ تضاد فکر سے منسوب کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ تضاد فکر نہیں بلکہ ارتقائی تبدیلیاں ہیں۔''[1]

عبدالحق نے اقبال کے فکری تضاد پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد ان تمام ناقدین کا مدلل جواب دیا ہے جنہوں نے اقبال کی فکر پر تضاد کا الزام لگایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک ہی چیز کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک پہلو سے کوئی چیز قابل مذمت ہے تو دوسرے پہلو سے وہ لائق ستائش بھی ہو سکتی ہے۔ ابلیس، مسولینی اور پیسے وغیرہ کا ذکر اسی اصول کے پیش نظر ہے۔

اقبال اولاً شاعر ہیں یا فلسفی؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ابھی تک ناقدین اقبال حتمی فیصلہ نہیں کر سکے ہیں۔ ہر گروہ کے پاس اپنی دلیلیں ہیں۔ ناقدین اقبال میں سے مجنوں گورکھ پوری، مولانا عبدالسلام ندوی، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر محمد حسن

---

1 اقبال کے ابتدائی افکار، عبدالحق ص ۱۲

جیسے ناقدین اقبال کی شاعرانہ حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہیں پروفیسر میاں محمد شریف، سید عبداللہ، عاشق حسین بٹالوی اور سید احتشام الدین اقبال کی شاعرانہ اور فلسفیانہ دونوں حیثیتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا رجحان کسی ایک طرف ہے مگر ان سبھی ناقدین کا ماننا ہے کہ اقبال کو صرف شاعر یا فلسفی ماننا اقبال کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ پروفیسر عبدالحق نے پروفیسر آل احمد سرور کی رائے:

'' یہ کہنا کہ اقبال محض ایک فلسفی ہے اقبال کی بہت بڑی توہین ہے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' جس طرح یہ کہنا کہ اقبال محض فلسفی ہے اقبال کی بہت بہت توہین ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ اقبال محض شاعر ہے اقبال کی سب سے بڑی اہانت ہے۔ اور شاید بد نصیبی بھی۔'' [1]

ڈاکٹر عبدالحق اپنے مضمون میں اقبال شاعر یا فلسفی میں سے کس کو مقدم کیا جائے اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبالیات میں یہ گفتگو ابھی ناتمام ہے کہ اقبال کی حیثیت فلسفی شاعر کی ہے یا شاعر فلسفی کی، ان موضوعات میں تقدیم و تاخیر کا ہی فرق نہیں بلکہ دونوں متضاد ہیں اور ان کے نتائج بھی مختلف النوع ہیں اقبال شناسوں کے درمیان اختلاف گفتگو موجود ہے۔ قارئین بھی کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اگرچہ اقبال کی شخصیت، فکر اور شاعری پر دوسرے فن کاروں کے مقابلے میں زیادہ دوٹوک رائے دیکھنے میں آتی ہے جو عام طور پر غیر سنجیدہ مطالعہ پر مبنی ہے اس بارے میں قطعی فیصلہ ناممکن نہ سہی دشوار ضرور ہے مگر یہ بات زیادہ اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ اقبال کو محض شاعر سمجھ لینا صرف اقبال کی ہی نہیں بلکہ اس تہذیب کی بھی توہین ہے جس کی اقبال ترجمانی کرتے رہے۔ اس فکر کی بھی اہانت ہے جو قوموں کی تقدیر بدل دینے کا حوصلہ رکھتی ہے فلسفی محض تسلیم کر لینا بھی ان کی عظمت و آفاقیت کے منافی ہے اقبال کے یہاں دونوں پہلوؤں کا اظہار موجود ہے، لیکن مجموعی طور پر انہوں نے اپنی مفکرانہ حیثیت پر زیادہ زور دیا ہے۔'' [2]

---

1 اقبال کے ابتدائی افکار عبدالحق ص ۱۹

2 اقبال کے شعری اسالیب ص 132

اس بحث میں تفصیلی موازنہ کے بعد عبد الحق فلسفی اقبال کو شاعر اقبال پر فوقیت دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

'' اقبالیات کا سنجیدگی اور تطہیر نفس کے ساتھ مطالعہ کرنے پر اقبال کی مفکرانہ عظمت زیادہ اجاگر ہوتی ہے۔۔۔۔۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہی فکر و فلسفہ ہی جذبۂ تخلیق کا محرک اول ہے۔''[1]

دراصل اقبال کے یہاں اسلوب کے مقابلے میں موضوع کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ وہ شاعری کو اپنے فلسفیانہ افکار کی ترویج کا ایک وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ اقبال نے اپنے خطوط اور شاعری کے ذریعہ بھی اس بات کی وضاحت کی ہے۔ اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں:

''باقی رہی زبان اردو اور فن شاعری سو ان سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ میرے مقاصد شاعرانہ نہیں بلکہ مذہبی اور اخلاقی ہیں۔'' [2]

اس وجہ سے اقبال کی فلسفیانہ حیثیت مقدم ہے۔ لیکن اس سے ان کی شاعرانہ حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اقبال نے جس طرح اپنے فلسفیانہ افکار کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے وہ ان کی شاعرانہ عظمت کو چار چاند لگاتا ہے۔

عبد الحق کی نظر میں محض اقبال کی شاعری پر گفتگو ''ایک موہوم اور مغالطہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی'' وہ لکھتے ہیں:

''کلام میں ایک بھی نظم غزل یا قطعہ نہیں ہے جو ان کی مخصوص فکر سے خالی ہو۔ شاعری وسیلۂ اظہار ہے۔ جو ثانوی ہے۔ اصل یا جوہر نہیں ہے۔ مگر بعض شارحین کی سرگردانی اس سے بھی آگے ہے۔'' [3]

---

1 اقبال کے ابتدائی افکار، ص ۲۲

2 انوار اقبال ص ۱۹۳ بحوالہ اقبال کے ابتدائی افکار ص ۲۳

3 اقبال شاعر رنگیں نوا ص ۴۵

اقبال کے یہاں فکر و فلسفہ پر فن اور اس کے لوازمات کے مقابلہ میں زیادہ زور دینے کی وجہ سے ان کے یہاں زبان و بیان کی بہت سی غلطیاں بھی در آئی ہیں۔ اقبال کے ناقدین نے ان پر پکڑ بھی کی ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ اور ایک صالح ادبی روایت کے لیے ضروری بھی۔ اکابرین فن کی فنی لغزشوں پر بھی گرفت کی جائے مگر اس گرفت میں ان کے ادبی مقام و مرتبہ کا پورا خیال بھی ضروری ہے۔

عبدالحق نے مطالعۂ اقبال میں فکر و شعر کے آہنگ و ارتباط پر خاص توجہ دی ہے۔ وہ اسے مطالعہ اقبال کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ مطالعہ اقبال کو خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے مجموعی تاثر پر ترجیح دینی چاہیے۔[1]

عبدالحق اقبال کو ایک شاعر مانتے ہیں۔ ایک ایسا شاعر جس نے اپنی شاعری کے ذریعہ قوم کو بیدار کیا۔ وہ ان ناقدین کی آرا سے اختلاف کرتے ہیں جو ان کے گرد تقدس کا ہالہ قائم کرکے ان کو پیغمبرانہ شان عطا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اقبال کی شاعری کے حوالے سے آمد اور آورد کی بحث کو وہ زمانہ مابعد کی بحث قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے بارے میں خلیفہ عبدالحکیم کے اس قول کا رد کیا ہے کہ۔

''اقبال کا تمام کلام آمد کا نتیجہ ہے اس میں آورد کو کہیں دخل نہیں''

عبدالحق لکھتے ہیں:

''اقبال کے کلام کا ایک چوتھائی حصہ محض آورد کا نتیجہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے اشعار کو بھی آمد سمجھ لیا جائے۔ ورنہ اس چوتھائی حصہ کلام کو ذہن و فکر پر زور دے کر قلم بند کیا گیا ہے۔''[2]

اقبال کے بارے میں اس قسم کی غلط فہمیاں 'روزگار فقیر' اور 'ذکر اقبال' جیسی کتابوں سے عام ہوئی جن میں اقبال کے بارے اس قسم کے واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے کہ اقبال کے اوپر نزول شعر کے وقت وہی کیفیت طاری ہوتی

---

1 دیکھیں: فکر اقبال کی سرگزشت از عبدالحق ص ۹

2 اقبال کے ابتدائی افکار ص ۲۷

تھی جیسی کہ محمد عربی ﷺ پر نزول وحی کی کیفیت ہوا کرتی تھی۔ یہ ساری روش کسی شاعر کو اس کے مقام سے بلندی کی طرف نہیں بلکہ پستی کی طرف لے جانے والی ہے۔

عبد الحق نے اقبالیاتی ادب میں پائی جانے والی اس بے اعتدالی کا نوٹس لیا ہے اور اس سلسلہ میں معتدل رائے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے سے اس قسم کے سارے اشکال رفع ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے کلام میں برابر اصلاح کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کے بعض ابتدائی متون بعد سے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ یہ معاملہ صرف اشعار کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ اپنے ملفوظات اور نثری تحریروں میں بھی برابر اصلاح کرتے رہتے تھے۔ یہ اصلاح کا عمل ان اشعار میں بھی جاری رہتا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آمد کا نتیجہ ہیں۔

اقبال نے مشرق و مغرب کے فلسفے سے خوشہ چینی کی۔ فکر انسانی کے قدیم و جدید سرمائے سے اخذ و رد کی صلاحیتوں کو سامنے لاتے ہوئے اقبال کے اختراعی ذہن نے اپنے ماحول اور حالات کے مطابق نئے فلسفے کی اساس رکھی۔ خودی کے فلسفے کے مآخذ کے بارے میں ناقدین نے مختلف قسم کی آرا پیش کی ہیں۔ کچھ نے اس کا سرچشمہ قران کہا ہے کچھ نے صوفیاء کے افکار اور کچھ نے مغرب کے فلسفوں میں اس کی جڑیں تلاش کرنی کی کوشش کی ہے۔ عبد الحق کا ماننا ہے کہ:

> '' اقبال کے ناقدین نے مغربی افکار کے سرچشموں پر بڑی توجہ دی ہے۔ مشرق یا ہندوستان کے مخصوص حالات پر زیادہ سنجیدگی سے توجہ نہیں کی گئی۔ جو ہنوز فکر طلب ہے۔'' [1]

اسی اخذ و رد کے اصول کے تحت اقبال متضاد عناصر میں سے اپنی ذہنی وابستگی کے لحاظ سے اپنے پسندیدہ عناصر کو چن لیتے ہیں۔ لیکن عبد الحق کے بقول ان عناصر اور افراد کے ساتھ اقبال کی وابستگی کہیں کہیں درجۂ غلو تک پہنچ جاتی ہے جو ایک محقق کے شایان شان نہیں ہے۔ وہ پیر رومی سے اقبال کے عقیدت مندانہ اظہار کو اسی زمرے میں رکھتے ہیں۔ [2]

---

1 پروفیسر عبد الحق، تنقید اقبال اور دیگر مضامین، صفحہ ۱۶، جمال پرینٹنگ پریس دہلی، سنہ ۱۹۷۶

2 دیکھیں: نقد اقبال ص ۱۸

ڈاکٹر عبد الحق اقبالیات کو خانوں میں تقسیم کرنے کے خلاف ہیں وہ مجموعی تاثر اور کوائف کے ارتکاز کو ترجیح دینے پر زور دیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں پائی جانے والی نغمگی کو صرف لفظوں اور قافیوں کی دین نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں پائی جانے والی نغمگی سلانے والی موسیقی نہیں بلکہ ادراک کو بیدار کرنے والی ہے۔

اقبال کی فکری جہات کو متعین کرتے ہوئے پروفیسر عبد الحق لکھتے ہیں:

''اقبال کی فکری جہات کے تین زاویے ہیں۔ ان زاویوں کا سرچشمہ انیسویں صدی کے اواخر کی تین تحریکیں ہیں۔ سرسید احمد کی علی گڑھ تحریک، مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی اور سید جمال الدین افغانی کی بین (کذا) اسلامی تحریک، ان تحریکوں کے واضح نشانات اقبال کی فکری روایت میں موجود ہے، سرسید احمد خاں تحریک کے مقاصد کی ترقی یافتہ صورت اقبال کے یہاں بڑی توانائی لے کر ابھرتی ہے جس میں ہندوستانی مسلمان مخاطب اول ہے یہ تحریک اصلاحی ہے جو زندگی کے ہر شعبہ عمل میں اصلاح کی خواہاں ہے۔''[1]

پروفیسر عبد الحق تنقید میں گول مول بات کرنے کے قائل نہیں۔ وہ دوٹوک الفاظ میں اپنی رائے قائم کر دیتے ہیں 'اقبال کی فکری سرگزشت' میں وہ لکھتے ہیں:

''اقبال کی بیش تر تخلیقات کے عقب میں مختلف محرکات شدت تخلیق کا سبب بنتی ہیں۔ طویل و مختصر نظمیں پیش نظر ہوں تو اس بدیہی حقیقت کا ادراک مشکل نہیں۔ بڑی مشکل سے کچھ نظمیں ملیں گی جو کسی عقبی تحریک یا واقعہ یا پس منظر سے خالی ہوں ورنہ ان کا پورا کلام کسی نہ کسی واقعہ کا مرہون منت ہے۔ وہ خود بڑے جذباتی تھے اور ان کی جذباتیت ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ چھوٹے موٹے واقعات بھی ان کے فکری اسالیب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ بہت جلد مشتعل ہو جاتے اور تخلیق کی صورت میں قلب و نظر کا ردعمل ظاہر کرتے۔''[2]

---

1 فکر اقبال کی سرگزشت ص ۱۵۲

2 فکر اقبال کی سرگزشت، ص۱۵۵

عام طور پر علی گڑھ تحریک سے اقبال کے فکر و فلسفہ کو الگ رکھا جاتا ہے۔ مگر عبد الحق کا ماننا ہے کہ اقبال اگرچہ براہ راست اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے مگر اپنے استاد میر حسن کے توسط سے اس تحریک سے متاثر ضرور تھے۔ یہ تاثر کیا تھا؟ اس کے بارے میں عبد الحق کہتے ہیں کہ

''اس کی بدولت مشرق و مغرب، مذہب و سائنس، اور جدید و قدیم میں ارتباط کا شعور پیدا ہوا۔'' [1]

عبد الحق کا ماننا ہے کہ اردو میں شخصی مرثیوں کی ابتدا 'سر سید کی لوح تربت' سے ہوئی۔ اقبال نے سر سید کی زندگی اور کارناموں سے متاثر ہو کر جو اشعار کہے وہ اردو میں ایک نئی روایت کا سبب بن گیا۔

عبد الحق نے اپنے مضمون 'ماخذ اور محرکات' میں اقبال کے فکری سوتوں کی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے فکر اقبال کا سب سے پہلا ماخذ گھریلو ماحول اور والد کی تربیت قرار دیا ہے۔ دوسرے ماخذ کے طور پر میر حسن کی شاگردی بیان کیا ہے جو جدید و قدیم فلسفہ کے ماہر تھے۔ میر حسن سر سید کے دوستوں میں سے تھے۔ پنجاب کے جن اصحاب پر سر سید کو اعتماد تھا ان میں میر حسن کا بھی اسم گرامی ہے۔ سر سید سے اقبال بالواسطہ متاثر ہوئے۔ تیسری شخصیت جس سے اقبال نے اثرات قبول کیے وہ ہے پروفیسر آرنلڈ کی پر بہار شخصیت۔ اگرچہ جاوید اقبال، رفیع الدین ہاشمی جیسے ناقدین اور سوانح نگاروں نے پروفیسر آرنلڈ کے اثرات کا انکار کرتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسی حقیقت کا انکار ہے جس کا ثبوت ان کی شاعری میں موجود ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اثر پذیری کے اس عمل میں بھی اقبال کے اخذ و رد کا اصول کار فرما ہے۔

عبد الحق کی نظر صرف اقبال اور ان کے افکار پر ہی نہیں ہے بلکہ اقبالیاتی ادب کے بحر بے کنار میں انہوں نے غوطہ زنی کی ہے۔ اس غوطہ زنی میں وہ اقبال ماہرین کی ان فرو گزاشتوں سے بھی واقف ہوئے جن پر عام قاری اور ناقد کی نظر نہیں پڑتی ہے۔ وہ ایک معلم کی طرح اپنے قاری کو ان فرو گزاشتوں سے واقف کرانے کا بھی کام کرتے ہیں۔ عبد الحق کا مطالعہ صرف اقبال کے فکر و فن کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ اقبالیاتی ادب کا بھی مطالعہ ہے۔ جہاں انہوں نے اقبالیاتی ادب کی فرو گزاشتوں پر نکیر کی ہے وہیں بعض اہم ناقدین اقبال کی کاوشوں کو بنظر تحسین دیکھا ہے۔ مولانا عبد السلام ندوی بھی انہیں خوش نصیب اقبال شناسوں میں سے ہیں۔ عبد السلام ندوی کو وہ آزاد ہندوستان کا پہلا اقبال شناس قرار دیتے ہیں۔

---

1 تنقید اقبال ص ۱۶

عبدالسلام ندوی نے 'اقبال کامل' ۱۹۴۸ میں لکھی۔ اس وقت تک ہندوستان میں کسی نے بھی کوئی مستقل کتاب علامہ اقبال پر نہ لکھی تھی۔ عبدالحق نے ۱۹۴۷ میں شائع سی جی کیرنن کی کتاب Poems from Iqbal کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ چند نظموں کا انگریزی ترجمہ ہے اس وجہ سے اسے مستقل کتاب کے زمرے میں نہیں رکھ سکتے۔ بالفاظ دیگر ہندوستان میں اقبال شناسی کا اولین شجر مولانا عبدالسلام ندوی نے لگایا۔ عبدالحق، مولانا عبدالسلام کی تعریف میں اس وجہ سے رطب اللسان ہی کہ انہوں نے اقبال شناسی کی شمع اس وقت روشن کی جب ہندوستان میں اقبال کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ انہیں اس بات پر افسوس بھی ہے کہ '' اقبال شناسی میں مولانا محترم کے اکتسابات کا صحیح طور پر ابھی تک اعتراف نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی ان کی ناقدانہ بصیرت کا تجزیہ ہی ہو سکا ہے۔''[1]

اسی طرح انہوں نے یوسف حسین خاں کی بھی تعریف و توصیف کی ہے۔ وہ اگرچہ اردو یا فارسی کی تدریس سے وابستہ نہ تھے لیکن بقول عبدالحق 'ان کا یہ (روح اقبال) گراں مایہ کام اقبال شناسی میں فلک تاب گنج گہرے کم نہیں ہے۔'[2]

عبدالحق اپنی تحریروں میں اعتدال و توازن کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔ انہوں نے اقبال کامل میں پائی جانے والی تسامحات کا بھی ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً اشعار سے استدلال میں بعض جگہوں پر غلطیوں کا در آنا، اقبال کے کلام کی خامیاں گناتے وقت بعض جگہوں پر صحیح کلام کو بھی غلطیوں کے زمرہ میں شامل کرنا وغیرہ لیکن اس کے ساتھ یہ اعتراف بھی کہ اولین کاوش ہونے کی وجہ سے 'ناسازگار حالات میں اقبال شناسی کی پہل، ایک دیوانگی سے کم نہ تھی، جس پر سیکڑوں فرزانگی قربان کی جاسکتی ہے۔'

'اقبالیاتی تحقیق میں ڈاکٹر گیان چند جین کی نارسائیاں' بھی ایسا ہی ایک تحقیقی مضمون ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے گیان چند جین کی کتاب ''ابتدائی کلام اقبال'' کی فروگزاشتوں پر گیان چند جین کی کڑی نقد کی ہے۔ 'پروفیسر گیان چند جین فکر اقبال کے معترف نہ تھے اس کے باوجود اقبالیاتی مطالعہ پر مائل ہوئے'[3] عبدالحق نے بھی چونکہ اسی قسم کا کام کیا تھا

---

1 اقبال شاعر رنگیں نوا ص ۹۴

2 دیکھیں: اقبال شاعر رنگیں نوا ص ۹۱

3 اقبال شاعر رنگیں نوا ص ۱۷۴

ان کی کتاب 'اقبال کے ابتدائی افکار' ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے اندر اقبال کی شاعری کے ابتدائی نقوش زیر بحث تھے اس وجہ سے انہوں نے بانگ درا کے متروک کلام کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ ساتھ ہی ۱۹۰۵ء تک کے کلام کے ماہ سال متعین کیے تھے۔ کئی تخلیقات کے زمانہ تالیف پر شک کا اظہار کیا تھا۔

عبدالحق نے یہ ثابت کیا کہ گیان چند جین نے تحقیق کے اصولوں کو صحیح طور پر نہیں برتا ہے۔ عبدالحق کی کتاب 'اقبال کے ابتدائی افکار' کے بجائے ثانوی مآخذ کی طرف رجوع کیا۔ جگہ جگہ تن آسانیاں دکھائی ہیں۔ اصل میں انہیں عبد الصمد کے بیاض سے ایک قلمی نسخہ ملا تھا جس کی مدد سے انہوں نے 'ابتدائی کلام مرتب کر دیا ہے۔ انہوں نے سنین کے تعین میں رنگ سخن کی بنیاد پر کئی جگہوں تخمیناً تاریخ لکھ دی ہے جو اصل سے مختلف ہے۔

بعض جگہوں پر ان کے جملے کچھ سخت ہو گئے ہیں لیکن یہ سختی اس باغبان کی سی ہے جو اپنے باغ کے پودوں کو خراب ہوتا دیکھ کر افسردہ ہوتا ہے اور بعض دفعہ غصہ میں اپنے ماتحتوں کو ڈانٹ ڈپٹ دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہی کہا جا سکتا ہے کہ کلام اقبال کی ترتیب و تدوین میں انہوں نے تامل سے کام نہیں لیا۔ یہ ان کا میدان نہ تھا اور نہ ہی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ بیاض ہاتھ لگا اور لے اڑے۔ اقبالیاتی تحقیق میں کولمبس بننے کی خواہش نے ان کی تحقیقی کاوشوں کو بے اعتبار بنا دیا۔''[1]

دراصل عبدالحق اقبال کی حمایت میں شمشیر برہنہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال پر بے جا تنقید کرنے والے فراق گورکھپوری ہوں یا ترقی پسندوں کے سرغنہ سردار جعفری ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور شخصیت عبدالحق نے ان سب کی خبر لی ہے۔ انہوں نے کلام اقبال اور خطوط اقبال میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے تحریف کرنے والوں کی کڑی تنقید کی ہے۔ اس معاملے میں اقبال کے بھتیجے اعجاز ہوں یا جاوید اقبال ہوں عبدالحق کی تنقید سے بچ نہیں پایا ہے۔ مظفر حسین

---

1 اقبال شاعر رنگیں نواص ۱۸۰

برنی اور ان کے معاونین کی کلیات مکاتیب اقبال کے تدوین میں ہوئی فروگذاشتوں پر انہوں نے سخت پکڑ کی ہے اور اسے سہل پسندی اور تحقیق کے اصولوں سے روگردانی قرار دیا ہے۔[1]

وہ گیان چند جین کی ادبی کاوشوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن ان کی نقد کا مقصد:

''۔۔۔نہ ان کی تنقیص مقصود ہے اور نہ تنقید بلکہ کوتاہیوں کی طرف اشارہ ہے۔ ناچیز ان کی علمی و ادبی خدمات کو قدر کی نظر سے دیکھتا ہے اور ان کی لغزشوں پر پردہ ڈال کر کسی عقیدت کی سرمستی میں خال گل کو رخ زیبا سمجھنے سے عاجز ہے۔''[2]

عبدالحق کی نظر اقبالیاتی ادب کے صرف قدیم سرمائے پر ہی نہیں ہے بلکہ وہ اقبالیاتی ادب میں مسلسل ہو رہی پیش رفت سے واقف ہیں۔ ان کا مضمون جو اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر سے شائع ہونے والی کتاب 'اقبالیات کے دس سال' میں شامل اس مضمون میں ۱۹۸۰ سے لے کر ۲۰۰۰ تک کے اقبالیاتی ادب پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کا یہ مضمون نہ صرف اقبال پر ہو رہی پیش رفت کو بتایا ہے بلکہ اقبال پر کن جہتوں پر مزید کام ہو سکتا ہے اس کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ گویا کہ عبدالحق صرف ماضی یا حال ہی کی طرف نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ وہ مستقبل میں بھی اقبالیاتی ادب کی جہت متعین کر رہے ہیں۔ اقبالیات میں مطالعہ کی جہات کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری نظر میں مطالعہ یا جائزے کے کئی ضمنی عنوانات ہو سکتے ہیں۔ پہلی صف میں اقبال پر مستقل تصانیف کو لے سکتے ہیں۔ تیسری طرف خصوصی شمارے ہیں یعنی رسائل کے اقبال نمبر ہیں چوتھے ان جرائد و رسائل میں چھپے اقبال پر متفرق مضامین ہیں، پانچویں مختلف عنوانات پر مشتمل مضامین کے مجموعے ہیں جن میں اقبال پر بھی دو ایک مضامین ہیں، چھٹے دانش گاہوں کے تحقیقی مقالات ہیں جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ صورتوں میں جگہ جگہ محفوظ ہیں۔ ساتویں حیثیت ان کتابوں کی ہے جو قومی و بین الاقوامی مذاکروں کی دین ہیں۔ آٹھویں صف میں اشاعت ثانی کے نتائج ہیں جو اس دہائی میں دوبارہ طبع ہوئیں۔ نویں فہرست میں شرح و تراجم کو شمار کر سکتے ہیں۔ دہائی کی

---

1 دیکھیں: اقبال اور اقبالیات کے مضامین 'اقبال کی تحریروں میں تحریف، اور اقبال اور نقد فراق کی نارسائی اور اس تعلق سے پروفیسر عبدالحق کے دوسرے مضامین۔

2 اقبال شاعر رنگیں نوا ص ۱۸۱

دسویں دست یابی میں وہ کاوشیں شامل ہیں جو دوسری زبانوں میں لکھی گئیں۔ یہ بھی اقبالیات کا عجوبہ ہے کہ تنقیدی کتابوں کے اردو تراجم بھی ہماری رسائی میں ہیں۔ جیسے روائع اقبال یا اقبال شاعر اور سیاست داں وغیرہ۔ اس حنا بندی میں گیارہویں نمبر پر خود علامہ کی تخلیق و تحریر کی نئی دریافتوں اور تدوین نو کو شامل کر سکتے ہیں۔'' [1]

یہ فہرست عبد الحق کی اقبالیات پر گہری پکڑ کی غمازی کر رہی ہے۔

عبد الحق تنقیدی تحریروں میں ادبیت کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے ان شارحین پر نقد کیا ہے جو ادبیت سے عاری شرح کرتے ہیں۔ اسی طرح ادبی شہ پاروں کے تراجم میں بھی ان کا ماننا ہے کہ اس کے لیے ادبی زبان کا ہونا ضروری ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون 'اقبال و غالب کے چند انگریزی تراجم' میں لکھتے ہیں:

''راقم کا مقصد ترجموں کا تقابل یا موازنہ نہیں ہے اور نہ ہی فیصلہ صادر کرنا ہے۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہر ترجمہ نگار کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں کہ وہ کس اصول پر کاربند ہے۔ کیا وہ الفاظ پر اکتفا کرتا ہے یا مفہوم کی ادائیگی کو ہی شافی و کافی سمجھتا ہے۔ ہر طرح کے ترجمے کی اجازت ہے۔ لیکن اتنا تو لازمی ہے کہ اس میں تخلیقی دل کشی ہو اور مفہوم کی صحیح ترجمانی بھی ہو۔ سپاٹ اور روکھے سوکھے ترجمے جاذب نظر نہیں ہو پاتے۔ کیوں کہ سائنسی اور فنی تحریروں کے تراجم کی نوعیت کچھ اور ہوتی ہے ور ادبی یا تخلیقی تراجم کی مطالبات بالکل مختلف ہوتے ہیں اور پھر اس میں نثری اور شعری تخلیقات کے تراجم کے مطالبات بلکل مختلف ہیں اور پھر اس میں نثری اور شعری تخلیقات کے تراجم کے آئین الگ الگ اور خاصے آزمایشی ہوتے ہیں۔''[2]

اس طویل اقتباس سے ایک بات خاص طور پر واضح ہوتی ہے کہ عبد الحق کی تحریروں میں جو چاشنی اور جاذبیت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ ادبی تنقید کو بھی ادبی پارہ کا درجہ دیتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ادبی تحریر غیر ادبی تحریر سے مختلف ہونی چاہیے۔ انہوں نے خود بھی اس پر عمل کیا اور دوسروں سے بھی اس کے خواہاں ہیں۔

---

1 عبد الحق، مشمولہ اقبالات - گذشتہ دس سال، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، بشیر احمد نحوی ص 2-3

2 اقبال شاعر رنگیں نوا ص ۱۵۰

اقبال کے یہاں مسئلۂ قومیت ہمارے بعض ناقدین کی کاوشوں کی وجہ سے ایک نزاعی مسئلہ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ پروفیسر عبد الحق اس بحث کو بے جا قرار دیتے ہیں :

> " میں ایک طالب علم کی حیثیت سے جانتا ہوں کہ ذہنی سفر کے کسی دور میں بھی اقبال حب الوطنی یا ارض ہند کی محبت سے بیگانہ نہیں رہے۔ ان کے افکار میں وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ مگر وطنیت کا تصور سیاسی فکر بن کر انسانی ہیئت اجتماعیہ کو پارہ پارہ کرتا ہے تو اقبال کی روح احتجاج کرتی ہے۔ ان کے نظریہ قومیت اور آفاقیت میں کسی طرح کا بعد نہیں۔" [1]

اقبال نے اپنے خیالات کو نظم و نثر کے مختلف اسالیب میں بیان کیا ہے۔ آپ اقبال کے خطبات، خطوط، اور مضامین کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنے کہ اشعار کو دیا جاتا ہے۔ اس کے بغیر اقبال کے افکار و نظریات تک رسائی ناممکن ہے۔ انہوں نے عبد السلام ندوی اور خلیفہ عبد الحکیم کے اس قول کا رد کیا ہے کہ اقبال کے زیادہ افکار ان کی شاعری میں ہیں اور اقبال اسرار حیات کو نثری استدلال میں پیش کرنے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے اقبال کے خطوط سے استدلال کر کے ان کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ اقبال نظم کے بجائے نثر کو زیادہ مفید اور کار آمد تصور کرتے تھے۔ نثر اقبال کے بارے میں عبد الحق کا حسن ظن اپنی جگہ ، اقبال کے نثری افکار کا مطالعہ اپنے آپ میں اگرچہ ایک اہم موضوع ہے، اس سے اقبال کی تفہیم میں بھی سہولت ہو گی۔ لیکن اقبال کی نثر میں وہ جاذبیت نہیں ہے جو ان کی نظموں اور غزلوں میں ہے۔ ان کی نثر سپاٹ اور جاذبیت سے خالی ہے۔ ان کا مطالعہ اقبال کے افکار سے واقفیت کے لیے کیا جا سکتا ہے ورنہ ان کا مطالعہ ادب کے قاری کے لیے اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ وہ ایک عظیم شاعر کی نثر ہے۔

عبد الحق نے اقبال کی فکری سر گزشت کو تین ادوار میں تقسیم کی ہے۔ پہلے دور کی سر گزشت 'اقبال کے ابتدائی افکار' میں، دوسرے دور کی سر گزشت 'تنقید اقبال اور دوسرے مضامین میں' اور تیسری اور آخری دور کی سر گزشت انہوں نے 'فکر اقبال کی سر گزشت' نامی کتاب میں لکھی ہے۔ یہ سبھی مضامین مختلف وقتوں میں لکھے گیے مگر ان کے اندر ایک تسلسل ہے۔ ان سبھی مضامین کو ایک جگہ ترتیب سے پڑھنے پر اقبال کی ذہنی اور فکری ارتقا کی ایک تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

---

1 تنقید اقبال ص ۲۰

اقبال اپنی زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے زیادہ اپنی فکری سرگذشت کو اہمیت دیا کرتے تھے۔ فوق نے اقبال سے ایک مرتبہ ان کی زندگی کے اہم واقعات کے بارے میں دریافت کیا تو اقبال نے کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔:

''میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے۔ جو اوروں کے لیے سبق آموز ہو سکے۔ ہاں خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی فرصت ہو گی تو لکھوں گا۔ فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔''[1]

اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال خود اپنی فکری سرگذشت مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن بوجوہ اسے مرتب نہ کر سکے۔ اقبالیاتی ادب پر کام کرنے والوں نے بھی اس پہلو پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ پروفیسر عبدالحق کو اس بات کا احساس ہے۔ اس لیے انہوں نے فکر اقبال کی ایک تفصیلی سرگذشت لکھی ہے۔

عبدالحق کا ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اقبال کے ابتدائی کلام کی روشنی میں اقبال کے ابتدائی افکار دریافت کرنے کی طرف توجہ دی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے جو عبدالحق نے اپنی کتاب میں دی ہے۔ اقبال کی شاعری میں مرد مومن کا تصور اقبال کے یہاں قیام یورپ کے بعد آیا۔ اقبال نے 'سر سید کی لوح تربت' جو کہ بانگ درا میں شامل ہے یورپ روانگی سے قبل لکھی تھی۔ اسی میں ایک شعر ہے۔:

بندۂ مومن کا دل بیم وریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

اس نظم میں بندۂ مومن کے لفظ سے بعض ناقدین کو اشکال ہوا کہ اقبال کے یہاں مومن کامل کا تصور قیام یورپ سے پہلے آچکا تھا۔ لیکن یہ حصہ اقبال نے بعد میں اضافہ کیا ہے۔ ان نظم کا قدیم متن اس اضافہ سے خالی ہے۔[2] غور کرنے

---

1 زندہ رود از جاوید اقبال ص

2 اقبال کے ابتدائی افکار ص ۳۷

کی بات ہے کہ پہلی نظم ۱۹۰۴ میں لکھی گئی ہے۔ اس میں اصلاح ۱۹۲۴ء میں ہوئی ہے۔ درمیان میں ایک لمبا عرصہ ہے لیکن ابتدائی کلام سے عدم واقفیت کی وجہ سے اس اصلاح کو بھی ۱۹۰۴ کا ہی کلام سمجھا جاتا رہا۔

عبدالحق انسان کو اقبال کی فکر کو محور قرار دیتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون 'انسان۔ فکر اقبال کے آئینہ میں' اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اقبال کے فلسفہ کی اساس میں انسان ہی وہ مرکزی محور ہے جس کے گرد ان کے تمام افکار حلقہ بدوش ہیں۔[1]

اقبال کے کلام میں تلمیحات کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اقبال نے خاص کر اسلامی تلمیحات کے ذریعہ جہاں حسن اور معنی آفرینی پیدا کی ہے وہیں فکر و فلسفہ کے طویل مباحث کو ایک لفظ میں سمیٹ دیا ہے۔ عبدالحق نے اقبال کی تلمیحات اور ، یہ صمیہ . مات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان مثالوں کو بھی قاری کے سامنے پیش کیا ہے جو کلام اقبال کے متداول نسخوں میں نہیں ہیں۔

عبدالحق کی نظر میں تصوف اسلام سے باہر کی چیز ہے جو عجمی اثرات کی وجہ سے مسلمانوں میں آئی اور اس نے اسلامی اصولوں سے بغاوت ان کا مذاق اڑانے کی راہ ہموار کی۔ عبدالحق نے اقبال کی فکر و فن کا ارتقائی مطالعہ کیا ہے اور اقبال کی فکری سرگذشت لکھی ہے اس وجہ سے اقبال کی فکر میں وقفہ وقفہ سے ہونے والی تبدیلیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ اپنے عمیق مطالعہ سے اس نتیجہ پہنچے ہیں کہ اقبال کی شاعری میں حسن ازل، ذات واحد سے وصل اور فراق اور وحدت الوجود کے مسائل دور تشکیک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اقبال مولانا رومی سے کافی متاثر تھے۔ لیکن بعد کے زمانے میں اقبال کو تصوف کی اصل حقیقت کا علم ہو گیا تھا اور انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ تصوف کا تعلق دین سے نہیں ہے۔ یہ باہر سے درآمد شدہ افکار ہیں جو اسلام کی قوت عمل کو فنا کر رہے ہیں۔ اقبال اپنے دور تشکیک میں بھی جب تصوف کے بارے میں حسن ظن کا شکار تھے ان کا تنقیدی نقطۂ نظر بھی ملتا ہے۔ عبدالحق لکھتے ہیں:

> "اقبال کو یہ پسند نہیں کہ شریعت پر تصوف کو مقدم قرار دیا جائے۔ یہ تقدیم و تاخیر ہرگز قابل قبول نہیں۔ شریعت کے بعد طریقت، حقیقت اور معرفت کی کیا ضرورت ہے تشریعی نظام کی موجودگی میں ہر نظام باطل اور

---

1 تنقید اقبال اور دوسرے مضامین از عبدالحق ص ۸۴

گمراہ کن ہے۔ ہمارے صوفیانے اس تفریق سے اسلام کو شدید نقصان پہونچایا ہے۔ اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔۔۔۔ تصوف کو باطنی اسرار سے تعبیر کرکے اس میں کشش اور دلاویزی کے صفات پیدا کیے گئے۔ پھر مجاز سے حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کی جانے لگی۔ ہر بوالہوس مجاز کے پردوں میں حقیقت کا عرفان حاصل کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ان حالات سے باخبر تھے۔ جہاں تک تصوف کے تفکیری نظام کا تعلق تھا جس میں وحدت وکثرت، حسن ازل کے مسائل شامل ہیں اقبال ابھی روایتی انداز فکر پر قائم ہیں اور کہیں کہیں اس انداز فکر میں ان کا ذاتی اضطراب بھی شامل ہے۔ وہ حقیقت کی بازیافت میں بھی منہمک ہیں جہاں تک تصوف کے ریاکارانہ پہلوؤں کا سوال ہے اقبال اس سے بیزار ہیں" [1]

گویا کہ عبدالحق اس بات کو مانتے ہیں کہ اقبال اگرچہ تصوف کے خلاف ہیں لیکن وہ بعض امور میں تذبذب کا شکار تھے۔ اقبال کی شاعری میں بعد کے ادوار میں بھی تصوف کی جھلک اسی وجہ سے ہے۔

'اقبال اور اقبالیات' میں ایک مضمون عبدالحق نے 'اقبال اور تصوف' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں تفصیل سے اقبال اور تصوف کے رشتہ کی گرہ کشائی کی ہے۔ انہوں نے دلائل کی بنیاد سے ان لوگوں کے خیال کی تردید کی ہے جو کہتے ہیں کہ اقبال زندگی کے آخری پڑاؤ میں ایک مرتبہ پھر تصوف کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ ضرب کلیم جو علامہ کی زندگی کے آخر میں لکھی گئی ہے اس کی دو نظموں 'ہندی اسلام' اور 'ساقی نامہ' کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ آخری عمر میں بھی اقبال تصوف سے اتنے ہی متنفر تھے جتنے کہ اسرار خودی کی اشاعت کے وقت تھے۔ وہ اقبال کی تصوف کے خلاف سختی کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔[2]

'عرفان نفس اور اس کے محرکات' کے عنوان سے انہوں نے اقبال کے فلسفۂ خودی کی عقدہ کشائی کی ہے۔ انہوں نے اقبالیاتی ادب کے سرمائے کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ قائم کیا ہے کہ خودی کا باضابطہ منظم فلسفہ انہوں نے ۱۹۱۴ میں پیش کیا۔ لیکن اس کے ابتدائی نقوش اقبال کی شاعری میں ابتدا ہی سے ابھرنے لگے تھے۔ ۱۹۱۴ کا زمانہ اقبال کے ولایت سے واپس آنے کے بعد کا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے خودی کا ماخذ یورپی مفکرین کے افکار کو قرار دیا ہے۔ عبدالحق

---

1 اقبال کے ابتدائی افکار ص ۱۲۰، ۱۲۱ از عبدالحق

2 دیکھیں: اقبال اور تصوف مشمولہ کتاب اقبال اور اقبالیات ۹۹۔۱۱۰

نے ایک تفصیلی بحث میں یہ ثابت کیا ہے خودی کے فلسفہ کے خد و خال اقبال کی شاعری میں یورپ جانے سے پہلے بھی موجود تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

'' یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال عرفان نفس کے ابتدائی دور میں معقول اصطلاح کی تلاش میں تھے۔ وہ بار بار مختلف ناموں سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں آخر میں لفظ خودی پر قناعت کرنا پڑا اس احساس نفس اور شعورِ ذات کے تعین کے لیے مدتوں انہیں کوئی معقول اصطلاح نہ ملی۔ آخر میں انہوں نے اسے پسند کیا اور اس لفظ کے رویتی معنوں میں تغیر و تبدیلی پیدا کر کے اسے اصطلاحی لفظ بنا دیا۔ اقبال کے یہاں لفظ خودی اپنا روایتی مفہوم ہی بدل چکا ہے۔ اس لفظ کو اصطلاحی معنوں میں اقبال نے برتا ہے۔ یہ ان کی اختراع ہے۔'' [1]

عبدالحق نے اپنے مضمون ' قومی تصورات' میں اقبال کے تصور قومیت پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ عبدالحق کو اس بات کا ادراک ہے کہ اردو شاعری میں حب الوطنی کی روایت رچی بسی ہے مگر ہندوستان اور چین کی جنگ کے بعد جس طرح سے میر و غالب اور اردو کے دیگر شعرا کی شاعری میں حب الوطنی کے عناصر کی تلاش کی جارہی ہے اور ان شاعروں کے کلام کی من مانی تاویلات کی جارہی ہے عبدالحق اس سے متفق نہیں ہیں۔ عبدالحق کا ماننا ہے کہ اقبال کے یہاں حب الوطنی کے عناصر ابتدا سے تھے فرق صرف یہ ہے کہ وہ یورپ جانے سے پہلے وطنیت اور قومیت میں مغایرت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس دور (یورپ جانے پہلے) تک وہ وطن اور مذہب میں کسی قسم کی مغایرت محسوس نہیں کرتے۔ 'بلال' ، 'سید کی لوح تربت' کی موجودگی سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے یہاں ملی تصورات یورپ جانے سے پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ ملی تصورات سے اگر مسلم قوم اور اس کی تہذیب و اصلاح مراد ہے تو یہ عنصر شاعری کی ابتدا سے موجود ہے۔ اصلاحی دور کی سبھی نظمیں مسلم قوم کی تہذیب و اصلاح کے جذبے سے معمور ہیں۔ مگر جہاں تک وطن اور مذہب کا تعلق ہے ان دونوں میں مغائرت کا تصور یورپ کی دین ہے۔ اس احساس نے ہی اقبال کو اسلامی نظریہ وطنیت کی طرف مائل کیا۔ ملت کا بین الاقوامی تصور پیدا ہوا۔''

---

1 اقبال کے ابتدائی افکار ص ۱۳۵، ۱۳۶

عبدالحق اقبال کو زمان و مکان کی سرحدوں میں قید کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ آنے والی سبھی صدیاں اقبال کی ہوں گی۔ انہوں نے اپنے مضمون ''اقبال اور ایشیائی بیداری'' مشمولہ ''اقبال شاعر رنگیں نوا'' میں ایشیا میں برپا ہونے والی سبھی تحریکوں کے بارے میں اقبال کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے روس کے انقلاب سے لے کر شام و فلسطین اور عربوں میں پائی جانے والی تحریکوں کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔ ان سبھی تحریکوں کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اقبال سے متاثر تھیں اس لیے کہ ان کے درمیان زبان کی سرحد حائل تھی۔ البتہ عبدالحق نے انقلاب ایران کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے کہ اس تحریک پر اقبال کے اثرات تھے۔ اقبال کے فارسی اشعار رضا شاہ کے خلاف برپا ہونی والی تحریک میں مشعل راہ کا کام دے رہے تھے۔

اقبال صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق سیاست سے بھی تھا اس وجہ سے ان کا سیاسی شعور عام شاعروں سے بلند تھا۔ عبدالحق بعض معاملوں میں اقبال کے سیاسی شعور کو نہرو اور گاندھی سے اعلی و ارفع مانتے ہیں۔ عبدالحق نے جمال عبدالناصر کے نہر سوئز کے قومیانے کے عمل کو انہوں نے ہندوستان کے گوا پر قبضے سے جوڑ کر دیکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''۱۹۵۲ میں پنڈت نہرو کی گوا پر قبضے کی کامیابی میں جمال عبدالناصر کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جس نے پرتگال لشکر اور فوجی ساز و سامان سے لیس بحری جہازوں کو سوئیز سے گزرنے نہیں دیا۔ اقبال کی حکیمانہ تخلیق کی معنویت کو اس سیاق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ فکر و تدبر کے سلیقے کا تقاضا ہے کہ ان کے جہان معنی سے سرسری نہ گزرا جائے۔''[1]

ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے ترقی پسندی کا مرجع روس کے اشتراکی نظام کو قرار دیا۔ ترقی پسندوں کی طرح اقبال بھی انقلاب روس سے بہت پر امید تھے۔ لیکن اقبال اس تحریک کے ذریعہ دبے کچلے مظلوم مسلمانوں کی آہ فریاد سے نابلد نہیں تھے۔ وہ روس کے استحصالی نظام سے بھی واقف تھے۔ عبدالحق لکھتے ہیں:

---

1 عبدالحق، اقبال شاعر رنگیں نوا ص ۲۹

''روس کی حکمرانی میں مجبور مسلمانوں کی بدحالی سے اقبال مایوس تھے۔ یہ ان کی بصیرت تھی کہ انہوں نے روس کے دوسرے انقلاب کو چشم دل سے دیکھ لیا تھا۔ یہ اشعار اسی عرفان نظر کے مظہر ہیں۔:

اگر محصور ہیں مردان تاتار

نہیں اللہ کی تقدیر ہ ہر

خودی را سوز و تاب دیگرے دہ

جہاں را انقلاب دیگرے دہ''

اپنے ایک اور مضمون 'بیسویں صدی کے فکری تضادات اور اقبال' میں بھی عبد الحق نے کلام اقبال کو تاریخی حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مضمون جدوجہد آزادی میں رہنماؤں اور ادیبوں کے فکری تضادات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ انہوں نے رہنمایان قوم کے بارے میں بے لاگ رائے دی ہے۔ ایک جگہ وہ گاندھی جی کے صلح کل کی پالیسی پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گاندھی جی بلاشبہہ ایک مثالی کردار تھے۔ اللہ ایشور تیرے نام وقت کا تقاضا ہی نہیں فکری تناظر بھی رکھتا تھا۔ اس تصور کا تعلق دلوں سے کم مصلحتوں سے زیادہ تھا۔ تقریبا سبھی رہروان تحریک آزادی اتحاد و اتصال کے داعی دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں کہ ساتھ ساتھ چل کر ہی آزادی کا استقبال کیا جا سکتا تھا۔ سوال آزادی کے بعد کا تھا یعنی آئین و اقتدار میں شرکت کا، اس سے سبھی خائف تھے اور حراساں بھی۔ گاندھی جی کی نظر صرف رام راج پر جا کر ٹھہر جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کو ہوم رول ہی کافی و شافی تھا۔ چکبست کی زبان میں:

نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے''[1]

اس وقت دو انتہا پسندانہ رجحانات مغرب کے تعلق سے پائے جاتے تھے۔ ایک یکسر مغرب بیزاری کا دوسرا مغرب پرستی کا۔ اقبال کا نظریہ اس تعلق سے اعتدال کا تھا۔ وہ مغرب کی تنقید تو کرتے تھے مگر تعلیم کے معاملے میں مغرب سے اخذ کی تعلیم دیتے تھے۔

کھلے ہیں سب کے لیے غریبوں کے مے خانے

---

1 اقبال شاعر رنگیں نوا ص ۷۱

علوم تازہ کی سر مستیاں گناہ نہیں

عبدالحق نے اس مضمون میں مولانا شبلی، حالی سرسید، مولانا حسرت موہانی، پنڈت نہرو، گاندھی اور سردار پٹیل جیسے رہنماؤں کے افکار و خیالات کا تذکرہ کرنے کے بعد اس وقت کے فکری تضادات میں اقبال کے موقف کو بیان کیا ہے۔

اقبال نے اپنے کلام میں قرآنی آیات سے استفادہ کیا ہے۔ عبدالحق نے بتایا ہے کہ اقبال کے کلام میں دو سو سے زائد قرآنی آیات کے حوالے ملتے ہیں۔ مولانا روم کے بعد کسی شاعر کے یہاں کلام اللہ سے استفادہ کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ وہ قرآن کی تفسیر اور فقہ کی تدوین کرنا چاہتے تھے مگر انہیں موقع نہیں مل سکا۔

اقبال نے کہاں کہاں سے خوشہ چینی کی۔ اپنے چشمۂ علم کو کہاں کہاں سے سیراب کیا یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ عبدالحق اگرچہ یہ مانتے ہیں کہ اقبال کی فکر کا سرچشمہ قرآن و حدیث ہے لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ انہوں نے مشرق و مغرب کے کارآمد عناصر سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کا موقف رسول پاک کی حدیث کا مصداق ہے۔ 'حکمت مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے، وہ جہاں بھی پائے حاصل کرے اس لیے کہ اس حکمت کا وہ زیادہ مستحق ہے۔'' چنانچہ اقبال نے جہاں ایک طرف اسلامی علوم سے استفادہ کیا، مغربی مفکرین سے کسب فیض کیا وہیں ہندی فکر و فلسفہ سے بھی خوشہ چینی کیا۔ بھرتی ہری، سری شنکر اچاریہ وغیرہ کے افکار کو اپنے اشعار میں پیش کیا۔ گائتری مسر کا ترجمہ کیا۔ رام اور نانک پر نظمیں کہیں۔ یہ سب اقبال کے اسی اخذ و رد کے اصول کے مطابق ہے۔ وہ اپنے مطلب کی چیز جہاں پاتے ہیں اسے لے لیتے ہیں۔ خواہ اس کا کہنے والا کوئی بھی ہو۔ اپنے ایک مضمون 'اقبال اور قدیم ہندی فکر و فلسفہ' میں وہ اقبال کی شاعری میں ہندی فکر و فلسفہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی عبدالستار دلوی کی کتاب 'اقبال کا ایک ممدوح عظیم سنسکرت شاعر اور مفکر'' (بھرتری ہری) کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مجموعی طور پر اس کتاب سے اتفاق کرنے کے باوجود عبدالحق نے اس کتاب کی بعض تسامحات بھی بیان کیا ہے۔

اقبال نے اگرچہ ہند و فلسفہ سے خوشہ چینی کی ہے لیکن اپنی شرطوں پر۔ بقول عبدالحق:

''ہندی فلسفہ کا غالب حصہ نفی و گریز کا ہے۔ مایہ ہو یا موہ، نجات ہو یا نروان، موکچھ ہو یا مہایان۔ سب میں کسی نہ کسی حد تک فرار یا انکار کا عنصر موجود ہے۔ اس کے برعکس اقبال اثبات و اقرار کے ترجمان ہیں۔ دونوں میں قطبین

> کا بعد ہے۔ حقیقت کے استقرار کے لیے اضداد کا وجود لازمی ہے۔ ان منفی تصورات نے اقبال کے استحکام کو فکری جواز فراہم کیا ہے۔''[1]

اقبال نے اگرچہ اپنے بعض مرکزی خیال ہندی فلسفہ سے لیا ہے مگر اس کو اپنے مخصوص سانچے میں ڈھال کے پیش کیا ہے۔

عبدالحق نے اپنی تنقیدی تحریروں میں اقبال کا مطالعہ دوسری شخصیات کے حوالوں سے بھی کیا ہے۔ ان مضامین میں انھوں نے ان دونوں شخصیات کی باہمی مماثلتوں کو بیان کیا ہے۔ ان کے درمیان پائے جانے والے اخذ و قبول کو بھی ثابت کیا ہے۔ اقبال اور رومی کے باہمی افکار کے تقابلی مطالعہ پر یوں تو بہت سارے اقبال شناسوں نے مضامین اور کتابیں تحریری کی ہیں لیکن عبدالحق کا مضمون ان سب میں فائق ہے۔ انھوں نے جس بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

'حالی۔ پیشروِ اقبال' عبدالحق کا ایک عمدہ مضمون ہے جو ان کی کتاب 'اقبال شاعر رنگیں نوا میں شامل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے حالی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ سرسید تحریک، شاعری کی اصلاح اور بامقصد ادب کے لیے ان کی کوششوں کا ذکر خیر کیا ہے۔ اقبال نے حالی کا زمانہ پایا تھا۔ ان مجلسوں میں بھی شریک ہونے کا موقع انہیں ملا جن میں حالی اپنی سخنوری کا جادو جگا رہے تھے۔ ایک ایسی ہی مجلس کا ذکر عبدالحق نے بھی کیا ہے جس میں مسدس حالی کو خود حالی کی فرمائش پر اقبال نے پڑھ کر عوام کو سنایا تھا۔ وجہ یہ تھی بڑھاپے کی وجہ سے حالی کی آواز کمزور پڑ رہی تھی اس وجہ سے حالی کے کہنے پر اقبال نے مسدس پڑھ کر سنایا۔ اقبال کو مسدس بہت پسند تھا۔ وہ اس کو بار بار پڑھا کر سنا کرتے تھے۔ نعت والے حصے پر وہ زار و قطار رویا کرتے تھے۔ اقبال اور حالی کی ذہنی ہم آہنگی پر لکھتے ہیں:

> '' دونوں کی ذہنی ہم آہنگی کی ایک اور جہت قابل ذکر ہے جو اس حسن امتزاج سے کہیں زیادہ معنی خیز اور فکر انگیز ہے، قومی ہمدردی کا جذبہ ایک تلاطم کی طرح دونوں کے دلوں میں بے اماں وسعتوں کا حامل ہے دونوں قوم کی ابتری سے افسردہ اور انحطاط سے خوف زدہ ہیں۔ وہ گردش ایام کسی ستم رانیوں سے شکوہ سنج ہیں۔ ان کی شاعری کا

---

1 اقبال شاعر رنگیں نوا ص ۱۱۵

بڑا حصہ ملت جو درد و داغ یا سوز و ساز کا نالۂ دل دوز ہے ان سے قومی محسوسات کی خوں چکاں کہانی دہرائی جاسکتی ہے۔ حالی کا آشوب نامہ 'مد و جزر اسلام' بہت مقبول ہوا۔ قومی زوال کا عبرت ناک تذکرہ حالی کا مقدر تھا۔ حالی کی حیات میں ہی ۱۹۱۲ میں لکھی جانے والی نظم 'شکوہ و جواب شکوہ'، مد و جزر اسلام کی توسیع یا تفصیل ہے۔ اگر شبلی کے شہر آسوب اسلام کو شامل کرلیا جائے تو یہ امت مسلمہ کے عروج و انحطاط کی داستان سرائی کے دلچسپ شعری دستاویز کہلائیں گے۔''[1]

اگر حالی کا مسدس اور اقبال کا شکوہ ملا کر پڑھا جائے تو فکری ہم آہنگی ہی نہیں بلکہ شعری آہنگ بھی ایک جیسا ہے۔ ان دونوں کے فکر و فن میں پائی جانے والی یکسانیت ہی ہے کہ آج بھی لوگ غلطی سے اقبال کے اشعار حالی کے نام اور حالی کے اشعار اقبال کے نام سے درج کر دیا کرتے ہیں۔ عبد الحق کی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ:

''حالی صرف اقبال کے ہی نہیں بلکہ ہماری ساری سخنوری اور سخن شناسی کے پیش رو ہیں۔ اقبال نے حالی کے تصورات کو تنوع اور توسیع دے کر ہمارے شعر و فکر کو گراں بار کیا ہے۔ گزشتہ صدی کی تاریخ میں کوئی بھی فن کار اور ادبی منظر نامہ اقبال کے استفادے سے ماورا نہیں ہے۔'' [2]

عبد الحق نہ صرف یہ کہ تنقید و تحقیق میں ادبیت کے قائل ہیں بلکہ ان کی تحریریں اس کا سلیقہ فراہم کرتی ہیں۔ صاف و سلیس ادبیت سے بھر پور جملوں کے ساتھ ایسی د لچسپ عبارت کرتے ہیں کہ ان کی تنقید بھی ادبی پارہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ عبد الحق کی تحریروں کو اقبالیاتی ادب کی آبرو ہے۔ عبد الحق ابھی باحیات ہیں۔ عمر کے اس حصہ میں بھی ان کا قلم جوان ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ وہ اقبالیاتی سرمائے میں مزید بیش بہا اضافہ فرمائیں گے۔

---

1 اقبال شاعر رنگیں نوا ص ۸۷

2 اقبال۔ شاعر رنگیں نوا ص ۹۰

# گیان چند جین

گیان چند جین اپنی تحقیقی کاوشوں کی وجہ سے اردو دنیا میں مشہور ہیں وہ ایک بے لاگ محقق ہیں اپنی تحقیق کا اظہار کرنے میں تردد سے کام نہیں لیتے۔ اقبالیات پر بھی انہوں نے بعض اہم تحقیقی کام کیے ہیں۔ 1988 میں ان کی کتاب ''ابتدائی کلام اقبال'' شائع ہوئی۔ یہ کتاب عمدہ تحقیق کا نمونہ ہے۔ اس کتاب میں اقبال کے ابتدائی کلام باعتبار ماہ و سن ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں وہ کلام بھی شامل ہے جو اقبال نے خود قلم زد کر کے اپنے مجموعہ کلام سے خارج کر دیا تھا اس طرح اس کتاب میں اقبال کے ابتدائی کلام خواہ وہ منسوخ ہو یا غیر منسوخ سلسلہ وار ماہ و سن کے اعتبار سے ایک جگہ جمع ہو گیا ہے۔ اس طرح اقبال کے فکر و فن کے ارتقاء کو سمجھنے میں یہ کتاب معاون ثابت ہو گی۔

# اکبر حیدری کشمیری

اکبر حیدری کشمیری، کو اقبالیات سے خاص لگاؤ ہے۔ اقبالیات میں ان کی تین کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ 'اقبال کی صحت زبان'، 'اقبال اور علامہ شیخ زنجانی مع وحی و الہام اور برہان امامت' اور 'اقبالیات کے نئے گوشے'۔ اکبر حیدری کے ساتھ پریشانی یہ ہے کہ وہ ادب کو بھی مسلکی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح وہ ادب کو ادب نہ رکھ کر مذہبی جدلیات میں شامل کر دیتے ہیں۔ اکبر حیدری اقبال تنقید میں بھی اپنے عقیدہ کا نہ صرف اظہار کرتے ہیں بلکہ اس کی وکالت کرتے نظر آتے ہیں۔

اکبر حیدری کی کتاب 'اقبال اور علامہ شیخ زنجانی مع وحی و الہام اور برہان امامت' اقبالیاتی ادب میں موتیوں کے ساتھ کس قسم کے خزف ریزے وجود میں آرہے اس کی ایک مثال ہے، یہ کتاب 2002 میں شائع ہوئی میرے سامنے اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو 2006 میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کے اہل بیت اور علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں کہے گئے اشعار کو پیش کر کے اکبر حیدری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال اگرچہ سنی تھے مگر شیعہ عقائد مانتے تھے یہاں تک کہ بارہ اماموں کے فلسفہ کے دل سے قائل تھے۔ اکبر حیدری نے یہ کتاب جدلیاتی دینی کتابوں کی طرز پر لکھی ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اقبال شناسوں کو نازیبا الفاظ سے یاد کیا ہے بلکہ تاریخی حقائق کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ 237 صفحات کی کتاب میں اقبال اور علامہ زنجانی کے رشتہ کو صرف دو صفحات (103-104) میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ اکبر حیدری کو اقبال اور زنجانی کے رشتہ کے بارے میں کوئی معلومات نہ مل سکی جو کچھ معلومات ہیں بھی وہ ادھوری اور ناقص ہیں۔

اکبر حیدری لکھتے ہیں:

یہ امر ہنوز [illegible] تحقیق ہے کہ شیخ زنجانی نے ہندوستان کا سفر کب اختیار کیا اور وہ کس زمانے میں وارد پنجاب ہوئے تھے پنجاب میں جو مجلسیں انہوں نے پڑھیں اور جو تقریریں انہوں نے کیں ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ شیخ زنجانی کی پہلی ملاقات علامہ اقبال سے کہاں ہوئی تھی۔ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اقبال علامہ کے علمی تبحر اور وسعت نظر سے مانوس ہو چکے تھے۔ ہمارے خیال میں علامہ زنجانی غالباً 1927 کے آخر یا اوائل 1928 میں لاہور تشریف لائے اور قزلباش خاندان کی روایت کے مطابق پنجاب کے رئیس اعظم اور ممتاز سماجی کارکن نواب فتح علی خاں قزلباش کے بڑے صاحبزادے نواب نثار علی خاں کے مہمان ہوئے اور انہی کی کوٹھی نثار حویلی لاہور میں مقیم تھے، نواب صاحب اقبال کے قدر دان تھے دونوں میں بے تکلفانہ ملاقاتیں ہوتی تھیں۔" [1]

اس پوری عبارت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگر اس کو تحقیق کہتے ہیں تو پھر تحقیق کا اللہ ہی نگہبان! ایک طرف اکبر حیدری اس سلسلے میں کہ زنجانی لاہور کب آئے، لاعلمی کا اظہار کر رہے ہیں پھر خود ہی ایک تاریخ مقرر کرتے ہیں مگر یہ بتانے کی زحمت نہیں کرتے کہ کس بنیاد پر انہوں نے یہ تاریخ بیان کی ہے۔ ایک طرف حیدری کہتے ہیں کہ پنجاب میں جو تقریری اور مجلسیں کیں ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا دوسری طرف اسی کے بعد والے پیراگراف میں لکھتے ہیں علامہ اقبال کچھ دوستوں کے ساتھ نثار حویلی گئے وہیں پر ان کی ملاقات زنجانی سے ہوئی، اقبال نے زنجانی سے وحی والہام، او ران کے درمیان فرق اور مہدی موعود کے بارے میں پوچھا کہ کیا ان کا کوئی وقت مقرر ہے؟ بقول حیدری:

"شیخ زنجانی نے ایسا اطمنان جواب (کذا) دیا کہ سب لاجواب ہو گئے اور پھر کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔"

"بعد میں اس واقعہ (کذا) کا ذکر لاہور کے بعض حلقوں میں کافی دیر تک ہوتا رہا۔ علامہ زنجانی کا حافظہ بہت تیز تھا انہوں نے ڈاکٹر اقبال کے سوال کا جواب مسلسل تین گھنٹے تک دیا۔" [2]

سوال یہ ہے کہ اگر پنجاب کی کسی مجلس یا تقریر کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا تو اس مجلس کے بارے میں کیوں کر معلوم ہوا۔ دوسری بات یہ کہ کس بنیاد پر یہ بات کہی جارہی ہے کہ شیخ زنجانی کے علمی تبحر اور وسعت علمی سے علامہ

---

1 اقبال اور علامہ شیخ زنجانی مع وحی و الہام اور برہان امامت، اکبر حیدری کشمیری، ص 103

2 ایضاً

مانوس ہو چکے تھے۔ موصوف خود لکھتے ہیں کہ نواب صاحب (جن کے مکان پر شیخ زنجانی نے قیام کیا تھا) اقبال کے قدر دان تھے دونوں میں بے تکلفانہ ملاقاتیں ہوتی تھیں)۔

ایسا بھی تو ہو سکتا کہ اقبال صرف نواب صاحب سے ملنے کی خاطر گئے ہوں اور وہاں ایک شیعوں کے ایک مشہور عالم دین کو دیکھ کر خیال کیا ہو کہ ان مسائل پر ان کی رائے لی جائے جو شیعوں اور سنیوں کے درمیان نزاع کا باعث ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا سراسر غلط ہے کہ اقبال شیخ زنجانی سے متاثر تھے یا ان کے عقیدت مندوں میں شامل تھے، اگر واقعی ایسی بات ہوتی تو اقبال پر لکھنے والوں نے ضرور ان کا ذکر کیا ہوتا۔ ان کا ذکر نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ملاقات اگر ہوئی تھی تو بھی ایک اتفاقیہ ملاقات تھی یا صرف افادہ اور استفادہ کی غرض سے تھی۔

اکبر حیدری کشمیری لکھتے ہیں:

"مجھے بعض ماہرین اقبال کے نامنصفانہ اور منافقانہ طرز عمل پر افسوس ہو رہا ہے کہ ان کے منہ میں گویا دو متضاد زبانیں چلتی ہیں، ایک زبان سے علامہ کو شاعر مشرق، ملک الشعراء ترجمان حقیقت اور حکیم الامت کی رٹ لگاتے ہیں دوسری زبان سے ان کے فرمودات کو جھٹلاتے ہیں۔"[1]

اکبر حیدری کشمیری نے پوری کتاب میں انصاف کی دہائی دی ہے مگر خود انہوں نے کہاں تک انصاف سے کام لیا ہے کتاب پڑھنے والا اس سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے۔ موصوف جس کو 'دو متضاد زبانیں چلنے' کی بات بتا رہے وہ صحیح نہیں۔ کوئی بھی شخص کتنا بھی بڑا دانشور کیوں نہ ہو جائے اس کی ہر بات پر حرف آخر نہیں ہوتی اور نہ ہر بات ماننے کے لائق ہوتی ہے، اہل تحقیق خود یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کون سی بات قابل قبول ہے کون سی قابل رد۔

اکبر حیدری کشمیری اپنی تحریر میں کس قسم کے اوچھے جملے لکھتے ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

'پروفیسر سلیم چشتی - یہ اقبال کے شارح اعظم مانے جاتے ہیں۔ انہیں اقبال کی ہم نشینی کا شرف بھی رہا ہے۔ اور بخیال خود علامہ سے سبقاً سبقاً کئی کتابیں پڑھنے پر بھی اوروں سے امتیاز حاصل تھا۔ علامہ نے 'اسرار خودی' میں

---

1 اقبال اور علامہ شیخ زنجانی مع وحی و الہام اور برہان امامت ص 8

حضرت علی کے فضائل قرآن و احادیث کے مطابق بیان کر کے انہیں نیابت الٰہی قرار دیا۔ چشتی صاحب کو یہ فرمودات گوارہ نہیں اس لیے انہوں نے اقبال کو ہدف تنقید بنادیا۔

علامہ کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں:

مسلم اول شہ مرداں علی
عشق راسرمایہ ایماں علی
از دلائے دودمانش زندہ ام
در جہاں مثل گہر تابندہ ام

چشتی صاحب شرح کا فتوی یوں داغتے ہیں:

اقبال صوفی ٹائپ کے آدمی تھے اور ایسا آدمی حب علی کے طلسم سے باہر نہیں نکل سکتا، تفصیل کی گنجائش نہیں۔'' [1]

یہ ہے پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کی تحریر خط کشیدہ الفاظ خاص طور پر ملاحظہ فرمائیں موصوف کو یہ بھی معلوم نہیں کہ فتوی کسے کہتے ہیں۔ اور فتوی دا ء   ۔   ے کی اصطلاح کن لوگوں سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے بتانے کی ضرورت نہیں۔

جہاں تک چشتی صاحب کی شرح کا تعلق ہے اس میں انہوں نے کوئی غلط بات نہیں کہی ہے مگر اس پر اکبر حیدری کشمیری کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

''صوفی ٹائپ'' اور ''طلسم'' کے الفاظ قابل توجہ ہیں ایسے رکیک الفاظ استعمال کر کے موصوف نے اپنے محدود نظر سے اور کٹھ ملا ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے کیا علی نعوذ باللہ کوئی جادوگر تھے، علی کے فضائل بیان کرنے کے لیے انسانی قلب و نظر میں بے پناہ وسعت چاہئے کیا چشتی صاحب کے بیان میں کوئی معقولیت ہے کہ 'تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔'' (ایضاً)

---

1 اقبال اور علامہ شیخ زنجانی مع وحی و الہام اور برہان امامت

اکبر حیدری کشمیری لکھتے ہیں:

"غرضیکہ اقبال بارہ اماموں کے قائل ہو چکے تھے (کذا) اور وہ انہی الکومُر مہ ہم' قرار دیتے تھے بارہویں امام کے بارے میں ان کا قول تھا۔

مجھ کو انکار نہیں آمد مہدی سے مگر
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا
دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالم افکار"[1]

موصوف کو غالباً معلوم نہیں کہ مہدی کا تصور صرف شیعہ ہی نہیں بلکہ سنیوں میں بھی ہے، سنیوں کے مطابق عیسی علیہ السلام سے پہلے مہدی علیہ السلام تشریف لائیں گے۔ کیا دلیل ہے کہ اقبال شیعوں کے مہدی منتظر کی بات کر رہے ہیں؟ اس شعر سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سنیوں کے عقیدے کے مطابق جس مہدی کا تذکرہ حدیثوں میں ملتا ہے اس کا بیان ہے۔

جہاں تک اقبال پر تفضیلی یعنی حضرت علی کو ابو بکر پر فضیلت دینے کا الزام ہے وہ بھی غلط ہے۔ اقبال حضرت علی سے اہل بیت ہونے اور ان کی علمی اور اخلاقی قدروں کی وجہ سے محبت کرتے تھے مگر ابو بکر کو نبی کے بعد سب سے افضل مانتے تھے۔ یہ ساری غلط فہمی اقبال کے چند کلام کو سامنے رکھ کر تجزیہ کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

علامہ اقبال کی زبان پر علامہ کی زندگی اور زندگی کے بعد بہت کچھ کہا گیا ہے۔ خود علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے کے دفاع میں لکھا۔ اکبر حیدری نے اس موضوع پر مختلف لوگوں کی آراء کو '**اقبال کی صحت زبان**' نام سے ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ اس طرح ان کا یہ کام تصنیف کے بجائے تالیف کے زمرے میں آتا ہے۔

---

1 اقبال اور علامہ شیخ زنجانی مع وحی و الہام اور برہان امامت ص16

2006 میں شائع ہونے والی پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کی کتاب **"اقبالیات کے نئے گوشے "**قدیم اخبارات ورسائل سے اقبالیات کے مواد کو اکٹھا کیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ 2000 آتے آتے اقبالیات میں جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے اب نئی چیز پیش کرنا ممکن نہیں۔ تعجب ہے کہ اردو دنیا کے اس عظیم شاعر کے لیے اردو والوں کے لیے کرنے اور کہنے کے لیے کچھ نیا نہیں بچا ہے۔ وہی پرانے مضامین کی تکرار، فرسودہ مضامین کی بہتات۔ تعجب یہ ہے کہ ہم اقبال سے اتنی جلدی نپٹ کیسے گئے۔

جب نیا کرنے اور کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا ہے تو دل کے بہلانے کے لیے بس ایک کام باقی رہ گیا ہے وہ کہ کتاب کے عنوان سے نئے پکا اظہار کرنے کی کوشش کی جائے۔ وحید قریشی کی کوششوں سے اقبالیات پر مختلف رسائل میں شامل مضامین کے انتخاب شائع ہو چکے ہیں اسی طرح مضامین کی شکل میں دوسرے اخبارات ورسائل کی اقبال شناسی کی خدمات کا جائزہ لیا جا چکا ہے، ایسے میں اس کتاب میں ایسا کیا ہے جو نیا ہے۔

''اقبالیات کے نئے گوشے'' میں خدنگ نظر لکھنؤ، میرٹھ، معارف، علی گڑھ میگزین، نیرنگ خیال لاہور، سہیل علی گڑھ، کلیم دہلی، شاہکار لاہور اور ایمان امرتسر وغیرہ رسائل میں اقبال کے شائع مضامین، نظمیں، اور ان کی حمایت یا مخالفت میں شائع مضامین پر گفتگو کی گئی ہے۔

اس طرح ایک فائدہ تو یہ ہوا ہے کہ اقبال کی نظموں اور غزلوں کے بارے میں جو ان رسالوں میں سب سے پہلے شائع ہوئی ہیں ان کی تاریخ اشاعت معلوم ہو گئی۔ حیدری صاحب نے ایک کام یہ بھی کیا ہے کہ اقبال کے رسائل کے مدیران کے نام دستی خطوط یا نظمیں جو ارسال کی تھیں اگر انہیں مل گئی ہیں تو اس کا عکس بھی شائع کر دیا ہے۔ اس طرح اس کی حیثیت تاریخی ہو گئی ہے۔

علامہ اقبال کی زندگی میں اقبال کی حمایت یا مخالفت کی جو فضا تھی ان رسائل کے حوالے وہ چیز ہمارے سامنے آجاتی ہے مثلاً اقبال کو جب سر کے لقب سے جب انگریزی حکومت نے سرفراز کیا تو اس کی جہاں بعض لوگوں نے سراہنا کی وہیں بعض علماء اور ادباء نے اس کو غلط مانا۔ حیدری صاحب نے اس وقت کی ایک نظم لکھی ہے جو میں شائع ہوئی تھی:

لو مدرسۂ علم ہوا قصر حکومت

افسوس کہ علامہ سے سر ہو گئے اقبال
پہلے تو سر ملت بیضا کے وہ تھے تاج

اب اور سنو تاج کے سر ہو گئے اقبال
پہلے تو مسلمان کے سر ہوتے تھے اکثر

تنگ آئے اب انگریز کے سر ہو گئے اقبال
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ

سر کی دہلیز پر سر ہو گئے اقبال
سر ہو گیا سڑکوں کی شجاعت سے سمرنا
سر کی تدبیر سے سر ہو گئے اقبال([1])

اسی موقع پر زمیندار کے ایڈیٹر ظفر علی خاں نے لکھا تھا:

مانگ کر احباب سے رحمت پسندی کی کدال
قبر آزادی کی کھودی کس نے؟ سر اقبال نے

مصنف اگر اس کتاب کو اقبال کی نظموں، غزلوں اور مضامین یا اقبالیات تک ہی محدود رکھتے تو اچھا تھا انہوں نے ہر رسالہ کے مالہ ماعلیہ اور مدیر کے بارے میں غیر ضروری تفصیلات فراہم کی ہیں جن کا اقبالیات سے کوئی تعلق نہیں اس سے خواہ مخواہ کتاب کی ضخامت بڑھ گئی ہے۔ ماہنامہ کلیم جو کہ جوش ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اس کا آخری اداریہ بقلم جوش مکمل نقل کیا ہے، اس کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو:

---

1 ص 96 بحوالہ صوفی۔ جلد 29، نمبر 169 جنوری 1923

''جی چاہتا لوگوں کو سڑکوں پر روک روک کر پوچھوں کہ بھائی یہ تو بتاؤ کہ ہمارا کلیم اب تک کیوں کر چل رہا ہے، اور یہ امر واقعی بھی ہے کہ کلیم کا اب تک چلتے رہنا ایک بڑا معجزہ ہے، حضرت کلیم اللہ اپنے عصا مبارک کو سانپ میں تبدیل ہوتے دیکھ کر اس قدر حیران نہیں ہوئے ہوں گے جس قدر یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ کلیم تقریباً چار برس سے چل رہا ہے۔ البتہ جب جنگل کے خودرو درختوں پر نگاہ کرتا ہوں اس وقت میرا یہ استعجاب دور ہو جاتا ہے اور یہ بات میری عقل میں آنے لگتی ہے کہ جس طرح خودرو درخت عناصر سے اپنی غذا زبردستی حاصل کر کے زندہ رہتے ہیں، اسی طرح بے یارومددگار اور بدنظمیوں کا شکار کلیم بھی اب تک زبردستی سے اپنے کو زندہ رکھے ہوئے ہے'' [1]

اس اداریہ کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلم مگر اقبالیات سے اس کا کیا تعلق؟ البتہ ایک اہم مضمون اس کتاب کے آخر میں شامل ہے جس میں اقبال کی وفات پر نایاب رسائل کے اداریے گئے ہیں اس سے اس کتاب کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔

---

1 اقبالیات کے نئے گوشے ص 320

# مظفر حسین

اقبالیاتی ادب میں چودھری مظفر حسین کی ایک کتاب 'اقبال کے زرعی افکار' (1984) کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر پہلی کوشش اور کامیاب کوشش تھی جس سے معلوم ہوا کہ اقبال کی شاعری کے بحر ذخار میں کیسے کیسے آبدار موتی و گوہر پوشیدہ ہیں جن تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ چودھری مظفر حسین نے اس کتاب کو سات ابواب پر تقسیم کیا ہے۔

پہلے باب میں انہوں نے نشان دہی کی ہے کہ اقبال کس قدر زراعت سے دلچسپی رکھتے تھے کس دردناک الفاظ میں انہوں نے دہقاں کی مظلومیت کی کہانی کو اور دیہات کی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ دوسرا باب مصنف نے مسئلہ ملکیت زمین کے نام سے رقم کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ اقبال اسلام کے داعی رہے ہیں انہوں نے یہاں بھی اسلامی نقطۂ نظر سے تمام زرعی مسائل کو اخلاقی نقطۂ نظر سے حل کرنے پر زور دیا ہے۔ زرعی لگان کے اصول و قواعد بیان کیے ہیں حق انتفاع بقدر محنت متعین کیا ہے۔

اقبال کے زرعی افکار پر روشنی ڈالتے ہوئے چودھری مظفر حسین رقم طراز ہیں:

> ''اقبال کی شاعری سے جنم لینے والی جذباتی فضا معاشی خوشحالی کے نظریے کو جو زرعی توسیع کا ایک لازمی وظیفہ ہے، مقبول عام بنانے کے لیے کتنی ساز گار ہے۔ اس کی فلسفیانہ بصیرتیں اور شاعرانہ تخیلات و اشارات ہمارے عوام کے لیے خصوصی کشش رکھتے ہیں اقبال کے فکر و فن کی یہ خوبیاں اس کے پیام کو زرعی توسیع کے لیے بے حد موزوں بنا دیتی ہے''

چودھری مظفر حسین کا کام اقبال پر ایک نئے بحث کا آغاز ہے۔ اقبالیات پر ان کی کوئی اور کتاب نہیں ملتی ہے۔ اس کے باوجود چونکہ اس موضوع پر اب تک کوئی دوسری کتاب سامنے نہیں آئی ہے اس لیے اس کتاب کو ایک نئے اضافہ کے طور پر دیکھا جائے گا۔

# عالم خوندمیری

پروفیسر عالم خوندمیری کی شائع ہونے والی کتاب 'اقبال، کشش اور گریز' 1985 دراصل ان کے تحقیقی مقالہ ''اقبال کا تصور زمان ومکان'' کی بازگشت ہے جو بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوچکی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اقبال کے تصور زمان ومکان کو خصوصی طور پر موضوع بحث بنایا ہے۔ خوندمیری کا خیال ہے کہ اقبال کے یہاں تضاد کی تلاش کرنے والے دراصل اقبال کے ایک جزء کو دوسرے سے الگ کرکے دیکھتے ہیں ورنہ کل اقبال میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین مصنف کی تحقیقی صلاحیت کی غماز ہے، جو اقبالیات میں ایک اضافہ کے طور پر دیکھا جائے گا۔

# محمد بدیع الزماں

1986ء میں محمد بدیع الزماں کی کتاب ''پیام اقبال'' منظر عام پر آئی۔ بدیع الزماں ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے موجودہ دور میں اقبال فہمی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ موصوف کا میدان اگرچہ ادب نہیں مگر ذوق و شوق اور مطالعہ کی وجہ سے انہوں نے اقبالیات پر جتنا کچھ لکھا ہے وہ اپنے آپ میں لائق ستائش ہے۔ موصوف کی تحریروں میں اقبال کے کلام کی تفہیم قرآن و حدیث کے حوالے سے ہوتی ہے۔ اقبال کے فکر کا بنیادی ماخذ بدیع الزماں قرآن و سنت قرار دیتے ہیں۔

'پیام اقبال' بدیع الزماں کے تیرہ مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے دس مضامین اقبال کے افکار اور 3 اقبال کے فن پر ہیں، ان مضامین میں چند مضامین خاص طور پر قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچتے ہیں مثلاً ''اقبال کے کلام میں الفاظ کی طلسم آفرینی''؛ ''اقبال اور معاملات حسن و عشق''؛ اور ''اقبال کے ذہن میں خواتین کا درجہ''۔

اقبال اپنے کلام میں جابجا عشق پر ابھارتے ہیں عشق کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بدیع الزماں لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے یہاں عشق عمل کا دوسرا نام ہے جس کی کارگزاری انہیں مسجد قرطبہ کے نقش و نگار میں نظر آتی ہیں کبھی خیبر کے میدان کارزار میں کبھی تنہائی کوہ و دمن میں اور کبھی سوز و سرور انجمن ہیں۔ اقبال انسانی عمل میں داخلی ارتقا کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں جس سے ہمارے عزم و ارادہ میں وجد آفرینی محرکات پیدا ہو سکیں کیونکہ جمالیاتی شعور کا عمل کو متاثر کرنا لازمی ہے حسن و عشق کے معاملات میں بھی اقبال کو جہاں تازہ ہی پیدا کرنا تھا۔''
> (ص78)

'اقبال کے کلام میں الفاظ کی طلسم آفرینی'' میں بدیع الزماں نے اقبال کے الفاظ کے استعمال کی دس خصوصیات سلسلہ وار مثالوں کے ساتھ بتائیں ہیں۔ یہ خصوصیات بدیع الزماں کے تنقیدی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ دسویں خصوصیت کے طور پر وہ لکھتے ہیں:

''الفاظ کے معاملہ میں اقبال کی دسویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے الفاظ میں جس میں بظاہر دیکھنے میں کوئی شور وشر نہیں نظر آتا مگر جب اسے شعر کے پیکر میں سمو دیتے ہیں تو ان کی گہرائی میں معنی کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے، ان کی تہوں میں ہزاروں لہریں موجزن ہو جاتی ہیں جیسے، حیرت، علم، فنا:

حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے
علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
فنا کو جو دیکھا فنا ہوگئی وہ
قضا تھی، شکار قضا ہوگئی وہ''

یہ مضامین اگرچہ مختلف رسائل میں پہلے چھپ چکے ہیں مگر ان کی ایک جگہ اشاعت سے قارئین کو ان کی طرف رجوع کرنے میں سہولت ہو گی۔

# محمد حبیب الدین احمد

1986 میں محمد حبیب الدین احمد کی کتاب ''علامہ اقبال کا نظریہ تعلیم'' شائع ہوئی۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کے نظریہ تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علامہ اقبال کی حیثیت ایک مصلح قوم کی ہے۔ علامہ اقبال اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ قوم کی اصلاح کا ہر راستہ تعلیم ہی سے ہو کر جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ تعلیم کی اہمیت و افادیت کے قائل تھے۔ تعلیم کے سلسلہ میں علامہ اقبال کے کچھ اپنے مخصوص خیالات تھے۔

علامہ اقبال اردو شاعروں میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے شاعر تھے۔ انہوں نے برصغیر کی جامعات کے علاوہ انگلینڈ کی جامعات میں بھی تعلیم پائی تھی اس وجہ سے تعلیم کے تعلق سے ان کے یہاں جو وسعت اور گہرائی ملتی ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی ہے۔

علامہ اقبال کی حیثیت ایک مربی اور معلم کی ہے ان کی فکر، فلسفہ اور شاعری کا ہر حصہ ہمیں درس دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اقبال کے کلام پر غور کرنے پر ہمیں ان کے یہاں درس و تعلیم کے واضح عناصر ملتے ہیں۔ ان میں خاص طور پر ایمان و یقین خودی اور خود اعتمادی، وسیع النظری اور بلند نگہی محبت واخوت وغیرہ اہم ہیں۔ یہ تعلیم ہمارے قلب و نگاہ کو روشن کرتی ہیں۔

اقبال اگرچہ تعلیمی مفکر نہ تھے مگر انہوں نے طلبہ نصاب مدرسہ اور اساتذہ پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے اور واضح اور رہنما خطوط سے قوم کو نوازا ہے۔ موجودہ تعلیمی صورتحال کا تنقیدی جائزہ لے کر اس کی خامیوں اور خوبیوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

در اصل اقبال کا نظریہ تعلیم اخلاقی اور اسلامی ہے ان کی نظر میں علم اور اخلاق دونوں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ موجودہ تعلیمی نظام میں اخلاقی قدروں کی پامالی پر اقبال نے سخت تنقید کی ہے۔ اقبال کی تعلیم میں بچے، عورتیں اور جوان سب آجاتے ہیں۔ اقبال کے تعلیمی نظریے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال کے نزدیک تعلیم کا اولین مقصود یہ ہے کہ طلبا اپنے دینی مذہب اور نظریہ حیات سے آشنا ہوں، وہ زندگی کے صحیح مفہوم اور مقصد اور دنیا میں انسان کی حیثیت کو سمجھتے ہوں، رسالت اور آخرت اور انفرادی و اجتماعی زندگی پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ اس سے بخوبی آگاہ ہوں، اخلاقیات کے اسلامی اصول، اسلامی ثقافت اور ایک مسلمان کے فرائض اور اس کے مشن سے وہ پوری طرح باخبر ہوں۔'' [1]

علامہ اقبال کی معلمانہ ذہن کی نمائندگی کرنے والے اشعار کی ایک بڑی تعداد اردو اور فارسی دیوان میں موجود ہے۔

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

سبق پڑھ پر صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

علم کا مقصد ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصد ہے عفت قلب و نگاہ

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لیے اب صلاح کی راہ

---

[1] ایضاً ص 20

علامہ کی بعض نظمیں تو سراپا درس و تعلیم کا نمونہ ہیں ایسی نظموں میں علی گڑھ کالج کے نام، عبد القادر کے نام، جاوید کے نام، جاوید سے خطاب، خطاب نوجوانان اسلام وغیرہ کافی اہمیت کی حامل ہیں۔

ایک مکڑی اور مکھی، ایک گائے اور بکری، ایک پہاڑ اور ایک گلہری، بچے کی دعاء، پرندے کی فریاد، شمع و پروانہ، عشق و موت، جگنو، نیا شوالہ اور تصویر درد وہ نظمیں ہیں جن کا موضوع اگرچہ تعلیم و تعلم نہیں ہے مگر ان میں درس کا مقصد ان میں پوشیدہ ہے۔

علامہ اقبال کے نظریات پر یوں تو چھوٹے مضامین کی شکل میں بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اس پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی ضرورت باقی تھی۔ یہ کتاب اس کمی کو ایک حد تک پوری کر رہی ہے۔

تاہم اقبال کا نظریہ تعلیم کافی وسیع موضوع ہے اس موضوع پر ابھی بہت کچھ تحقیقی کام کرنے کی گنجائش باقی ہے۔

# ایس ایم منہاج الدین

ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین نے اقبالیات کے تفہیم و تجزیہ میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی تین کتابیں اقبالیات کے فکری مباحث پر مشتمل شائع ہو چکی ہیں۔ 'افکار و تصورات اقبال' (۱۹۸۵)[1] کلام اقبال کے فکری مباحث پر مشتمل ایک اہم کتاب ہے جس میں انہوں نے افکار اقبال کو ان کے کلام کے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ 'افکار اقبال' (۱۹۸۶) اقبالیات پر شائع ہونے والی ان کی دوسری کتاب ہے اس میں انہوں نے اقبال کی طویل نظموں کا فکر و فن کے لحاظ سے جائزہ لیا ہے۔ 'تصورات اقبال' (۱۹۸۹)[2] ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں بھی انہوں نے اقبال کے فکر کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے آخر میں کلام اقبال کا ایک انتخاب بھی شائع کیا گیا ہے۔

ایس ایم منہاج الدین کی کاوشیں اقبال کے فکر و فلسفہ کی تفہیم میں لائق قدر ہیں اور اقبال فکر کو سمجھنے میں معاون ہیں۔

---

1 ط: کاروان ادب، ملتان

2 مصنف کی دونوں کتابیں کاروان ادب، ملتان سے شائع ہوئی ہیں۔

# اسلم انصاری

اسلم انصاری ایک نقاد اور شاعر ہیں۔ اقبالیاتی ادب میں ان کی کتابیں 'اقبال۔ عہد آفرین' (۱۹۸۷) اور 'اقبال عہد ساز شاعر و مفکر' ان کے تنقیدی وژن اور موضوعات کے تنوع کی وجہ سے اہمیت کی حامل ہیں۔ اسلم انصاری کو اقبال سے دلچسپی ان کے تعلیمی دور سے ہی تھی۔ تعلیمی دور میں ان کا ایک مقالہ 'اقبال اور فنون لطیفہ' ہفت روزہ جرس ملتان میں ۱۹۵۹ میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو پورے پاکستان میں پہلی پوزیشن ملی تھی۔ اسی طرح پنجاب یونی ورسٹی کے طلبا یونین کی طرف سے منعقد ایک مقابلے میں ان کے مقالہ 'مسجد قرطبہ۔ ایک تجزیاتی مطالعہ' کو ادبی مباحثہ میں اول انعام ملا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کے منصفین میں ڈاکٹر محمد باقر، سید وقار عظیم اور سید نذیر نیازی جیسے ماہرین اقبالیات تھے۔[1]

'اقبال۔ عہد آفرین' میں شامل مقالے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اسلم انصاری نے اقبال کے فکر و فن دونوں پر مضامین لکھا ہے۔ لیکن کمیت کے لحاظ ان کے یہاں دانشور اقبال کو فوقیت حاصل ہے۔ انہوں نے فکر اقبال کو سمجھنے کے لیے تاریخ، فلسفہ اور نفسیات کا سہارا لیا ہے۔ کتاب میں شامل موضوعات سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ 'اقبال۔ عہد آفریں'، 'اقبال کی بیانیہ شاعری'، 'اقبال اور عشق رسول'، 'اقبال کا تصور تاریخ'، 'اقبال کا لفظی تخیل'، 'اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر'، 'ہمالہ۔ نظم یا کسی طویل نظم کا ابتدائیہ' اور 'اقبال شخص اور شخصیت'، ایک نظر میں۔ اس میں زیادہ تر مضامین اقبال کی فکر کا احاطہ کرتے ہیں اور کچھ مضامین اقبال کے فن کا۔ 'اقبال۔ عہد آفریں' میں اردو نظم پر اقبال کے اثرات بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اقبال سے پہلے جو حرفِ سادہ تھی اس کو اقبال نے اس میں حیات و کائنات کی صداقتوں کو سمو دیا۔

---

1 ملتان میں اقبال شناسی، ص ۱۰۷

"اقبال نے نظم کو خط مستقیم کا مسافر ہونے کے بجائے نغماتی تحرک اور آہنگ کے خم پیچ سے آشنا کیا اور نظم کو ایک پیچ کی طرح نقطۂ آغاز سے بڑھنا اور پھولنا سکھایا۔ اردو نظم پہلی بار اقبال ہی کے ہاں ایک نامیاتی وحدت کے طور پر رونما ہوئی۔ جس میں تعمیراتی وحدت کا حسن بھی ہے۔"[1]

مذکورہ بالا تنقیدی عبارت پروفیسر اسلم انصاری کے تنقیدی شعور اور فہم اقبال کا پتہ دیتی ہے۔ انہوں نے جو بھی لکھا ہے اس میں اقبالیات کے نئے نئے گوشے تلاش کیے ہیں۔ مثلاً 'اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر' پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"اقبال کے ہاں ڈرامائی عناصر جس واضح، مکمل اور معنی خیز صورت میں نظر آتے ہیں اس سے سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال نے انہیں اپنے فنی مقاصد کی تکمیل کے لیے کامل فنی شعور کے ساتھ استعمال کیا ہے۔"[2]

اسی طرح انہوں نے اقبال کی اہم نظم ہمالہ کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک نیا نکتہ پیش کیا ہے۔ اپنے مضمون 'ہمالہ۔ نظم یا کسی طویل نظم کا ابتدائیہ' میں بیان کرتے ہیں کہ اقبال کی اس نظم کا تار و پود اس امکان کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ صرف ایک نظم نہیں ہے بلکہ کسی طویل نظم کے ابتدائیہ کی طور پر لکھی گئی ہوگی۔[3]

ظاہر سی بات ہے کہ کسی خارجی شہادت کے بغیر اس دعوی کا تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کے باوجود پروفیسر اسلم کی اس محنت کی داد دینی ہوگی کہ انہوں نے کلام اقبال کا مطالعہ اس باریک بینی سے کیا ہے۔ اسلم انصاری کی کتاب کا اعتراف کئی ماہرین اقبالیات نے کیا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی اس کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

1 اقبال۔ عہد آفریں، اسلم انصاری، ص ۱۸، کاروان ادب ملتان، ۱۹۸۷ء

2 اقبال۔ عہد آفریں، ص ۲۲۸

3 اقبال۔ عہد آفریں، ص ۳۱۲

''اسلم انصاری اقبال کے مداح ہیں اور اسلامی تاریخ و تفکر کا وہ شعور رکھتے ہیں جو اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے یہ مضامین علامہ سے ان کی گہری وابستگی کے ساتھ اقبال کی شاعری اور متعلقہ علوم کے وسیع مطالعہ کا ثبوت ہیں۔''[1]

اسلوب احمد انصاری رقم طراز ہیں:

''اقبال عہد آفریں'، اقبال پر تنقید میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور مصنف کی وسعت نظر اور فکر و تامل کی صلاحیت پر دال ہیں ، ... مبہمات سے حتی الامکان پرہیز کیا گیا ہے یہ کتاب یقیناً اس لائق ہے کہ اقبال کی شاعری کی رسیا اور اس کے سنجیدہ اور ذمہ دار مطالعے کے شائقین اسے غور سے پڑھیں اور اس کے مطالب کو گرفت میں لاکر اقبال شناسی کی سمت قدم بڑھائیں''[2]

اسلم انصاری کا اسلوب خالص علمی ہے۔ وہ کوئی بھی بات کرتے ہیں تو دلیلوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کے نتائج سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کاوشوں کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں۔

---

1 اقبالیات کے تین سال، ص ۱۰۲

2 ملتان میں اقبال شناسی، ص ۱۱۰

# سلیمان اطہر جاوید

1992ء میں شائع ہونے والی کتاب ''اقبال ماورائے دیر حرم'' پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے نو مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں لکھے۔ آخری مضمون کے نام پر انہوں نے کتاب کا نام رکھا ہے۔ بعض مضامین کافی معلوماتی اور فکر انگیز ہیں مثلاً ''اقبال کا ادبی تنقیدی شعور''، ''اقبال کے کلام میں اشاریت''، اور ''اقبال ماورائے دیر و حرم'' اقبال کا ادبی تنقیدی شعور میں اطہر جاوید نے اقبال کے خطوط مضامین، خطبات اور اشعار کے حوالے اقبال کے تنقیدی شعور کو پیش کیا ہے۔ ایک خط جو اقبال نے سکندر علی جاوید کو لکھا تھا اس کے حوالے لکھتے ہیں کہ اقبال اردو میں تنقیدی سرمایہ کی کمی کا احساس کرتے ہوئے انگریزی تنقید سے استفادہ کرنے کی ضرورت پر زور دیتے تھے۔ زبان و بیان اور مختلف دبستانوں کے تعلق سے اقبال کا نقطۂ نظر اقبال کے تنقیدی شعور کی واضح علامتیں ہیں۔ علامہ اقبال کی تحریروں سے تنقیدی مواد کو یکجا کرنا واقعی ایک قابل قدر کام ہے۔ اس سے اقبال پر تنقیدی کام کرنے والوں کو خود اقبال کے تنقیدی رجحان سے واقفیت ہو گی۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اقبال کے تصور ابلیس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عام طور پر ابلیس کا نام آتے ہی لاحول پڑھا جاتا اور لعنت بھیجی جاتی ہے جب کہ اقبال نے ابلیس کا اس زاویے سے مطالعہ نہیں کیا ہے وہ ان لوگوں میں نہیں جو بدی کو نفرت اور حقارت کے لائق ہی سمجھتے ہیں اور اس کے تذکرہ سے بھی اجتناب برتتے ہیں، اقبال کا تصور ابلیس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہے، وہ اس خصوصیت میں کہیں بھی قرآن شریف کی روشنی سے دور نہیں ہوتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ابلہِ مسجد کے زاویۂ فکر سے نہیں وسیع النظری سے کام لیتے ہیں، وہ ابلیس کو محض بدی کا مجسمہ قرار دینا رسمی مذہب تصور کرتے ہیں۔'' ([1])

[1] اقبال ماورائے دیر و حرم سلیمان اطہر جاوید، ص 34

اقبال کے کلام میں اشاریت کی معنویت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''اقبال کے اشارات ان کے مذہبی ذہن اور مختلف مذاہب سے ان کی آگہی، تاریخ اسلام اور تاریخ عالم کے ان کے گہرے مطالعے، سیاست حاضرہ سے ان کے غیر معمولی دلچسپی، مختلف فلسفوں پر ان کی گہری نظر، ان کی تمدنی بصیرت، ان کے تصور حسن اور ان کے شاعرانہ نقطۂ نظر کے غماز ہیں۔ جس طرح ان کے افکار میں پیچیدگی نہیں ہے، ان کے اشارات بھی نہ تو گنجلک ہیں اور نہ ژولیدہ! بلکہ سادہ اور معنویت سے بھرپور کہ ان کے فکر وفن کو سمجھنے کے لیے ان کے اشاراتی انداز کو سمجھنا ضروری ہے اقبال کے اشارات کا اپنا ایک طور ایک انداز ہے، ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال کو بھی اپنی زبان کی لفظیات کا سرمایہ ناکافی محسوس ہوا اس لیے انھوں نے ترسیل کے لیے بیشتر الفاظ کو اشارت کی حیثیت دے کر ان میں مفاہیم کی نئی دنیا آباد کر دی، ان کی معنوی پنہائیوں کو اور وسیع کر دیا، ان کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیا، اشارت کا حسن یہی ہوتا ہے۔'' ([1])

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اقبال کو کسی خاص ملک اور مذہب سے جوڑ کر دیکھنے کو اقبال کے ساتھ حق تلفی قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں اقبال کی اسلامیت وطن دوستی کی راہ میں حائل ہوئی اور نہ اس کے برعکس ان کی وطن دوستی اسلامیت کی راہ میں حائل ہوئی۔ اقبال مذہب کو ایک دریچہ مانتے تھے جس سے وہ پورے عالم کا مشاہدہ کرتے تھے۔ ان کا مخاطب پورا عالم تھا نہ کہ ایک خاص مذہب اور ملک کے لوگ۔

مجموعی طور پر ''اقبال ماورائے دیر وحرم'' اقبالیات کے سرمائے میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔

---

[1] اقبال ماورائے دیر وحرم سلیمان اطہر جاوید، ص76

اقبال اور تصوف کے بارے میں متضاد خیالات کا اظہار ناقدین کرتے رہے ہیں۔ ہر فریق اس بات پر زور دیتا ہے کہ اقبال اسی کی فکر رکھنے والے تھے۔ وہ اپنے مطلب کے اشعار بھی پیش کر دیتا ہے۔ اسی طرح کی ایک کتاب ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم[1] کی "مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال" (1992) ہے اس میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال نہ صرف یہ کہ وحدۃ الوجود کے قائل تھے بلکہ اس فکر داعی بھی تھے۔ اس کے لیے موصوف نے اقبال کے کلام ہی سے اقتباسات اور حوالے دیے ہیں۔

تصوف اسلامی ہے یا غیر اسلامی یہ بحث علماء کا کام ہے اس کا ادب سے کوئی رشتہ بھی نہیں۔ اس وجہ سے اس پر گفتگو بے کار ہے۔ البتہ یہ موضوع فکر اقبال کے ناحیہ سے اہم ہے کہ اقبال اس فکر کے قائل تھے یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ موصوف نے کلام اقبال کو ضرورت سے زیادہ توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال تصوف میں اعتدال کے قائل تھے۔ اس تصوف کے سخت مخالف تھے جو مسلمانوں سے اس کا حرکی پہلو سلب کرلے۔ اقبال پر جو بھی کام ہوئے ہیں ان میں سب سے زیادہ غیر معیاری کام وہ ہیں جن میں اقبال کی فکر کا مطالعہ مذہبی نقطہ نظر سے کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اس قسم کے ناقدین اپنے محدود زاویۂ نظر سے اقبال کی فکر کا مطالعہ کرتے ہیں اور یک طرفہ رائے دیتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اقبال کی فکر کا مطالعہ کرنے والوں میں معتدل اور معروضی مطالعہ کی کمی کی شکایت عام ہے۔ اس سمت میں ابھی بھی معیاری کام کرنے کی گنجائش باقی ہے۔

---

1 سمیرا جہانگیر, صابر لودھینے الف د نسیم کی ادبی خدمات پر ایک کتاب 'ڈاکٹر الف د نسیم کی ادبی خدمات' کے نام سے لکھی ہے جو ۱۹۹۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

# محمد صدیق قریشی

1993ء میں محمد صدیق قریشی کی کتاب 'اقبال ایک سیاست داں' شائع ہوئی۔ 'اقبال ایک سیاست داں' اقبال کی عقیدت میں ڈوب کر لکھی گئی ایک کتاب ہے۔ کتاب میں تین مضامین ہیں فلسفہ تعلیم، حریم وطن سے حریم بشریت تک اور کوچہ سیاست میں۔ اصل کتاب کوچہ سیاست میں ہے۔ مصنف نے پاکستان کی تشکیل میں اقبال کے کردار کو سراہتے ہوئے مسٹر جناح سے اقبال کے تعلقات کی سرگزشت بیان کی ہے۔ اقبال اور نظریہ پاکستان پر چونکہ لوگوں نے مختلف انداز سے گفتگو کی ہے۔ دونوں فریق اپنے اپنے دلائل دیتے ہیں۔ اس کتاب میں اقبال کو پاکستان کے قیام اور اس کے لیے جدوجہد کرنے والے ایک سپاہی کے طور پر دکھایا گیا ہے۔

# منظر اعجاز

اقبال اور قومی یکجہتی (1996 )ڈاکٹر منظر اعجاز کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اس کتاب میں اقبال کی قومی یکجہتی کو موضوع بنایا گیا ہے 1990 کے بعد شائع ہونے والی کتابوں کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں اقبال کی وطن دوستی، قومی یکجہتی اور سیاسی زندگی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

قومی یکجہتی کی جب ہم بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ قوم سے ہماری مراد کیا ہے۔ اس لیے کہ قومیت یا قوم کا تصور زمین و زمان کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ کبھی پیشے اور برادری کے اعتبار سے لفظ قوم کا استعمال ہوا اور کبھی نسل اور خاندان کے اعتبار سے۔ وطن سے محبت، اپنی قوم سے محبت ایک جبلی تقاضا ہے۔

قومیت کا مغربی تصور جارحانہ ہے۔ کمزوروں کو وطن کی خاطر یا وطن کے نام پر ستانا یا زیر کرنا اقبال اس قسم کی وطنیت کے سخت مخالف تھے۔ دراصل اقبال ایک بڑے شاعر تھے اور بڑا شاعر وطن اور قوم کی محدود سرحدوں سے ماوراء ہو جاتا ہے لہٰذا اقبال کو ان تنگ سرحدوں میں قید نہیں کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر منظر اعجاز لکھتے ہیں:

> 'اقبال کا قومیت کا تصور محدود قومیت کے تصور سے مختلف ہے۔ گوشت پوست کا زندہ انسان زمین کے جس خطے پر ہو، کسی مذہب میں ہو کسی سیاسی اقتصادی نظام میں ہو گوشت پوست کا زندہ انسان ہے، اس کی محبت، اس کی نفرت ،اس کی تمنا، اس کے ذہنی جسمانی تقاضے، اس کے فکری نظری میلانات، اس کے جبلی عملی محرکات یکسانیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ بنیادی وحدت ہے جس کو پالینا ہی انسان کی گمشدہ جنت کی بازیافت کی ضمانت ہے۔'' ([1])

---

1

وہ ایک جگہ اقبال کے وطن کے تصور پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وطن کا مادی تصور جغرافیائی حدود سے وابستہ ہے جس پر اقبال نے اعتراض کیا ہے وطن کے اس مادی تصور نے خلق اللہ کو نہ صرف یہ کہ تقسیم کر دیا بلکہ ایک دوسرے سے لڑا دیا ہے۔ وطن کے تصور کو اگر مادی حدود سے پار کر لیا جائے تو خودی کی جارحانہ تحریکات کا بدرقہ (کذا) ہو جائے گا اور وطن کا تصور تعمیری، تخلیقی اور ارتقائی تحریکات کا سرچشمہ بن جائے گا۔'' (منظر اعجاز ص106)

اپنے مضمون 'مولانا روم' میں منظر اعجاز اقبال پر رومی کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اقبال نے مولانا روم کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کر لیا۔ مولانا روم زاویۂ وجدان کے رہبر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اور اقبال بھی چونکہ وجدانی اہمیت کے قائل ہیں اس لیے مولانا روم کو وہ وجدانی تصور کے تحت اپنا مرشد تسلیم کرتے ہیں۔ غزالی اور مولانا روم کے عہد کے جس تناؤ نے المنقذ اور مثنوی کی تحریک کی تھی اقبال کا عہد بھی اسی تناؤ سے دوچار تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مولانا روم حلقۂ تصوف میں وحدت الوجود کے قائل ہیں اور حافظ بھی۔ لیکن اقبال کا خیال جداگانہ تھا۔''[1]

منظر اعجاز نے اقبال اور مولانا کی جمہوریت کے خلاف اقبال کے نظریہ کو منظر اعجاز پنجاب قانون ساز اسمبلی میں ہوئے تلخ تجربات کا ردعمل قرار دیتے ہیں۔

الغرض اقبال کے سیاسی نظریات کو سمجھنے کے لیے ایک جامع کتاب ہے۔

---

1 سہ ماہی اقبال ریویو، حیدر آباد، رومی نمبر

# شبنم منیر

علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بہت لکھا گیا۔ بعد کے ادوار میں ایک رجحان یہ پیدا ہوا کہ اقبال کے فکر و فلسفہ کے کسی ایک جزء کو سامنے رکھتے ہوئے اقبالیاتی ادب میں تحقیق کی جائے۔ یونی ورسٹیوں میں تحقیقی کام زیادہ تر اسی نوعیت کے ہوئے۔ شبنم منیر فاطمہ بھی انہیں ناقدین میں سے ہیں جنھوں نے اقبال کے فلسفہ کے ایک جزء عشق رسول پر لکھا ہے۔ ان کی کتاب 'اقبال کا تصور عشق' 2008 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شبنم منیر نے منتخب نظموں کی روشنی میں اقبال کے تصور عشق کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ شبنم منیر کی یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔(۱) اردو شاعری میں تصور عشق (۲) اقبال کے تصور عشق کا تدریجی ارتقا(۳) اقبال کا تصور عشق اور عشق رسول۔ ہر باب کے تحت کچھ ذیلی عنوان کے ذریعہ محترمہ نے موضوع کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جس میں شبنم منیر صاحبہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ پہلے باب میں اقبال سے پہلے کے شعراء کا جائزہ لیا ہے اور ولی سے لے کر مومن اور اس کے بعد کے شعراء کی شاعری میں عشقیہ عناصر کو عشق مجازی قرار دیا ہے۔ محترمہ کہتی ہیں:

> ''ان کی (ولیؔ) کی شاعری میں اور اس عہد کے تمام شعراء کے یہاں عشق مجازی و مادی کا ہی رنگ چھایا ہوا ہے اس میں داخلیت کم خارجیت زیادہ ہے'' [1]

> ''خاص کر لکھنوی شعراء (کچھ کو چھوڑ کر) نے ہوس و سطحی باتوں کو عشق کا لبادہ پہنا کر اس فن لطیف کو فن کثیف بنا دیا۔ چونکہ ان کے اعصاب پر عورت ہی عورت سوار تھی اور ان کی شاعری اسی کی شرح و بسط، اس کا بیان ہے۔ یہ شاعر زلف و رخسار کے بھنور ہی میں ڈوبے نظر آتے ہیں لیکن لکھنؤ سے الگ دہلی میں کم سے کم تصور عشق ہوس نہیں، عیش و طرب نہیں بلکہ حرمان ہے، غم و اندوہ ہے، عشق مجازی اور حقیقی دونوں رنگ نظر آتے ہیں'' [2]

---

1 اقبال کا تصور عشق ، شبنم منیر، ص35

2 اقبال کا تصور عشق ص 35

محترمہ کی نظر میں اقبال اور دوسرے شعراء کے تصور عشق میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اقبال کا عشق جلاتا ہے باقی کا تصور عشق جلاتا ہے۔ محترمہ شبنم منیر کی نظر میں اقبال کی شاعری کا محور پیغام عمل، خودی کا پیغام اور عشق کا پیغام ہے۔ اقبال کا تصور عشق ان کو ورثہ میں ملا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''ان کا تصور عشق آغاز سے ہی معیاری اور بلند رہا کیونکہ اقبال کو بچپن کے دنوں سے اپنے گھریلو ماحول اپنے والد کی نصیحت سے ہی درس قرآن اور عشق رسول کا جذبہ ملا''۔[1]

کتاب میں چند چیزیں قابل ملاحظہ ہیں۔ پہلے باب میں محترمہ نے ''عشق کیا؟'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

''رب کے دل میں جب عشق پیدا ہوا، یہ خیال پیدا ہوا کہ دوسرے بھی اسے جانیں پہچانیں تو اس نے اسم محمد پیدا کیا، انہیں اپنا محبوب و عاشق بنایا یعنی: اللہ کا عشق بھی محمدؐ، عاشق بھی محمدؐ اور معشوق بھی محمدؐ۔''[2]

یہ کتاب کوئی دینی کتاب نہیں ہے کہ دینی نقطۂ نظر سے اس پر گفتگو کی جائے مگر ایک محقق کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ کوئی بات لکھنے سے پہلے اس کی تحقیق کر لے کہ کس بنیاد پر یہ بات کہی جا رہی ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ یا کم از کم ان کتابوں کا حوالہ دے دے جہاں سے معلومات اخذ کی ہیں۔

افسوس کہ محترمہ نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ حدیثوں کے نام پر چند ایسی حدیثیں لکھی ہیں جو حدیث کی کسی بھی مستند کتاب میں نہیں۔ اور حوالہ میں صرف 'حدیث قدسی' لکھا ہے۔ جو کہ اصول تحقیق کے اعتبار سے غلط ہے۔

اس کے بعد محترمہ نے قرآن و حدیث کی روشنی میں محبت اور عشق کی تعریف کی ہے۔ یہاں بھی محترمہ نے قرآن و حدیث کی من مانی تاویل کی ہے۔

'الا بذکر اللہ ب القلوب'

---

1 اقبال کا تصور عشق ص 67

2 اقبال کا تصور عشق ص 15

(خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے)۔

اس آیت کے ترجمہ کے بعد موصوف نے لکھا ہے:

'یہاں ذکر کا مطلب غالباً محبت ہی ہے، کیونکہ ذکر بھی تو عشق کی ہی ایک شکل ہے'[1]

یہ قرآن کی من مانی تاویل ہے۔ ذکر اردو کا نہیں بلکہ عربی کا ہے اور دونوں میں فرق ہے۔ اور 'غالباً' کے لفظ سے شبنم منیر کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ یہ تحقیق کی زبان نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے احتراز ہی کرنا بہتر ہے۔

ان خامیوں کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب سے اقبالیات کی تفہیم میں کسی اضافہ کی امید کرنا مناسب نہیں ہے۔

## بدر الدین بٹ

اقبالیات پر جہاں اقبال کے فکر و فن اور سوانح پر کتابیں لکھی گئیں وہیں پر کچھ ناقدین نے اقبال پر تحقیقی کتابیں بھی لکھیں۔ ان میں سے بعض نے اقبالیاتی ادب کے جائزہ کی بھی کوشش کی۔ پاکستان میں رفیع الدین ہاشمی نے اس حوالے سے کافی کام کیا ہے۔ ان کی کتاب 'اقبالیاتی جائزے' ایک کارآمد کتاب ہے۔ رفیع الدین ہاشمی کے علاوہ دوسرے ناقدین نے بھی اس جانب توجہ دی ہے۔ ڈاکٹر بدرالدین بٹ بھی انہیں میں سے ہیں۔ انہوں نے اقبال اور عالم عربی کے تعلقات کے حوالے سے گراں قدر کام کیا ہے۔ ان کی کتاب 'اقبال اور عالم عربی و دیگر مقالات' (2007) اگرچہ عالم عرب میں اقبال کو متعارف کرانے والے اقبال شناسوں کی خدمات کو متعارف کراتی ہے مگر ان میں کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جو اقبالیات سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً سیرت نبوی اور مستشرقین کے اعتراضات، سرور عالم اور عالمی امن، حضرت شاہ ہمدان

1 اقبال کا تصور عشق ص 17

اور کشمیر، حضرت شاہ ہمدان کے سیاسی افکار اور ابتدائی عرب تاریخ نگاری کا ایک مختصر جائزہ۔ مذکورہ مضامین اگرچہ وقیع ہیں اور معلوماتی ہونے کی وجہ سے اہم بھی ہیں مگر اس کتاب میں ان کی شمولیت کسی بھی طرح صحیح نہیں کہا جاسکتا ہے۔

علامہ اقبال کو عالم عربی سے متعارف کرانے کی سب سے پہلی کوشش مرکزی بزم اقبال حیدرآباد دکن کی طرف سے ہوئی 1946 میں یہاں سے الحیاۃ والموت فی فلسفہ اقبال' شائع ہوئی، اس کے بعد عالم عربی میں خود عربوں میں سے چند جیالوں نے اور برصغیر ہندوپاک عربی زبان وادب میں مہارت رکھنے والوں نے اقبال کے فکر وفن سے عالم عرب کو متعارف کرانے کا کام کیا۔

اقبال عربی زبان وادب سے واقف تھے، عربی زبان سے واقفیت کے باوجود اقبال دلی خواہش کے باوجود عربی زبان میں اشعار نہیں کہہ سکے۔ اقبال عربی زبان سے اس وجہ سے محبت کرتے تھے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے اسی میں قرآن نازل ہوا اور پیارے صحابہ اسی میں گفتگو کرتے تھے۔

اقبال کی شاعری میں عرب، ریگستان صحرا اور عرب بہادروں کا ذکر کثرت سے ہے اس وجہ سے عربوں کے اندر ان کے کلام میں کشش کا مادہ ہے، انہیں اقبال کی آواز اپنی آواز معلوم ہوتی ہے۔

عالم عربی میں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے سب سے پہلے اقبال کو متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ مگر بقول علی میاں ندوی انہوں نے اپنے اوپر منظوم ترجمہ کرکے ظلم کیا۔ اس سے مفہوم کی ترسیل وترجمانی صحیح انداز میں نہ ہوسکی۔

ڈاکٹر بدرالدین بٹ نے اقبال اور عالم عرب سے متعلق مقالات کا خوب صورت مجموعہ اس کتاب میں جمع کیا ہے۔ فکر اقبال میں قرآن کا مقام، اقبال اور عالم عربی، مصر میں اقبالیات، ڈاکٹر احمد امین کے افکار پر اقبال کا اثر، کلام اقبال کے عربی تراجم وشروح، اقبال پر عربی تصانیف کا ایک تعارف ابوعلی مسکویہ۔ اقبال کی نظر میں، اور اقبال اساطین علم وادب اور زعماء دعوت وفکر کی نگاہ میں، جیسے وقیع اور فکر انگیز مقالہ اس کتاب کی زینت ہیں۔ جو ہمیں بتاتے ہیں کہ اقبال ملکوں اور زبا ں کی سرحدوں کو عبور کرکے کس طرح دنیا میں اپنی فکر اور فن کی وجہ سے مقبولیت کی چوٹی پر پہنچ رہے ہیں۔

ڈاکٹر بدرالدین بٹ کے مطابق اقبال پر سب سے زیادہ کام مصر میں ہوا ایسا کیوں نہ ہو اقبال کے سارے عالم اسلام کو ایک لڑی میں پرونے کا جو خواب دیکھا تھا اس کی ابتدا وہ مصر سے ہی کرنا چاہتے تھے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

ڈاکٹر بدر الدین بٹ لکھتے ہیں:

''اقبال کو عرب دنیا میں مقبول و متعارف کرنے والی دو اہم شخصیات شیخ صاوي سعلان اور ستارۂ مشرق ام کلثوم ہیں۔ کلام اقبال کا عربی اشعار میں بہترین بلکہ بے مثال ترجمہ صاوي سعلان ہی نے کیا ہے۔ وہ ایک فصیح و بلیغ پختہ شاعر ہیں اور کلام اقبال کو اس نے بڑی خوبصورتی اور بے ساختگی کے ساتھ عربی میں منتقل کیا ہے۔ اس نے ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کا ترجمہ ''حديث الروح'' کے عنوان سے کیا ہے اور کمال کر دکھایا ہے اس میں اصالب کے ساتھ لفظ و معنی کا اتنا خوبصورت انداز اختیار کیا گیا ہے کہ ترجمہ کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ پھر جب اس ''حديث الروح'' کو ام کلثوم کی ساحرانہ آواز عطا ہوئی تو عرب دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اقبال کو بچہ بچہ جان گیا۔ 'حديث الروح' کا مصنف اقبال آج عرب دنیا کا شاعر متصور ہوتا ہے اور عوام وخواص کی زبان پر اس کے اشعار ہر طرف سنائی دیتے ہیں''۔[1]

عالم عرب کے بے مثل ادیب اور مفکر احمد امین کے افکار پر اقبال کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کے افکار سے اگرچہ احمد امین نے استفادہ کیا ہے مگر مصریوں کے مزاج کی وجہ سے ان کا حوالہ نہیں دیا۔

علامہ اقبال کی خدمات کا عرب کے مشہور معروف تقریباً ادیبوں نے کیا ہے۔ بدر الدین بٹ نے ایک مقالہ میں ان میں سے اکثر کا قول نقل کیا ہے۔ڈاکٹر طہٰ حسین کا یہ قول قابل توجہ ہے:

''اہل اسلام میں دو شاعر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اسلامی ادب کا پایہ آسمان تک پہنچا دیا۔ اور اس کی عظمت کا نقش جبین وقت پر ثبت کر دیا۔ ایک ہندو پاک کا شاعر اقبال دوسرے عرب کا شاعر ابو العلا' ([2])

---

1 اقبال اور عالم عربی ودیگر مقالات از ڈاکٹر بدر الدین بٹ ص 49-50

2 اقبال اور عالم عربی ودیگر مقالات ص 118

پروفیسر عبدالوہاب عزام نے اپنی پوری زندگی اقبال کو دنیائے عرب میں متعارف کرانے میں وقف کر دی ہے ان کا کہنا ہے:

'اگر جلال الدین رومی اس زمانہ میں جی اٹھیں تو وہ محمد اقبال ہی ہوں گے' ([1])

احمد حسن زیات کے بقول 'حسان اگر شاعر رسول ہیں تو اقبال بے شک شاعر رسالت ہیں' ([2])

علامہ محمود محمد شاکر کہتے ہیں:

'سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے ورطہ حیرت میں ڈالدیا وہ پیرس کی مسجد میں داخل ہونے سے اقبال کا انکار ہے ان کا یہ کہنا کہ یہ مسجد دمشق کی بربادی کی بہت ہی کم قیمت ہے۔ ان کے ذکر دائم میں ہونے کا ثبوت ہے۔ ہم میں سے کتنے ہوں گے جن کے اذہان میں اپنے دین اور اپنی ثقافت کی تاریخ اس طرح مستحضر ہو گی'۔[3]

ڈاکٹر بدر الدین بٹ کی یہ کوشش اگرچہ اس موضوع پر پہلی کوشش نہیں ہے اس سے پہلے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں اس موضوع پر ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جاچکا ہے۔ مگر اردو زبان میں بہر حال میرے محدود علم کے مطابق پہلی کامیاب کوشش ہے۔ ڈاکٹر بدر الدین بٹ کی یہ کوشش اس لحاظ سے اہم ہے کہ ہمیں اقبال کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کے علاوہ عربی تک محیط ہے۔ عربی ادب کی عظیم شخصیات نے اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

---

1 اقبال اور عالم عربی ودیگر مقالات ص119

2 اقبال اور عالم عربی ودیگر مقالات ص121

3 اقبال اور عالم عربی ودیگر مقالات ص123

# منظر حسین

ڈاکٹر منظر حسین کی کتاب ''اقبال اور دانتے'' (1998) تقابلی مطالعہ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اقبال اور دانتے دونوں عظیم شاعر ہیں ایک کا تعلق مشرق سے ہے دوسرے کا مغرب سے ہے، ضروری سی بات ہے دونوں کی شاعری کے مزاج میں مشرقیت اور مغربیت کا فرق تو ہو گا ہی۔ جن لوگوں نے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا انہوں نے تعیین قدر کرتے وقت سخت دھوکا کھایا ہے۔

منظر حسین کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اقبال کو ان کی مشرقیت سے الگ کر کے اور دانتے کو ان کی مغربیت سے الگ کر کے نہیں دیکھا۔ منظر حسین نے دونوں کے درمیان چند ایسی مناسبتوں کی تلاش کی ہے جن پر اب تک توجہ نہیں دی گئی۔

منظر حسین کی نظر میں دونوں شاعروں کے یہاں احترام انسانیت حب الوطنی اور انسانی دوستی جیسے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اقبال کے یہاں اسلامی تعلیمات کی روح میں شرابور ہونے کی وجہ سے جو رواداری اور وسعت قلبی ہے وہ دانتے کے یہاں نہیں ہے۔

چونکہ اقبال پر کلیم الدین احمد نے جو حملہ کیا تھا اس میں دانتے اور اقبال کا موازنہ بھی شامل تھا۔ اقبال اور دانتے کے بارے میں نامکمل واقفیت کی وجہ سے اقبال کا مرتبہ کلیم الدین احمد نے گھٹا کر پیش کیا تھا۔ یہ کتاب اس کا مثبت جواب ہے اور ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی جو ''اقبال - ایک مطالعہ'' کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں۔

دانتے اور اقبال کے تفصیلی مطالعہ کے بعد منظر حسین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

'ڈیوائن کامیڈی' اور ''جاوید نامہ'' کے تقابلی مطالعہ اور فنی تجزیہ کے بعد جو نقش ابھرتا ہے اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ دانتے کے یہاں فنی لوازم اور شاعرانہ محاسن کی کمی نہیں لیکن فکری و موضوعاتی اعتبار سے اس کی تصنیف میں تاریک

گہرائیاں لپکے ہوئے شعلے جھلستی ہوئی روحیں، چیختے ہوئے قلوب کے علاوہ خود مصنف کی ذہنی خباثت مذہبی ناروا داری اسلام مخالف ذہنیت جیسے قبیح اور مکروہ محرکات اس کی شاعرانہ فطانت کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں؟اس کے بر عکس شاعر مشرق کی شاہکار تصنیف ''جاوید نامہ'' فکر اور فن دونوں اعتبار سے بلند اور رجائیت کی روح سے معمور ہے۔"[1]

---

1 اقبال اور دانتے، منظر حسین، ص 124

# بشیر احمد نحوی

عصر حاضر کے اقبال ناقدین میں ایک نام بشیر احمد نحوی کا بھی ہے۔ وہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر سابقہ ڈائرکٹر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے دور صدارت میں اقبال پر کئی اہم سمینار منعقد کرائے ہیں اور ان سمینار کے مقالوں کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ ان کتابوں میں 'وہ دانائے سبل ختم الرسل'(۲۰۰۰)،'ذحاتِ اقبال'،(۲۰۰۱)، 'اقبال ایک تجزیہ'(۲۰۰۰)،'اقبال کی تجلیات'(۲۰۰۲)،اقبال گزشتہ دس سال (۲۰۰۴)، 'اقبال بحر خیال' (۲۰۰۷)،'جامعہ کشمیر اور اقبالیات'(۲۰۰۹) کافی اہم ہیں۔ بشیر احمد نحوی اقبال کے مداحوں میں ہیں۔ انہوں نے اقبالیات پر جو بھی لکھا وہ اقبال کے دفاع اور ان کے کلام کی تعبیر و تفسیر کے سلسلے میں اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی کا مضمون ''اقبال دشمنی یا دریدہ دہنی ایک تجزیہ'' ایک لائق قدر مقالہ ہے اس میں انہوں نے علاوہ اقبال پر قدیم و جدید ناقدین اقبال کا جنہوں نے اقبال پر بے جا تنقید کی ہے، کا جائزہ لیا ہے اور ان کو مثبت جواب دیا ہے۔ بشیر احمد نحوی کی خاص بات یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر لکھیں زبان و بیان کی درستگی پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ وہ کسی کے رد میں بھی اگر کچھ لکھتے ہیں تو شائستگی کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔

# وحید عشرت

ڈاکٹر وحید عشرت کا میدان اگرچہ فلسفہ کا تھا لیکن اقبالیات سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ ان کی اسی دلچسپی نے انہیں ماہرِ اقبالیات کے مقام پر فائز کر دیا۔ انہوں نے عمومی طور پر اقبال کے فکر کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کی کتاب 'اقبال فلسفیانہ تناظر میں' ان کے اقبالیاتی مضامین کا مجموعہ ہے اس کتاب کے علاوہ انہوں نے علامہ اقبال کے خطبات کا اردو ترجمہ 'تجدید فکریات اسلام' کے نام سے بھی کیا ہے۔

ان کی کتاب 'اقبال فلسفیانہ تناظر' چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''سوانح کا تناظر'' ہے۔ اس میں ''اقبال... آئینہ ماہ و سال'' میں حیاتِ اقبال مختصراً پیش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں جو مقالات درج ہیں وہ ''اقبال...

فلسفیانہ تناظر میں'' کے عنوان کے تحت ہیں۔ اس میں 12 مقالات ہیں: 'فلسفہ اقبال کے مآخذ و مصادر'، 'اقبال کا فلسفیانہ نظام'، 'تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کا منہاج'، 'اقبال کا فلسفہ ارتقائی'، 'علامہ اقبال اور اسلام میں اصولِ حرکت'، 'مسلم نظریہ علم'، 'اقبال کا فلسفہ انقلاب'، 'ارسطو پر اقبال کی تنقید'، 'اقبال اور مسئلہ بروزیت'، 'اقبال کا عمرانی فلسفہ'، 'اقبال اور تصورِ جنت و دوزخ' اور 'اقبال اور اشتراکیت'۔ تیسرے باب کا عنوان 'اقبال، فلسفہ سیاست کے تناظر میں' ہے اس میں شامل مضامین ہیں: 'اقبال اور جمہوریت'، 'اقبال اور جمہوری خلافت کا تصور' اور 'منتخب پارلیمنٹ اور اجتہاد'۔ چوتھے باب کا عنوان ''اقبال تنقید کے تناظر میں'' ہے۔ اس میں جو مقالات شامل ہیں وہ درج ذیل ہیں: 'شاعرِ طوس اور شاعرِ لاہور'، 'فکری موازنہ، ملآئیت اقبال اور حکیم (خلیفہ عبدالحکیم) کی نظر میں' اور 'فلسفہ طراز کی خطرناک جہتیں اور اقبال'۔ یہاں پر 'اقبال فلسفیانہ تناظر میں' کے مضامین کی فہرست پیش کرنے کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ وحید عشرت نے اگرچہ اقبالیات پر صرف یہی ایک کتاب لکھی ہے لیکن انہوں نے جن مضامین پر قلم اٹھایا ہے وہ کافی فکر انگیز ہیں۔ خاص طور پر اقبال کے فلسفہ سیاست میں پیش کردہ مضامین اپنی نوعیت میں اچھوتے ہیں۔

کتاب کے مقدمہ میں جاوید اقبال لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر وحید عشرت علامہ اقبال سے گہری عقیدت رکھنے کے باوجود اُن کے اندھے مقلد نہیں، جیسا کہ آپ خود محسوس کریں گے ان کے نزدیک اقبالیات میں تخلیقی فکر کی نمو کے لیے از بس ضروری ہے کہ ہم اپنے گردوپیش کے حالات اور مسائل پر کھلی آنکھیں رکھتے ہوئے جہاں ناگزیر ہو وہاں اقبال سے اختلاف بھی کریں اور فکرِ اقبال کے وہ گوشے جو تشنہ یا مبہم رہ گئے ہیں ان کے بارے میں اپنی رائے کا برملا اظہار کریں، اور فکرِ اقبال میں جو چیزیں آنے والے وقت نے مسترد کر دی ہیں ان کو بھی اجاگر کریں اور جن چیزوں کو ہم صدقِ دل سے غلط سمجھیں ان کو بھی عیاں کریں۔ فکرِ اقبال کو بند آنکھوں سے دیکھنا اور اپنانا، انہیں بت یا پیر بنا کر پوجنا خود اقبال کے نزدیک غیر صحت مند رویہ ہے اور اس سے اقبال کی فکر کی کوئی خدمت نہیں ہو گی۔ اقبال کی فکر کو تخلیقی رویّے سے دیکھنا ہی اقبالیات میں تخلیق کاری کرنا اور فکرِ اقبال کی مشعل کو آگے بڑھانا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر وحید عشرت کا اقبالیات کے حوالے سے رویہ تخلیقی ہے اور وہ اقبال کی محبت میں وہ غلو نہیں کرتے۔''[1]

---

1 اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے، ممتاز حسین، بحوالہ اقبال معاصرین کی نظر میں، وقار عظیم، ص ۲۴، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۲ء

وحید عشرت کی یہ کتاب موضوع اور مواد کے لحاظ سے اقبال کی فکر کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو گی۔

## محمد نفیس حسن

فکر اقبال کے مشرقی مصادر (2000) در اصل ڈاکٹر محمد نفیس حسن کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس پر انہیں دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ اس مقالہ کی خاص بات یہ رہی کہ اس کے ممتحن مشہور عالم دین اور ''نقوش اقبال'' کی وجہ سے بطور ماہر اقبالیات شہرت پانے والے سید ابوالحسن علی میاں ندوی تھے۔

مصنف نے اس کتاب میں اپنی تلاش و جستجو فکر اقبال کے مشرقی مصادر تک ہی محدود رکھا۔ ان مصادر کو بھی عربی، ایرانی اور ہندوستانی میں تقسیم کر کے ہر ایک پر سیر حاصل بحث کی۔ مصنف کو اس بات کا اعتراف ہے کہ اقبال کا بنیادی مآخذ قرآن اور حدیث رسول ہے، اسی سے اقبال اپنے فکر کی غذا لیتے تھے۔

خاص بات یہ ہے کہ موصوف نے ہر ایک باب کے شروع میں اس علاقہ کی تہذیب اور وہاں کے رجحان سے بھی قاری کو متعارف کرایا ہے جس سے اقبال کے کلام میں اس کی معنویت سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کے بعض اشعار ایسے ہیں جن میں اقبال نے قرآنی آیات کو بعینہ استعمال کر دیا ہے اور بہت سارے اشعار ایسے ہیں جن میں صرف مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ محمد نفیس صاحب نے ان اشعار کو ڈھونڈ کر اس کی وضاحت کی ہے۔

ایک بات ضرور کھٹکتی ہے وہ یہ کہ مصادر سے مصنف نے کیا مراد لیا ہے۔ کلام اقبال میں ان کا تذکرہ یا اقبال پر ان کے اثرات یا اقبال نے جہاں سے مواد اخذ کیا وہ؟

مصنف بعض جگہوں پر محض تذکرہ کو بھی مصدر میں شمار کرتے ہیں یہ بات عقل سے بعید ہے۔

# باب سوم

# اقبال کی شاعری کے نقاد

# سر عبدالقادر

سر عبدالقادر اقبال کے اولین اقبال شناس ہیں۔ اردو میں ان کی شہرت رسالہ 'مخزن' کی وجہ سے ہوئی۔ یہ اردو کا معتبر جریدہ تھا جس میں اردو کے نامور ادیبوں اور شاعروں کے مضامین اور کلام شائع ہوتے تھے۔ علامہ اقبال کو ادبی دنیا سے متعارف کرانے کا کام حقیقی معنوں میں رسالہ 'مخزن' نے کیا ہے۔ان کی مستقل تصانیف دو ہیں، 'اردو ادبیات کا دبستان جدید'، اور 'مقام خلافت'۔[1]

اب تک کی دستیاب دستاویز کے مطابق اقبال پر سب سے پہلا مضمون سر عبدالقادر کا ہی ہے جو خدنگ نظر (مئی ر ۱۹۰۲ء) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد بھی انہوں نے اقبال پر مضامین لکھے ہیں مگر ان کا خدنگ نظر میں شائع شدہ اولین مضمون جو 'اقبال جادو گر ہندی نژاد' میں شامل ہے اور بانگ درا کا دیباچہ کافی مشہور ہے۔ سر عبدالقادر اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔ اس وجہ سے اقبال کے حالات زندگی کے بارے میں ان کی واقفیت دوسروں کی بہ نسبت زیادہ تھی۔ لیکن سر عبدالقادر کے زمانے تک اقبال کے کلام کا زیادہ تر حصہ سامنے نہیں آیا تھا اس وجہ انہوں نے اقبال پر جو کچھ لکھا ہے وہ نوجوان اقبال یا مسٹر اقبال ایم اے پر لکھا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اقبال کی شاعری کی جن خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اقبال کی شاعری میں آخر تک موجود تھیں۔ اس طرح سر عبدالقادر کا مضمون اقبالیات میں خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

1 بیسوی صدی کے اردو مصنفین، سیدہ خاتون،ج ۱، ص ۲۹۲۔۲۹۳، ط: خود مصنف، ۲۰۰۴

'اصل اندازہ تو کسی کے کلام کا اس کے بعد کی نسلیں لگاتی ہیں اور اس لیے اس کے معاصرین کے لیے موقع صحیح اندازے کا نہیں ہو سکتا۔ مگر اتنا کہنے میں ہمیں تامل نہیں کہ جو کچھ اقبال نے اب تک لکھا ہے وہ اس اعتبار سے کہ ایک نوجوان انگریزی خواں کا کلام ہے جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علوم انگریزی کی تحصیل میں صرف کیا ہے اور جسے اہل زبان ہونے کا دعویٰ نہیں، نہایت بے بہا ہے اور اس حصہ ملک کے لیے جسے اب وہ اپنا وطن کہتا ہے مایہ فخر وناز ہے'[1]

سر عبد القادر کی زیادہ تر گفتگو اقبال کی سوانح کے بارے میں ہے۔ اور سوانح میں بھی وہ سر سری طور پر گزر جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے اقبال کو متعارف کرا رہے ہوں جو اقبال کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ سر عبد القادر کا یہ مضمون جس وقت سامنے آیا اس وقت تک اقبال اگرچہ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کی وجہ سے کافی مشہور ہو چکے تھے لیکن لاہور سے باہر ادبی دنیا میں وہ غیر متعارف تھے۔ مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر عبد القادر کو اقبال کی صلاحیتوں کا اعتراف تو تھا مگر اس کا ادراک نہیں۔ انہوں نے اقبال کی شاعری کی تعریف مشروط طور پر کی۔ بلاشبہہ اس وقت تک یعنی مئی ۱۹۰۲ء تک اقبال کی شاعری کا ایک بڑا حصہ سامنے آ چکا تھا۔ اقبال کی ابتدائی شاعری کے نمونے جو حب الوطنی پر مشتمل ہیں فن شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ سر عبد القادر کے معاملے میں یہ بات ثابت آتی ہے کہ وہ اقبال تنقید پر لکھتے ہوئے احتیاط سے کام لے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں اب تک کسی نے گفتگو نہیں کی تھی۔ اس وجہ سے سر عبد القادر کا قلم پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہے۔ اس احتیاط کے باوجود سر عبد القادر لکھتے ہیں:

'' اقبال کا کلام ابھی کمیت میں اکثر مشہور شعرا کے برابر نہیں پہنچا۔ مگر کیفیت میں انداز خاص رکھتا ہے۔ اول تو بھرتی کے اشعار اس کے کلام میں کم پائے جائیں گے۔ بقول داغؔ ع 'اس کے ہر شعر میں ترکیب نئی بات نئی،' نظر آتی ہے۔ غزل کے اکثر اشعار واقفیت کا رنگ لیے ہوتے ہیں اور تصنع ان میں بہت کم نظر آتا ہے۔ مگر طبیعت اپنے جوہر اصلی مسلسل نظموں میں دکھاتی ہے۔''[2]

---

1 خدنگِ نظر مئی ۱۹۰۲ء، بہ حوالہ: اقبال، جادو گرِ ہندی نژاد از عتیق صدیقی، علی گڑھ ، اگست ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۷، ۱۴۴

2 خدنگِ نظر مئی ۱۹۰۲ء، بہ حوالہ: اقبال، جادو گرِ ہندی نژاد از عتیق صدیقی، علی گڑھ ، اگست ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۷، ۱۴۴

سر عبد القادر کی تنقید میں نئی بات کی تلاش اس وجہ سے بیجا ہے کہ ان کی ہر بات نئی ہے۔ کیوں کہ وہ اقبال تنقید کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ انہوں نے اقبال کے کلام میں جن خوبیوں کی نشاندہی کی ہے وہ ہے ترکیب کی جدت، ندرت خیال، فلسفیانہ افکار و خیالات وغیرہ۔ انہوں نے اقبال کے کلام پر مشکل پسندی کی بات بھی کہی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اقبال کے بعض معترضین نے ان پر اعتراض کیا تھا جس سے دلبر داشتہ ہو کر اقبال نے شاعری ترک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ :

''کئی سخن فہم حضرات نے اس مشکل پسندی پر اعتراض کیا ہے۔ اور ایک حد تک یہ اعتراض بجا بھی تھا مگر اس کا اثر اقبال کی طبیعت پر ابتدا میں اچھا نہیں پڑا۔ بجائے اس کی اصلاح کی فکر کے اس کا قصد ہوا کہ شعر گوئی ترک کر دے۔ چنانچہ ایک دو بے تکلف دوستوں کے روبرو اس خیال کا اظہار بھی کر دیا۔ مگر انھوں نے سمجھایا کہ اگر کہیں ایک شعر اایسا نکلتا ہے جس پر کوئی درست اعتراض وارد ہو سکے تو دس ایسے ، کلہ یے ہیں جن کی خوبی کو سب مانتے ہیں اور ترک شعر گوئی ملک کی شاعری کو نقصان رساں ہو گا اور اسی زمانے میں دور دور سے دادیں آنے لگیں۔ مجملہ دیگر اصحاب کے مولیٰنا شبلی نعمانی جیسے نکتہ رس مشہور عالم نے بدین الفاظ داد دی کہ ''جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ آپ کو ڈھونڈھیں گے''۔ ان باتوں نے اقبال کی ہمت پھر بندھا دی۔ اعتراض کا ایک حصہ جو اختیاری تھا رفع ہو جاتا ہے۔ اور اب پہلے سے زیادہ ایسے اشعار اقبال کے قلم سے ، کلہ یے ہیں جو زور کے ساتھ سادگی اور سلاست کی خوبیوں سے بھی آراستہ ہوتے ہیں۔ مگر اعتراض کا ایک حصہ غیر اختیاری تھا اور وہ رفع نہیں ہوا اور نہیں ہو سکتا۔''

جہاں تک اقبال کی مشکل پسندی کی بات ہے تو اقبال کی ابتدائی نظمیں سادہ اور عام فہم ہوا کرتی تھیں۔ اس پر مشکل پسندی کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک اقبال کی شاعری میں فلسفیانہ افکار کی کار فرمائی کی وجہ سے مشکل پسندی کا سوال ہے جس کے بارے میں سر عبد القادر نے لکھا ہے کہ 'یہ غیر اختیاری تھا رفع نہیں ہوا' یہ ان کی شاعری کا خاصہ تھا۔

سر عبد القادر نے بعد میں بانگ درا پر جو مقدمہ لکھا اس میں بھی انہی باتوں کی تکرار ہے۔ لیکن اس کے اندر کچھ پختگی پائی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ ان کے سامنے اقبال کا پورا ایک مجموعۂ کلام تھا۔ انہیں اقبال پر لکھتے ہوئے کسی جواز کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بانگ درا کے دیباچہ کی ابتداء انہوں نے ان جملوں سے کی ہے:

''کسے خبر تھی غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہو گا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادب اردو کے فروغ کا باعث ہوں گے، مگر زبان اردو کی خوش اقبال دیکھئے کہ اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب

ہوا جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اردو دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم وایران بلکہ فرنگستان تک پہنچی ہے'[1]

اس اقتباس کو تنقید نہیں بلکہ توصیف کے زمرہ میں رکھ سکتے ہیں، سر عبدالقادر نے اقبال کی عظمت کی بنیاد ان کی شہرت پر رکھی ہے۔ اگرچہ انہوں نے 'ندرت خیال اور نرالا انداز' جیسے تنقیدی جملوں سے اس کے لیے وجہ جواز تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے لیے بھی غالب کا سہارالیا ہے۔ گویا کہ سر عبدالقادر کے زمانے تک غالب اردو شاعری کے لیے ایک پیمانہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی اقبال کی شاعری کے لیے غالب سے جواز تلاش کیا ہے۔ وہ اس حد تک اس موازنہ میں آگے نکل جاتے ہیں کہ ان کی نظر میں غالب کی بے چین روح نے اقبال کی شکل میں دوبارہ جنم لیا۔

سر عبدالقادر نے اقبال پر کئی مضامین لکھے ہیں جن میں اقبال کے کلام کی توضیح و تفہیم کی ہے۔ 'مخزن' میں ایک مضمون 'رموز بے خودی' میں انہوں نے رموز بے خودی کو مثنوی مولانا روم کا امتداد قرار دیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اسرار خودی اور رموز بے خودی میں مثنوی مولوی معنوی کا تتبع کیا گیا ہے۔[2]

'بانگ درا' کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ دعوی سے کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں آج تک کوئی ایسی کتاب اشعار کی موجود نہیں جس میں خیالات کی یہ فراوانی ہو۔ اس قدر مطالب و معانی یکجا ہوں اور کیوں نہ ہو، ایک صدی کے چہارم حصے کے مطالعے اور تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ اور سیر وسیاحت کا نتیجہ ہے۔"[3]

---

1 دیباچہ بانگ درا، بانگ درا کا دیباچہ مولوی عبدالحق نے بھی لکھا تھا۔ اس میں اقبال کی شاعری پر تنقید زیادہ جامع ہے ۔ لیکن اس میں سوانحی مواد اس کے مقابلے میں کم ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کلیات اقبال کی تقریباً سبھی اشاعتوں میں سر عبدالقادر کا دیباچہ ہی شائع ہورہا ہے۔ ایک دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ دیباچہ بانگ درا کی پہلی اشاعت کی یادگار ہے۔

2 رموز بے خودی، سر عبدالقادر، مشمولہ اقبال معاصرین کی نظر میں ، وقار عظیم، ص ۲۶۵

3 دیباچہ بانگ درا

سر عبد القادر نے اقبال کی شاعری کے اس وقت تک کے سرمائے کو سامنے رکھتے ہوئے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور اقبال کے یورپ جانے سے پہلے کا دوسرا یورپ کے سفر کے بعد کا یعنی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا دور۔ اس کے بعد کے دور کو وہ تیسرا دور قرار دیتے ہیں جو کہ ان کے بقول اب تک جاری ہے۔ یہ تقسیم تقریباً وہی ہے جو میں دوسرے ناقدین نے قائم کی ہے۔ اقبال کی سوانح اور ان کی علمی سرگرمیاں علمی مدرسہ اور کالج کی تعلیم سبھی کچھ انہوں نے ایک چھوٹے سے مضمون میں سمیٹ دیا ہے۔

سر عبد القادر نے اقبالیات میں جو بھی لکھا وہ کمیّت کے لحاظ سے کم ہو، کیفیت کے لحاظ سے بھی اس میں اگرچہ کوئی قابل ذکر چیز نہ ہو لیکن انہوں نے اقبال تنقید میں پہل کرتے ہوئے اقبال کو ادبی دنیا میں متعارف کرانے میں اولیت کا تاج اپنے سر پر رکھ لیا ہے۔ اقبال تنقید کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ جلی حرفوں میں لکھا جائے گا۔

# مولوی احمد دین

مولوی احمد دین کو اب تک کی تحقیق کی مطابق اردو میں سب سے پہلے تنقیدی کتاب لکھنے کا شرف حاصل ہے۔ اس زمانے میں جب اقبال پر صرف چند تنقیدی مضامین ہی سامنے آ سکے تھے مولوی احمد دین نے اقبال کی سوانح اور کلام اقبال کی تنقید پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر اقبالیاتی تنقید میں اولیت کا سہرا ہمیشہ کے لیے اپنے نام کر لیا۔[1]

مولوی احمد دین کی کتاب 'اقبال' سب سے پہلے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت تک علامہ اقبال کے کلام کا کوئی مجموعہ بھی شائع نہیں ہوا تھا۔ احمد دین نے مختلف رسائل جن میں مخزن سر فہرست ہے، میں شائع شدہ اقبال کے کلام کو جمع کر کے اس کتاب میں شامل کر لیا، اکثر نظموں اور غزلوں پر تنقیدی نوٹ لکھے اور باقی کلام اقبال بغیر کسی تنقیدی نوٹ کے یوں ہی شائع کر دیا۔ مولوی احمد دین اقبال کے دوستوں میں سے تھے، علامہ اقبال کو جب اس کتاب کا علم ہوا تو آپ نے اسے ناپسند کیا۔ مولوی احمد دین کو جب اقبال کی ناپسندیدگی کا علم ہوا تو انہوں نے خود ساری کتابیں جلا دیں۔ علامہ اقبال نے کس وجہ سے ناگواری کا اظہار کیا اس کے بارے چند باتیں بیان کی جاتی ہیں:

1. چونکہ علامہ اقبال خود اپنے کلام کو شائع کرنے کے لیے اس پر نظر ثانی کر رکھی تھی۔ اس میں کئی نظموں غزلوں میں ترمیم بھی کر رہے تھے۔ کئی نظموں اور غزلوں کے کچھ حصے حذف کیے تھے۔ ایسے میں احمد دین نے اس سبھی غزلوں کو ابتدائی شکل میں شائع کر دیا۔ یہ بات اقبال کو ناگوار گزری۔

---

1 اس کتاب سے پہلے سر عبدالقادر کا مضمون جو بانگ درا میں مقدمہ کے طور شامل کیا گیا ہے کے علاوہ چند مضامین شائع ہوئے تھے، نیز ایک مختصر انگریزی کتاب A VOICE FROM THE EASTشائع ہوئی تھی۔ دیکھیں: مشفق خواجہ، مولوی احمد دین کی کتاب پر لکھا گیا دیباچہ ص ۱۹، ط: اقبال اکادمی پاکستان ۲۰۰۶،

2. 'اقبال' از احمد دین کا ایک بڑا حصہ کلام اقبال پر مشتمل تھا، جس کو انہوں نے بغیر کسی تنقیدی نوٹ کے شامل کر لیا تھا۔ اقبال چونکہ خود اپنا کلام شائع کرنا چاہتے تھے ایسے میں ان کی کتاب کی اہمیت پر حرف آتا۔

بہر حال جب مولوی احمد دین کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس کے سارے نسخے جلا دیے۔ اقبال کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انہیں اس بات کا افسوس بھی ہوا۔[1]

مولوی احمد دین نے اس کتاب کو از سر نو لکھا، اور ۱۹۲۶ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب پہلی کتاب سے ضخامت میں کم تھی اس کی وجہ ہے کہ اس کتاب میں کلام اقبال کا حصہ حذف کر دیا گیا۔ کلام اقبال کے صرف ان ہی اقتباسات کو شامل کیا گیا جو مثالوں کے لیے ناگزیر تھے۔ پہلے نسخہ کے تین ابواب 'غزلیات'، 'اکبری رنگ' اور مقصد شاعری ختم کر دئے گئے۔ کلام اقبال کے لیے بانگ درا کی قرات کا اعتبار کیا گیا۔

کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہی رائج ہوا لیکن دونوں ایڈیشنوں کے اپنے فائدے ہیں۔ پہلے ایڈیشن میں جہاں اقبال کے ابتدائی کلام سے واقفیت ہوتی ہے وہیں دوسرے ایڈیشن میں تنقیدی حصہ زیادہ ہے۔ پہلا ایڈیشن چونکہ خود مصنف نے ضائع کر دیا تھا اس وجہ سے اس کا ملنا کافی دشوار کام تھا۔ مشفق خواجہ کو تلاش کے بعد پہلے اور دوسرے ایڈیشن سے واقفیت ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے ان دونوں ایڈیشنوں کو ایک میں ضم کر دیا۔ اس طرح اقبالیات پر پہلی باضابطہ کتاب کا پنر جنم مشفق خواجہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

احمد دین ایک کشمیری النسل خاندان میں ۱۸۶۶ء میں لاہور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گجرانوالہ اور میٹرک لاہور سے کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد انہوں نے انگلش سے ایم اے کے لیے داخلہ لیا لیکن پھر ارادہ ترک کر کے قانون کی تعلیم پائی۔ انہوں نے لاہور کے پیشہ اخبار سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا، پیشہ سے وکیل تھے۔ ان کی کتابیں 'اقبال'، 'سرگذشت اقبال' اور 'جلال الدین محمد اکبر' کافی مشہور ہوئیں۔

---

1 مشفق خواجہ کا دیباچہ ص ۱۹۔۲۰۔

اقبال اور احمد دین میں کئی باتیں مشترک تھیں، دونوں کشمیری النسل تھے، وکیل تھے، انجمن حمایت اسلام اور انجمن کشمیری مسلمانان کے پلیٹ فارم پر سرگرم تھے۔ ان دونوں انجمنوں کے علاوہ بازار حکیماں کی ادبی محفلوں نے ان دونوں کے تعلقات کو پختگی بخشی۔

احمد دین نے اقبال کے ساتھ انجمن اسلام کے جلسوں میں شرکت کی تھی، یہ وہی انجمن ہے جس نے اقبال کو ایک ایسا پلیٹ فارم دیا جس سے اقبال قوم کے ہر دلعزیز شاعر بن گئے۔ انہوں نے انجمن اسلام کے جلسوں میں اقبال کی نظموں کی پزیرائی کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'نالۂ یتیم پہلی نظم تھی جو اقبال نے ہزاروں کی تعداد کے ایک جمع کثیر میں پڑھی۔ حسن اتفاق ہے کہ اقبال جو اسلام اور اسلامیوں کا گرویدہ اور دلدادہ ہے اپنی شاعرانہ زندگی کی ابتدا (ابتدا اس لیے کہ 'نالۂ یتیم جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں پہلی نظم تھی جو کثیر التعداد مجمع میں پڑھی)، 'نالۂ یتیم' ہی سے کرتا ہے اور اس طرح اپنی قومی شاعری کی بنا قومیت اسلامی کی بنا سے ایک انداز سے وابستہ کر دیتا ہے:

تھی یتیمی کچھ ازل سے آشنا اسلام کی
پہلے رکھی ہے یتیموں نے بنا اسلام کی''[1]

مذکورہ بالا اقتباس صرف ایک جلسہ کی روداد ہی نہیں ہے بلکہ احمد دین نے اس کے اندر نہایت اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ اقبال نے سب سے پہلی عوامی نظم میں اپنے اسلامیت کو بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس طرح وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اقبال کی اسلامی شاعر بعد کے زمانے کی دین ہے غلط ثابت ہوتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اقبال ابتداء سے اسلامی شاعر تھے اور آخر تک وطن دوست شاعر بھی۔ فرق صرف ترجیحات کا ہے پہلے وطن دوستی کو ترجیح حاصل تھی بعد میں اسلامی شاعری نے یہ جگہ لے لی۔

---

1 اقبال، احمد دین، مرتب مشفق خواجہ ص ۱۱۳

احمد دین کی کتاب 'اقبال' کے ابتدائی کلام کا اہم ماخذ ہے، دوسرے ایڈیشن کو اگرچہ انہوں نے نئی قرات کے مطابق کر دیا ہے لیکن مشفق خواجہ نے پہلے ایڈیشن کے اختلافات کو بھی بیان کر دیا ہے اس وجہ سے اس کی افادیت دوبالا ہو گئی ہے۔ ایک جگہ وہ بانگ درا سے کچھ نظموں کے اخراج کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ تینوں نظمیں 'بانگ درا' میں جو علامہ اقبال نے شائع کی ہے، موجود نہیں ہے۔ غالباً بعض اصطلاحی وجوہات شاعری اور نظر ثانی کے لیے کم فرصتی کی بنا پر مجموعے میں انہیں درج نہیں کیا گیا۔ ان میں خیال کی وہ بلندی اور بندشوں کی وہ مسلسل لطافت اور چستی بھی نہیں جو بعد کی نظموں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ تاریخی اعتبار سے مجموعہ کلام اقبال میں یہ نظمیں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی، اقبال کے اس سلسلۂ منظومات میں جو اقبال کی شہرت کا باعث ہوئیں، منظومات جو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاسوں کے لیے لکھی گئیں، یہ تینوں نظمیں ایسی کڑیاں ہیں جو چھوڑی نہیں جاسکتیں۔ علاوہ ازیں ان نظموں میں شاعر کا میلان طبیعت بھی، اگرچہ سیدھے سادے الفاظ اور بندشیں ہیں نمایاں ہے رسول عربی کا عشق اور قومی درد ایک ایک شعر میں ساری ہے اور یہی خصوصیات تا حال اقبال کی نظموں میں میں چاہے کسی رنگ میں ہوں اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔''[1]

محولہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد دین نے اقبال کے فکر اور فن دونوں پر توجہ دی ہے۔ لیکن ان کی توجہ زیادہ تر اقبال کے کلام کی فنی خوبیوں پر رہی ہے۔ وہ کلام کے محاسن کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔ اقبال کے متروک کلام کی ادبی اہمیت کا انہیں احساس ہے۔ غالباً وہ پہلے اقبال شناس ہیں جنہوں نے متروک کلام اقبال کی ادبی اہمیت اور اقبال کے ذہن اور دماغ کی رسائی کے لیے اس کی افادیت کا اظہار کیا۔ متروک کلام اقبال کی افادیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ کلام اقبال کے تدریجی ارتقاء کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہ بات اس وقت کہی جب کلام اقبال مکمل صورت میں شائع بھی نہیں ہوا تھا۔

---

1 اقبال، احمد دین، ص ۱۱٦

احمد دین نے اقبال کی سوانح کو بھی مختصر طور پر بیان کیا ہے لیکن ان میں سے بعض معلومات بعد میں دستیاب ہونے والے مآخذ سے مختلف ہیں۔ انہوں نے اقبال کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۵ء بیان کی ہے۔ جو کہ بعد کے حقائق کی بنیاد پر ۱۸۷۷ء قرار دیا گیا ہے۔ اوراب اسی کو ہر جگہ تسلیم بھی کر لیا گیا ہے۔

انہوں نے اقبال پر ان کے استاد میر حسن اور پروفیسر آرنلڈ کے اثرات کو خصوصی طور پر بیان کیا ہے۔ میر حسن نے ان کے اندر ادبی ذوق اور اسلام سے گہری انسیت کا بیج بویا تو پروفیسر آرنلڈ کی صحبت میں وہ فلسفہ کی طرف مائل ہوئے۔ اس طرح اقبال کا خمیر ان دنوں بزرگوں کی بدولت فلسفی شاعر کا بنا۔ احمد دین کے لفظوں میں:

> "مذاق طبعی اور استاد کی خاص توجہ اور الفت نے اقبال کو فلسفی مسائل کا فریدہ کر دیا اور کالج میں اقبال نے مضمون فلسفہ میں خاص امتیاز حاصل کیا۔۔۔۔۔ خاندان، مدرسہ اور کالج کی تعلیم وتربیت کا اثر جیسا کہ واقعات مابعد نے ظاہر کیا، اقبال کے دل میں مذہبی جذبات کا پیدا کرنا اور ابھارنا تھا۔ جذبات جو اس کے کلام میں مختلف صورتوں میں جلوہ آرا ہوتے رہے۔ حسن وعشق تصوف کے اصل اصول ہیں۔ صوفیانہ مذاق کی آبیاری نے حسن وعشق کی کشت زار میں خوب گل کھلائے اور فلسفہ جو اقبال نے لاہور گونمنٹ کالج کی عالیشان درسگاہ میں پڑھا تھا، مذہب کے سائے میں گوناگوں رنگ لایا۔"[1]

احمد دین نے اقبال کے کلام کے بارے میں جو رائیں پیش کی ہیں وہ ان کی شاعری کے ابتدائی شاعری کو سامنے رکھ کر کی ہے۔ اقبال کا بہت سارا کلام مختلف رسائل وجرائد میں بکھرا ہوا تھا لیکن ان کی اشاعت کتابی صورت میں نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے بعض خیالات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر اقبال کی شاعری میں تصوف کے عناصر کے بارے میں احمد دین کا بیان محل نظر ہے۔ اقبال تصوف کے ایک جارح ناقد کی صورت میں ظاہر ہوئے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اقبال کے کلام کے جو محاسن بیان کیے ہیں وہ ان کے عمیق نظر کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ انہوں نے اقبالیات کے جس عمارت کی بنیاد رکھی ہے بعد کے ناقدین نے اسی کی توسیع کی ہے۔

---

1 اقبال، احمد دین ص ۱۱۸

احمد دین نے فکر اقبال کے بتدریج ارتقاء پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اقبال کی نظموں کے مطالعہ میں انہوں نے اس کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے۔ کچھ نظموں کی تشریح مختصر تو کئی نظموں میں قدرے طوالت سے کام لیا ہے لیکن یہ طوالت بھی حد اعتدال سے تجاوز نہیں کرتی۔ نظموں کی تشریح دیکھیں:

''گل پژمردہ(۶۰)

'گل پژمردہ' کی افسردگی میں ہمارا فلسفی شاعر اپنے دل کے ویرانے کی تصویر اور اپنی زندگی کے خواب کی تعبیر دیکھتا ہے۔

گل رنگیں(۱۵)

' گل رنگیں ' کے سامنے آجاتا ہے تو اس کی سوزبانوں پر بھی خاموشی شاعر کو تڑپا دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اپنی پریشانیوں کو دیکھتا ہے اور متحیر ہے کہ آرزو جو اس کی زندگی کا سوزو ساز ہے، گل رنگیں کے سلسلۂ حیات میں نظر نہیں آتی۔ اور ذوق آرزو جو اسے ہلکان کیے دیتا ہے، پھول اس سے محض ناآشنا ہے۔ اس کی راز جو نگاہیں پھول کی لطیف اور زریں زندگی میں نازک کلیوں اور نفیس پتیوں کا سکون دیکھتی ہیں اور حیران ہیں کہ اس اپنا درد آشنا دل گلشن ہستی کی دوڑ دھوپ میں قدم قدم پر کانٹوں کی الجھنوں اور آبلہ آفرینیوں سے بے قرار ہے۔ مقابلہ مایوس کن ہے لیکن ان حالات میں بھی ہمارے شاعر کے لیے فلسفے کی تسکین عجب فرحت افزا ہے:

یہ پریشانی مری سامان جمعیت نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغ خانہ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو
رشک جام جم مرا آئینہ حیرت نہ ہو
یہ تلاش متصل شمع جہاں افروز ہے
توسن ادراک انساں کو خرام آموز ہے

تصوف کی تاثیر دیکھئے کہ بار دیکھنے اور غور کرنے سے پتا لگتا ہے کہ:

تمیز لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل

اور اس لیے حق جوئی کا تقاضا ہو رہا ہے کہ:

جہاں میں دانہ کوئی چشم امتیاز کرے (۱۳۶)

حیات انسانی (۱۲۶ کسی نظم کا عنوان نہیں ہے بلکہ غزل کا مصرع ہے)

اس معمورۂ ہستی میں سب سے بڑی بات جو انسان کو حیران کر رہی ہے اس کی اپنی زندگی کا مسئلہ ہے:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انسان
کہاں جاتا ہے آیا (کذا) ہے کہاں سے

کوہ ہمالہ

اور اس مسئلہ کے حل کرنے کی غرض سے شاعر کے تخیل کی بلند پروازیوں نے فصیل کشور ہندوستان، ہمالہ پہاڑ کے کنج خلوت خانہ قدرت میں، انسان کی سیدھی سادی زندگی، کی تلاش کی اور اسی سلسلے میں 'ابر کہسار' (۲۰) کی درافشانیوں'، پرندوں کے ترنم' اور 'غنچۂ گل کے ذوق تبسم' کی ٹوہ لگائی۔۔۔۔۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباس میں کئی باتیں قابل توجہ ہیں:

احمد دین نے نظموں اور غزلوں کی ترتیب یہ رکھی ہے: گل پژمردہ، گل رنگیں، کوہ ہمالہ اور ابر کہسار اور دو غزلوں کے اشعار بھی درج کیا ہے یہ ترتیب موجودہ ترتیب کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔ بانگ درا کی پہلی نظم کوہ ہمالہ ہے اس کے بعد گل رنگین ہے پھر گل پژمردہ اور ان نظموں کے درمیان بھی کئی نظمیں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ترتیب میں اقبال کے کلام کی اس ترتیب کا خیال نہیں رکھا ہے جو بانگ درا میں ہے۔

اگرچہ دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے کلام اقبال کی نئی قرات کا التزام کیا اس کے باوجود کچھ جگہوں پر انہوں نے موجودہ نسخے سے اختلاف کیا ہے، مثلاً

'کہاں جاتا ہے آیا (کذا) ہے کہاں سے'

---

1 اقبال ص ۱۱۹۔۱۲۰

حالانکہ بانگ درامیں 'آیا' کی جگہ 'آتا' ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے نظموں اور غزلوں کی تشریح کرنے کے بجائے متعلقہ نظم یا غزل کے بارے میں مجموعی تاثر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں انہوں نے یکساں رویہ نہیں اختیار کیا۔ کہیں ایک جملے میں بات مکمل کر دی اور کہیں پورا ایک پیرا گراف بیان کیا ہے۔ انہوں نے یہی طریقہ پوری کتاب میں باقی رکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے کلام کو تسلسل کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ بعد کے ناقدین اقبال کے یہاں یہ نقطۂ نظر تھوڑا مدھم پڑ گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فکر اقبال سے دور چلے گئے۔ وہ اقبال کے ذہن تک رسائی نہ حاصل کر سکے۔ احمد دین نے کلام اقبال کی تفہیم کا جو راستہ عملی طور پر دکھایا ہے اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ کلام اقبال کی تفہیم کی پہلی مربوط کوشش ہے اس وجہ سے اس کو اسی پس منظر میں دیکھا جاتا چاہئے۔

احمد دین نے اقبال کے شب و روز اور ان کی سرگرمیوں کے حوالے سے ان کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے مطالعہ میں اقبال پر مختلف واقعات کے اثرات کو دکھایا ہے۔ اقبال کی مختلف فلسفیانہ اساس کو انہی کی سوانح اور گرد و پیش سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اقبال کے فلسفۂ حرکت و عمل کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ سفر یورپ میں انہوں نے وہاں کے باشندوں کی تگ و دو کو دیکھ کر اپنی قوم کی ترقی کے لیے بھی اسے ایک فلسفہ کے طور پر پیش کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں پر کوئی تگ و دو میں لگا ہوا ہے۔ ان کی نظر میں ان کی کامیابی کا راز ان کے حرکت و عمل میں تھا۔ یہی سبق انہوں نے یورپ سے واپسی کے بعد اپنی قوم کو دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''میدان عمل میں فرنگستان کی دوڑ دھوپ اور حالات حاضرہ کی زبردست قوت تاثیر نے اقبال کے درد مند دل میں ہیجان پیدا کیا، اور ان کے حکمت پرور دماغ کو ایک نئے سلسلۂ جستجو میں سرگرداں کر دیا۔ اقبال نے دیکھا کہ یورپ مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک زندگی کی تگ و دو میں منہمک ہے اور اہل فرنگ امیر سے لے کر غریب تک اور بوڑھے سے لے کر بچے تک، زن و مرد، دولت و ثروت اور حکومت کے نشے میں سرشار شب و روز محنت و مشقت کی راہوں میں گامزن ہیں اور دنیا کی قیادت کے دعوے دار ہو رہے ہیں۔ عمل ان کا وظیفہ ہے۔ کام کرنے میں انہیں وہ حظ حاصل ہوتا ہے جو محض باتوں میں میسر نہیں۔'' [1]

---

1 اقبال ص ۱۴۳ مزید تفصیل کے لیے اس کے بعد کے صفحات بھی ملاحظہ فرمائیں

لیکن اس قسم کا نظریہ پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اقبال کی دور اول اور دور ثانی کی شاعری کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے۔ اور دیکھا جائے کہ کیا ان کی شاعری کے پہلے دور میں حرکت و عمل کا فلسفہ تھا یا نہیں، اگر ان کی شاعری میں یہ فلسفہ پہلے بھی موجود ہے تو اقبال کی شاعری کے بارے میں یہ رائے باطل ٹھہرے گی۔ جب ہم اقبال کی شاعری کے پہلے دور پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نظموں ہی میں 'گل رنگیں'، موج دریا، سید کی لوح تربت اور تصویر درد جیسی نظمیں اقبال نے پہلے دور میں ہی کہی ہیں ان کے اندر جو حرکت و عمل کا پیغام ہے اس وہ دوسرے دور کی شاعری سے کم نہیں ہے۔ تصویر در کے یہ اشعار حرکت و عمل کی دعوت دیتے ہیں:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئین قدرت ہے، یہ اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن، محبوب فطرت ہے

اس پوری نظم میں ناکامیوں اور نامرادیوں کی سب بڑی وجہ بے عملی کو قرار دے کر بار بار عمل کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ نظم اقبال کے سفر یورپ سے پہلے کی ہے اس وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اقبال نے یہ فلسفہ یورپ جانے کے بعد وہاں کی زندگی سے متاثر ہو کر پیش کیا۔

اس کے باوجود احمد دین کی استخراج نتائج کی کوشش کو اس وجہ سے سلام کرنا چاہئے کہ انہوں نے ایک راستہ دکھایا ہے جس پر چل کر ہم کلام اقبال اور ذہن اقبال کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس راہ میں کچھ لغزشیں بھی ہونگی جیسا کہ احمد دین کے یہاں جابجا دیکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن تفہیم اقبال کے کچھ نئے گوشے سامنے آسکتے ہیں۔

اقبال نے خود اپنے کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے احمد دین نے بھی اس تقسیم کو برقرار رکھا ہے۔ انہوں نے ہر دور کے کلام کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ پہلے دور کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے 'دور اول پر اجمالی نظر' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''پیشتر اس کے کہ آگے بڑھیں اس دور کی نظموں پر ایک اجمالی نظر ہمیں بتادے گی کہ اقبال کی شاعری کے ان ابتدائی مراحل پر غزلیات میں حسن کی شوخیاں عشق کی گرمیاں، ادھر نیاز اُدھر ناز، اسی پرانی طرز پر جلوہ آراء ہیں۔ مگر ساتھ ہی کہیں کہیں تصوف کی رنگ آمیز اور کبھی کبھی حکمت کی صورت گری نے حسن و عشق کا مرقع

ایسا دلکش بنادیا ہے کہ استعجاب کی آنکھ حیران رہ جاتی ہے۔ حکمت وتصوف کے اثرات دوسری نظموں میں بدرجۂ اولیٰ نمایاں ہیں۔"[1]

اس دور اول کی خصوصیات جو احمد دین کے مطابق سفر یورپ پر ختم ہوتا ہے، احمد دین نے جو بتایا ہے اس کے مطابق آپ نے فنی طور پر قدیم روش کو بر قرار رکھا موضوعاتی لحاظ سے بھی کوئی خاص ندرت نہیں تھی لیکن یہاں بھی اقبال کی عام روش سے ہٹ کر کام کرنے کی روش نے اپنا الگ راستہ نکالا۔ حکمت و تصوف کی آمیزش نے فکر وخیالات کے نئے گل بوٹے رقم کئے۔

اقبال کی شاعری میں وطنی شاعری کو احمد دین اسی دور کی شاعری قرار دیتے ہیں۔ آپ کا ماننا ہے کہ 'اقبال کی وطن پرستی کا یہیں خاتمہ ہو گیا'[2] یورپ اور جرمنی کے سفر سے اقبال نے ملکی شاعری کی جگہ ملی شاعری کرنے لگے۔ احمد دین نے جس غلط فہمی کا بیج اپنی تنقید میں یہاں بویا ہے اس کے اثرات آج بھی ناقدین کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کی وطنی شاعری کی ایک حدبندی مقرر کر دی۔ کسی بھی شاعر کی زندگی میں خیالات یک بار گی نہیں بدل جاتے۔ اس تبدیلی میں ایک زمانہ لگتا ہے۔ یہ تبدیلی بھی بتدریج ہوتی ہے۔ لیکن اقبال کے بارے میں یہ مان لیا گیا ہے کہ ان کی ایک دور کی شاعری دوسرے دور کی شاعری سے بالکل الگ ہے۔ اور یہ تبدیلی یکبارگی وجود میں آگئی ہے۔ اقبال کے بارے میں اس قسم کی رائے اقبالیات کے پورے سرمائے پر نظر نہ رکھنے کی وجہ سے قائم کی گئی۔ احمد دین کو اس معاملے میں معاف بھی کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان کے سامنے کلام اقبال مکمل صورت میں شائع نہیں ہوا تھا، لیکن کے بعد کے ناقدین کو نہیں۔

احمد دین کی کتاب اقبالیات میں خشت اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کی عظمت جن بنیادوں پر قائم ہے اس کی تعمیر میں مولوی احمد دین کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

---

1 اقبال، ص ۱۳۸

2 اقبال، ص ۱۴۳

# محمد دین تاثیر

ڈاکٹر محمد دین محمد تاثیر کا شمار ماہر اقبالیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اقبال کی شاعری کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا اور اقبال پر بیش بہا مضامین لکھے۔ ان کے مقالات کو ممتاز اختر مرزا نے 'مقالات تاثیر' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔[1] ان مضامین میں اقبالیات پر دس مضامین ہیں۔ 'فلسفہ اقبال'، 'مزار اقبال کی تعمیر'، 'علامہ اقبال سے ایک ملاقات'، 'میرا پیام اور ہے'، 'اقبال کا نظریہ فن وادب'، 'اسماء الرجال اقبال'، 'سرود رفتہ'، 'اقبال ایک آفاقی شاعر'، 'کلام اقبال' اور 'اقبال کی موت'۔ ان مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبال کے فکر اور فن دونوں پر لکھا ہے لیکن فن کا پلڑا بھاری ہے۔ انہوں نے 'اقبال کی موت' پر جو مضمون لکھا ہے اس میں اقبال سے گہری وابستگی اور عقیدت کا واضح اظہار ملتا ہے۔ وہ اقبال کو ان الفاظ کے ساتھ یاد کرتے ہیں:

> ''وہ اس دنیا میں کبھی اطمینان کی سانس نہیں لیتا تھا۔ ہماری تمہاری ذاتی دنیا میں اسے ایک دم بھر کے لیے چین حاصل نہ تھا۔ وہ صحیح معنوں میں دنیا دار تھا۔ جملہ انسانی فرائض ادا کرتا تھا۔ خوش مزاج اس قدر کہ روتوں کو ہنساتا تھا۔ بے تکلف اتنا کہ پہلی ملاقات میں رسمی قیود اٹھا دیتا تھا۔ لیکن اس قدر حلقہ احباب رکھتے ہوئے بھی اقبال تنہا تھا۔ اس کا کوئی دوست ہم خیال نہ تھا۔ وہ جس بلندیوں پر رہتا تھا وہاں کسی اور انسان کے دم مارنے کی جگہ نہیں۔''[2]

---

1 یہ کتاب مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔

2 اقبال ایک آفاقی شاعر از محمد دین تاثیر، مشمولہ مقالات تاثیر، ص ۱۳۳

مذکورہ اقتباس کے ایک ایک لفظ سے عقیدت جھلک رہی ہے۔ علامہ سے اسی عقیدت کا نتیجہ ہے کہ اقبال تنقید میں ان کا اسلوب توصیفی ہے وہ اقبال کو ایک آفاقی شاعر مانتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اردو میں اگر کوئی ایسا شاعر ہے جس کے اندر آفاقیت کی شان ہے تو وہ اقبال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آئندہ کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، محض رائے کا اظہار ہی کیا جاسکتا ہے۔ اپنی زندگی میں بڑی بڑی شہرتوں کے مالک آج ایسے بھلائے جاچکے ہیں کہ ان کے متعلق تحقیقات کرنے والے لوگوں پر کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا کی پھبتی کسی جاتی ہے۔ ذوق جنہیں شاید اپنے وقت میں غالب سے بہت بلند سمجھا جاتا تھا، آج غالب سے ان کا مقابلہ کرنا بھی بد ذوقی کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اس سے ادبی تنقید کی بے بضاعتی واضح ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھار صدیوں کے بعد کوئی ایسا شاعر بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کے متعلق پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ صدیوں تک اس کا نام زندہ رہے گا اور اس کا کلام اثر انداز رہے گا۔ اقبال ان چند شاعروں میں سے ہے، اور یہی نہیں کہ اس کا اثر ہندوستان میں بڑھتا جائے گا بلکہ قیاس یہ ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں جب اس کا کلام ترجمہ ہو کر پہنچے گا تو اس کا انداز خیال بہت مقبول ہو گا۔ اردو میں اور کوئی شاعر ایسا نہیں جس کے اثر کے متعلق ایسے عالمگیر امکانات کی توقع کی جاسکے۔''[1]

اقبال کی اسلامی شاعری پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مخصوص فرقہ کے شاعر تھے۔ تاثیر نے اس سلسلے میں ان لوگوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے جو اقبال کے دفاع میں یہ کہتے ہیں کہ اقبال اسلامی شاعر نہیں تھے۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال اسلامی شاعر تھے۔ وہ ایک مومن شاعر تھے۔ اس کے باوجود ان کا اصرار ہے کہ وہ ان سب کے ساتھ ایک آفاقی شاعر ہیں انہوں نے مغربی شاعروں ہومر، دانتے، کالی داس اور ٹیگور وغیرہ کی شاعری کا حوالہ دے کر کہا کہ ان کی شاعری ان کے مخصوص عقائد اور توہمات کو شامل ہونے کے باوجود آفاقی ہے تو پھر اقبال کی بھی شاعری اسلامی پس منظر کے ساتھ آفاقی ہوسکتی ہے اور ہے۔ انہوں نے اقبال کے عقائد اور اساطیر کے بیان کو دیگر عظیم شاعروں سے مختلف قرار دیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال جب مذہبی عقائد اور شخصیات کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی شان جدا ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں:

''مگر ایک بات میں اقبال ان سب سے ممتاز ہے اور وہ یہ کہ وہ پرانی روایات کو اس طرح برتتا ہے کہ ان کا مفہوم بدل جاتا ہے اور ان میں نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جب کبھی اقبال ابراہیم خلیل اللہ کا ذکر کرتا ہے، تو وہ

---

1 اقبال ایک آفاقی شاعر، مشمولہ مقالات تاثیر، ص ۱۲۰

یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے ایک نبی نہیں ہوتے بلکہ شاعر کا تصور انھیں جنگ آزادی کا مجسمہ بنا دیتا ہے اور آزر کے بت غلامی اور توہمات کی تمثیل بن جاتے ہیں جنھیں توڑ کر انسان صحیح انسانیت کا دعویٰ دار ہو سکتا ہے!۔ ایسے ''خلیل'' کو فرقہ واری کا نشان سمجھنا بد ترین فرقہ وارانہ ذہنیت کی نشانی ہے۔''

یہ تو وہ خلیل ہے جو عشق کا مجسمہ ہے، وطن کا، آزادی کا، عشق کا جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے:

بے خطرہ کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی''[1]

مذکورہ بالا اقتباس سے تاثیر کی تنقیدی بصیرت کا علم ہوتا ہے۔ ناقدین نے اقبال پر وارد اس اعتراض کا جواب دیا ہے لیکن تاثیر کا انداز ان سب میں نرالا ہے۔

تاثیر اقبال کی وطنی شاعری کے دلدادہ ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال نے وطن دوستی میں جو نغمہ پیش کیا اس کی مثال اب تک پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اقبال کے یہاں ایک توازن ہے انہوں نے وطن پرستی کی اندھی روایت کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے۔ اس معاملے میں انہوں نے اقبال اور نطشے کے نظریات میں یکسانیت کی بات کی ہے۔ جہاں تک مغربی مفکرین سے متاثر ہونے کی بات ہے تو تاثیر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اقبال نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ اس سے اقبال کی عظمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اقبال نے اپنے مطلب کے افکار و نظریات جہاں بھی ملے انہیں اپنی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کیا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ شخصیت کی بیماریاں بہت طرح کی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''متعدد شخصیتوں کی بیماری'' کہ جس میں ایک شخص دو دو تین تین چار چار حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ اگر رات کے وقت وہ خونخوار ڈاکو ہے تو دن کو بڑا متقی، پارسا بزرگ ہے۔ رات کے وقت اسے دن کی حالت یاد نہیں ہوتی اور دن کے وقت، رات کی حالت بھول چکا ہوتا ہے۔ ایک

---

1 ایضاً

شخصیت کئی ٹکڑوں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس طرح نیند بھی شخصیت کی بیماری ہے اور انسان آدھی عمر نیم مردہ سا رہتا ہے! لیکن یہ بیماریاں ہلکے ہلکے جھٹکے ہیں، مدھم مدھم زلزلے ہیں مگر خودی کی قیامت موت ہے۔

وہ اقبال کے بعض افکار و نظریات سے اتفاق بھی نہ کرتے ہوئے اس کی توجیہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ اس کا خوب صورت مفہوم سامنے آجائے۔ جنت و جہنم کے بارے میں اقبال کے نظریات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"موت سے ٹکرا کر بہت کم شخصیتیں صحیح سالم رہتی ہیں اور اقبال کے نزدیک موت کے بعد زندگی ہر انسان کا حق نہیں بلکہ اس کی شخصیت کی پختگی کا ثمرہ ہے۔ اگر خودی محکم ہے تو موت پر غلبہ حاصل کرلے گی۔ نہیں تو موت اسے مٹا دے گی۔ یہی خیال جرمنی کے مشہور فلسفی شاعر گوئٹے کا بھی تھا مگر اس نے اقبال کی طرح اس کی وضاحت نہیں کی۔ مجھے یاد ہے میں نے علامہ اقبال سے پوچھا تھا کہ اگر فقط چند مستحق لوگ ہی مرنے کے بعد زندہ ہوں گے تو پھر جہنم اور جنت کی تفریق کیا ہوئی۔ انھوں نے فرمایا اول تو دوزخ اور جنت مقامات نہیں بلکہ ذہنی حالت کے دو نام ہیں اور پھر یہ کہ جہنم کا حق دار ہونا بھی خودی کی قوت کا نتیجہ ہے۔ ابو جہل دوزخ کا ایندھن بنے گا، خالد اور طارق وغیرہ جنت کی کیفیت میں ہوں گے اور عام انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح تلف ہو جائیں گے۔"[1]

ظاہر سی بات ہے کہ اس عقیدہ سے ہر کوئی اتفاق کرے ممکن نہیں۔ تاثیر بھی متفق نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود لکھتے ہیں:

"یہ خیال جیسے میں ابھی عرض کر چکا ہوں بہت نرالا ہے مگر اقبال کے فلسفہ خودی کا لازمی نتیجہ ہے اور آپ چاہے میری طرح اسے صحیح نہ سمجھیں یا اس کے قائل ہوں، میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر ہمارے عہد میں کوئی شخصیت موت کے بعد زندہ رہنے کی حق دار ہے تو وہ اقبال کی شخصیت ہے۔"[2]

---

1 ایضاً ص: ۱۲۵

2 اقبال کا فکر و فن مرتبہ: افضل حق قرشی، بزم اقبال لاہور، ۱۹۹۴ء

دراصل توصیفی ناقدین کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ صرف خوبیوں پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ اگر فن پارے میں کوئی خامی نظر آئے تو اس کی توجیہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہ بھی ایک خوبی کے طور پر نظر آئے۔ محمد دین تاثیر نے یہاں اقبال کے حوالے سے یہی رویہ اختیار کیا۔

محمد دین تاثیر اقبال کے ہم عصر ہیں۔ اقبال کے دوستوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اقبال سے ان کی عقیدت کو اسی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ انہوں نے اقبالیات پر جو بھی لکھا ہے اس میں توصیفی رنگ غالب ہے۔ پھر بھی ان کی تنقیدی کاوش کو اس وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی تنقید اقبالیات کے ابتدائی نقوش کی حیثیت رکھتی ہے۔

# عبدالسلام ندوی

عبدالسلام ندوی علمی دنیا میں ایک مستند عالم دین، محقق اور ادیب کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ادبی حلقوں میں ان کی کتاب 'شعر الہند' اور 'اقبال کامل' انہیں ایک بڑے ادبی محقق اور تنقید نگار کے طور پر یاد رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ان کی کتاب 'اقبال کامل آزادی کے بعد ہندوستان میں اقبالیاتی ادب پر سب سے پہلی مکمل کتاب ہے۔ اس سے پہلے اگرچہ وی.جی کررنن کی کتاب Poems from Iqbal ۱۹۴۷ء میں شائع ہوچکی تھی مگر یہ اقبال کی منتخب نظموں کا ترجمہ ہونے کی وجہ سے مستقل کتاب کی حیثیت نہیں رکھتی۔

مولانا عبدالسلام ندوی ۱۶ فروری ۱۸۸۳ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں ۱۹۰۶ تا ۱۹۰۹ء کے دوران تعلیم شبلی نعمانی کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے تحریری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا موقع ملا۔ ندوہ سے فراغت کے بعد وہیں پر استاد مقرر ہوئے وہاں کے ترجمان 'الندوۃ' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ بعد میں شبلی نعمانی کی زیر نگرانی سیرت کے اسٹاف میں شامل رہے۔ پھر سید سلیمان ندوی کی دعوت پر دارالمصنفین چلے گئے۔ یہاں وہ اپنی عمر کے آخری پڑاؤ تک تصنیف و تالیف سے وابستہ رہے۔ ۱۳۰کتوبر ۱۹۵۶ میں آپ کا انتقال ہوا۔

مولانا کا اہم ادبی کارنامہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد جب مخصوص ذہنیت کے حامل افراد کے ذریعے اقبال کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جارہا تھا۔ ادب پر سیاست کو ترجیح دی جارہی تھی۔ دوسری طرف ترقی پسندوں کا ٹولہ تھا جس میں سردار جعفری، مجنوں گورکھپوری، اختر حسین، سبط حسین، اختر ، ماہری جیسے لوگ پیش پیش تھے۔ ان ناقدین نے اقبال کو ایک آسان ہدف کے طور پر دیکھا اور اقبال کی کردار کشی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا۔ ان میں سے سردار جعفری کو غالبا اپنی غلطیوں کا احساس ہوگیا تھا جس کا کفارہ انہوں نے اقبال پر اپنی مشہور کتاب 'اقبال شناسی' لکھ کر کیا ہے۔ لیکن آخری عمر تک سردار جعفری ترقی پسندی کا علم بلند کرتے رہے اس وجہ سے اس حصار سے باہر نہ آسکے۔

اقبال کے خلاف ایک اور محاذ علما کا تھا۔ کبھی تصوف کی وجہ سے خواجہ حسن نظامی اور دوسرے علما سے اقبال کی معرکہ آرائی رہی تھی لیکن زندگی کے آخری پڑاؤ پر حسین احمد مدنی کے ساتھ قومیت کے مسئلہ پر ہونے والے بحث و مباحثہ نے اس خلیج کو دیوبندی جماعت کے دل میں اور گہرا کر دیا تھا۔ ثالثیوں کی مدد سے اقبال اور حسین احمد کے بیچ تصفیہ بھی ہو گیا لیکن کلیات اقبال کی اشاعت میں حسین احمد مدنی کے بارے میں اشعار کو کلیات میں شامل کرنے کی وجہ سے حسین احمد مدنی کے عقیدت مند چراغ پا ہو گئے۔

مولانا عبد السلام ندوی بھی ایک عالم دین تھے۔ لیکن ان کا تعلق دیوبند سے نہیں ندوہ سے تھا غالباً یہی وجہ ہے کہ اقبال پر 'اقبال کامل' لکھنے میں حسین احمد مدنی اور اقبال کے درمیان کی خلیج حائل نہ ہوئی۔ پروفیسر عبد الحق نے اپنی کتاب 'اقبال۔ شاعر رنگیں نوا' میں لکھا ہے کہ اگر مولانا عبد السلام ندوی دیوبند سے تعلق رکھتے تو یہ کتاب ترتیب نہ دیتے۔ ادبی معاملات میں مذہبی آویزش کی وجہ سے ممکن ہے کہ بات ایسی ہی ہوتی۔

مولانا کی کتاب کے دو حصے ہیں پہلا اقبال کی سوانح پر اور دوسرا اقبال کے کلام کا تنقیدی مطالعہ پر ہے۔ جہاں تک پہلے حصے کی بات ہے تو مولانا خود کہتے ہیں کہ اس حصے پر انہوں نے خاص توجہ نہیں دی ہے بلکہ مختلف کتابوں میں جو کچھ بھی ان کو ملا اس کو حوالے کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اس حصے کی خاص بات جس میں مولانا کی ندرت جھلکتی ہے وہ ہے حسن ترتیب اور سوانح میں اشعار سے بر محل استشہاد۔ لیکن شعرا کے کلام سے ان کی سوانح مرتب کرنا ایک نازک مرحلہ ہوتا ہے کیوں کہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ شاعر نے جن خیالات کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے وہ واقعی اس کی زندگی سے متعلق ہو۔ بہر حال مولانا عبد السلام ندوی نے ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اقبال کے اجداد کے بارے لکھتے ہوئے انہوں نے اقبال کے اس شعر سے استدلال کیا ہے۔

میں اصل کا خاص سومناتی / آبا مرے لاتی و مناتی

تو سید ہاشمی کی اولاد / پری کفِ خاک برہمن زاد

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں / پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اس قسم کی کامیاب مثالوں میں سفر یورپ، اساتذہ، مسولینی سے ملاقات وغیرہ سے متعلق واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض جگہوں پر وہ دھوکہ کھا گئے اور شاعرانہ فنکاری کو اصل حقیقت سمجھ بیٹھے۔ پروفیسر عبد الحق نے عبد السلام

ندوی کی ایسی ہی ایک غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''اپنی زندگی میں وہ مشکک تھے۔'' اور انہوں نے استدلال میں یہ اشعار پیش کیے ہیں:

سالہا بودم گرفتارِ سکے/از دماغِ خشکلا ئمین ِ شکے

حرفے از علم الیقیں ناخواندہٗ/در گماں آباد حکمت ماندہٗ

پروفیسر عبد الحق لکھتے ہیں:

> ''یہ استنباط غلط ہے۔ اقبال نے حضور کونین ﷺ کی بارگاہ میں اپنی عاجری کا ذکر کیا ہے۔ وہ زندگی کے کسی دور میں تشکیک میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ہر دور کے اشعار جو تصور توحید اور پیغمبر اعظم و آخر ﷺ کی بارگاہ میں ہدیۂ عقیدت کے طور پر پیش کیے ہیں ان کے موحد کیش ہونے کی دلیل ہیں۔ ہاں ایک دور ایسا ضرور گزرا ہے جب وہ وجودی افکار سے مغلوب تھے یہ زمانہ ۱۹۰۱ سے ۱۹۰۵ تک ہے۔''[1]

سب سے پہلے ان کی سوانح کے بارے میں ان کی زندگی، تعلیم، سیاست اور غیر ممالک کے اسفار کا ذکر کیا ہے اس کے بعد ذاتی حالات کے تحت اقبال کے مذہب عقائد، دین و دنیا کے بارے میں انکے خیالات کو بیان کیا ہے، اخلاق و عادات کے اقبال کے طرز معاشرت غذا الباس اور وطن کی محبت جیسے مضامین قائم کیے ہیں۔ پھر تصنیفات کا عنوان دے کر اقبال کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں اور مضامین کا جائزہ لیا ہے۔ ۱۱۰ صفحات کے بعد وہ اردو شاعری کے عنوان سے کتاب کے اصل حصے کی طرف آتے ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ جو اقبال کی شاعری سے متعلق ہے اس میں مولانا نے کافی محنت کی ہے۔اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ مولانا کو چونکہ احساس تھا کہ اقبال پر لکھے گئے مضامین اور کتابیں اکثر سطحی قسم کی ہیں۔

مولانا اقبال کے فکر اور فن کے درمیان توازن قائم رکھنے کے قائل ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقبال کے فکر اور فلسفہ کی بلندیوں کے معترف ہونے کے باوجود انہوں نے اقبال کے فن کو ان کے فکر اور فلسفہ پر مقدم کیا ہے اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ:

---

1اقبال شاعر رنگیں نوا از عبد الحق ص ۹۷

"ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ زیادہ تر فلسفیانہ، صوفیانہ مذہبی اور قومی مسائل پر مشتمل ہے لیکن یہ مسائل شاعرانہ طرز و اسلوب میں بیان کیے گئے ہیں، اس لیے ان کی تمام حیثیتوں پر شاعرانہ حیثیت کو تقدم حاصل ہے ۔۔۔۔۔ میرے نزدیک ان کا کلام خشک فلسفیانہ مسائل کا مجموعہ نہیں ہے، یعنی وہ صرف ناظم نہیں ہیں بلکہ ایک قادرالکلام شاعر ہیں اس لیے میں نے فلسفیانہ، صوفیانہ اور سیاسی مسائل سے پہلے انکی ذات کو صرف ایک شاعر کی حیثیت کے پیش نظر رکھا ہے اور مختلف عنوانات میں ان کی شاعرانہ حیثیت کو زیادہ مکمل صورت میں نمایاں کیا ہے۔" [1]

مولانا نے لکھا ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز پنجابی سے کیا ہے، اس کے بعد اقبال کی شاعری کے ارتقائی منازل کے بارے میں انہوں نے گفتگو کرتے ہوئے ارشدؔ اور داغؔ کی شاگردی کا تذکرہ اور پھر داغؔ کی شاگردی اور ان کے اثرات سے کنارہ کشی کا بیان کیا ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اقبالؔ نے ارشد سے صوری تلمذ حاصل کیا اور داغؔ سے تحریری اصلاح کی مگر غالبؔ سے معنوی استفادہ کیا اور یہ چونکہ ان کی طبیعت کے مناسب تھا اس لیے وہ دیرپا ہے۔

اقبال کی شاعری میں مختلف اصناف سخن کے بارے میں لکھتے ہوئے انہوں نے تنقیدی نوٹ بہت کم لکھے اقتباس کی بھرمار ہے۔ اس طرح مولانا کی تنقیدی صلاحیت ان اقتباسات میں دب کر رہ گئی ہے۔ مولانا بال جبرئیل کی غزلوں کو بمشکل غزل مانتے ہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ غزل صرف ایک ہیئت ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک مخصوص قسم کے مضامین بھی ہوتے ہیں جس سے یہ غزلیں عاری ہیں۔

اقبال کی مرثیہ گوئی پر مولانا کا یہ کہنا بجا ہے کہ اس کے اندر لہجہ حسرت و یاس کا نہیں ہے بلکہ اس کے اندر بلند آہنگی پائی جاتی ہے۔ دراصل اقبال کا مزاج ہی رونے رلانے کا نہیں ہے، یہاں تک کہ انہوں نے اپنی والدہ کی موت پر جو مرثیہ لکھا اس کے اندر بھی موت و حیات کے فلسفہ اور دوسرے مضامین پر توجہ مبذول کی آخر میں چند اشعار ہی ایسے تھے جس رنج و غم کا اظہار تھا۔ مولانا نے غالبؔ کے مرثیہ کو ایک مکمل مرثیہ کہا ہے۔ اردو میں شخصی مرثیوں کو فروغ دینے میں اقبال کا نام جلی حروف میں لکھا جائے گا۔ اقبال سے پہلے اگرچہ حالیؔ نے شخصی مرثیہ لکھ کر اردو والوں کے لیے ایک نیا افق روشن کیا۔ لیکن اقبال نے 'والدہ محترمہ کی یاد میں' داغؔ اور غالبؔ پر مرثیہ لکھ کر اس صنف کو مقبولیت بخشی۔

---

1 اقبال کامل

جہاں تک مثنوی کی بات ہے تو مولانا نے اس کے بارے کوئی خاص بات نہ کہہ کر ساقی نامہ کو ہی مثنوی کے زمرہ میں رکھا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے ساقی نامہ ایک الگ صنف سخن ہے اور مثنوی ایک الگ صنف سخن۔ چند ظاہری مناسبتوں کی وجہ سے دونوں کو ایک ہی زمرہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔

مناظر فطرت کی شاعری کے طور پر مولانا نے لکھا ہے کہ:

" شاعرانہ حیثیت سے مناظر قدرت کی خوبی صرف یہ سمجھی جاتی ہے کہ ایک چیز کی ہو بہو تصویر کھینچی دی جائے لیکن ہمارے نزدیک صرف یہی خوبی کافی نہیں ہے بلکہ یہ تصویر اس طرح کھینچنی چاہیے کہ ہمارے جذبات بھی اس سے متاثر ہوں اور ہم میں رنج و غم انبساط و مسرت اور ولولہ و مستی کی کیفیت پیدا ہو، اور ڈاکٹر صاحب نے مناظر قدرت پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں یہ خصوصیت خاص طور پر پائی جاتی ہے۔"[1]

یہاں تک تو واقعی کوئی قابل اعتراض بات نہیں مگر آگے چل کر مولانا ایک اور بات کہتے ہیں کہ 'چاند جگنو'، 'صبح کا ستارہ'، 'چاند اور تارے'، 'ایک شام'، اور 'شعاع آفتاب' پر لکھی گئی نظموں کو مناظر فطرت میں شامل کرنا غلطی ہے۔[2]

معلوم نہیں کہ مولانا کس بنیاد پر ان نظموں کو مناظر فطرت کے زمرہ سے خارج قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ سب بھی مناظر فطرت کا حصہ ہیں، جب "ابر" پر لکھی گئی نظم مناظر فطرت میں شامل ہو سکتی ہے تو یہ نظمیں کیوں نہیں ہو سکتی ہیں؟

مولانا، بال جبریل اور دوسرے مجموعوں میں شامل قطعات اور رباعیوں کو صورۃ رباعی نہیں مانتے ان کے نزدیک یہ قطعہ نما رباعی ہیں۔ اس کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ رباعی کی متداول بحروں میں نہیں ہیں۔

اقبال کی رباعیوں پر بہت سارے ناقدین نے اظہار خیال کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ رباعی کی متداول بحروں میں یہ رباعیاں یا ان میں سے اکثر نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود پروفیسر محمود الٰہی جیسے ماہرین نے انہیں رباعی مانا ہے۔ خود اقبال انہیں رباعی کہتے ہیں۔ دراصل اقبال کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی وہ بنی بنائی شاہراہ پر چلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنا

---

1 اقبال کامل ص ۱۵۰

2 اقبال کامل ص ۱۵۲

راستہ خود نکالتے تھے۔ انہوں نے غزل کو وسعت دے کر اس کی سرحد کو نظم سے ملا دیا۔ نظم میں غزل کی سی چستی پیدا کر کے نظم کو غزل کی معنویت سے ہمکنار کر دیا۔ اقبال نے اگر ایسی ہی جدت طرازی صنف رباعی میں کی ہے تو کیا صرف اس وجہ سے اس کو رباعی نہیں مانا جاسکتا کہ وہ ایک مخصوص بحر میں نہیں ہے جو اس کے لیے خاص مانا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا ماننا ہے کہ اقبال کی وسعتوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنی اصول نقد میں وسعت پیدا کرنی ہو گی۔

قومی اور وطنی شاعری کے بارے مولانا کا یہ نقطہ قابل غور ہے کہ حالیؔ اور اسماعیل میرٹھی کی طرح اقبال نے قوم کو بیدار کرنے کے لیے اپنی پستی کا اظہار نہیں کیا اس لیے کہ یہ خودداری کے خلاف ہے اور اس سے دلوں میں پست جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا نے اقبال کی ظریفانہ شاعری کو اکبر الہ آبادی کی تقلید قرار دیا ہے۔ اقبال نے واقعی یہ اشعار اکبرؔ کی تقلید میں کہے ہیں مگر یہ محض تقلید نہیں بلکہ اکبرؔ کی عظمت کے اعتراف کے لیے تھا جیسا کہ انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ کسی شاعر کی عظمت کے اعتراف کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے رنگ میں اشعار کہے جائیں۔

مولانا عبد السلام ندوی نے اقبال کی کتابوں کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔ یہ حصہ بہت اہم ہے۔ لیکن 'تشکیل جدید الٰہیات' کو ذکر نہ کرنا تعجب کا باعث ہے۔ حالانکہ فکر اقبال کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

کتاب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں کلام کی ادبی خوبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے یہاں پر انہوں نے زیادہ تر اقبال کی شاعری کو کلاسیکی طرز نقد پر پرکھا ہے۔ اس سے پہلے جدید طرز نقد کے مطابق یوسف حسین خاں نے 'روح اقبال' میں جو کچھ لکھا تھا اس کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔ انہوں نے خود سے کلام اقبال پر قدیم طریقۂ نقد کے مطابق لکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال اگرچہ دور جدید کے روشن خیال آدمی ہیں مگر ان کا میلان قدیم کی طرف تھا۔

مولانا نے اقبال کے معترضین کا بھی مختلف جگہوں پر جواب دیا ہے چنانچہ مجنوں گورکھپوری کی طرف سے اقبال کے اشعار میں عقاب، شاہین، شہباز اور چیتے جیسے جانوروں کی تشبیہات کو سفاکیت کی تعلیم اور دعوت دینے والا قرار دینے کو وہ غلط کہتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال ان جانورں کی وصف قوت کو مشبہ بہ بناتے ہیں چنانچہ اقبال کو کبوتر کے لہو میں نہیں بلکہ اس پر جھپٹنے میں مزا آتا ہے۔

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ایسی بات نہیں کہ انہوں نے صرف دوسروں کی آرا سے اختلاف کیا ہے کئی جگہوں پر اقبال کے بعض خیال سے بھی اختلاف کیا ہے، ایک جگہ وہ اقبال کے اس شعر پر جس میں اقبال نے خود کا موازنہ گوئٹے سے کرتے ہوئے کہا تھا:

او چمن زادے چمن پرورده
من دمیدم از زمین مرده

نقد کرتے ہوئے مولانا نے کہا ہے کہ کم از کم پنجاب کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی جو اقبال کے کلام کو سننے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے تھے، مگر راقم کے خیال میں اقبال نے جو بات کہی تھی اس کا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری قوم عمل کے اعتبار سے مردہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم برادری اس صفت سے متصف ہے۔

اقبال کی جن فنی خامیوں کی طرف صاحب اقبال کامل نے توجہ دلائی ہے وہ ان کی ناقدانہ بصیرت کا بین ثبوت ہے۔ البتہ کئی جگہوں پر وہ جادۂ راہ سے بھٹک گئے ہیں اور زبان و بیان کے ایسی ترکیبوں اور محاوروں کو بھی غلطی میں شمار کیا ہے جو رائج ہیں۔ ایسی ہی کچھ غلطیوں کی طرف پروفیسر عبدالحق نے اشارہ کیا ہے۔

''مصنف کا خیال ہے کہ لب دو ہوتے ہیں لہٰذا 'لب مائل گفتار تھے'، ہونا چاہئے تھا۔ اس اعتراض میں صداقت نہیں ہے۔ لب واحد ہے لبوں یا لباں جیسی جمع کی صورت نہیں ہے کہ فعل بھی جمع ہو، اسی طرح وہ 'طلب خو' پر معترض ہیں۔ کیوں کہ ان کے بہ قول یہ بدنما اور غیر مستعمل ترکیب ہے۔ 'نشہ پلا کے گرانا' پر بھی اعتراض ہے کہ یہ لکھنؤ کا محاورہ نہیں ہے یہ بھی لکھا ہے کہ غالباً پنجابی محاورہ ہو گا۔ پنجاب میں ہی نہیں یہ محاورہ اب تو عام ہے۔''[1]

---

1اقبال۔ شاعر رنگیں نوا ص ۹۸

'اقبال کامل' کے علاوہ مولانا نے 'شعر الہند' لکھی۔ یہ کتاب مولانا نے اقبال کامل سے کچھ سالوں پہلے لکھی تھی۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ دو جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں ایک یا دو نظموں کے سر سری ذکر کے علاوہ اقبال کی شاعری پر کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے 'اقبال کامل' لکھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس وجہ سے یہ سوچ کر اقبال کے بارے میں اس کتاب میں مواد جمع نہیں کیا کہ اس سے تکرار لازم آتی۔ پروفیسر عبدالحق نے بھی اسی رائے کا اظہار 'حسن ظن' کے طور پر کیا ہے۔

اقبال کا موازنہ دنیا کے بڑے شعرا کے ساتھ کیا جاتا ہے مگر مولانا کے نزدیک اقبال کا موازنہ کسی بھی شاعر سے نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ موازنہ کے لیے اشتراک موضوع اور اشتراک خیال ضروری ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب دنیا کے منفرد شاعر ہیں جن کا کوئی اسکول نہیں۔

مجموعی طور پر مولانا کا اسلوب نفسیاتی اور تشریحی ہے۔ جابجا اشعار اور انکی شرح بیان کی گئی ہے۔ بعض دفعہ یہ گمان ہے کہ یہ کتاب اقبال تنقید پر ہے یا کلام اقبال کا انتخاب یا اس کی تشریح۔ اس کی وجہ غالباً یہ احساس ہے کہ بقول مولانا اب تک اقبال کے کلام کا کوئی جامع انتخاب نہیں شائع ہوا ہے مگر اس کا یہ موقع ہر گز نہ تھا۔

ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق، مولانا عبدالسلام ندوی کی اقبال شناسی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مولانا کی تنقیدی بصیرت اور تخلیق کی دروں بینی کو آفریں کہتا ہوں کہ انھوں نے شعری تخلیق کی پر اسرار کیفیات کی تفہیم میں جس آگہی کا مظاہرہ کیا وہ قابلِ ستایش ہے۔ وہ تنقید کے مروجہ دبستانوں سے وابستہ نہ تھے اور نہ کسی نظریہ کی ادعایئ ہی تھی۔ یہ مشرقی اصول نقد کو بروئے کار لا کر بیسوی صدی کے مفکر شاعر کے فکر و فن کو صحیح تناضر میں پیش کرنے کی اہم مثال ہے۔ خاص طور پر کتاب کے آخری ابواب میں اردو شاعری کا تجزیہ اقبال کے فنی ارتکاز کا نقطۂ پرکار ہے اور مولانا کے شعری عرفان کی صبح درخشاں بھی ہے۔ کیوں کہ انھوں نے صرف بیسویں صدی ہی نہیں بلکہ کئی صدیوں پر محیط ایک مجددِ فکر کے فلسفہ و شعر پر تنقید و تحسین کی جرأت کی ہے وہ بڑے مطالعہ و مشاہدہ کا تقاضا کرتی ہے وہ جرأت پیکرِ خاکی میں نفس جبرئیل پیدا کرنے کی آرزو سے کم نہیں ہے

کیونکہ تخلیق کے حرفِ راز کی تعبیر و تشریح کے لیے جنوں خیز حوصلہ چاہیے وہ جنوں جو شرر سے شعلہ تک رسائی حاصل کرتا ہے اور فلک تاب کہکشاں پر کمندیں ڈالنے کے لیے ولولۂ شوق اور پرِ پرواز بھی بخشتا ہے''[1]

مجموعی طور پر 'اقبال کامل' اقبالیاتی ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس کی عظمت کا اعتراف تقریباً سبھی اقبال ناقدین نے کیا ہے۔ ماہر اقبالیات خلیفہ عبدالحکیم نے جن تین کتابوں کو اقبالیاتی تنقید میں اہم اور قابل قدر گردانا ہے ان میں سے عبدالسلام ندوی کی 'اقبال کامل' بھی ہے۔

---

1اقبال شاعر رنگیں نوا ص ۹۹

# سید عابد علی عابد

اردو کے جن قلم کاروں نے اقبال پر سنجیدگی سے قلم اٹھایا ان میں ایک نام سید عابد علی عابد کا بھی ہے۔ سید عابد علی عابد کی کتاب "شعر اقبال" اور 'تلمیحات اقبال' علامہ اقبال کے کلام کی فنی تنقید کے عمدہ نمونے ہیں جنھیں اقبالیات میں حوالہ جاتی کتابوں کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ سید عابد علی عابد کے تنقیدی نظریات پر لکھتے ہوئے انور سدید کہتے ہیں:

> "عابد علی عابد (متوفی ۱۹۷۰ء) نے تنقیدی اصولوں کی تدوین میں مشرق کی خوش ذوقی اور مغرب سے یکساں فائدہ اٹھایا اور اپنے جمالیاتی مزاج کے مطابق تنقیدی فیصلے دیے ، انہوں نے شعر کے داخل اور خارج سے موسیقی کا آہنگ دریافت کیا اور معنوی خوبیوں کے ساتھ لفظی دلالتوں، تشبیہوں اور استعاروں کے فنکارانہ استعمال کو زیادہ اہمیت دی۔"[1]

چنانچہ عابد علی عابد نے اقبال تنقید میں بھی فکر کے بجائے فن پر توجہ مرکوز رکھی۔ وہ اقبال کے مداح ہیں لیکن پرستار نہیں، وہ جہاں اقبال کی فکری یا فنی خامی محسوس کرتے ہیں اس پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، اس کی راہ میں شخصیت حائل نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال کی شاعری پر ان کے زمانے میں ہی کئی لوگوں نے فنی اعتراضات کیے تھے۔ اقبال نے خود ان کا جواب دیا تھا۔ یہ جواب اقبال کی شاعری کے فن پر مہارت اور قدماء کے اشعار پر ان کی گرفت کا مظہر ہے۔ اس سے پہلے اقبال اس بات پر اصرار کرتے رہے تھے کہ شاعری ان کا مقصد نہیں ہے، وہ صرف اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے

---

1اردو ادب کی مختصر تاریخ از انور سدید، ص۴۵۹

لیے شاعری کا سہارا لیتے ہیں، اگرچہ ان کا بعد میں بھی رویہ یہی رہا لیکن انہوں نے پہلی دفعہ اپنی شاعری کا فنی لحاظ سے دفاع کیا۔ اقبال پر ایک اعتراض یہ تھا کہ اقبال کی شاعری میں ایطا کا عیب پایا جاتا ہے، مطلب یہ کہ بعض دفعہ وہ قافیہ کے اصولوں کی پابندی نہیں کرتے۔ اقبال نے اپنی اس غلطی کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنی شاعری کے جواز کے لیے قدماء کے ان اشعار کو نقل کیا جس میں انہوں نے قافیہ کی پابندی نہیں کی تھی۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ایسا کرنا کوئی عیب نہیں ہے۔ عابد علی عابد نے اس پر تنقیدی نوٹ لکھتے ہوئے کہا:

''اصولاً یہ جواب غلط ہے۔ غلطی کے تکرار سے غلط صحیح نہیں ہو جاتا۔۔۔۔ جہاں تک قدیم شعراء کے کلام میں ایطاء موجود ہے اس توجیہ کی ضرورت نہیں ہے اتنا کہنا کافی ہے کہ ایطاء ہے۔ہاں، اقبال کہہ سکتے تھے کہ اساتذہ نے بھی اس قسم کی غلطی کی ہے۔''

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عابد علی عابد غلط کو غلط کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں جو کہ تنقید میں شرط اولین ہے۔ اس کے باوجود کچھ جگہوں پر انہوں نے بھی اقبال کے ساتھ غلو سے کام لیا ہے۔ اقبال اور مولانا آزاد کی چپقلش مشہور و معروف ہے عابد علی عابد نے اقبال کی عقیدت میں انہیں آزاد سے بڑا مفسر قران قرار دیا ہے۔ اس کو اگر ہم اقبال سے اندھی عقیدت نہ کہیں تو عابد حسین کی کم علمی تو کہہ سکتے ہیں، اقبال کی قرآنی بصیرت اپنی جگہ مسلم ہے مگر مولانا آزاد کی قران فہمی نہ صرف اردو دنیا میں بلکہ عربوں میں بھی مشہور معروف ہے ان کے ہم پایہ قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

'شعر اقبال' کی ابتدا میں انہوں نے 'پس منظر' کے عنوان سے اقبال کی شاعری کے پس منظر پر ایک بھرپور نوٹ لکھا ہے۔ اس کے اندر انہوں نے اقبال کے فکر و فن کے پس منظر، اقبال پر جن شاعروں اور مفکروں کے اثرات رہے نیز اس دور کی ہستیوں میں سرسید، شبلی، اور حالی کے اثرات کو دکھلایا ہے اور کہا ہے کہ چاہے یہ اثرات اسی شکل میں کیوں نہ ہوں کہ اقبال نے ان لوگوں کے رد عمل میں قلم اٹھایا ہو لیکن بہر حال یہ اثرات ہی تو ہیں۔ یہ حصہ اقبالیاتی تنقید میں نیا

ہے، عابد علی عابد کے زمانے میں اور اس کے بعد کے زمانے میں بھی کوئی اس موضوع کو اتنے اچھے اور عمدہ انداز میں بیان نہیں کر سکا ہے۔ عمومی طور پر اقبالیاتی تنقید میں ان رویہ خالصتاً جمالیاتی ہے۔'[1]

عابد علی عابد کی کتاب کا سب سے اہم حصہ کتاب کا تیسرا باب ہے جس میں انہوں نے اقبال کے کلام کی فنی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اس کے لیے جن عنوانات کا انتخاب کیا وہ نہ صرف یہ کہ ان کے عہد تک نئ تھیں بلکہ اب بھی ان کی ندرت بر قرار ہے۔ جو موضوعات اس حصہ میں زیر بحث آئے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

مطابقت الفاظ و معنی

علائم و رموز

صنعت گری

(الف) تشبیہات و استعارات

(ب) محسنات شعر، صنائع و بدائع لفظی و معنوی

(ج) خیال افروزی

(د) ایجاز حذف

عابد علی عابد نے مطابقت الفاظ و معنی کے تعلق سے قدیم و جدید علماء و مفکرین کی آراء پیش کر کے اس حوالے سے بڑی عمدہ گفتگو کی ہے۔ الفاظ و معنی کا رشتہ ایک قدیم فلسفیانہ بحث ہے جس کو کئی علماء زبان نے چھیڑا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ انڈا اور مرغی میں پہلے کون؟ والے مسئلہ کی طرح یہ مسئلہ بھی سلجھتا ہوا نظر نہیں آتا۔ سید عابد نے اس بحث کو کلام اقبال کے حوالے سے جانچنے کی کوشش کی ہے جس میں کسی حد تک کامیاب ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال کی شعری کائنات میں آنے

---

1اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۴۶۰

کے بعد الفاظ کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی نظر میں اقبال کے یہاں ابلاغ و ترسیل کے معاملہ میں الفاظ کی مکمل کامیابی محال ہے۔

اس سلسے میں وہ اقبال کا ایک شعر نقل کرتے ہیں:

ارتباط حرف و معنی اختلاط جان تن
جس طرح اخگر قباپوش اپنی خاکستر سے ہے

عابد علی عابد کہتے ہیں:

''معانی نازک اور مطالب دقیق ازل والہامی ہونے کے باعث جب الفاظ کا لباس پہنتے ہیں تو کسی نہ کسی حد تک اصل مطلب کے کچھ پہلو بیان ہونے سے رہ جاتے ہیں کیونکہ الفاظ انسان کے وضع کردہ ہیں اور ان میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ افکار وخیالات کے تمام پہلو ؤں کو حامل ہوسکیں۔'' [1]

یہ ایک نفیس نکتہ ہے، عابد علی عابد کا ماننا ہے کہ 'جو حقیقتیں الفاظ کا لباس نہیں پہنتیں وہ موسیقی کے لطیف ترین اشاروں کے ذریعہ ادا کی جاسکتی ہیں۔' [2]

اس نفیس علمی و فلسفیانہ بحث میں عابد علی عابد نے اقبال اور فیضی کے مابین اس مسئلہ میں نزاع کا بھی ذکر کرکے اقبال کا دفاع کیا ہے، اصل میں فیضی کا ماننا ہے کہ معانی پہلے سے موجود ہوتے ہیں، شاعر ان کو دریافت کرتا ہے، جبکہ اقبال کا ماننا ہے کہ صناع معانی کا موجد ہوتا ہے، وہ ان معانی کی اپنی دماغی کاوشوں سے تخلیق کرتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا ایک بڑا حصہ علائم اور رموز پر مشتمل ہے عابد علی عابد نے ان علائم اور رموز پر روشنی ڈالی ہے۔ عابد علی عابد کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی بھی فنی نکتہ کو بیان کرتے ہیں تو اس کی مکمل وضاحت کرتے ہیں، پھر قدماء کے اشعار سے اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں، پھر اقبال کے کلام پر آتے ہیں اور اپنی سلجھی ہوئی تحریر سے یکے بعد دیگرے مثالیں دے کر

---

1 شعر اقبال، عابد علی عابد، ص ۳۶۹، بزم اقبال لاہور، طبع دوم ۱۹۷۷، طبع اول ۱۹۵۹

2 شعر اقبال، ص ۳۶۹

اس کی گرہ کشائی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ بعض مقامات پر شجرے بنا کر ان کی تشریح کرتے ہیں۔ عابد علی عابد اقبال کے علائم اور رموز میں سب سے نمایاں جگہ 'انسان کامل' کو دیتے ہیں۔ انسان کامل کے لیے اقبال نے شاہین، قلندر اور درویش کے کلمات بھی استعمال کیے ہیں، ان علامتوں کے استعمال کی وجہ عابد علی عابد کے بقول یہ ہے کہ 'ہر علامت انسان کامل کی کسی خاص صفت کو نمایاں کرکے دکھاتی ہے۔'[1]

''عابد علی عابد نے انسان کامل کے منصب تک پہنچنے کے مراحل کے لیے مختلف کوائف کا ذکر کیا ہے، اور ان کوائف کو اقبال کی استعمال کردہ چند علامتوں کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے، یہ علامتیں نے نوازی، 'پروانہ' ، 'جگنو' ، اور لالہ ہیں، عابد علی عابد نے تفصیل سے ان علامتوں پر روشنی ڈالی ہے ان کے علاوہ شاہین، درویش، انسان کامل، مرد مسلماں، مومن اور قلندر وغیرہ کی وضاحت اقبال کے اشعار کی مدد سے کی ہے۔۔۔۔ عشق، نظر، دید اور فکر وخبر کو عابد صاحب نے کلام اقبال کی روشنی میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔[2]

عابد علی عابد نے اقبال کے کلام میں پائی جانے والی تشبیہوں، استعاروں اور مجاز مرسل وغیرہ کی تفاصیل شجروں کے ساتھ دی ہے۔ اس حصہ میں بھی انہوں نے پہلے ان مصطلحات کی تعریف بیان کی ہے پھر قدماء کے اشعار سے ان کی وضاحت کی ہے پھر کلام اقبال میں ان کے استعمال کو بیان کرکے ان کی فنی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اقبال کی تشبیہات و استعارات کی مقصدیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> '' اقبال کے کلام میں اکثر و بیش تر تشبیہات و استعارات کے استعمال کا مقصد محض آرائش کلام نہیں بلکہ توضیحِ معانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ فطرتِ خارجی کے مناظر کی تصویریں کھینچتے ہیں تو تشبیہات و استعارات میں وہ اکتۂ نہیں ہوتی جو ان کے کلام کا شیوۂ خاص ہے۔ ہاں جب وہ دقیق ر عقلات، باریک تصورات اور لطیف افکار و

---

1 شعر اقبال، ص ۴۰۴

2 تفہیم اقبال جائزہ اور تعین قدر از ڈاکٹر غلام قدوس، ط ۱۹۹۷ء

اسرار کی توضیح کرنا چاہتے ہیں تو ایسی ایسی خوب صورت تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں کہ ان دیکھی چیزیں دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔" 1

عابد علی عابد کے یہاں اس قسم کے جملے بکثرت ملتے ہیں کہ 'ابھی مجھے یاد نہیں آرہا ہے'، یا میں نے اسے کہیں پڑھا ہے' وغیرہ مثال کے طور پر ایک جگہ لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ حافظہ پر زور دینے کے باوجود یاد نہیں آتا کہ میں نے اس طرح کی فوق اور ان کے ہم عصروں کی غزلیں کہاں پڑھی ہیں لیکن پڑھی ضرور ہیں اور کسی غزل کا ایک مصرعہ بھی ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ تھا:

تیری چمپا کلی میں رہتے ہیں"

بعض مرتبہ یہ جملہ کہنے کے بعد بیچ میں کسی اور کا شعر یاد آگیا تو اس کی بھی لکھ دیتے ہیں۔ ان کے اس عمل سے قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے 'غبار خاطر' کی طرح بغیر کسی کتاب کی مدد کے لکھی ہے۔

ایک بات ہے جس کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں وہ یہ کہ عابد علی عابد کو ہر موضوع سے متعلق بے شمار مستند شعراء کے کلام یاد ہیں جن کو موقع و محل کے اعتبار سے وہ استعمال کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہر باب کے شروع میں پہلے دیگر شعرا کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے اشعار بھی بیان کرتے ہیں اس کے بعد اقبال کے کلام سے اس کا موازنہ کرتے ہیں۔ یہ کام عابد علی عابد جیسا شخص ہی کر سکتا ہے۔

عابد علی عابد کے مطابق اقبال کے یہاں شاعری کا محرک کوئی ایک چیز نہیں، وہ کہتے ہیں:

"اقبال کی شخصیت کے پہلو اتنے متنوع تھے کہ آغاز سخن سرائی سے لے کر ۱۹۰۵ء تک انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس جا سرچشمہ ی محض کوئی لگاؤ ہی نہیں بلکہ کچھ اور محرکات اور عوامل بھی ہیں جو انہیں اس بات پر آمادہ کر رہے

---

1شعر اقبال، ص ۳۷۶۔

ہیں کہ وہ غزلوں کے بجائے نظموں میں اپنی بصیرت اور مشاہدے کو جذبات میں سمو کر قاری کے سامنے پیش کریں"[1]

اس کے بعد ان محرکات کی نشاندہی کرتے ہیں:

"الف) مناظر فطرت کے مشاہدات کا تاثر

ب) حب وطن اور ارباب وطن سے عقیدت

ج) عقل اور عشق دل اور دماغ نظر اور خبر الہام اور ادراک کا تقابل تضاد اور باہمی آویزش۔"[2]

جزء دوم میں اقبال کے سفر یورپ کا تذکرہ اور اس کی وجہ سے ان کی شاعری پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔اس کے بعد دوسرے باب میں اقبال کے یورپ کے سفر اور فکری انقلاب کے عنوان سے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔اس باب میں اقبال کے فنی ارتقاء کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اگرچہ موضوع کی مناسبت سے اقبال کی فکر بھی موضوع بحث آئی ہے لیکن عابد علی عابد نے کمال ہوشیاری سے اس کو فنی ارتقاسے جوڑ کر فن پر فکر کو حاوی نہیں ہونے دیا۔البتہ عابد علی عابد کا ماننا ہے کہ اقبال کی شاعری میں فکر و فن کو الگ الگ دیکھنا ممکن نہیں ہے۔اس وجہ سے کہ تصور فن سے فن کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔تصور فن کا تعلق ذہن و فکر سے ہے۔

عابد علی عابد کی کتاب کا سب سے اہم جزو شعر اقبال کا تیسرا حصہ ہے،'صنعت گری' کے عنوان انہوں نے اس حصہ میں اقبال کے کلام میں پائی جانے والی فنی خوبیوں پر اظہار خیال کیا ہے۔عابد علی عابد کا تنقیدی اسلوب مشرقی ہے۔انہوں نے انہیں مشرقی شعریات کے اصولوں کا کلام اقبال کی فنی تفہیم میں سہارا لیا ہے جو حالی اور اس سے پہلے کے شعراء کے یہاں رائج تھیں۔تشبیہ،استعارہ مجاز مرسل،ایہام،تضاد اور بقیہ تمام صنائع وبدائع کا تفصیلی تعارف پیش کرکے اساتذۂ فن

---

1 شعر اقبال ص۱۴۱

2شعر اقبال، ص ۱۴۱۔۱۴۲

کے کلام سے دلیلیں دی ہیں۔ اس کے بعد کلام اقبال کی موتیوں سے اس کی گہر آفرینی کی ہے۔ یہ حصہ 'شعر اقبال' کا ماحصل ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر غلام قدوس لکھتے ہیں:

''کلام اقبال میں تشبیہ، استعارہ مجاز مرسل وغیرہ کی جستجو میں جس دیدہ ریزی اور محنت و کاوش کے ساتھ کی گئی ہے اس سے کتاب کے عنوان کا حق ادا ہو جاتا ہے، چونکہ عابد صاحب نے یہ کتاب اقبال کی شاعری کے فنی پہلو پر لکھی ہے اور کتاب کے اس حصے میں یہ فنی پہلو بہت اچھی طرح نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے اس لیے بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ عابد علی عابد نے کتاب کے موضوع کا حق ادا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔''[1]

عابد علی عابد نے صرف اردو و فارسی شعراء کے کلام ہی نہیں بلکہ عربی شاعروں میں ام کلثوم وغیرہ کے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اردو کی قدیم اصطلاحوں میں انگریزی کا سہارا لے کر خوش نما اضافہ بھی کیا ہے۔ 'خیال افروزی' ایسا ہی ایک لفظ ہے انہوں نے انگریزی کے لفظ suggestion کا ترجمہ کیا ہے۔ اس سے ملتا جلتا لفظ اردو میں بہت پہلے سے مستعمل تھا، خیال آفرینی، عابد علی عابد کے لفظوں میں خیال افروزی 'اسلوب کا شیوۂ خاص' ہے، 'جس کے اسرار و رموز صرف تخلیقی فن کار کو معلوم ہیں۔'[2] ایک اور جگہ انہوں نے خیال افروزی کی تعریف ذرا تفصیل سے پیش کرتے ہوئے کہا ہے:

''خیال افروزی شعر کی وہ صنعت خاص ہے جس سے کام لے کر شاعر گنتی کے الفاظ میں کبھی ان کی صوتی ہم آہنگی سے کبھی ان کے معنوی ربط سے کبھی ان دونوں کے امتزاج سے کبھی دوسرے تلازموں سے کام لے کر ایسی رمزی اور ایمائی کیفیتیں پیدا کر دیتا ہے جن کی دلالتیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، جو معنی الفاظ سے مترشح نہیں ہوتے پڑھنے والا ان کی جھلک بھی ان رمزی اور ایمائی کیفیتوں کے ذریعہ دیکھتا ہے۔''[3]

---

1 تفہیم اقبال ص ۱۰۶

2 شعر اقبال، ص ۵۹۸

3 شعر اقبال، ص ۵۹۹

نے شعر اقبال میں عابد علی عابد کا مطمح نظر اقبال کے شعورِ تخلیق کا جائزہ لینا تھا اس ضمن میں اقبال کے فن اور فکر دونوں سے خوشہ چینی کرنا ناگزیر تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقبال کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھا ہے۔ البتہ ان کی زیادہ توجہ اقبال کے فن پر تھی اس وجہ سے کلام اقبال کے فکری مباحث بہت تفصیل سے سامنے نہیں آسکے لیکن کلام اقبال کے فنی محاسن پر چونکہ کم توجہ دی گئی ہے اس وجہ سے ان کی یہ کتاب ایک حد تک اس ضرورت کو پوری کرتی نظر آتی ہے۔

عابد علی عابد کی نظر اقبال کے کلام کے علاوہ اساتذہ کے فن پر بھی ہے اس کا ثبوت ان کی کتاب کا ہر ایک صفحہ دے رہا ہے لیکن ان کی یہی خوبی اس کتاب کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔ اساتذہ فن کے اشعار میں اقبال کہیں کھو جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے اقبال کے فارسی کلام سے بہت زیادہ مثالیں دی ہیں، عموماً ان اشعار کا ترجمہ بھی نہیں دیا ہے۔ اب اردو داں طبقہ کی وہ نسل ختم ہوتی جارہی ہے جو کبھی فارسی پر بھی عبور رکھتی تھی، اس لیے 'شعر اقبال' کے ان حصوں کے مطالعہ میں غیر فارسی داں طبقہ کو بڑی الجھنوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

اقبال نے داغ کی شاگردی اختیار کی، یہ شاگردی اگرچہ چند روزہ تھی اور وہ بھی بالمصافحہ نہ تھی لیکن اقبال پر اس کے اثرات بہت واضح انداز میں محسوس کیے گئے۔ عام طور پر ناقدین اقبال کے ابتدائی کلام میں ہی داغ کے اثرات تلاش کرتے ہیں۔ جبکہ سید عابد علی عابد کا ماننا ہے کہ یہ اثرات ان کی شاعری میں آخر تک رہے البتہ اس کی نوعیت الگ ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''داغؔ کی غزل میں اُردو شعری روایت کے تمام علائم اور رموز موجود تھے۔ اقبال نے ان کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر اپنے سیاسی، ملی اور فلسفیانہ افکار کے ابلاغ کے لیے انہی علائم و رموز کو نئی معنویت دی۔''[1]

عابد علی عابد کی اقبال شناسی کی دلیل صرف یہی کتاب 'شعر اقبال' ہی نہیں ہے انہوں نے تلمیحات اقبال'[2] لکھ کر اقبال فہمی کے لیے ایک بنیاد فراہم کیا۔ اس کتاب میں انہوں اقبال کے اردو کلام اور فارسی کلام میں واقع تلمیحات کو حروف تہجی کے اعتبار سے بیان کیا ہے۔ ترتیب میں اقبال کے کلام کے مجموعوں کا خیال رکھا ہے۔ سب سے پہلے بانگ درا، پھر بال

---

1 شعر اقبال، لاہور،، ص ۸۴

2 یہ کتاب بزم اقبال لاہور سے ۱۹۵۹ میں شائع ہوئی۔

جبریل، ارمغان حجاز اور آخر میں ضرب کلیم میں واقع تلمیحات کی تشریح کی ہے۔ یہی طریقہ فارسی کلام اقبال کے حصہ میں بھی انہوں نے اپنایا ہے۔

'تلمیحات اقبال' عابد علی عابد کا ایک منفرد کارنامہ ہے جس کو بنیاد بنا کر بعد کے ناقدین اقبال نے بھی اقبال کی تلمیحات اور اشارات پر کتابیں ترتیب دی ہیں۔ لیکن ان سب میں مقدم ہونے کی وجہ سے عابد علی عابد کا نام سب سے اوپر رہے گا۔

عابد علی عابد نے عام طور پر تلمیحات اقبال کی تشریح میں کلام اقبال سے متعلقہ مقام کی تشریح یا حوالہ دینے سے گریز کیا ہے، ایسا غالباً کتاب کی ضخامت کی وجہ سے کیا ہے لیکن اس سے قاری کو مذکورہ تلمیح کے بارے میں واقفیت نہیں ہو پاتی کہ اقبال نے اسے کس پس منظر میں استعمال کیا ہے۔ عابد علی عابد کم از کم ان اشعار کا حوالہ دے سکتے تھے جس سے قاری ان اشعار کی طرف رجوع کر لیتا لیکن انہوں نے اس سے بھی احتراز کیا ہے۔ البتہ جہاں انہوں نے ضرورت محسوس کی ہے وہاں تفصیل سے کام لیا ہے۔ اقبال کے کلام کے علاوہ دوسرے شعراء کے کلام سے بھی مثالیں پیش کی ہیں۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے انہوں نے تلمیح 'ابن بدروں' کی تشریح کی ہے۔ علامہ اقبال نے بانگ درا کی ایک نظم 'صقلیہ' میں کہا ہے:

"آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی

ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی"

اس شعر میں وارد 'ابن بدروں' کی تشریح میں عابد علی عابد نے دولت غرناطہ کی تاریخ پر روشنی ڈالی، اس کے بعد بتایا ہے کہ ابن بدروں کی طرف اس مرثیہ کی نسبت کرنا غلط ہے کیوں کہ اصل میں اس کا لکھنے والا عبدون تھا، ابن بدروں نے اس مرثیہ کی شرح لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابن بدرون جس دولت غرناطہ کی بربادی کا ماتم کر رہا ہے وہ کون سی ہے، پہلے تو یہ سن لیجئے کہ غرناطہ کی تباہی کا مشہور مرثیہ ابن بدرون نے نہیں بلکہ عبدوں نے لکھا ہے جس کا پورا نام ابو محمد عبدالمجدی الفہری ہے۔ یہ شاعر ۱۱۳۴ھ میں وفات پاتا ہے، اس مرثیہ کی متعدد شرحیں لکھی گئیں اس میں ابن بدروں کی شرح سب سے اچھی خیال کی جاتی ہے۔ اب واضح ہو گیا کہ غرناطہ کے جس مرثیہ کا ذکر علامہ کر رہے

ہیں وہ بنی نصر سے تعلق نہیں رکھتا کہ ابن عبدون ۱۱۳۴ھ میں وفات پاجاتا ہے۔ بہ قطع ویقین معلوم ہوا کہ یہ مرثیہ بنی زیری کے عہد حکومت سے متعلق ہے۔''

عابد علی عابد مزید لکھتے ہیں:

''بہر حال مراد علامہ کی یہ ہے کہ غرناطہ کی بربادی پر ابن عبدون نے قصیدہ لکھا ابن بدروں نے اس کی شرح کی لیکن صقلیہ کا ماتم کسی نے نہیں کیا وہ میرے حصے آیا۔''

مذکورہ بالا اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ 'تلمیحات اقبال' میں:

- عابد علی عابد استدلالی اسلوب کی پیروی کرتے ہیں، بعض دفعہ مناظراتی اسلوب کی جھلک بھی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن اقبال کے فن اور فکر پر گرفت کرتے وقت وہ قدرے نرم لہجہ اختیار کرتے ہیں۔
- ضرورت کے مطابق تاریخی حقائق کو مدلل انداز میں بیان کرتے ہیں۔
- ضرورتاً کلام اقبال کے متعلقہ حصے کی تشریح بھی کرتے ہیں۔

اقبال تنقید اور خاص طور پر اقبال کی فنی تنقید پر عابد علی عابد نے جو کچھ لکھا ہے وہ اقبالیات کے تنقیدی سرمائے کو وقار بخشتا ہے۔جب بھی کلام اقبال کے فنی رموز کی بات ہوگی عابد علی عابد کا ذکر ناگزیر ہوگا۔

# مجنوں گورکھپوری

ڈاکٹر سچدانند سنہا کی طرح اقبال کے افکار و نظریات پر کڑی تنقید کرنے والے مجنوں گورکھپوری اس معنی میں ڈاکٹر سنہا سے مختلف ہیں کہ انہوں نے اقبال پر لکھتے وقت صرف منفی پہلوؤں کو ہی نہیں دیکھا ہے۔ بلکہ وہ اقبال کی آفاقیت اور شعری کمالات کے بھی قائل ہیں۔ بحیثیت شاعر انہوں نے اقبال کی جس قسم کی توصیف کی ہے وہ ان کے معاصرین کے یہاں بھی نظر نہیں آتی۔ وہ اقبال کو صاحب بصیرت اور دانائے راز جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ دور دور تک ان کی جگہ لینے والا نظر نہیں آتا۔[1] اقبال کی فکر میں لاکھ کجی دیکھنے کے باوجود ان کا اصرار ہے کہ اقبال کو عہد آفریں شاعر ماننے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو۔[2]

اقبال نے مغربی مفکرین سے استفادہ کیا ہے اس میں کوئی دورائے نہیں ہے۔ اقبال کے اس پہلو پر لکھتے ہوئے عام طور پر ناقدین افراط و تفریط کا شکار ہوگئے ہیں لیکن مجنوں گورکھپوری نے اس مقام پر اعتدال کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ وہ اقبال پر گوئٹے، نطشے، ہیگل، برگساں، ورڈورتھ، ہائنا اور جرمنی فلسفی لاسبر کے اثرات کے قائل ہیں۔ مجنوں اقبال کے اخذ ورد کی صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اسی خصوصیت کی وجہ سے اقبال کے یہاں مشرقی خیالات اور مغربی افکار کا جو امتزاج ہے وہ کہیں اور نہیں نظر آتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری اقبال کو بنیادی طور پر غزل کا شاعر مانتے ہیں ان کا ماننا ہے کہ ان کے اندر یہ اثرات داغ کی شاگردی کی وجہ سے آئے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

1 اقبال از مجنوں گورکھپوری، ص ا، اشاعت اول ۱۹۵۰ء

2 ایضاً ص ٦

''ہم کو تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اقبال فطرتاً غزل گو تھے اور اتنے بڑے نظم نگار ہونے کے بعد اور اس کے باوجود بھی وہ غزل گو ہی رہے۔ نظموں میں بھی اُنہوں نے ایک قسم کی غزل گوئی ہی کی ہے۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ان نظموں میں شاید گنتی کے اشعار ایسے نکلیں گے جو فرداً فرداً اپنی جگہ معنی اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے مکمل نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اقبال کی نظموں کے بند کے بند بغیر ارادہ اور کوشش کے زبان پر چڑھ جاتے ہیں اور ہر شعر اپنے اندر ضرب المثل ہو جانے کی قوی صلاحیت رکھتا ہے۔'' [1]

ترنم اور موسیقی کو وہ شاعری کے لیے لازمی عنصر قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے یہاں پائی جانے والی موسیقیت میں ہمواری اور بلاغت کے عنصر کو خاص اہمیت دیتے ہیں اس اعتبار سے وہ اقبال کو غالب اور داغ سے بڑا شاعر مانتے ہیں:

''میر سے لے کر داغ تک اور داغ سے لے کر اب تک ہر شاعر کے وہاں موسیقیت ملے گی اور ہر شاعر کی موسیقیت کا انداز جدا ہو گا۔ اقبال کی شاعری کا بھی ایک غالب عنصر اس کی انفرادی موسیقیت ہے، جس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہمواری اور بلاغت ہے۔ اس اعتبار سے اُردو کا کوئی دوسرا شاعر ان کا پورا حریف نظر نہیں آتا۔ اگر داغ ہمواری میں ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو بلاغت اور معنوی قدر کا ان کے یہاں پتا نہیں ہے۔ اور اگر غالب بلاغت میں اقبال کے ہمسر کہے جاسکتے ہیں تو ان کے کلام کی موسیقیت میں ایسی ہمواری نہ ملے گی۔'' [2]

مجنوں گورکھپوری پہلے رومانی نقاد کی صورت میں سامنے آئے پھر انہوں نے ترقی پسندی کے راستے کو اختیار کیا۔ ایک طرف ان کی ترقی پسندی تھی جو ادب میں 'کیسے' کے بجائے 'کیا' کا جواب تلاش کرنے کی زیادہ کوشش کرتی تھی تو دوسری طرف ان کا شاعرانہ مزاج انہیں 'کیا' پر 'کیسے' کو اہمیت دینے پر اکسایا۔ اقبال تنقید میں انہوں نے ترقی پسند سے زیادہ ایک شاعر کی نظر سے اقبال کو دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب اقبال کی شاعری سے زیادہ لوگ ان کے فلسفے اور پیغام پر توجہ دے رہے تھے انہوں نے اقبال کو بحیثیت شاعر دیکھا وہ اقبال کے بعض خیالات سے اختلاف کے باوجود اس بات کے قائل ہیں کہ :

---

1 اقبال از مجنوں گورکھپوری

2 اقبال از مجنوں گورکھپوری

'اقبال کے اشعار ہماری سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، یا ان کے افکار و نظریات سے ہم کو اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن جس خصوصیت کا ان کے حامی اور مخالف دونوں کو قائل ہونا پڑے گا، وہ یہ ہے کہ ان کا ایک مصرع ایسا نہیں ہوتا جو نازک سے نازک ساز پر گایا نہ جا سکتا ہو۔ اور یہ خصوصیت محض غنائی نہیں ہے یعنی وہ محض خوش آہنگ الفاظ کے حسنِ ترتیب سے نہیں پیدا ہوئی ہے۔ اقبال کے اشعار میں جو موسیقیت ہوتی ہے، وہ ایک مرکب آہنگ ہے جس کو الفاظ و افکار دونوں سے بہ یک وقت ایک اصلی اور اندرونی تعلق ہوتا ہے اور ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ اور معنی باہم مل کر ایک ایسی دھُن پیدا کر رہے ہیں جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اقبال کا ترنم کبھی سطحی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر تہ بہ تہ گہرائیاں ہوتی ہیں۔'[1]

مجنوں گورکھپوری کی تنقید کی بنیادی خصوصیت اسلوب کی لذت اور ذوقی رویہ ہے۔ انہوں نے اقبال کی تنقید میں بھی ذوقی رویہ کو خوبصورتی سے اپنایا ہے۔

مجنوں گورکھپوری کے نزدیک اقبال کی شاعری کی اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

- موسیقیت و ترنم۔
- الفاظ اور ترکیبوں کے حسنِ انتخاب جس کو مجنوں 'کلاسیکی اسلوب' کا نام دیتے ہیں۔
- فارسی و عربی تاریخی زندگی سے متعلق روایات و تلمیحات اور انہی سے ماخوذ تشبیہات و استعارات کا بکثرت استعمال۔

ان تینوں اہم خصوصیات میں بھی انہوں نے سب سے زیادہ موسیقیت اور غنائیت پر زور دیا ہے۔ جو ان کے یہاں شاعری کا سب سے اہم جزو ہے۔ جہاں تک تیسری خصوصیت کی بات ہے تو مجنوں اسے اقبال کی کمزوری بھی مانتے ہیں اور دوسری ہی سانس میں اسے اقبال کی شاعری کا کمال بھی۔ مجنوں کی تنقید کا یہی اسلوب ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ناقدین نے کہا ہے کہ وہ قول محال پیش کر کے قاری کو الجھانے کا کام کرتے ہیں۔ اقبال کے بارے میں ان کی یہ رائے بھی اسی کے ضمن میں آتی ہے:

---

1 اقبال از مجنوں گورکھپوری

''ایک گروہ ایسا ہے جو اقبال پر اعتراض کرتا ہے کہ ان کے وہاں فارسی الفاظ اور ترکیبوں اور ایران و عرب کی تواریخی زندگی سے متعلق روایات و تلمیحات اور انہی سے ماخوذ تشبیہات و استعارات کی بھرمار ہے۔ یہ شکایت ایک خاص نقطۂ نظر سے اور ایک حد تک بجا بھی ہے۔ اقبال کی بڑھی ہوئی فارسیت نے ان کو عوام کا شاعر ہونے نہیں دیا اور اس لحاظ سے وہ یقیناً خسارے میں رہے۔ مگر پھر ایسا مفکر اور ایسا صاحبِ شعور شاعر عوام کی اور پھر ہندوستان کے عوام کی چیز نہیں ہو سکتا۔ اقبال کی فارسیت سے ان کو صرف اس قدر نقصان پہنچا ہے کہ ان کے سمجھنے والوں اور ان کے پیغام سے موافق یا مخالف اثر قبول کرنے والوں کا دائرہ محدود ہو گیا۔ لیکن اس سے ان کی شاعری کو فائدہ بھی بہت پہنچا۔ ان کے کلام میں ایک حلاوت، ایک متنوع ترنم، ایک بلیغ خوش آہنگی بھی پیدا ہو گئی ہے جو داغ یا امیر کی سلیس اور عام فہم اور رواں اور سہل زبان کے استعمال سے نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اقبال کی شاعری میں جو صوتی حسن ہے، اس کی ترکیب میں جہاں اور بہت سے عناصر داخل ہیں، وہاں ایک عنصر فارسی الفاظ کا صحیح اور کامیاب انتخاب اور ان کا قرینے کے ساتھ استعمال بھی ہے۔'' [1]

ایک ہی جملے میں وہ ایک ہی چیز کو اقبال کے لیے مضر بھی قرار دیتے ہیں اور فوراً ہی اس کی توجیہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہی خرابی فوراً ایک خوبی نظر آنے لگتی ہے۔ ان کے بارے میں انور سدید لکھتے ہیں:

''مجنوں ادبی مسائل کو مستقیم انداز میں حل نہیں کرتے بلکہ قول محال پیدا کر کے قاری کو الجھا دیتے ہیں، یہ حربہ انہوں نے تفہیم و تعبیر اقبال میں زیادہ استعمال کیا ہے۔'' [2]

مجنوں گورکھپوری کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ جس اقبال کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان تھے اسی اقبال پر آگے جاکر جس خلط مبحث کا شکار ہوئے اس نے اقبالیاتی ادب میں ان کا وقار مجروح کر دیا۔ اقبال کے تصور عشق اور آزادی پر لکھتے ہوئے اقبال کی ملی شاعری کی بحث چھیڑ کر اقبال پر حملہ آور ہوگئے۔ بقول پروفیسر عبدالحق انہیں اقبال کی حجازی لے پسند نہیں آئی۔ انہوں نے اقبال کی اس سلسلے میں کڑی تنقید کی۔ وہ لکھتے ہیں:

---

1 اقبال از مجنوں گورکھپوری

2 اردو ادب کی مختصر تاریخ، از انور سدید، ص ۴۶۲، ط، عالمی میڈیا ٹرسٹ، ۲۰۱۴ء

''آخری دور میں اقبال کی شاعری میں ایک اور میلان پیدا ہو گیا جو حجازیت سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور جس کو ہم عقابیت کہیں گے جو ایک قسم کی فاشیت (FASCISM) ہے۔ جس طرح اقبال کے تصور میں حجاز نے اپنا تسلط جما لیا تھا۔ جس طرح عقاب شاہین اور شہباز اور چیتے جیسے سفاک جانوروں نے بھی ان کی فکر و بصیرت میں ایک مرکزی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ وہ ان میں بالخصوص مرد مومن میں انہیں پھاڑ کھانے والے جانوروں کی خصلت دیکھنا چاہتے ہیں سنئے کتنی لذت سے کہتے ہیں:

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ذرا ہم آپ تھوڑی دیر کے لیے سوچیں کہ اگر یہ غارت گرانہ میلان عام ہو جائے تو ہماری دنیا کا کیا حال ہو گا اور وہ رہنے کے لیے کیسی چیز ہو گی۔''[1]

دراصل یہاں مجنوں گورکھپوری کو مغالطہ ہوا، اقبال نے خود ہی کہا ہے کہ کبوتر کے لہو سے زیادہ مزہ اس کے طلب میں کی جانے والی تگ و دو میں ہے۔ وہ اس کے ذریعہ قوم کو حرکت و عمل کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر عبدالحق لکھتے ہیں:

''جھپٹنا پلٹنا کسی لغت میں جنگ کرنے کے معنی میں مستعمل نہیں ہوا ہے۔ اس میں اقبال کا فلسفہ سخت کوشی پوشیدہ ہے۔ جنگ کا تصور کہیں سے نہیں ہے۔ سکون دوسام سے اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔ اس سکون بروا لوم کو ختم کرنے کے لیے جھپٹنا پلٹنا ضروری ہے۔ اس میں قتل و غارت گری کا عنصر نہیں ہے اور نہ اس کا شائبہ اور نہ اس میں پھاڑ کھانے کے رمز موجود ہیں۔ ''شاہین'' درویش بھی ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔''[2]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

---

1 اقبال ص ۴۹ از مجنوں گورکھپوری

2 اقبال کے ابتدائی افکار از عبدالحق ص ۴۴، ۴۵

"مجنوں گورکھپوری نے شاہین کی غلط تاویل کرکے ایک غلط فہمی پیدا کی ہے۔ حالانکہ شاہین کی علامت میں قتل و غارت گری کا عنصر شامل نہیں ہے۔ اس میں طاقت اور خیر کی طاقت کا رمز پوشیدہ ہے۔"[1]

عزیز احمد نے اقبال کے شاہین کے بارے میں بہت اہم بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اقبال کا شاہین جو آسمان کو زیر پر رکھتا ہے کبوتروں کو مارنا نہیں سکھاتا۔ وہ بلند پرواز خیر کی طاقت کا رمز ہے۔ جبر کا نہیں طاقت اس لیے ضروری ہے کہ انسان مظلوم نہیں بن سکتا۔ اور مظلوم بننا ایک ایسی کمزوری ہے جس کو اقبال اور قدرت دونوں حقارت سے دیکھتے ہیں اقبال نے دوسرے تمدنوں یا دوسرے مذہبوں کے حقوق پامال کرنے کی ہدایت نہیں کی ہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے بے انتہا قوت مہیا کرنے کی البتہ تلقین کی ہے اگر یہ شاہینی طاقت نہ ہوتی تو کیا اسٹالن گراڈ کا تحفظ ممکن تھا؟ کیا آج سویٹ فوجیں وارسا اور بوداپشت تک دشمنوں کا پیچھا کر سکتیں۔"[2]

مجنوں گورکھپوری کو بھی سردار جعفری کی طرح اقبال کے افکار میں تضاد نظر آتا ہے۔ وہ اقبال کے یہاں پائے جانے والے تضادات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں ایسے تناقضات کی حامل ہیں جو کسی طرح شیر شکر نہیں ہوسکتے" [3]

مجنوں گورکھپوری نے اقبال پر زیادہ نہیں لکھا ہے۔ لیکن جو بھی لکھا ہے اس کو اقبال کی شاعری پر ایک تاثراتی نوٹ کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ اس تاثراتی نوٹ میں انہوں نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اور ان کی نظر میں جو خامیاں تھیں ان پر کھل کر تنقید بھی کی۔ اگر چہ یہ تنقید بعض لوگوں کو ناگوار لگی لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں سے اقبال تنقید کو ہندوستان میں

---

1 اقبال کے ابتدائی افکار ص ۴۷

2 ترقی پسند ادب از عزیز احمد ص ۴۹

3 اقبال از مجنوں گورکھپوری ص۲۶

فروغ دیا ہے۔ تنقید کی دنیا میں ہر ایک کو اپنی بات کہنے کا پورا اختیار ہے۔ مجنوں گورکھپوری کو اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر انہوں نے اقبال پر کڑی تنقید کی ہے تو دوسری طرف ان کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے:

"اقبال نے اپنے فن میں ڈوب کر خودی اور بے خودی کا فلسفہ لکھا ہے جسے نئی دنیا کا نیا دستورالعمل قرار دیا جاسکتا ہے۔"[1]

مجنوں گورکھپوری اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے اقبال کے زیر سایہ پرورش پائی۔ ان کے زمانے تک اقبال کا طوطی بولتا تھا۔ اقبال کے خلاف تو دور، ان کی مخالفت میں ایک جملہ بولنا بھی محال سمجھا جارہا تھا۔ مجنوں گورکھ پوری نے اپنی فہم وذکا کے مطابق اقبال کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اقبال کے جن نظریات سے انہیں اختلاف ہوسکتا تھا اس کا انہوں نے برملا اظہار بھی کیا۔ اس کو ادب میں تنقید کی صالح روایت کو برقرار رکھنے کے لیےایک لازمی عنصر کے طور پر دیکھنا چاہیئے۔

---

1 پردیسی کے خطوط ص ۹۳ بحوالہ اقبال کے ابتدائی افکار

# فراق گورکھپوری

کلیم الدین احمد نے اقبال کے بارے میں جن انتہا پسندانہ خیالات کا اظہار کیا تھا اس کا جواب اقبال کے پرستاروں کی طرف سے اس سے بھی سخت لہجے میں دیا گیا۔ کلیم الدین احمد کو انتہا پسند اور متنازعہ نقاد کہہ کر ناقدوں نے سکون کا سانس لیا۔ کلیم الدین احمد سے بھی پہلے مجنوں گورکھپوری نے اپنی تنقید میں اقبال کی شاعری اور فلسفے کے بعض عناصر سے نہ صرف اختلاف کیا تھا بلکہ اس کا برملا اظہار بھی کیا تھا۔ مجنوں گورکھپوری کو اقبال شکن مانا جاتا ہے، ان کے بارے میں عام رائے کچھ اس انداز سے قائم کی گئی کہ ان کی اقبال تنقید کے مثبت عناصر کو بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ دراصل اقبال تنقید جس طرح سے ایک خاص ڈھرے پر چل رہی تھی اس کے لیے مجنوں گورکھپوری اور کلیم الدین احمد جیسے ناقدین کی ضرورت تھی۔ فراق کے نظریات سے اختلاف کے باوجود اقبالیات میں ان کی میرے نزدیک یہ ہے کہ انہوں نے اقبالیات میں کئی سوالات قائم کئے۔ اقبال کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی شاعری شروع ہی سے ایک ایسی شاندار ذہنیت و شخصیت کا ثبوت دے رہی تھی جسے ہم انگریزی میں split personality کہتے ہیں۔ دو حصوں میں منقسم یہ دونوں حصے ایک دوسرے کی ضد تھے اور باہم متناقص، متضاد اور متصادم تھے۔ اس شخصیت کا ایک حصہ ہندوستان پرست تھا اور دوسرا حصہ ملت اسلامیہ پرست یا فرقہ پرست''

فراق گورکھپوری نے اقبال پر سخت قسم کی تنقید کی ہے انہیں اقبال کی حجازی لے پر سخت اعتراض ہے۔ جہاں تک اقبال کے کلام میں موجود تضادات کی بات ہے تو فراق گورکھپوری کے علاوہ دوسرے ناقدین نے بھی قلم اٹھایا ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ فراق کو سارے تضادات برداشت ہیں لیکن وطنی اور ملی شاعری کے درمیان پائے جانے والے تضاد کو وہ برداشت نہیں کر سکتے۔

پروفیسر عبدالحق نے فراق گورکھپوری کی اقبال پر 'ملن' عصبانہ' تنقیدوں کا سخت لہجے میں جواب دیا ہے۔ حالانکہ پروفیسر عبدالحق کا لہجہ تلخ ہو گیا ہے لیکن فراق گورکھ پوری کے لہجے میں اقبال کے تئیں جو ترشی ہے اس سے بہر حال

عبدالحق صاحب کی تلخی کم ہے۔ عبدالحق نے اقبال کے دفاع میں صرف اقبال کی شاعری کے ان عناصر کا ذکر نہیں کیا ہے جن میں حب الوطنی اور سیکولزم کے نمونے ہیں بلکہ فراق ہی کے مختلف اقوال جو انہوں نے دوسرے پس منظر میں لکھے ہیں بیان کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال پر فرقہ پرستی کا الزام رکھنے والے فراق خود فرقہ پرست تھے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ ایک طرف تلسی کی رامائن کی مدح سرائی کرتے ہیں کہ وہ اعتقادی اقدار سے لبریز ہے مگر اسلامی اقدار کی ترسیل کرتی اقبال کی شاعری فرقہ پرستی کے دائرہ میں آجاتی ہے؟[1]

فراق کی اقبال تنقید پر پروفیسر عبدالحق نے ہی نہیں بلکہ دیگر ناقدین نے بھی عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر محمد حسن کی رائے میں ان کی اقبال تنقید 'سخت اور جارحانہ ہے اور ہر طرح کے انتقادی معائر سے محروم ہے۔'[2]

فراق دراصل بنیادی طور پر شاعر تھے اس کے باوجود انہوں نے تنقیدی مضامین اور کتابیں لکھیں۔ چونکہ وہ درس و تدریس سے وابستہ تھے اس وجہ سے تنقیدی مضامین سے سروکار رکھنا ایک ضروری امر تھا۔ انہوں نے اقبال کا زمانہ بھی پایا تھا۔ شاعروں میں ایک دوسرے کی مقبولیت کو دیکھ کر جو دلی کیفیت ہوتی ہے فراق کی اقبال تنقید اسی کی اظہاری شکل ہے۔

پروفیسر عبدالحق اقبال پر فراقؔ کے تنقیدی سرمائے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اقبال سے متعلق فراق کے خیالات ان کے مضامین، بیانات اور بعض تحریروں میں ضمنی طور پر آ گئے ہیں۔ جن میں تعریف و تحسین بہت کم اور تنقیص و تضحیک غالب ہے۔ دو مضامین 'آج کل اقبال نمبر' علامہ اقبال سے متعلق خوش فہمیاں ۱۹۷۷ء کا اور اقبال کی شاعری مشمولہ 'باتیں فراق سے' توجہ طلب ہیں۔ اقبال کے عام معترضین کی طرح وہ بھی اقبال کے شعری اکتسابات کی عظمت کے کسی حد تک قائل ہیں مگر فکر و فلسفہ کی افادیت سے انکار اور اس کی آفاقیت سے وہ خاص طور پر بیزار ہیں۔''[3]

---

1 پروفیسر عبدالحق، اقبال اور اقبالیات ص ۱۳۲، ناشر مؤلف خود، سن اشاعت: ۲۰۰۶ء

2 بحوالہ اقبال اور اقبالیات، ص ۱۳۰

3 اقبال اور اقبالیات ص ص ۱۳۱۔۱۳۲

ایک بات خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے کہ فراق نے اپنی شاعری میں ہندوستانی عناصر کو شامل کیا اور اسے خوبصورتی سے برتا ہے۔ ہندو دیومالاؤں سے اردو غزل کو رنگینی بخشی۔ یہی کام اقبال نے اسلامی روایات کی شمولیت سے اردو غزل میں کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک بات اور ملحوظ رہے کہ اقبال نے وسعت قلبی سے کام لے کر رام، گرونانک، بھرتری ہری وغیرہ کا بڑے والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ ان کے بارے میں نظمیں کہیں۔ لیکن فراق اپنی پوری شاعری میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک بھی نظم نہیں کہہ سکے۔ وسعت قلبی کس کے یہاں ہے؟ فراق کے یہاں یا اقبال کے یہاں؟ کوئی ضروری نہیں کہ آدمی اسی وقت وسیع القلب اور سیکولر کہلائے جب وہ تمام مذہبی اور سماجی بزرگ و شخصیات کے بارے میں توصیفی کلمات کہے۔ یہاں صرف مقصود یہ ہے کہ اقبال اپنی تمام تر فراخدلی کے باوجود فراق کے نزدیک فرقہ پرست ہیں اور خود فراق نے صرف ایک خاص مذہب اور اس سے متعلق شخصیات کا ذکر کرکے خود کو سیکولر ثابت کر دیا؟

ایک اور جگہ فراق نے اپنے ایک مضمون 'اتحاد اور قومی یک جہتی' میں اقبال کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''جہاں تک اردو زبان وادب کا تعلق ہے۔ ہمیں مغرب یا غیر مسلم قوموں کے خلاف اور زہریلے غصہ سے بچنا ہے جس کی قابل افسوس مثالیں اقبال کی شاعری میں ملتی ہیں۔''[1]

یہی فراق ہیں جب جوش ملیح آبادی کو پاکستان خط لکھتے ہیں تو اقبال کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں ، ی ملقانہ انداز اپناتے ہیں، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ خط انہوں نے پاکستان میں بغرض اشاعت بھیجا تھا۔ اور پاکستان میں اقبال شکن خط یا مضمون کی اشاعت تو دور کوئی اسے پڑھنا بھی گوارہ نہیں کرتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے جوش ملیح آبادی کو مخاطب کرکے اقبال کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''یہ تمہاری غلطی تھی پاکستان میں رہ کر اقبال کی مخالفت دانشمندی نہیں اور صحیح بات تو یہ ہے کہ تم اقبال کو سمجھ نہیں سکتے کیوں کہ اقبال نے دین اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی افادیت میں اعلیٰ پیمانے کی گہر افشانی کی ہے ان کا علم اس معاملہ میں مکمل ہے تمہارا علم ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ تم دین سے واقف نہیں۔۔۔ میں

---

1 بحوالہ ، اقبال اور اقبالیات ص ۱۳۶

نے جو اقبال پر اعتراض کیے ہیں ان کی نوعیت الگ ہے۔ یعنی وہ ملت کی شاعری اگر نہ کرتے تو عظیم شاعر ہوتے۔"[1]

تنقید میں جس طرح کی مصلحت کوشی کی دعوت فراق نے جوش ملیح آبادی کو دی ہے وہ اپنے آپ میں تنقید کے لیے خطرناک ہے۔ تنقید نگار کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ حق بات کے اظہار میں کسی کی پرواہ نہ کرے۔ جہاں تک مذکورہ بیان کے آخری ٹکڑے کی بات ہے جس میں انہوں نے اپنی اقبال تنقید کا جواز پیش کیا ہے، توانہوں نے اقبال کو فرقہ پرست کیوں کہا؟ مذہبی گفتگو کرنا کیا فرقہ پرستی ہے اگر ہے فراق گورکھپوری بھی اس کے مرتکب ہوئے ہیں؟

ایک اور مقام پر وہ اقبال کی شاعری میں وطن سے ملت کی طرف رجوع کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

'اقبال کی شاعری موجودہ صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں قدم رکھتی ہے۔ ہندستان کی نشاۃ ثانیہ کا آفتابِ نصف نہار اس زمانہ میں بہت بلند ہو چکا ہے اور اس نئی بیداری سے اقبال بیک وقت متاثر بھی ہیں اور خائف بھی۔ بلکہ لرزہ براندام بھی۔۔۔۔ وطن پرست اقبال کا اس زمانے میں انتقال ہو چکا ہے اور اقبال اپنے ہی ہاتھوں اسے دفنا چکے ہیں۔ اسی دوران اپنی ملت پرستی کے جواز میں اقبال نے فلسفۂ خودی اور بے خودی کا ایجاد بندہ قسم کا آڈمبر رچا۔"[2]

مذکورہ اقتباس میں فراق نے تین دعوے کیے ہیں:

1. اقبال نے موجودہ صدی (انیسویں صدی) کی تیسری اور چوتھی دہائی میں وطنی شاعری چھوڑ کر ملی شاعری شروع کر دی تھی۔ جس کو فراقؔ وطن پرست اقبال کی موت اور خود اپنے ہاتھوں اسے دفنانے سے تعبیر کرتے ہیں۔
2. ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ سے اقبال 'متاثر بھی ہیں، خائف بھی بلکہ لرزہ براندام بھی ہیں۔'

---

1 لٹریری نیوز لاہور، پیش رفت، دہلی/ اکتوبر ۱۹۹۸ء بحوالہ اقبال اور اقبالیات از عبدالحق ص ۱۳۷

2 بحوالہ اقبال اور اقبالیات ص ۱۳۶

3. اسی دوران یعنی انیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ملت پرستی کے جواز میں ' فلسفۂ خودی اور بے خودی کا ایجاد بندہ آڈمبر رچا'۔

جہاں تک پہلے دعوے کی بات ہے تو پہلی بات یہ کہ اقبال کی شاعری میں وطن پرستی جس کو اس سے بھی وسیع معنی میں وطن دوستی کہنا زیادہ مناسب ہو گا آخری زمانے تک وطن دوستی اقبال کے یہاں موجود رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اقبال نے ۱۹۰۸ء ہی میں وطن پرستی کے 'پر فریب مغربی تصور کو خیر باد' کہہ دیا تھا۔ چنانچہ اقبال کا یہ شعر بطور ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

جہاں تک دوسرے دعوے کی بات ہے تو اقبال خود ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کے علمبرداروں میں سے تھے۔ ان کا پورا پیغام اسی کا غماز ہے۔ اگر فراق کی مراد کسی اور نشاۃ سے ہے تو اس کی وضاحت ہونی چاہئے تھی۔

اقبال نے فلسفۂ خودی کو دوسری دہائی میں ہی پیش کر دیا تھا، اور یہ ایجاد بندہ نہیں بلکہ عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔[1]

فراق گورکھپوری نے اقبال تنقید پر جو بھی لکھا ہے اس کو اردو تنقید میں ایک مثبت روایت کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ سراسر اردو تنقید میں فرقہ واریت کو فروغ دینے کی ناروا کوشش ہے۔ اس کی پذیرائی نہیں کی جا سکتی ہے۔

---

1 اقبال اور اقبالیات از عبدالحق ص ۱۳۷-۱۳۸۔

# رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی کا شمار ان ناقدین میں ہوتا ہے جن کے بغیر اردو تنقید کی مختصر سے مختصر تاریخ بھی نامکمل رہے گی۔ انہوں نے اقبال پر کوئی مبسوط کتاب اگرچہ نہیں لکھی لیکن وہ اقبال کے مداحوں میں سے تھے انہوں نے چند مضامین مختلف مواقع پر لکھے جنہیں کتابی شکل میں 'اقبال شخصیت اور شاعری' کے عنوان سے شائع کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے زیادہ مضامین تائثراتی ہیں۔ لیکن درمیان میں اقبال تنقید کے کئی اہم نکات انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ ایک ممتاز ناقد ہیں چاہتے تو اقبال اور ان کی شخصیت پر تفصیلی کتاب لکھ سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے صرف ان امور پر توجہ دی جو ان کی نظر میں اقبال فہمی میں ضروری تھیں۔ اقبال شخصیت اور شاعری میں اس عنوان کا کوئی مضمون نہیں ہے البتہ اس کے اندر جو مضامین ہیں ان سے اقبال کی شخصیت اور شاعری نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ کتاب میں شامل مضامین ہیں:

بیاد اقبال، (یہ مضمون جوہر کے اقبال نمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا)، پیام اقبال (اس عنوان سے دو مضامین شامل ہیں۔) یوم اقبال، اقبال اور ان کی شاعری، اقبال اور غزل، شاعر مشرق اور مسجد قرطبہ، اقبال اور غالب، آخر میں متفرقات کے تحت ان جواہر ریزوں کو جمع کر دیا گیا ہے جو انہوں اقبال کے علاوہ پر مضامین لکھتے ہوئے اقبال کی شاعری، شخصیت اور فن پر لکھا ہے۔

رشید احمد صدیقی اقبال کو اسلامی شاعر مانتے ہیں ان کا ماننا ہے کہ ان کے تعلیم کی بنیاد سراسر دین کے ارکان اساسی پر ہے۔ انہوں نے اقبال کے انسان کامل کے فلسفہ کی بنیاد خلافت ارضی کی آیت قرآنی کو قرار دیا ہے۔ رشید احمد اقبال کو دانشور اور شاعر دونوں حیثیتوں کو برابر تسلیم کرتے ہیں، انہوں نے اقبال کے پیغام اور فلسفہ کے علاوہ اقبال کی شاعری اور فنی امور سے متعلق بھی مضامین لکھا ہے۔ اپنے مضمون 'اقبال اور ان کی شاعری' کے عنوان سے انہوں نے اقبال کی شاعری کا خالص فنی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے 'اقبال اور غزل' کے عنوان سے لکھے اپنے ایک مضمون میں (جو کہ ان کی کتاب 'جدید غزل' کا بھی ایک حصہ ہے)، میں انہوں نے غزلوں کو ان کے افکار کی روشنی میں جانچا ہے۔ اس میں انہوں نے اقبال کی شاعری کے فن سے کم سروکار رکھا ہے۔

ڈاکٹر غلام قدوس رشید احمد صدیقی کی اقبال شناسی پر لکھتے ہیں:

''پروفیسر رشید احمد صدیقی ان لوگوں میں سے ہیں جو اقبال سے براہ راست اور ذاتی واقفیت رکھتے ہیں اس لیے ان کے مطالعہ اور تاثرات کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کلام اقبال کے ذریعہ افہام تفہیم کی کوششوں کو حاصل نہیں ہو سکتی کیوں کہ پہلی صورت میں واقفیت کا رشتہ اس سرچشمہ سے جڑا ہوا ہے جس سے فن کے سوتے ابلتے ہیں۔ فن کار سے ذاتی واقفیت فن کو زندہ و توانا اکائی کی صورت میں سمجھنے اور پیش کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ بصورت دیگر ہم مُردہ الفاظ کے ذریعہ اس جاں بخش مبلغ تک پہنچنا چاہتے ہیں جہاں سے فن کے پیکر میں زندگی کی نمود ہوئی تھی۔ لیکن الفاظ کو الگ کر لینے کے ہم تجزیہ تو کر سکتے ہیں اور نتائج بھی اخذ کر سکتے ہیں پھر بھی اس کی حیثیت پوسٹ مارٹم ہی کی ہوگی۔ اور فن کو زندگی عطا کرنے والے فن کار سے دریافت کیے بغیر سمجھنے کی یہ کوشش اتنی بھرپور نہیں ہو سکتی جتنی پہلے صورت میں ممکن ہے۔''[1]

ڈاکٹر غلام قدوس کی اس بات میں صداقت بھی ہے کہ اقبال پر جتنی کتابیں ان واقف کاروں نے لکھی ہیں زمانہ گزرنے کے باوجود آج بھی وہی مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بعد میں جن لوگوں نے بھی اقبال کے فکر و فن پر قلم اٹھایا اقبال کی صحبت میں بیٹھنے والوں کی برابری نہ کر سکے۔

رشید احمد صدیقی نے 'نظام اردو خطبات' میں 'غالب کی شخصیت اور شاعری' کے عنوان سے ایک یادگاری خطبہ دیا تھا۔ اس کا ایک حصہ جو اقبال اور غالب کی شاعری اور فکر کے موازنے پر مشتمل تھا اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

''اقبال اور غالب ہمارے وہ یگانہ روزگار شعراء ہیں جنہوں نے اردو زبان اور اردو شاعری کا حسب و نسب بلند کیا۔ غالب نے فارسی کے سہارے اردو نسب کو ولی اور ان کے چند پیش رووں سے آگے بڑھا کر رود سے ملا دیا۔ اس فارسی کے سہارے جو صدیوں پہلے ہندستان کی فضا میں نشو و نما پا رہی تھی اور اپنے نوک پلک اور آب و رنگ کے اعتبار سے سبک ہندی کہلائی۔''[2]

---

1 تفہیم اقبال ص ۲۰۸

2 غالب کی شخصیت اور شاعری ص ۱۳۵

غالب نے بھی فارسی تراکیب کا استعمال کیا ہے اور اقبال نے بھی، لیکن رشید احمد صدیقی نے دونوں کے فرق کو واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ اقبال کے برعکس غالب کے یہاں مستعمل فارسی تراکیب اردو میں وہ رواج نہ پاسکے۔

رشید احمد صدیقی اردو تنقید میں اپنے شگفتہ اسلوب کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ اردو تنقید میں ان کے کئی جملے ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہیں۔ البتہ اقبال پر لکھتے ہوئے انہوں نے سنجیدگی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے اندر انہوں نے شگفتگی کا ثبوت کم دیا ہے۔

اس سلسلے میں پروفیسر توقیر احمد خاں لکھتے ہیں:

' رشید احمد صدیقی ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں اور اقبال ایک مفکر شاعر اور بظاہر دونوں کے درمیان ایک اسلوبیاتی بُعد بھی نظر آتا ہے۔ تاہم رشید صاحب مزاح آمیز نثر نگار ہوتے ہوئے بھی جب کبھی اقبال کے حوالے سے قلم اٹھاتے ہیں تو اپنی عام روش کے خلاف نہایت فکر مند اور سنجیدہ دکھائی دینے لگتے ہیں اور یہ غالباً رشید صاحب پر اقبال کی فلسفیانہ فکر کا نمایاں اثر ہے جو رشید صاحب کا اقبال سے ایک ذہنی رشتہ بھی ظاہر کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ کلامِ اقبال کے مداح رہے اور انھوں نے اقبال کے خیالات کو ہمیشہ عزت واحترام کی نظر سے دیکھا ہے۔'[1]

البتہ وہ مضامین جو انہوں نے اقبال کے بارے میں یادداشت کی شکل میں لکھا ہے اس میں ان کی شگفتگی برقرار ہے۔ مثلاً 'بیادِ اقبال' کا یہ اقتباس دیکھیں:

''میں نے ایک دفعہ کسی قدر گستاخ ہو کر ۱۹۲۵ء میں ان سے کہہ دیا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ نے دنیا کو دھوکہ دے رکھا ہے۔ اس فریب کو دنیا نے کبھی پالیا تو کیا ہوگا۔' یہ سن کر وہ متحیر ہوگئے لیکن مسکرا کر پوچھا 'کیوں کیا بات ہے۔' میں نے عرض کیا ہم سب یہ سمجھتے ہیں کہ آپ بڑی محنت اور بڑے غور وفکر کے بعد اپنے خیالات اپنے اشعار میں قلمبند کر دئے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ جو کچھ جانتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی آپ کے کلام میں نہیں ہے یہ تو بڑا ستم ہے کہ ہم صرف اتنا ہی جان کر اکتفا کرلیں اور آپ یہ غضب کر رہے ہیں کہ شعر و شاعری سے آگے نہیں بڑھتے۔ ۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر صاحب بڑے زور سے ہنسے۔ سر کرسی کے تکئے پر ڈال دیا۔ چھت کی طرف دیکھتے رہے اور حقے ایک گہرا کش لے کر بولے:

---

1 غبارے از جہان اقبال ص ۸۹

"دیکھو، دنیا جس آفت میں مبتلا ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جو لوگ جانتے ہیں وہ پورے طور پر بتا نہیں سکتے اور جو لوگ نہیں جانتے، وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ رہتے ہیں ور بتاتے بھی رہتے ہیں۔" اس کے بعد ایک عجیب انداز سے مسکرائے، کہنے لگے "تو پھر کیا چاہتے ہو؟" اس کے بعد پھر ایسی بات بتائی جس کے بتانے کا یہ موقع نہیں"[1]

اقبالیات پر رشید احمد صدیقی کی ساری کاوشیں بکھرے ہوئے مضامین کی شکل ہی میں کیوں نہ ہوں، ان کے اندر اقبال فہمی کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے اقبالیاتی تنقید میں جسے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

---

1 اقبال کی شخصیت اور شاعری ص ۸۔۷

# اسلوب احمد انصاری

معاصر اقبال شناسوں کا تذکرہ اسلوب احمد انصاری کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ انہوں نے اردو میں تجزیاتی مطالعوں کو فروغ دیا۔ اقبال تنقید پر ان کی دو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ 'نقش اقبال' اور تجزیاتی مطالعوں پر مشتمل 'اقبال کی تیرہ نظمیں'۔ انہوں نے اس کتاب میں اقبال کی تیرہ طویل نظموں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ تیرہ نظمیں ہیں: تسخیر فطرت، تنہائی، شمع و شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضر راہ، طلوع اسلام، مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، ساقی نامہ، لا الٰہ الا اللہ، ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام، شعاع امید اور ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ ان نظموں کے تجزیاتی مطالعہ میں وہ شرح اور تنقید کے ملے جلے اسلوب کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ان کا تجزیاتی مطالعہ تاثراتی قسم کا نہیں ہے۔ ایک بھرپور قسم کا تنقیدی جائزہ ہے جس میں انہوں نے ان نظموں کے پس منظر، اسلوب اور مواد کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی تشریح کی ہے جو اقبالیاتی تنقید میں الگ نوعیت کی چیز ہے۔

کتاب کا تعارف کراتے ہوئے اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

> "ان نظموں کو تحلیل تجزئے اور چھان بین (evaluation) کے عمل سے گزارا گیا ہے، یعنی ان نظموں کی بیرونی ہیئت جسمانیت پر نظریں جما کر یہ پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے اندر خیالات اور مرکزی اقدار حیات کس طرح کے تفاعل سے منسوب کیے جاسکتے ہیں"[1]

چنانچہ انہوں مرکزی 'اقدار حیات' کے تفاعل پر اپنی توجہ مبذول کرتے ہوئے ان نظموں کی جو تعبیر و تفسیر کی ہے اس کا معیار دیگر شارحین اقبال سے بلند ہے۔ ان کا انداز نرالا اور منفرد ہے۔

---

1 اقبال کی تیرہ نظمیں، اسلوب احمد انصاری ، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۷ء ص ۲۱ ص

اقبال ایک عظیم شاعر ہیں، اس بات کا اعادہ تقریباً ہر اقبال شناس نے کیا ہے۔ لیکن اقبال کی عظمت کی وجوہات کیا ہیں، اقبال کی عظمت کن بنیادوں پر قائم ہے اس کی تشریح میں عام طور پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کو اقبال کی عظمت ان کے ملی فلسفہ میں نظر آتی ہے۔ تو کچھ ان کی شاعری میں مناظر فطرت اور قومی شاعری کے عناصر کو اقبال کی عظمت کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری نے اقبال کی شاعری کا مطالعہ ان کی فکر کی گہرائی تک اتر کر کیا ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اقبال ایک فلسفی شاعر ہیں، ان کی شاعری میں فکر و فلسفہ کی ایک دنیا آباد ہے لیکن ان سب سے بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ اقبال ایک شاعر ہیں۔ ان کے نزدیک اقبال کی عظمت کا راز یہ ہے کہ وہ ایک شاعر ہیں۔ ایک ایسے شاعر جو مشکل سے مشکل فلسفیانہ خیالات کو دلکش شعری پیرایہ میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

ہندوستان میں اقبال شناسی کی راہ میں سب سے بڑا سد باب اقبال کی اسلام پسندی ہے۔ اردو ناقدین کے ایک طبقہ نے اس وجہ سے اقبال کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ان کی شاعری میں اسلامی روایات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اسلوب احمد انصاری کو اس بات کا احساس ہے اس وجہ سے انہوں نے اس سلسلے میں اقبال کا دفاع کرتے ہوئے عالمی ادب کے شہ پاروں سے مثالیں دیتے ہوئے کہا ہے کہ دنیا کی تمام ادبی شاہکاریں مذہبی سرچشمے سے دوام حاصل کرتی ہیں۔ ایسے میں اگر اقبال نے اسلامی روایات سے استفادہ کیا تو انہوں نے کون سا جرم کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ 'آپ اقبال کی شاعری پر محدودیت کا الزام اسی وقت لگا سکتے ہیں جب اسلام کی آفاقیت کے دعوی کی تکذیب کر سکیں'

اسلوب احمد انصاری کی تنقیدی بوطیقا میں جانب داری نہیں ہے۔ اقبال کے فکر فن کی عظمت کے اعتراف کے باوجود جہاں کہیں بھی انہوں نے محسوس کیا کہ اقبال کے افکار خوب صورت شعری پیرایہ میں نہیں ڈھل سکے وہاں اس کی نشاندہی کرنے میں تامل سے کام نہیں لیا ہے۔ جواب شکوہ، مثنوی اسرار خودی، رموز بے خودی، اور ابلیس کی مجلس شوری وغیرہ کو ان نظموں میں شمار کرتے ہیں جہاں فکر و فن کا حسین امتزاج مفقود نظر آتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری سے اس معاملہ میں اختلاف کی گنجائش ہے لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ انہوں نے اقبال کا مطالعہ جس نہج پر کیا ہے اور اس کا اظہار جس بے باکی سے کیا ہے اس کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

اقبال نے اگرچہ اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن ان کو ایک نظم گو شاعر کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی غزلیں اکثر روایتی حد بندیوں سے تجاوز کرتی نظر آتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبال صنف غزل کے

رمز شناس نہ تھے۔ چونکہ ہر بڑا شاعر روایت شکن ہوتا ہے۔ اقبال نے بھی یہاں روایت شکنی ہے۔ انہوں نے غزل کا سرا نظم سے اور نظم کا سرا غزل سے ملا دیا ہے۔

اسلوب احمد انصاری اردو کے انگریزی زبان کے بھی ماہر ہیں ان کی نظر مشرقی ادبی سرمایہ کے علاوہ مغربی فن پاروں پر بھی ہے۔ اس وجہ سے وہ اقبال کا مطالعہ کرتے وقت اقبال کو مغربی مفکروں کے ساتھ رکھ کر تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ اپنے تقابلی مطالعہ میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اقبال کی شاعری کو دنیا کی عظیم شاعروں کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ اپنے مضمون 'اقبال اور بلیک' میں دونوں کے مابین وسیع تر اختلافات کے باوجود انہوں دونوں میں یکسانیت تلاش کی ہے۔
اسلوب احمد انصاری کو اقبالیاتی تنقید میں ہیہ ر ے ی ی تنقید کے زمرہ رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے اقبال کے فکر و فلسفہ پر بھی گفتگو کی ہے لیکن ان کے یہاں فن پر توجہ زیادہ ہے۔ انہوں نے اقبال کی تیرہ نظموں میں جس انداز سے ان نظموں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اس سے وہ اقبال کے شارح کے طور پر بھی سامنے آئے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری نے اقبالیات کے تفہیم و تجزیہ کی جو گراں قدر خدمت انجام دیا ہے وہ اقبالیات میں ایک اہم اضافہ کے طور پر دیکھا جائے گا۔

# فرمان فتحپوری

'اقبال سب کے لیے' کے ذریعہ فرمان فتحپوری نے اقبالیات میں شہرت کی جس بلندی پر اپنی کمندیں ڈالی ہیں وہاں تک اقبالیات پر دوسرے بہت سے ناقدین درجنوں کتابیں لکھ کر بھی نہیں پہنچ سکے ہیں۔ ان کی کتاب 'اقبال سب کے لئے' اقبال کے فکروفن کے علاوہ اقبال کی سوانح پر بھی مشتمل ہے۔ انہوں نے یہ کتاب عام اردوداں طبقہ اور خصوصی طور پر طلبہ کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے لکھی ہے اس وجہ سے انہوں نے مختصر الفاظ میں اقبالیات کے تقریباً سبھی اہم مباحث کو اس کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

فرمان فتحپوری کے یہاں اقبالیت فلسفی کے مقابلے میں اقبال بحیثیت شاعر مقدم ہے۔ وہ کتاب کے مقدمہ میں ہی اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ 'علامہ اقبال فلسفی بھی ہیں شاعر بھی لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام فلسفی سے بلند تر ہے۔'[1] وہ مختلف حوالوں سے فلسفہ اور شعر کے فرق کو واضح کرنے کے بعد اس امر کا اعادہ کرتے ہیں کہ:

> ''فلسفے اور شعر کا یہ فرق ذہن میں ہو تو کہنا پڑے گا کہ اقبال فلسفی نہیں صرف شاعر تھے اس لیے کہ ان کی شاعری آب حیات کا خزانہ ہے جس سے زندگی اور زندگی کے چشمے ابلتے ہیں جن سے سیر اب ہو کر مایوس دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور امید کی کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔ البتہ وہ ایسے شاعر ضرور ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں فلسفے کی ایک صفت یعنی موضوع کی کلیت وہمہ گیری کو ملحوظ رکھا ہے اور اپنے مخاطب یا قاری کو زندگی کا ایک مربوط منظم اور بعض حیثیتوں سے ایک مکمل اور عملی فلسفہ دیا ہے۔ گویا اقبال کی شاعری صرف

---

1 اقبال سب کے لیے از فرمان فتحپوری، دیباچہ: صفحہ :م طبع اول ۱۹۷۸ء ہندوستانی ایڈیشن، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی ۱۹۸۰ء

ان معنوں میں فلسفیانہ ہے کہ وہ زندگی کا ایک مدلل اور کلی تصور پیش کرتی ہے، لیکن ایسا کرنا کسی معمولی درجے کے شاعر کے بس کی بات نہیں ہوتی۔"[1]

اس معاملے میں فرمان فتحپوری کا رویہ مثبت ہے۔ وہ اقبال کو ایک فلسفی شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ صرف شاعر یا صرف فلسفی نہیں۔ یہ ایک درمیانہ راستہ ہے۔ جس سے بہت سے ناقدین اقبال نے انحراف کرکے اپنی تنقید کو اکہرے پن کے عیب سے متصف کرلیا ہے۔

فرمان فتحپوری نے کتاب کے پہلے حصے میں اقبال کی سوانح پر مختصر نوٹ لکھا ہے۔ انہوں نے اس میں اقبال پر لکھی گئی سوانحی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے پیش نظر ذکر اقبال، روزگار فقیر اور سیرت اقبال جیسی کتابیں تھیں۔ ان کا رویہ تحقیقی ہے انہوں نے اقبال کی تاریخ پیدائش کے بارے میں مختلف شارحین کے اقوال کو بیان کرنے کے بعد راجح تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء قرار دی ہے۔ یہ وہی تاریخ ہے جس کے مطابق ہندوپاک میں اقبال صدی تقریبات منائی گئیں۔

فرمان فتحپوری نے اپنی توجہ صرف سوانح تک ہی محدود نہیں رکھی ہے۔ انہوں نے اقبال کی سیرت پر بھی لکھا ہے۔ ان کا مقصد اس سے اقبال کی ایک مثالی سیرت پیش کرنا ہے وہ اقبال کے بارے ہیں لکھتے ہیں:

"اقبال جہاں بھی رہے ان کی سادگی شرافت نفس اور اخلاق کی بدولت ان کا گھر مرجع خلائق بنا رہا ان کا دروازہ ہر شخص کے لیے ہمہ وقت کھلا ہوا تھا۔ ایک معمولی اور اجنبی آدمی سے لے کر بڑے سے بڑا عہدے دار اور رئیس ان سے آسانی سے مل سکتا تھا۔ ان کے بے تکلف دوستوں کا بیان ہے کہ صبح سے شام تک ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ جب جس کا دل چاہتا چلا جاتا اور جتنی دیر چاہتا بیٹھتا، آنا جانا لگا رہتا۔"[2]

فرمان فتحپوری بھی علامہ کی شاعری کو 'الہامی' قرار دیتے ہیں اس سلسلے میں انہوں نے اقبال کے رفقاء کے اقوال نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی اشعار کے ورود کے وقت وہی حالت ہوتی تھی جو پیغمبر پر وحی کے وقت

---

1 اقبال سب کے لیے دیباچہ: صفحہ: ن

2 اقبال سب کے لیے ص ۲۲

ہوتی تھی۔ ان روایتوں پر اعتماد انہوں نے اس وجہ سے بھی کیا ہے کہ اقبال نے خود ایک مرتبہ کہا ہے کہ 'ان پر پورا شعر نازل ہوتا ہے۔'[1] جب تک خارجی شہادتیں نہ ہوں ہم ان کا انکار نہیں کر سکتے۔

علامہ اقبال کی زندگی میں ان کی شاعری کے اثرات نہ ہونے اور ان کے عمل سے بے پرواہ ہونے کے الزامات لگتے رہے ہیں۔ مولانا مودودی نے اقبال کو فرقہ ملامتیہ میں شمار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اقبال خود اس قسم کا تاثر پیش کرتے تھے حالانکہ حقیقی طور پر ایسا نہیں ہوتا تھا۔ فرمان فتحپوری نے اقبال پر اس اعتراض اور خود اقبال کے جواب درج کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ ان کی انکساری تھی۔ ورنہ انہوں نے ایک منظم زندگی گزاری ہے۔[2]

فرمان فتحپوری نے اقبال کے مختلف نظریات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اقبال کا نظریہ خودی ہو یا بے خودی، انہوں نے اقبال کے کلام اور خطوط کے حوالوں سے اسے سمجھا ہے۔ ان کا ایک اہم مضمون اقبال کے نظریہ تعلیم پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اقبال کی تعلیم و تعلم سے وابستگی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے تعلیمی نظریات کا علم اس وقت سے ہوتا ہے جب انہوں نے اسرار خودی بھی نہ لکھی تھی۔ چنانچہ وہ ایک جلسہ میں اقبال کی تقریر کا حوالہ دیتے ہیں کہ اقبال نے اس میں جبری تعلیم کے دفاع میں صدارتی تقریر کی تھی۔ انہوں نے استدلال کیا تھا کہ اسلام میں جبری تعلیم کا وجود ہے۔ چنانچہ نماز سے بے پرواہی پر جبر کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ بات جس پر جبر کیا جا رہا ہے اس کے حق میں ہے۔ یہ بات ۱۹۱۲ء کی ہے۔[3]

علامہ نے مدرسہ اور اہل مدرسہ کے بارے میں جو تنقید کی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمان فتحپوری لکھتے ہیں کہ

---

1 اقبال سب کے لیے ص ۲۵

2 اقبال سب کے لیے ص ۲۹۔۳۰

3 اقبال سب کے لیے ص ۱۰۳۔۱۰۴

''اقبال یہ دیکھتے ہیں کہ اساتذہ کی بے بصری تعلیم کے اصل مقصود سے کو فراموش کرتی جارہی ہے اور ان کا تقلیدی ذہن مدرسے کے صحن میں دیوار کھینچ کر خورشید علم کو طلبہ کی نظروں سے اوجھل کیے دے رہاہے تو اس صورت حال کو وہ ملت کی زبوں بختی اور مجرمانہ غفلت سے تعبیر کرتے ہیں۔''[1]

ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

''تعلیم کے مسئلے میں اقبال کی رائیں کسی تنگ نظری کا شکار نہیں۔ ان کو احساس تھا کہ مغرب کا نظام تعلیم مشرق کے مقابلے میں بہر حال فکر انگیز اور زندگی افروز ہے ہر چند کہ اس کی بنیاد عقل کی مادی ترقیوں پر ہے بایں ہمہ اس کی کامرانیاں قابل رشک ہیں اس نے ملک کے چپے چپے کو فردوس بنادیا ہے اور مشرق ابھی تک خیالی جنت کے انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔''[2]

اقبال کے سیاسی نظریات کے حوالے سے انہوں نے اقبال کو نظریہ پاکستان کا محرک اول قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو تفصیلی گفتگو کی ہے اس پر ہندوپاک میں اپنے اپنے انداز میں لکھا جاچکا ہے۔ انہوں نے یہ کتاب پاکستان میں لکھی ہے اس وجہ سے ہندوستان کے بارے میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں ان کو کوئی ضروری نہیں ہے کہ غیر پاکستان میں بھی قبول کیا جائے۔ اسی وجہ سے تنقیدی کتابوں میں سیاسی نظریات پر لکھتے ہوئے اس بات کی رعایت ہونی چاہئے کہ وہ ہر جگہ قابل قبول ہو۔ موضوع اگرچہ ایسا ہو کہ دوسروں کے نظریہ کے مطابق نہ ہو لیکن لہجہ طرف دارانہ نہیں ہونا چاہئے۔

'علمی وادبی دنیا پر اقبال کے اثرات' فرمان فتحپوری کا ایک اہم مضمون ہے۔ لیکن یہ موضوع جس قدر تفصیل کا تقاضا کرتا ہے اس کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت تھی انہوں نے چند صفحات میں اس کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے اس کا حق نہیں ادا ہو سکا ہے۔

فرمان فتحپوری کو پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ کو ٹھوس علمی انداز میں بیان کرنے کے بجائے انہوں نے تاثراتی اسلوب اختیار کیا ہے۔ اقبال کے نظریہ تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے اقبال کی

---

1 اقبال سب کے لیے ص ۱۱۶

2 اقبال سب کے لیے ص ۱۲۱

تعلیم کے پیشہ سے وابستگی اور اس سے جڑے واقعات پر توجہ دی ہے۔ اسی طرح سیاست پر لکھتے ہوئے اقبال کے سیاسی نظام کے بارے میں نظریات پر لکھتے ہوئے بھی یہی طریقہ روا رکھا ہے۔ یہ طریقہ انہوں اقبال کے نظریہ فن اور تصوف پر بھی لکھتے ہوئے اپنایا ہے۔ وہ ٹھوس علمی مباحث سے اپنا دامن بچا کر تاثراتی انداز اپنا لیتے ہیں۔ اس سے اقبال کے نظریات کھل کر سامنے نہیں آ سکے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اقبال کے فکر و فن کی مشہور ترین کتابوں میں ہونے کے باوجود ناقدین اقبال نے اس کتاب کو وہ وقعت نہ دی جو خلیفہ عبدالحکیم اور یوسف حسین خاں کی کتاب کو دی ہے۔

# کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد اپنے انتہاپسندانہ خیالات کی وجہ سے کافی مشہور ہیں۔انہوں نے اردو ادب کو مغربی عینک سے دیکھا تو اس میں خامیاں ہی خامیاں نظر آئیں، حالی کے ناقد ہونے کا انکار کیا، اردو تنقید کو فرضی قرار دیا، غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا۔ ان کے یہ خیالات اردو دنیا میں ہلچل مچانے کے لیے کافی تھے۔ مگر کلیم الدین احمد نے کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنے تنقیدی سفر کو جاری رکھا۔ "اردو تنقید پر ایک نظر" اور "اردو شاعری پر ایک نظر" کے بعد انہوں نے "اقبال۔ایک مطالعہ" لکھ کر اپنی توپ کا رخ اقبال کی طرف کیا تو اقبال بھی ان کی متشددانہ تنقید سے نہ بچ سکے۔

کلیم الدین احمد نے اقبال ایک مطالعہ کے پیش لفظ ہی میں اپنے تیور کو ظاہر کر دیا اور اردو تنقید کے بارے میں اپنی رائے دے دی:

> "اردو تنقید کی ذہنیت میں بت پرستی کچھ اس طرح رچی بسی ہے کہ اس نے دو بڑے دیوتا بنالئے ہیں غالب اور اقبال، اور جہاں اس قسم کی ذہنیت نے جڑ پکڑلی ہو وہاں بے لاگ تنقید کا گزر نہیں ہو سکتا۔" [1]

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "اقبال شاعر تھے اچھے شاعر تھے اور زیادہ اچھے شاعر ہو سکتے تھے اگر وہ شاعر ہونے پر قناعت کرتے اور پیغمبر بننے پر مصر نہ ہوتے اس پیغمبری نے ان کی شاعری پر ایک کاری ضرب لگائی لیکن اس کاری ضرب کے بعد بھی ان کی شاعری باقی رہی، یہ ان کی شعری جانداری کا ثبوت ہے"[2]

---

[1] اقبال۔ایک مطالعہ، پیش لفظ

[2] ایضاً

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ اقبال ہمیں راہ نجات دکھانے میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں اس کام کو وہ اس قدر اہم سمجھتے ہیں کہ اکثر شاعری کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔"

"اقبال کے تخیل میں کچھ انتشار سا ہے"[1]

مذکورہ بالا اقتباسات میں کلیم الدین احمد نے جو تین اعتراضات کیے ہیں ان میں ایک اقبال شناسوں کے رویہ سے متعلق ہے اور دو خود اقبال کے اوپر ہیں۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ اردو تنقید نے 'دو بڑے دیوتا بنالئے ہیں غالب اور اقبال' تو یہ تنقید اقبال پر نہیں بلکہ اردو کے عام تنقیدی رویے پر ہے۔ اگر سچائی سے کلیم الدین احمد کی اس بات کا جائزہ لیا جائے تو اس کے اندر جزوی سچائی ہے۔ اردو تنقید نے ان دو عظیم شاعروں کے ساتھ عمومی طور پر دیوتاؤں جیسا سلوک کیا ہے۔ جب بھی کسی نے عام ڈھرے سے ہٹ کر ان شاعروں کے فکر و فن کا جائزہ لینا چاہا ہے تو اس کو سخت مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ غالب کے ساتھ وہ معاملہ نہیں تھا جو اقبال کے ساتھ ہے۔ اقبال کو ایک طبقہ نے رحمت اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانگ کر اس پر اسلامیت کی مہر لگادی۔ ان کی شاعری پر تنقید کو اسلام پر تنقید سے جوڑ کر دیکھا جانے لگا۔ ایسے ماحول میں اگر کلیم الدین احمد کی تنقید اقبال پر سخت ہوئی ہے تو اس کا جواز اس طور پر بنتا ہے کہ اگر کلیم الدین احمد نے یہ رویہ نہیں اختیار کیا ہوتا تو اقبال کے فکر و فن پر دیگر بے ضرر تنقیدوں کی طرح ان کی تنقید بھی بھیڑ میں گم ہو جاتی۔

اقبال کی ذات پر انہوں نے جو دو تنقیدیں کی ہیں ان میں پہلا یہ ہے کہ وہ منصب شاعری سے آگے بڑھ کر 'پیغمبر' بننے پر مصر ہوئے۔ اس کے ساتھ وہ اقبال کی فنی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کر رہے ہیں کہ اگر ان کی شاعری زندہ ہے تو صرف اس وجہ سے کہ اس کے اندر جان ہے۔ جہاں تک اقبال کے پیغمبر بننے کی بات ہے تو یہاں اصل مسئلہ ادب کی مقصدیت کا ہے۔ اقبال چونکہ ادب برائے ادب کی جگہ ادب برائے اصلاح کے قائل تھے۔ اقبال نے خود اس بات کا اظہار کیا کہ وہ کچھ پیغام رکھتے ہیں جس کو وہ اپنی شاعری کے ذریعہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ شاعری چونکہ پیغام کی ترسیل کا سب سے مؤثر

---

1 اقبال۔ ایک مطالعہ، کلیم الدین احمد، ص:۲۲

ذریعہ ہے اس وجہ اقبال نے شاعری کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ اس لیے شاعری کو پرکھنے کے لیے 'کیا کہا گیا ہے؟' سے زیادہ اس بات پر توجہ دینی چاہئے کہ 'کس طرح کہا گیا ہے؟' کلیم الدین خود اس بات کا اعتراف کررہے ہیں کہ اقبال کی شاعری جاندار ہے۔ یہ 'جانداری' دراصل اقبال کی فنی صلاحیت ہی ہے۔

جہاں تک دوسرے اعتراض کا تعلق ہے تو وہ اقبال کے فکر سے متعلق ہے۔ کلیم الدین احمد نے اقبال پر جو اعتراض کیا ہے اس میں وہ منفرد نہیں ہیں۔ سردار جعفری اور مجنوں گورکھپوری نے بھی اقبال کی فکر میں انتشار کی بات کہی ہے۔ دراصل اقبال کی شاعری میں پائے جانے والے تضادات کی جو بھی توجیہ کی جائے اس کو تضاد ہی کے زمرے میں رکھا جائے گا۔ علامہ اقبال نے مختلف اوقات میں مختلف قسم کے نظریات پیش کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں ہر کوئی اپنے مطلب کی چیز تلاش کرسکتا ہے۔ صوفیانہ عقائد کی حمایت اور مخالفت دونوں میں اقبال کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔ اس کی توجیہ یہ کی جاسکتی ہے کہ یہ اقبال کا ذہنی وفکری ارتقاء ہے۔ پھر بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کیا اقبال کی پہلے کی شاعری کو منسوخ اور بعد کی شاعری کو ناسخ مانا جائے؟ پہلے کی شاعری کا مطالعہ صرف فنی نقطۂ نظر سے کیا جائے اور بعد کی شاعری کو ہی ان کے فکر کا ترجمان مانا جائے، جس پر وہ زندگی کے آخری ایام تک قائم رہے۔ شاید ہی اردو تنقید میں کوئی اس بات سے متفق ہو۔

"جاوید نامہ" اقبال کی ایک ایسی نظم ہے جس میں انہوں نے عالم افلاک کی خیالی سیر کی ہے۔ اس میں انہوں نے تاریخ کی بڑی شخصیتوں سے ملاقات کی ہے اس حوالے سے انہوں نے اپنے پیغام کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ کلیم الدین احمد جن کو ادب میں مقصدیت ہی گوارہ نہیں سب کچھ برداشت کرکے اس نظم کو پڑھتے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

> "اقبال کا تخیل اپنے خیالی سفر کی واضح منطقی متعین تصویر پیش نہیں کرپاتا"[1]

> "اقبال کو انسانی تجربوں کے امکانات سے کوئی دل چسپی نہ تھی اور اور نہ انسانی المیوں سے۔ بہت سی وجہوں میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری جوئے کم آب ہو کر رہ گئی۔"[1]

---

1 اقبال۔ ایک مطالعہ ،ص۲۳

دراصل انہوں نے "جاوید نامہ" کا مطالعہ "ڈیوائن کامیڈی" کو سامنے رکھ کر کیا۔ غالباً انہوں نے اس جانب توجہ نہیں دی کہ اسلامی روایات اور عیسائی روایات میں فرق ہے۔ اس فرق کا اثر عالم بالا کے خیالی سفر پر بھی پڑے گا۔ علامہ نے "جاوید نامہ" جو کچھ پیش کیا ہے وہ اسلامی پس منظر میں ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر دیومالائیت کے عناصر نہیں آسکتے۔ الغرض کلیم الدین احمد نے "اقبال اور دانتے" کے مضمون میں دونوں کا موازنہ اپنے مغرب زدہ خیالات کے ذریعہ کیا ہے اور دکھایا ہے کہ دانتے کے مقابلہ میں اقبال کی فکر اور تخیل نہایت معمولی قسم کی ہے۔ تقریباً ۱۵۰ صفحات کا موازنہ اپنے آپ میں اس معاملے میں اہم ہے کہ اردو میں اس طرح کا موازنہ اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ سے اقبال کے ناقدین کو اقبال کے کلام پر از سرِ نو غور کرنے کی تحریک ملی۔

"دانتے اور اقبال" کے بعد اقبال کی پانچ نظمیں کے عنوان سے "خضر راہ"، "طلوع اسلام"، "ذوق و شوق"، "مسجد قرطبہ" اور "ساقی نامہ" کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس جائزہ میں انہوں نے ان نظموں پر جو تشریحی نوٹ لکھا ہے وہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان نظموں پر تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کلیم الدین احمد نے خاص طور پر اس چیز پر اعتراض کیا ہے کہ یہ نثر کے موضوع ہیں شاعری کے نہیں۔ 'شعر میں اس کی کوئی جگہ نہیں اور شعر شعر باقی نہیں رہتا منظوم نثر ہو جاتا ہے' ان کا ماننا ہے کہ "نرا پیغام یا پروپیگنڈہ شاعری نہیں"۔ کلیم الدین احمد نے اسی بنیاد پر ترقی پسند ادب کے ایک بڑے حصہ کو مسترد قرار دے دیا ہے کہ یہ ادب نہیں پروپیگنڈہ ہے۔ لہٰذا اقبال کی شاعری پر ان کا یہ اعتراض نیا نہیں ہے۔

خضر راہ کے ابتدائی حصہ کی وہ تعریف کرتے ہیں کہ اس کے اندر مناظر فطرت کی بہترین عکاسی ہے مگر اس کے بعد جہاں سے خضر سے ملاقات ہوتی ہے اقبال ان کے سامنے سوالات کا پلندہ پیش کرتے ہیں کلیم الدین احمد کی پیشانی پر شکن آجاتی ہے اور کہتے ہیں کہ 'یہ سوالات اقبال کے لیے اہمیت رکھتے ہوں لیکن یہ سوالات نثر میں بھی پوچھے جاسکتے تھے۔'[2]

وہ خضر راہ کو نظم ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "خضر راہ نظم نہیں کیونکہ اس کے مختلف حصوں میں ربط کامل تو بہت بڑی چیز ہے سرے سے کوئی ربط ہی نہیں"[1]

---

1 اقبال۔ ایک مطالعہ، ص ۳۰

2 اقبال۔ ایک مطالعہ، ص ۱۵۰

اور آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "جہاں ربط و تسلسل ہے وہ مصنوعی ہے" [2]

خضر راہ پر آخر میں رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ نظم پر فیکٹ ہوتی، کمی صرف یہ ہے کہ اس کا وسط کا حصہ قدرے مختصر ہے۔"[3]

کلیم الدین احمد کی علمیت اپنی جگہ درست، لیکن مذکورہ بالا اعتراضات بالکل سطحی ہیں۔ ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے جہاں طویل بحث ہو وہاں یہ کہہ دیا جائے کہ یہاں مختصر ہونا چاہئے تھا اور جہاں مختصر ہو وہاں کہہ دیں کہ یہ تفصیل کا مقام ہے ۔ کسی بھی بھی فن پارے کی تنقید کرتے وقت اس بات کا بھی دھیان ہونا چاہئے کہ شاعر جس تجربہ سے گزرا ہے اس کے اظہار کے لیے اس نے مناسب ترین الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ان تجربات کو اس نے بیان کس طرح کیا ہے؟ کیا اس نے ادبی پیرائے میں بیان کیا ہے یا نہیں؟ کلیم الدین احمد نے اس مقام پر اقبال کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

'طلوع اسلام' کو ان پانچ نظموں میں سب سے کمزور نظم کہتے ہیں اس کے اندر کلیم الدین احمد کو تسلسل کی کمی ستاتی ہے جو اس کو نظم سے غزل کے زمرے میں شامل کر دیتی ہے۔ دوسری کمی خطیبانہ اسلوب جو اقبال کی اکثر غزلوں اور نظموں کا جوہر ہے وہ کلیم الدین احمد کے یہاں ایک خامی ہے ۔ یہ اشعار تخیل کی کمی کی وجہ شعریت کے جوہر سے محروم ہیں۔ کلیم الدین احمد کی تنقید کا یہ حصہ اس معنی میں اہم ہے کہ اس میں انہوں نے کم از کم کسی مغربی شاعر سے موازنہ کر کے یہ تو نہیں کہا کہ اقبال کی اندر یہ جوہر کہاں؟

کلیم الدین احمد بعض جگہوں پر طنزیہ رخ اختیار کر لیتے ہیں مثلاً ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

"اقبال اچھے اچھے اشعار لکھتے ہیں لیکن شاید انہیں اس بات کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ انہوں نے اچھے اشعار لکھے ہیں وہ ان شعروں کو جلد پس پشت ڈال دیتے ہیں اور اپنے خیال میں الجھ جاتے ہیں۔"[1]

---

1 اقبال۔ ایک مطالعہ ،ص ۱۵۲

2 اقبال۔ ایک مطالعہ ،ص ۱۵۸

3 اقبال۔ ایک مطالعہ ،ص ۱۵۸

اب اسے کیا کہا جائے، یہ اقبال کی شاعری پر طنز کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہر شاعر اپنی شاعری میں ایک پیغام رکھتا ہے۔ حسن و عشق کی شاعری بھی ایک پیغام ہی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو اس کو شاعری نہیں لغو کے درجہ میں رکھا جائے گا۔ مجموعی طور پر کلیم الدین احمد نے اقبال کے ان اشعار کو پسند کیا ہے جن میں کسی مظاہر قدرت کی منظر کشی کی گئی ہو، چنانچہ 'خضر راہ' میں رات کا سماں اور 'ذوق وشوق' میں صبح کی منظر کشی ہی ان دونوں نظموں میں انہیں نظر آئی۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں بھی انہوں نے اپنے فکر وفلسفہ کو پیش کیا ہے وہ ان کے یہاں مبغوض قرار پائی ہے۔

'مسجد قرطبہ' اقبال کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے مگر کلیم الدین احمد نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ اقبال نے کسی تعمیر کے ثبات کے لیے 'مرد مومن' کے ہاتھ سے ہوئی تعمیر کو ضروری قرار دیا ہے۔ بقول کلیم الدین احمد، اقبال نے یہ بات مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے کہی ہے۔

کلیم الدین احمد نے اس کتاب میں اقبال کے کلام کی فنی خوبیوں کو پرکھا ہے مگر کہیں کہیں وہ اس منصب سے الگ ہو کر اقبال کی فکر اور فلسفہ پر گفتگو کرنے لگتے ہیں چنانچہ شروع کتاب میں انہوں نے اقبال اور دانتے کا موازنہ کیا تھا جو فکر اور فن دونوں پر مشتمل تھا۔

کلیم الدین احمد نے اقبال پر تنقید کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بعض معاملوں میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے فکر وفن پر نہیں بلکہ اقبال کی ذات پر تنقید کر رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال ان کی وہ تنقید ہے جس میں وہ اقبال کی ایک فکر کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔ وہ اقبال کے ایک مشہور شعر:

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
نگاہ عشق ومستی میں وہی اول، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ [1]

کے بارے میں کلیم الدین کہتے ہیں:

---

1 اقبال۔ ایک مطالعہ، ص۱۷۶

"رہا تیسرا حصہ تو وہ آرتھوڈکس مسلمانوں کی نظر میں صرف کو سب چمیہ بل ﴿سوالیہ﴾ نہیں بلکہ کفر ہے۔ وہ عشق و مستی میں ہو یا نگاہ باخر میں، پیغمبر اسلام کو وہی اول وہی آخر وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہ کہنا درست نہیں، جب کہ (ہو الاول والآخر والظاہر والباطن) خدا کے لیے آیا ہے، اور جب ہمیشہ پیغمبر اسلام نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ا(بشر مثلکم یوحی الی انما الہکم الٰہ واحد) میں یہ ملّایانہ اعتراض نہیں کرتا لیکن اقبال خود بھی اور دوسرے لوگ بھی اقبال کی فکر کا سرچشمہ اسلام کو بتاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے بہت سے خیالات unislamic ہیں۔"

پھر اچانک ان کو یاد آتا ہے کہ یہ تو میرا منصب نہیں تو فوراً یہ کہتے نظر آتے ہیں:

"اس سے ان کی شاعری پر کوئی فرق نہیں پڑتا اسی لیے میں ہمیشہ اس بات پر زور دیتا ہوں کہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ شاعری کیسی ہے خیالات فلسفہ سائنس بدلتے رہتے ہیں، لیکن شاعری نہیں بدلتی۔"[1]

یہی بات کلیم الدین احمد پر بھی صادق آتی ہے۔ اگر وہ بجائے اس کے کہ 'کیا کہا گیا ہے؟' پر توجہ دینے کے، 'کیسے کہا گیا ہے؟' پر توجہ دیتے تو اقبال کی شاعری کے بارے میں ان کا نظریہ مختلف ہوتا۔

مجموعی طور پر کلیم الدین احمد کی یہ کتاب اقبال کے کلام کی فنی تنقید ہے مگر کہیں کہیں وہ اس ڈگر سے ہٹ کر اقبال کے فلسفہ کو بھی موضوع بنا لیتے ہیں ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے جب وہ اقبال کا موازنہ کسی مغربی شاعر سے کرتے ہیں۔

'اقبال ایک مطالعہ' کے علاوہ کلیم الدین احمد نے اقبال پر 'اردو شاعری پر ایک نظر' میں بھی لکھا ہے مگر 'اقبال ایک مطالعہ' کا خصوصی تذکرہ اس لیے غیر ضروری ہے کیوں کہ اس کے اندر جو بھی باتیں متفرق طور پر کہی گئی تھیں ان کو یہاں ایک ہی جگہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

کلیم الدین احمد کی اقبال پر تنقید کا مختلف ناقدین نے جواب دیا ہے ان میں سب سے اہم نام پروفیسر عبد المغنی کا ہے۔ انہوں نے 'اقبال اور مغربی مفکرین' میں کلیم الدین احمد کی تنقید کا ترکی بترکی جواب دیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم نام پروفیسر عبد الحق کا ہے۔ انہوں نے مختلف مضامین میں کلیم الدین احمد کی تنقیدوں کا جواب دیا ہے۔ عبد الحق کی تنقید کی

---

1 اقبال۔ ایک مطالعہ، ص۲۷۹۔۲۸۰

خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے لہجے میں تلخی نہیں آنے دی ہے۔ جبکہ کلیم الدین احمد کی تنقید کا جواب دیتے وقت عام طور پر ناقدین کی زبان بے لگام ہو جایا کرتی ہے۔

کلیم الدین احمد کی اقبال پر تنقید اگرچہ جارحانہ ہے۔ لیکن ان کی تنقید کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے کہ ان کی وجہ سے اقبال کی شاعری پر ناقدین نے خصوصی توجہ دینی شروع کی۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے کی طرف لوگ راغب ہوئے۔ سب سے اہم بات یہ کہ 'اقبال تنقید' جس یک رخے پن کا شکار تھی اس سے نکالنے کے لیے انہوں نے فرض کفایہ ادا کر دیا۔ ان کے نظریات سے اگرچہ اختلاف کیا جائے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اقبال تنقید کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

# سہیل بخاری

سہیل بخاری اردو تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ انہوں نے اقبال تنقید پر زیادہ نہیں لکھا ہے۔ ان کی دو کتابیں 'اقبال۔ مجد دعصر' ۱۹۸۱ء اور 'اقبال ایک صوفی شاعر' (۱۹۸۸ء) منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'اقبال مجد دعصر' میں بنیادی طور پر انہوں نے اقبال کی شاعری کے فنی پہلو پر توجہ دی ہے۔

اقبال ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری میں کئی پرتیں ہیں، کہیں علم و فن کی قندیلیں روشن ہیں تو کہیں فلسفے و سائنسی توجیہات ہیں گویا اقبال اردو کا وہ واحد شاعر ہے جس کی شاعری ست رنگی ہے۔ زندگی و کائنات کا کوئی پہلو ایسا نہیں جہاں اقبال کی شاعری ہماری رہنمائی نہ کرتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال سے سب مرعوب نظر آتے ہیں۔ آخر اقبال سے ہر کوئی کیوں مرعوب ہے۔ سہیل بخاری کی کتاب ''اقبال مجد دعصر" (۱۹۸۱ء) در اصل انہی سوالوں کا جواب پیش کرتی ہے ۔ سہیل بخاری نے علامہ اقبال کی شاعری کی جملہ خصوصیات، خطابت زبان، اسلوب، فضا، پیغام اور سیرت پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے ان سبھی موضوعات پر علامہ اقبال کی انفرادیت دکھلائی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو شاعری میں اقبال کی حیثیت ایک مجدد کی ہے، سہیل بخاری کی نظر میں علامہ اقبال کے فکر اور فلسفہ سے مرغوب ہو کر ان کی ہر بات کو سرِ تسلیم خم کر کے مان لینا یا جھنجھلا کر ہر بات کی بے جا تنقید پر اتر آنا دونوں غلط ہے۔

اقبال کی شاعری میں انداز خطابت پر سہیل بخاری رقم طراز ہیں کہ:

'' اقبال کی آواز میں وہ توانائی اور خود اعتمادی بھی ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس کے تفکر میں وہ بلندی اور بصیرت بھی ہے جو گرے ہوئے کو اوپر اٹھاتی ہے اور ان کے ذہنوں کو جلا بخشتی ہے۔ ایک طرف

''شکوہ''اس کے جوش خطابت کی روشن مثال ہے تو دوسری طرف مختلف قسم کے چھوٹے بڑے مکالمے اس ذوق کی نشان دہی کرتے ہیں اور یوں اقبال شروع سے آخر تک پیغمبرانہ لہجے میں خطاب کرتا سنائی دیتا ہے۔''[1]

مجدد کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پژمردہ چیزوں کو جلا بخشے اور ان کے اندر زندگی کی روح پھونکے۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ یہی کام لیا ہے اس وجہ سے وہ بجاطور پر مجدد کہلانے کے حق دار ہیں۔

سہیل بخاری اقبال کے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خطاب اور زبان کی طرح اقبال کے اسلوب بیان میں بھی کچھ ایسی ماورائیت پائی جاتی ہے جو اسے آسمانی صحیفوں کے قریب لے آتی ہے، اس کی پہلی اہم خصوصیت ایمائیت ہے اقبال نے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لیے شعر کا انتخاب کیا ہے، لیکن شعر کی سب سے بڑی خوبی اس کا ایجاز ہے جس کے پیش نظر شاعر کو ایمائیت سے کام لینا پڑتا ہے اور اشاروں کنایوں میں باتیں کرنا ہوتی ہے۔''[2]

سہیل بخاری کہتے ہیں کہ اقبال نے مکالموں کے مقابلہ میں تمثیلوں سے کام کم لیا ہے۔ وہ اپنے کلام میں جابجا خیالی محفلیں جما کر کرداروں کی زبانی اپنے پیغام کو پہنچاتے ہیں۔ اپنی دوسری کتاب 'اقبال ایک صوفی شاعر'[3] میں انہوں نے اقبال کو ایک صوفی شاعر کے طور پر پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اقبال کی شاعری ابتدا سے لے کر آخر تک تصوف کا رنگ غالب رہا ہے۔

---

1 اقبال مجدد عصر ص 39، مکتبہ نعیمیہ، مٹیا محل، دہلی ۱۹۸۱

2 اقبال مجدد عصر ص 39

3 ط: مکتبہ اسلوب کراچی

# عبدالمغنی

پروفیسر عبدالمغنی کا شمار ماہر اقبالیات میں ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی کتابوں کے ذریعہ اقبالیات میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔وہ اقبال کے مداح اور ثناخواں ہیں۔اقبال کی شاعری اور فن کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کا وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں۔انہوں نے اقبال پر چار کتابیں لکھی ہیں۔'اقبال اور عالمی ادب'[1]، 'اقبال کا نظام فن'[2]،'اقبال کا نظریہ خودی،[3] تنویرِ اقبال[4] اور 'اقبال کا ذہنی وفکری ارتقا'[5]۔پروفیسر عبدالمغنی اردو کے علاوہ انگریزی زبان کے ماہر ہیں اس وجہ سے ان کی نظر مغربی ادب پر براہ راست ہے۔انہوں نے اقبال پر انگریزی میں ایک کتاب[6] (Iqbal the poet) لکھی ہے۔انہوں نے اقبال کا موازنہ عالمی ادیبوں سے کیا ہے۔اقبال کی عظمت کی بات تو سبھی ناقدین کرتے ہیں لیکن عظمت کا معیار کیا ہو اس بارے میں اکثر خاموش رہتے ہیں۔اس سلسلے میں عبدالمغنی نے ایک اہم کام کیا ہے۔انہوں نے اقبال کی شاعری اور فکر و فلسفہ کا موازنہ عالمی ادیبوں سے کیا ہے۔یہی ایک مثبت طریقہ ہو سکتا ہے کسی شاعر کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے۔ عبدالمغنی نے اقبال کے فکر اور فن دونوں پر لکھا ہے۔ان کی کتاب 'اقبال کا فن' اس موضوع پر اہم کتابوں میں مانی جاتی ہے۔

---

1 باہتمکلام ینسیدہ ۔ ط ب پبلی کیشنز. گیا، ۱۹۸۲

2 اہتمام: اُردو بُک فاؤنڈیشن. نئ دہلی ۱۹۸۴

3 اہتمام: مکتبۂ جاطمعیہ ۔ نئ دہلی، ۱۹۸۹

4 اہتمام: مکتبۂ تعمیر انسانیت، لاہور: ۱۹۹۰ء

5 اہتمام:انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۱

6 ط: ۱۹۸۹

کلیم الدین احمد نے 'اقبال - ایک مطالعہ' میں اقبال کی شاعری اور فن پر جو اعتراضات کیے اور عالمی ادیبوں اور شاعروں اور ان کے کلام سے موازنہ کرکے اقبال کے کلام کو فروتر بتایا تھا اس کے رد عمل میں عبد المغنی نے یہ کتاب لکھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عبد الرحمان بجنوری نے جو کام غالب کے لیے کیا تھا اس کام کو عبد المغنی نے اقبال کے لیے کیا ہے۔

پروفیسر عبد المغنی ہی چونکہ نادانستہ طور پر کلیم الدین احمد کی کتاب 'اقبال۔ ایک مطالعہ' کی تالیف کا سبب بنے ہیں اس وجہ سے انہوں نے اس کے کفارہ کے طور پر اس کتاب کی تصنیف کی اور یقیناً انہوں نے اس کا حق بھی ادا کردیا۔ کلیم الدین احمد نے جس طرح سے جارحانہ انداز میں اقبال پر حملہ کیا اور اقبال کو شاعری میں پستہ قد ثابت کرنے کی ناکامیاب کوشش کی اس کاتر کی بہ ترکی جواب عبد المغنی نے دیا ہے۔ عبد المغنی کی نظر میں اقبال کا مدمقابل صرف اردو زبان ہی میں نہیں بلکہ پورا ادبیات عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ عبد المغنی نے کلیم الدین احمد کو مشرقی شعریات کے مزاج سے نابلد قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے جس انگریزی دانی کا انہیں دعوی ہے اس کے ادب ہی سے نہیں بلکہ انگریزی زبان میں کلیم الدین احمد کی استعداد سطحی ہے۔

پروفیسر عبد المغنی کا لہجہ بعض جگہوں پر جدلیاتی ہوگیا ہے، انہوں نے بھی وہی ترش لہجہ اختیار کرلیا ہے جو کلیم الدین احمد نے 'اقبال۔ ایک مطالعہ' میں اختیار کیا ہے۔ اس طرح اس کتاب پر اگرچہ جدلیاتی کتابوں کا رنگ آگیا ہے مگر ہم اس میں مصنف کو معذور سمجھتے ہیں، اس لیے کہ ایسی کتابوں میں کتنا بھی دامن بچایا جائے لہجہ ترش ہو ہی جاتا ہے۔ پرفیسر کلیم الدین احمد کا محاکمہ وہ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

"جناب کلیم الدین احمد کا یہ خیال کہ:

اردو میں نہ تو کوئی ڈن ہے، نہ پوپ، نہ بلیک، نہ ورڈسورتھ، نہ ہو پکد . سر، نہ یسٹ ، نہ ایلیٹ۔"

تنقید کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ ایسے بے معنی بیان کا سب سے آسان اور بالکل چست جواب تو یہ ہے کہ کہا جائے:

"انگریزی میں نہ کوئی درد ہے، نہ اکبر، نہ مومن، نہ جوش، نہ ن، م، راشد، نہ فراق، نہ فیض۔"

جب کہ ''غالب اور اس سے بھی بڑھ کر اقبال ہونا تو کسی انگریزی شاعر کے تصور سے بھی دور ہے۔''[1]

ایک اور جگہ وہ کلیم الدین احمد کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے پہلے کلیم الدین احمد کا اعتراض اور پھر اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زیر نظر کتاب کے باب ''ملٹن اور اقبال'' کی تمہید میں جناب کلیم الدین احمد رقمطراز ہیں: ''ملٹن اور اقبال میں کوئی قدر مشترک نہیں اور ملٹن اور اقبال کا موازنہ AN EXERCISE IN FUTILITY سے زیادہ نہیں۔ لیکن صفحہ 369 سے 416 پینتالیس صفحات میں ہمارے مغربی نقاد نے یہی لغو کام کیا ہے، جو بہر حال غیر متوقع نہیں، اس لیے کہ تضاد اور کارِ عبث جناب کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کی نمایاں ترین خصوصیات ہیں۔''[2]

عالمی پیمانہ پر کسی شاعر کو جانچنے کا معیار کیا ہو اس کے بارے میں ظاہر ہے کہ ناقدین اپنی سہولت اور ترجیحات کے مطابق الگ الگ رائے پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر عبد المغنی نے اس سلسلے میں اپنی رائے کچھ اس انداز میں قائم کی۔

''عالمی ادب میں اقبال کا مقام متعین کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ مشرقی ادبیات میں ان کی جگہ کیا ہے، مشرق میں جو زندہ زبانیں پائی جاتی ہیں، ان سب کے مشاہیر شعرا کی صف اولین میں سے ہم سب سے پہلے رومیؒ، حافظؒ، سعدیؒ، اور خیامؒ کا موازنہ اقبال کے ساتھ کرنا چاہیں گے، اس سلسلے میں یہ نکتہ تو بالکل واضح ہے کہ نہ صرف افکار کی گراں مائیگی اور وسعت کے اعتبار سے بلکہ اصناف و اسالیب کی کثرت اور تنوع کے لحاظ سے بھی اقبال کی جامعیت کا مقابلہ ان میں کوئی ایک شاعر تنہا نہیں کر سکتا، لہٰذا موازنہ کی جہت یہی ہو سکے گی کہ اقبال کے کسی ایک ہی پہلو کا تقابل ان میں سے ہر ایک کی پوری شاعری سے الگ الگ کیا جائے۔ موازنہ کی یہ جہت ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مجموعی طور پر فارسی کا کوئی ایک شاعر پورے اقبال کے برابر نہیں ٹھہرتا، اس کے بعد دیکھئے تو رومی کی مثنویات کا حجم جو بھی ہو، اقبال کی فارسی مثنویاں (اسرار خودی وغیرہ) اور اردو مثنوی (ساقی نامہ) ملا کر بہ اعتبار وصف رومی کی شاعری پر ایک وقیع اضافہ ہیں''[3]

---

1 اقبال اور عالمی ادب، عبد المغنی، ص 11، کریسنٹ پبلی کیشنز، گیا۔ ۱۹۸۲ء

2 اقبال اور عالمی ادب، ص 429،

3 اقبال اور عالمی ادب ،ص 565

تقابلی مطالعہ کے اس پیمانہ سے کلی طور پر اتفاق کرنا اگرچہ بعض لوگوں کے لیے مشکل ہو مگر اب تک تقابلی مطالعہ کے جو پیمانے وضع کیے گئے خصوصاً مشرقی شعرا کا موازنہ مغربی شعرا سے کرتے وقت، عبدالمغنی کا پیمانہ ان سب سے زیادہ انصاف پر مبنی ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی کی یہ کتاب اس لحاظ سے بھی ممتاز حیثیت رکھتی ہے کہ اس نے اقبال کا موازنہ عالمی شعراء سے مدلل اور عالمانہ انداز میں کیا ہے، اور تقابلی مطالعہ کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ اردو کی طویل نظموں کے ساتھ فارسی کی نظموں کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اس طرح عالمی سطح پر اقبال کے مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں عبدالمغنی بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

اقبال کے نظریہ 'خودی' پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا مگر یہ سلسلہ اب تک صرف مضامین اور مقالوں کی شکل میں تھا۔ اقبال کے اسی فلسفۂ خودی پر مفصل اور مبسوط کتاب 'اقبال کا نظریۂ خودی' لکھ کر عبدالمغنی نے ایک عظیم اضافہ کیا ہے۔ اقبالیاتی ادب میں سب سے زیادہ اقبال کے فکر پر گفتگو ہوتی ہے اور فکر میں بھی خودی کے فلسفہ پر سب سے زیادہ توجہ دی گئی ہے مگر عبدالمغنی کا ماننا ہے کہ اب تک نظریۂ خودی کی جو بھی تشریحات و توضیحات کی گئی ہیں ان میں پیچیدگی اور ژولیدگی ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی نظریۂ خودی کی بنیادی اساس اقبال کی کتاب "ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقا" اور "اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید" مانتے ہیں۔ بعد میں اقبال کے اشعار میں جو فکر پیش کی گئی ہے وہ انہی دو کتابوں کی تفصیل ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی نظریۂ خودی کو اقبال کے افکار کی بنیاد مانتے ہیں لہٰذا ان کی نظر میں 'اس نظریہ کی تشریح پورے نظام فکر کی توضیح ہے۔'

عبدالمغنی نے "اقبال کا نظریۂ خودی" میں نظریہ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کرکے اقبال کے پورے نظام فکر کی تلاش کی ہے اگرچہ اس کتاب میں افکار اقبال کی فلسفیانہ دستاویزوں کی تشریح کی گئی ہے مگر زیادہ زور ان کی شاعری پر دیا گیا ہے۔ ایسا اس وجہ سے کیوں کہ شاعری اقبال کا محبوب آلۂ ترسیل ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی صحیح شعور ذات کے ساتھ خودی کے لیے تعمیری سرگرمی کی بھی شرط لگاتے ہیں۔ ان کی نظر میں اس کے بغیر خودی کا مطمح نظر نامکمل ہے۔

پہلے خودی کے پس منظر مغرب، مشرق اور انسانیت پر گفتگو کرنے کے بعد خودی کے تمام ماٰخذ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ عبدالمغنی خودی کے پہلے ماخذ کے طور پر فلسفہ کا ذکر کرتے ہیں اس کے بعد "ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقا" اور "اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید" کا تفصیلی ذکر پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد شاعری میں خودی کے عناصر کی تلاش کرتے ہیں حصہ دوم میں نثری مضامین و مکاتیب کے حوالے سے اقبال کے نظام فکر کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"اقبال کا نظریۂ خودی جس پس منظر میں مرتب ہوا وہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مشرق و مغرب کی کش مکش تھی، جو اقبال کے خیال میں دراصل مادیت و روحانیت کی ایک ایسی آویزش تھی جس کے زیر اثر تہذیب و وحشت کی چپقلش پیدا ہو گئی تھی اور انسانیت حیوانیت کے مقابلے میں صف آرا تھی۔ اس طرح اپنے ماحول کے خلاف اقبال کا رد عمل نہ تو مہ . فیانہ تھا نہ سطحی، اسی لیے اس رد عمل کا محرک سیاسی اور قومی نہیں، نظریاتی اور اخلاقی تھا، گرچہ ایک قوم کی آزادی اور ایک ملت کا استقلال یقیناً اقبال کے پیش نظر تھا۔" [1]

عبدالمغنی نظریہ خودی کی ہمہ گیریت کے قائل ہیں، ان کی نظر میں:

"اقبال کا نظریہ خودی فی الواقع ہندوستان، مشرق، نوع انسانی اور ملت اسلامیہ سب کے لیے تھا اس لیے کہ اس کا نصب العین عروج آدم خاکی تھا۔" [2]

وہ لکھتے ہیں:

"اقبال نے جس انداز سے عصر حاضر کے سامنے نظریہ خودی پیش کیا وہ انہیں اپنے دور کے تمام مفکرین و قائدین سے ممتاز کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ مشرق کی نئی نسل سب سے زیادہ اقبال کے افکار سے متاثر ہوئی، جب کہ مغرب میں بھی ان کے متعلق تجسس پایا جاتا ہے اور یہ مسلسل بڑھتا جاتا ہے۔ یہ تاریخ کا نادر واقعہ ہے کہ کسی شاعر نے

---

1 اقبال کا نظریہ "خودی" ص 527

2 اقبال کا نظریہ "خودی" ص 538

معاشرے کی تشکیل جدید کے لیے کوئی متعین نصب العین متعین کیا ہو اور اسے عوام وخواص دونوں کے دلوں کی دھڑکن بنادیا ہو۔"[1]

اقبالیات پر پروفیسر عبد المغنی کی ایک اور گراں قدر تصنیف ''اقبال کا ذہنی و فنی ارتقاء'' ہے۔ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ اقبالیات پر بے شمار کتابیں ہونے کے باوجود بعض گوشے ایسے ہیں جو ابھی تشنہ ہیں اور ان پر کام ابھی باقی ہے۔ ''اقبال کا ذہنی وفنی ارتقاء'' اگرچہ صرف چند صفحات تک محدود ہے مگر اپنی معنویت کے لحاظ سے کافی اہم ہے۔ عبد المغنی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کی فکر میں تضاد نہیں ہے بلکہ ایک قسم کا تسلسل ہے اس کے اندر ارتقا پایا جاتا ہے تضاد نہیں۔ لکھتے ہیں:

''اقبال ایک منظم شاعر ہیں اور ان کی فکر کی استواری وہمواری ان کے فن کی عظمت کا باعث ہے اس کے علاوہ کلام اقبال میں فکر وفن کی ہم آہنگی بھی ذہن شاعر کے ہم آہنگ ارتقا پر مبنی ہے جس کے مختلف مراحل میں تضاد کے بجائے تطبیق کا پہلو نمایاں ہے، فی الواقع شروع سے اقبال کے کلام وپیام میں ایک نمایاں تسلسل ہے جس سے اس کے حسن میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، یہ تسلسل کسی منصوبے کے تحت نہ بھی ہو تو جذبے کی ہمواری کے سبب ہے ضرور۔'' [2]

عبد المغنی نے کلام اقبال میں ذہنی وفکری ارتقاء کو سمجھنے کے لیے اقبال کے کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے تحت ہر دور کی نظموں اور غزلوں کا جائزہ لیا ہے اور ماقبل کی شاعری اور مابعد کی شاعری سے ان کا رشتہ جوڑا ہے۔

عبد المغنی ان ناقدین کے خلاف ہیں جو اقبال کے فکر وفن میں تفریق کرتے ہیں ان کا ماننا ہے کہ یہ تفریق نامناسب ہے۔

کتاب کا مرکزی عنوان اقبال کے کلام میں فکری تضاد کا رد ہے، اس وجہ سے اسی بات پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی۔ لکھتے ہیں:

---

1 اقبال کا نظریہ ''خودی''، ص 543

2 اقبال کا ذہنی و فنی ارتقاء ص 12

''بانگ درا سے ارمغان حجاز تک اقبال کے کلام پیام کا جو تسلسل ہے وہ کم از کم تضاد سے یقیناً خالی ہے فکر و فن کے ارتقاء کی جو کیفیت اقبال کی شاعری میں ہے وہ بیج کے درخت بننے اور برگ و بار لانے کی ہے۔ اقبال کا پورا کلام ایک نظام جسمانی کی طرح عضویاتی طور پر مربوط اور سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اس کے اجزاء و عناصر میں تناسب اور توازن نمایاں ہے فطرت کا موضوع ہو یا محبت کا، خودی کے اسرار ہوں یا بے خودی کے رموز، فرد کا نغمہ ہو یا معاشرے کا...... زندگی اور فن کے یہ سارے پہلو اقبال کی حیات افروز شاعری میں اپنی اپنی جگہ اور ساتھ ساتھ بھی ایک خاص انداز سے رونما ہیں۔ ان کے درمیان ترکیب و ترتیب، ربط و ارتباط اور ہم آہنگی و پیوستگی کلام اقبال کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔''[1]

اقبال کے کلام میں ''شاہین'' کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے عبد المغنی رقمطراز ہیں:

''شاہین محض طاقت کا مجسمہ نہیں ہے جیسا عام طور پر سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے، اس کی خصوصیات میں فقر و غنا، غیرت و حمیت، سخت کوشی اور وسیع النظری جیسے اوصاف شامل ہیں اور اقبال نے ان سب اوصاف کی بنا پر ہی اس پرندے کو اپنے پیغام کی ایک علامت بنایا ہے، یہاں شاعر نے اپنے آپ یا انسان کو اپنی علامت کے ساتھ ضم نہیں کیا ہے اور اسے واحد متکلم میں اپنی حقیقت واضح کرنے کا موقع دیا ہے۔ مگر انداز و ادا سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاہین اقبال کا پسندیدہ کردار، ان کا ممدوح اور ان کی فکر میں صلابت کا اشاریہ ہے:

کیا میں نے اس خاکداں سے کنار
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری، نہ گل چیں، نہ بلبل
نہ بیمارھ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

1 اقبال کا ذہنی و فنی ارتقاء ص 127

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری

جواں مرد کی ضربت غازیانہ

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں ہیں

کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ "[1]

علامہ اقبال کی شاعری پر ان کی فکر کی بہ نسبت کام کم ہوا ہے، اقبال پر کام کرنے والے ان کے کلام میں پائے جانے والے فکر اور پیغام سے کچھ اس قدر مسحور ہو جاتے ہیں کہ اقبال کی شاعری پس منظر میں چلی جاتی ہے، یہیں سے بعض ناقدین نے یہ بات بھی پھیلائی کہ اقبال کی شہرت ان کے کلام کی وجہ سے نہیں بلکہ فکر کی وجہ سے ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبال شاعر پہلے ہیں فلسفی اور مفکر بعد میں، فکر و فلسفہ کی ساری رعنائی انہی اشعار کی فن کاری کی وجہ سے ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ اقبال شاعر اور اقبال فلسفی میں زیادہ اہم کون مگر اتنی بات تو ضرور ہے کہ ان میں سے اقبال کی کسی بھی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صرف اقبال مفکر کا مطالعہ اسی طرح ادھورا اور نامکمل رہے گا جس طرح صرف اقبال شاعر کا مطالعہ رہے گا۔

پروفیسر عبد المغنی نے اسی اہم ضرورت کو سامنے رکھ کر اقبال کے نظام فن کا مطالعہ ایک نہایت ہی مبسوط کتاب 'اقبال کا نظام فن' میں کیا ہے۔ اقبال کے نظام فن پر اس سے پہلے اور بعد میں بھی کچھ کتابیں منظر عام پر آئیں مگر ان کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ مختلف اصحاب قلم کے مضامین کا مجموعہ ہیں اور جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں کہ مختلف مواقع پر لکھی گئی ماہرین کی تحریریں کسی بھی موضوع کا پورا حق ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ ہنگامی طور پر ان مضامین سے کام چلایا جا سکتا ہے، لیکن کسی بھی موضوع کی پوری تفصیل سے قاری کو روشناس کرانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کوئی مستقل کتاب لکھی جائے۔ پروفیسر عبد المغنی کی یہ کتاب اس ضروت کو پوری کر رہی ہے۔ عبد المغنی اقبال بحیثیت شاعر کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

1 اقبال کا ذہنی و فنی ارتقاء ص 77

''اقبال کے افکار نے ایسا طلسم قائم کر دیا ہے کہ ان کے فن کی طرف بہ مشکل کسی کی توجہ مبذول ہوتی ہے حالانکہ یہ طلسم در حقیقت فن ہی پر مبنی ہے اقبال کے تصورات شاعری کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اور ان کا مطالعہ کرنے والے سب سے پہلے شاعری ہی سے لطف بھی لیتے ہیں۔ اسی لطف کے سبب وہ ان افکار کے طلسم میں گرفتار ہوتے ہیں جن کے اظہار کے لیے یہ شاعری کی گئی ہے۔ چنانچہ اگر شاعری کو ہٹا دیا جائے تو افکار میں جو طلسم کی جو کیفیت ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔''[1]

گویا کہ عبدالمغنی اقبال کی حیثیت بحیثیت شاعر کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اقبال کے فکر کی رنگینی بھی شاعری کے مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعی طور پر ان کے یہاں شاعر اقبال کا پلڑا فلسفی اقبال پر بھاری ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ اقبال کی فکر ہی ان کے فن کا محرک رہی ہے اس کا مواد اور موضوع بھی مگر اس کا اظہار شاعری ہی میں ہوا۔

اقبال کے فن کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''اقبال کی فکری اور فنی ہم آہنگی کا راز یہ ہے کہ انہوں ن فکر کو کبھی اپنی فنی زندگی کا مسئلہ بننے نہیں دیا بلکہ شروع سے ایک سلیم و مستقیم فکر کو مسئلے کے حل کے طور پر قبول کر لیا اور اسے اپنی تمام کاوشوں کا معیار و محور بنا دیا، جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فن کی تخلیق و تزئین کے لیے یکسو ہو گیے اور اس تخلیقی عمل پر اپنی بہترین توجہات اور صلاحیتیں مرکوز کر سکے۔''[2]

عبدالمغنی، اقبال کو اردو کا سب سے بڑا غزل گو مانتے ہیغزلوں کو اقبال کے مجموعہ ِ کلام کو صرف تتمہ نہیں مانا ہے۔ اس طرح اقبال نے عبدالمغنی نے اقبال کے نظام فن کو سمجھنے کے لیے اقبال کی نظموں غزلوں قطعات اور رباعیات سب کو اپنے معروضی مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ عام طور پر اس قسم کے مطالعہ میں چھوٹی نظموں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے مگر عبدالمغنی نے ان تمام کو اس میں شامل کر لیا ہے۔

---

1 اقبال کا نظام فن ص۱۱

2 اقبال کا نظام فن ص۱۳

عبد المغنی نے کلیم الدین احمد کے رد میں اقبال کا مقام و مرتبہ اردو ہی نہیں عالمی شعراء سے بھی بڑھا دیا ہے۔ یہ رویہ بھی کلیم الدین احمد کی طرح لائق ستائش نہیں ہے۔ دونوں اس معاملہ میں حقیقت سے دور ہیں۔ سچ یہ ہے کہ کلیم الدین احمد کی اقبال شکنی سے اقبال کی عظمت پر کوئی حرف آئے گا اور نہ پروفیسر عبد المغنی کی مدلل مداحی سے اقبال کا قد بلند ہو گا۔ اقبال ایک عظیم شاعر ہیں اور رہیں گے۔

اقبالیات میں عبد المغنی کی کاوشیں اقبال شناسی کے نئے افق روشن کرتی ہیں۔ ان کی کتابوں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ مختلف مضامین کا مجموعہ نہیں ہیں۔ انہوں نے اقبالیات پر منظم طور پر مستقل یک موضوعی کتابیں لکھی ہیں۔ اقبال تنقید میں بہت کم ناقدین نے اس قسم کی کوششیں کی ہیں۔ اس وجہ سے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبالیات کی تفہیم میں عبد المغنی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

# گوپی چند نارنگ

اقبال کی خوش نصیبی ہے کہ تقریباً ہر بڑے نقاد نے ان کی شاعری اور فکر پر خامہ فرسائی کی ہے۔ چاہے اقبال کی شاعری اور فکر کو ستائشی نظروں سے دیکھا ہو یا اس کے اندر اسے خامیاں ہی نظر آئی ، لیکن اقبال کے لیے یہ اعزاز ہی کافی ہے کہ ان پر لکھے بغیر کوئی بڑا نقاد نہیں بن سکتا۔ گویا کہ اقبال، ناقدین کی تنقیدی بصیرت اور مہارت کو جانچنے کا ایک پیمانہ بن گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ عہد کے اہم ناقدین نے بھی اقبال پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ گوپی چند نارنگ اس سے مستثنٰی نہیں ہیں۔ انہوں نے اقبال کے کلام کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ دوسروں سے متاثر ہوئے بغیر کلام اقبال کو خود ان کے کلام کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس وجہ سے ان کی تنقید میں ندرت اور جدت ہے۔ اقبالیاتی تنقید میں ان کی مرتب کردہ کتاب 'اقبال کا فن' اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اقبال کی شاعری کی فنی تنقید پر مشتمل مضامین کو جمع کیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختلف ناقدین کے مضامین کا مجموعہ ہے لیکن اس کی خاص بات مرتب کا حسن انتخاب اور اس میں شامل مضامین ہیں جو ان کے ذوق وشوق کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کی ایک دوسری کتاب 'اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر' میں بھی مضامین کا مجموعہ ہے اس میں انہوں نے جامعہ کے قدیم وجدید لکھنے والے مصنفین کی ان تحریروں کا انتخاب شائع کیا ہے جو انہوں نے اقبال کی شاعری اور فکر پر لکھا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس قسم کی کتابوں میں وحدت فکر مفقود ہوتی ہے۔ ساتھ ہی مؤلف قلم کاروں کی بھیڑ میں گم ہو جاتا ہے۔

گوپی چند نارنگ نے اقبالیات پر بہت کم لکھا ہے۔ جو بھی لکھا ہے وہ محض چند مضامین ہیں۔ اس کے باوجود اقبال کے فکر وفن پر لکھی گئی تحریروں میں ان کے وسیع مطالعہ اور گہرے فکر کی چھاپ نظر آتی ہے۔

گوپی چند نارنگ اردو دنیا کی متحرک ترین ہستیوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اقبال پر کئی سمینار منعقد کرائے۔ اقبال صدی تقریبات کے سلسلے میں انہوں نے ایک سمینار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کرایا تھا۔ اس سمینار کے مقالے انہوں نے 1983 میں ''اقبال کا فن'' کے نام سے مرتب کرکے شائع کر دیا، یہ کتاب اس معنی میں کافی اہم ہے کہ اب تک اقبال مفکر اور فلسفی پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر اقبال پر بطور شاعر توجہ کم دی گئی ہے حالانکہ اقبال شاعر اور اقبال فلسفی میں فرق

کرنا بہت مشکل ہے کسی ایک حیثیت کو دوسرے کے مقابلہ میں نظر انداز کرنا نہ مناسب ہے اور نہ ہی ممکن۔ بہر حال یہ کتاب علامہ اقبال کے فن پر روشنی ڈالتی ہے۔ 17 مضامین میں سے دو مضامین، گیان چند جین کا مضمون ''اقبال کے کلام کا عروضی مطالعہ'' اور گوپی چند نارنگ کا مضمون''اسلوبیات اقبال'' اگرچہ سمینار میں نہیں پڑھے گئے تھے مگر موضوع کی مناسبت سے اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

''اقبال کا فن'' اس لحاظ سے اہمیت کی حامل کتاب ہے کہ اس کے اندر ماہرین اقبالیات کی پوری ایک ٹولی جمع ہے۔ 'اقبال کے کلام میں جلال و جمال کی آمیزش'از یوسف حسین خاں،'خضر راہ ایک مطالعہ' ازآل احمد سرور 'اقبال کے دو طویل نظموں کی بازآفرینی - خضر راہ اور مسجد قرطبہ'؛'ترمیمات اقبال کا تنقیدی جائزہ'از جگن ناتھ آزاد'اقبال کا لفظیاتی نظام 'از شمس الرحمان فاروقی جیسے مضامین اپنے اہل قلم کی بالغ نظری اور موضوع کی ندرت کی وجہ سے اقبالیاتی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔

گوپی چند نارنگ کا مضمون' اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام' اقبالیاتی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر انہوں نے اقبالیات پر کوئی اور مضمون نہ لکھا ہوتا تو ان کا یہی مضمون ان کو اقبالیاتی ادب میں باقی رکھنے کے لیے کافی تھا۔ اس مضمون کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ''زیر نظر مضمون میں اقبال کی اردو شاعر کے اسلوبیاتی مطالعے کے صرف ایک پہلو یعنی صوتیاتی نظام کو لیا جائے گا۔ اسلوبیاتی مطالعے کی کئی سطحیں اور کئی پہلو ہوسکتے ہیں، مثلاً کوئی بھی فن پارہ اظہاری اکائی کے طور پر وجود میں آتا ہے۔ یہ اکائی کلموں سے مل کر بنتی ہے جسے اظہار کی نحوی سطح کہہ سکتے ہیں۔ کلمے، لفظوں یا لفظوں کے قلیل ترین حصوں یعنی صرفیوں (Morphemes) سے مل کر بنتے ہیں، جنھیں اظہار کی لفظیاتی یا صرفیاتی سطح کہہ سکتے ہیں اور یہ صر فیے بجائے خود اصوات کا مجموعہ ہوتے ہیں جنھیں اظہار کی صوتیاتی سطح کہہ سکتے ہیں۔ اس مضمون میں اظہار کی سب سے بنیادی سطح یعنی صوتیاتی سطح ہی کے بارے میں غور و خوض کیا جائے گا۔'[1]

---

1 اقبال کی شاعری کا صوتیاتی نظام از گوپی چند نارنگ، مشمولہ اقبال کا فن، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشرز دہلی ۱۹۸۳ء

مسعود حسین کی طرح گوپی چند نارنگ بھی اقبال کے یہاں صوتی آہنگ کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ اقبال کی شاعری کو غالب پر فوقیت دیتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کی شاعری کی مقبولیت کو بھی صوتی آہنگ میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''غالب اور اقبال کے صوتیاتی آہنگ کا بنیادی فرق مصمتوں سے زیادہ مصوتوں کے استعمال میں کھلتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین نے صحیح اشارہ کیا ہے ''غالب کا کمال لفظ اور ترکیب میں ظاہر ہوتا ہے صوتی آہنگ میں نہیں۔ وہ لفظ کی تہ داری اور ترکیب کی پہلو داری سے اکثر اوقات صوتی آہنگ کی کمی کو چھپا لے جاتے ہیں'' اقبال کے یہاں یہ کیفیت نہیں۔ ان کے یہاں صوتی آہنگ کی کمی کا احساس قطعاً نہیں ہوتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی کہ ان کے اشعار کو کہیں سے پڑھیے، ان میں عجیب و غریب نغمگی کا احساس ہوگا، گویا لفظوں میں موسیقی سموئی ہوئی ہے۔ آخر غالب کے صوتی آہنگ کی وہ کون سی کمی ہے جو اقبال کی آواز تک پہنچ کر دور ہو گئی ہے۔ اتنی بات معلوم ہے کہ غالب کا فن معنی آفرینی کا رمزیہ فن ہے۔ ان کا فنی سانچا غزل کا شعر یعنی دو مصرعوں کی محض ذرا سی زمین ہے جس میں وہ جہاں معنی آباد کر دیتے ہیں۔ اگرچہ اقبال کی شاعری بھی رمزیہ امکانات رکھتی ہے لیکن ترغیب عمل کی پیغامی شاعری ہونے کی وجہ سے اس کے فنی سانچے وسیع ہیں۔''[1]

گوپی چند نارنگ نے اقبالیات پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے۔ اقبالیات پر ان کا کل سرمایہ چند مضامین کی شکل میں ہے۔ پھر بھی یہ مضامین کسی کتاب سے کم نہیں ہیں۔

---

1 ایضاً

# شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمن فاروقی اردو تنقید کا وہ نام ہے جس کے بغیر اردو تنقید کی مختصر سے مختصر تاریخ بھی نامکمل سمجھی جائے گی۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے وہ جدیدیت کے علمبردار ہیں۔ وہ تنقید میں متن کی قراءت کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین عام روش سے ہٹ کر ایک نئی راہ دکھاتے ہیں۔ فاروقی کی تنقید کی سب اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ جب لکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اونچائی سے مخاطب ہے۔ وہ تنقید نگار سے زیادہ ایک معلم نظر آتے ہیں۔ انہوں نے میر و غالب کی تنقید پر نئے زاوئے سے کام کیا۔ بہت ساری پرانے نظریات پر انہوں نے قلم پھیر دیا۔ ان کا قلم اگرچہ غالب اور میر کی طرح اقبال کی طرف متوجہ نہیں ہوا لیکن اقبال کی شاعری ان اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہی۔ انہوں نے اقبال پر اگرچہ کم لکھا لیکن جو بھی لکھا ہے اس میں ان کے سلیقہ، شعور، اور فہم و فراست کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

وہ اقبال کو بنیادی طور پر شاعر مانتے ہیں:

> ''اقبال کی اہمیت قائم ہی اسی وجہ سے ہوئی کہ وہ شاعر ہیں۔ لہٰذا ان کی شاعری کو ترک کر کے کسی بھی چیز کو اختیار کرنا، چاہے وہ جذباتی طور پر ہمارے لیے کتنی ہی خوشگوار کیوں نہ ہو، ادبی مطالعے کے ساتھ بے ادبی کے علاوہ خود اقبال کے ساتھ بے انصافی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اقبال کے افکار جس شکل میں بھی ہمارے سامنے ہیں وہ اُن کی شاعری ہی کے مرہون منت ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ انھی افکار کو کسی اور پیرائے میں بیان کر دیا جائے اور پھر بھی وہ اقبال کے افکار و آثار رہ جائیں۔ وہ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' ہو یا ''طلوع اسلام'' یا ''ساقی نامہ'' یا ''مسجدِ قرطبہ'' کسی بھی نظم میں کوئی ایسا خیال نہیں ہے جسے خالص اقبالؔ کی ملکیت کہا جا سکے یا جس کے بارے میں یہ دعویٰ ہو سکے کہ اگر یہ خیال اقبال اس نظم میں نہ رکھتے تو دنیا اس سے محروم رہ جاتی۔ ان خیالات میں جدت، لذت، حسن جو کچھ بھی ہے وہ محض اس وجہ سے ہے کہ وہ اقبالؔ کی زبان میں بیان ہوتے ہیں، ورنہ ان کا کوئی

Patent اقبال کے پاس نہیں تھا۔ وہ ہم آپ ہوں یا اقبال کا بڑے سے بڑا شارح، ان خیالات کو نظم سے الگ بیان کیا جائے تو اقبالؔ کی نظم نہیں، بلکہ ایک نسبتاً یا کلیتاً بے روح بیان وجود میں آئے گا۔"[1]

شمس الرحمن فارقی کی تنقید کی خاص بات یہ ہے کہ وہ آسان اور عام فہم دلائل سے قاری کو قائل کر لیتے ہیں۔ مذکورہ بالا اقتباس میں انہوں نے اقبال کی شاعری کو اس کے فکر پر ترجیح دینے کی جو منطق پیش کی ہے وہ بہت سارے ان ناقدین کے لیے سیکھنے کی چیز ہے جو اقبال کو شاعر نہیں بلکہ فلسفی تسلیم کرتے ہیں، یا وہ لوگ جو اقبال کو فلسفی کے ساتھ 'شاعر بھی' تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ سوال اپنے آپ میں اہم ہے کہ اقبال نے اگر شاعری کے علاوہ نثر میں ان خیالات کو بیان کیا ہوتا تو اسی طرح اثر انگیز ہوتے جیسے کہ موجودہ شکل میں ہیں، اس کا جواب یقیناً نفی میں ہو گا۔ میرا ماننا ہے کہ ایسی صورت میں وہ تاریخ کی ان لاکھوں ہستیوں کی بھیڑ میں گم ہو جاتے جن کا نام بھی ہم آج نہیں جانتے۔

فاروقی شاعری میں موسیقیت اور آہنگ کو خاص طور پر اہمیت دیتے ہیں اس لیے نہیں کہ شاعری خاموش بیٹھ کر پڑھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ 'شاعری کا آہنگ دراصل وہ موسیقی ہے جو خاموش ہیں پڑھنے میں نمایاں ہو جسے ساز یا ترنم کی ضرورت نہ ہو'۔ اس مفروضے پر انہوں نے کلام اقبال کو پرکھنے کے بعد رائے دی ہے کہ ' اقبال کا شاعرانہ حُسن اُن کے افکار پر مقدم ہے'

اقبال کی نظموں پر انتشار کی کثرت کی وجہ سے اور غزلوں پر فکر کی وحدت کی وجہ سے اعتراض ہوتے رہے ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ اقبال نے دونوں کی سرحدوں کو باہم ملا دیا ہے۔ فاروقی نے اقبال کی نظموں میں پائے جانے والے فکری انتشار کو خصوصی مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے نظم کی کسی ایسی تعریف کو وضع کرنا کہ اقبالؔ کی مبینہ غیر نظم نظمیں بھی اس تعریف کے تحت شامل ہو سکیں ایک مشکل کارروائی ہے۔ لیکن یہ غیر ضروری کارروائی بھی ہے کہ کیوں کہ اگر یہ ثابت ہو سکے کہ اقبال کی نظموں میں وحدت اور تسلسل موجود ہے تو نئی تعریف وضع کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ وہ لکھتے ہیں:

---

1 شمس الرحمن فاروقی، اقبال کا لفظیاتی نظام، بحوالہ : اقبال کا فن، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۳ء

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اقبالؔ کی طویل اور نسبتاً طویل نظموں میں تسلسل اور وحدت کے ذریعہ قوت دراصل ان کے لفظی دروبست کی بنا پر جود میں آئی ہے۔ اس کلیے کو ثابت کرنے کے لیے میں ''ذوق وشوق'' کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔''

فاروقی نے اقبال کی شاعری میں مستعمل علائم اور رموز اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے انہوں نے خصوصی طور پر لالہ کا تذکرہ کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اردو شاعری میں گل وبلبل کی جگہ شاہین اور لالہ صحرا کو اپنے اظہار کے لیے چنا۔ چونکہ اقبال کی مقصدیت کے لیے یہ زیادہ موزوں تھے۔ فاروقی نے لالہ کی تشریح میں یوسف سلیم چشتی کی تشریحات کو ناکافی قرار دیتے ہوئے اس کی معنویت کو ایک وسیع پس منظر میں بیان کیا ہے۔ کلام اقبال میں وارد لالہ کی علامتوں کو سامنے رکھتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''پورے تناظر میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو لالۂ صحرا کے استعارے کے ذریعہ ظاہر کرنا دراصل علامتی ہے۔ کیوں کہ لالے کا سوز دروں اور داغ عشق پہلے حوالوں سے قائم ہو چکے ہیں۔ اب اس کی سرخی اور گل گونی اس پر مستزاد ہے۔ سُرخ جو کام یابی، عزت داری، شاہی، جلال اور خون کا رنگ ہے، لفظ صحرا لالے کے پھول کی مضبوطی اور اس کی قوت نمو ظاہر کرتا ہے اور اس بات کو بھی کہ یہ پھول اگرچہ نامساعد اور بیابانی ماحول میں اُگا لیکن اس کی فطرت جیسی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایسے ہی حالات میں کھلے۔ لالۂ صحرا کی تنہائی اس کی یکتائی اور ورڈزورتھ کے گل بنفشہ کی طرح اس کی ناقدری کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ اس طرح لالۂ صحرا اسلام اور اُس کے بہترین پھول یعنی مرد مومن اور اس کی خاک پیدائش یعنی حجاز، ان سب تصورات کو محیط ہو جاتا ہے۔
''

یہ لالہ کی کامل تشریح ہے جو اقبال کے کلام اور ان کے آہنگ سے مطابقت رکھتی ہے۔

فاروقی ناقدین اقبال کی اقبال کی شاعری کی فنی خصوصیات تک عدم رسائی کے شاکی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال کے کلام میں رعایت لفظی کی اتنی ہی رعایت ہے جتنی کہ غالب کے یہاں۔ وہ اقبال کی شاعری کی لفظیات کو ماضی کی روایات کا روشن نمونہ قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے 'ذوق وشوق' کی اپنے مخصوص لہجے میں تشریح کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے اندر پائی جانے والی رعایت لفظی اردو شاعری کی اس روایت کا تسلسل ہے جس کے امین میر وغالب ہیں۔ فاروقی بنیادی طور پر شارح ہیں۔ ان کا قلم شرح نگاری میں نکتہ آفرینی کی جو مثال پیش کرتا ہے وہ اردو کی ادبی تاریخ میں اس سے پیشتر دیکھنے کو نہیں ملتا۔ انہوں نے اقبال کی شاعری کی کوئی تشریح اب تک نہیں لکھی ہے جس طرح انہوں نے میر اور

غالب پر لکھا ہے۔ لیکن انہوں نے جن نظموں کی تشریح کی ہے اس میں وہی فکر کی تازگی اور ندرت ہے جو میر وغالب پر لکھتے ہوئے ان کے یہاں ہے۔ بطور مثال 'ذوق وشوق' کے ایک شعر کی تشریح ملاحظہ فرمائیں:

''صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبر حسینؑ بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

نکات ورعایات: صدق خلیل اور صبر حسین دونوں قافلۂ حجاز کی یاد دلاتے ہیں۔ خلیل اللہ کا مختصر قافلہ جو ان کے اہل خانہ پر مشتمل تھا، حرم کی تعمیر کرتا ہے اور حسین کا قافلہ جو اُن کے اہل خانہ پر مشتمل تھا، حرم کا استحکام کرتا ہے۔ (نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسمٰعیل) پچھلے شعر میں دل اور نگاہ شروع میں مذکور دل کے سود اور نگاہ کے زیاں سے مربوط ہیں اور یہ تینوں (عقل ودل ونگاہ) صدق خلیل سے مربوط ہیں، کیوں کہ خلیل اللہ نے عقل کے مشاہدے اور نگاہ کی بصارت کو دل کی گواہی سمجھا لیکن جب ان پر عشق آشکار ہوا تو انھیں معلوم ہوا کہ اصلیت تو کچھ اور ہے۔ جو کچھ اُن کی آنکھ دیکھتی گئی وہ جھوٹا ثابت ہو گیا، اس طرح نگاہ کا زیاں دل کا سود بنا۔ معرکہ وجود کا تعلق صبر حسین سے بھی ہے کہ انھوں نے جان کھو کر زندہ وجود حاصل کیا اور حسنِ ازل کی نمود سے بھی، کہ جس کے ذریعہ پردۂ وجود چاک ہوتا ہے اور حقیقت نمودار ہوتی ہے۔ یعنی حسین نے پردۂ زندگی چاک کیا تو انھیں حسن ازل کی نمود کا دیدار ہوا۔''

اس تشریح میں انہوں نے جس طرح تاریخی روایات میں تسلسل اور ان کے اندر باہمی ربط تلاش کر کے نتائج اخذ کیے ہیں وہ متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اگرچہ اقبالیات پر کم لکھا ہے لیکن جو بھی لکھا ہے وہ اقبالیات میں اعادہ کے بجائے اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

# شکیل الرحمن

شکیل الرحمن کا شمار اردو تنقید میں جمالیات کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ انہوں نے مختلف ادیبوں اور شاعروں کے یہاں جمالیاتی عناصر کی تلاش کی ہے۔ ان کی تقریباً تیس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اقبال بھی ان کے مطالعہ کا محور رہے ہیں انہوں نے اقبالیات پر دو اہم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ 'اقبال اور فنون لطیفہ'[1] اور 'اقبال روشنی کی جمالیات'[2]۔ شکیل الرحمن کی تنقید ہیہ ر ۔ ے ی تنقید کے دائرے میں آتی ہے وہ تنقید میں فن پارے کے متن پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ اقبال اور فنون لطیفہ ان کی مشہور و معروف کتاب ہے جس میں انہوں نے اقبال کے نظریہ فن، فنون لطیفہ سے متعلق تصورات، تخلیقی عمل، تصور عشق، موسیقی اور مصوری وغیرہ سے متعلق مباحث سے گفتگو کی ہے۔ کتاب کے ایک حصہ میں انہوں فنون لطیفہ سے متعلق اقبال کی شاعری سے انتخاب پیش کیا ہے۔

'اقبال: روشنی کی جمالیات' میں انہوں نے اقبال کی شاعری کے ایک اہم پیکر روشنی کو موضوع بنایا ہے۔ روشنی اقبال کے حسیاتی پیکروں میں کافی آہم عنصر ہے۔ شکیل الرحمن نے اقبال کے ان تمام جمالیاتی تجربوں کا جن میں روشنی کا حسیاتی پیکر ابھرتا ہے، تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔

شکیل الرحمن کی کاوشیں اقبالیاتی ادب میں فن کے حوالے سے کافی اہم ہیں۔ بلاشبہہ انہیں اقبالیات میں ایک بیش بہا اضافہ کے طور پر دیکھا جائے گا۔

---

1 ط: شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجران کتب، سری نگر، ۱۹۷۸

2 ط: اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

# ظ۔ انصاری

ظ۔ انصاری اردو کے ایک اہم ناقد ہیں۔ وہ اردو تنقید میں اپنے تختہ شعور کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اقبالیات پر کم لکھا ہے لیکن جو بھی لکھا ہے اس میں ان کی علمیت کی چھاپ واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کی تنقیدی کتابوں میں 'ورق ورق'، غالب شناسی' اور خسرو شناسی' کافی اہم مانی جاتی ہیں۔ ان کی کتاب 'اقبال: کی تلاش'[1] اقبالیات پر ان کی اکیلی کتاب ہونے کے باوجود انہیں اقبال شناسوں کی بھیڑ میں منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ انہوں نے اس میں اقبال کی شاعری اور فن پر جس انداز سے گفتگو کی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اقبالیات پر گیارہ مقالوں کو شامل کیا ہے۔ جن میں چند اہم مضامین ہیں۔ اقبال اور ہم، شعور کے چار چشمے، بمبئی میں چار روز، اقبال اور جرمنی، پنجاب کے پس منظر میں۔ شان جلالی شان جمالی، فراق ووصال، قلندر کا لہو ترنگ، خدا لگتی، ردو قبول کا عمل، تصوف کا تاریخی رول۔

یہ سبھی مضامین ان کے پختہ تنقیدی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ ظ انصاری کی نظر اقبالیاتی ادب پر بھی ہے انہوں نے اقبالیات پر شائع ہونے والی کتابوں اور خصوصی نمبروں پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ اس حوالے سے ابوالحسن ندوی کی نقوش اقبال پر ان کا تبصرہ کافی اہم ہے۔

---

1 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۸ء

# نصیر احمد ناصر

اقبال کی شاعری پر فنی نقطہ نظر سے لکھنے والوں میں ایک نام نصیر احمد ناصر کا بھی ہے۔وہ اقبال کے شیدائیوں میں سے ہیں، تعلیم و تعلم سے ان کا رشتہ ہے۔ بہاولپور یونیورسٹی، پاکستان کے سابق وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ ان کی کتاب 'اقبال اور جمالیات' (۱۹۸۰) اقبال کی شاعری میں جمالیاتی عناصر کی تلاش کی ایک اچھی کوشش ہے۔انہوں نے اقبال کے کلام اور ان کے فکر سے شواہد جمع کرکے اقبال کی خودی کے جمالیاتی مضمرات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔اس کے ساتھ ہی **انہوں** نے اقبال کے دوسرے نظریات وحدت الوجود اور نظریۂ حرکت و عمل میں پوشیدہ جمالیاتی عناصر کی نشاندہی کی ہے۔کتاب کے دو حصے ہیں پہلا 'حسن' ہے جس میں انہوں نے انہوں نے خودی، وحدت الوجود، حسن معروضی اور حسن موضوعی، اور حسن کا حرکی نظریہ جیسے موضوعات سے بحث کی ہے۔کتاب کا دوسرا حصہ 'فن' کے عنوان سے ہے جس میں انہوں نے فن کی ماہیت، مقصدیت فن، فن اور فطرت اور فنی صلاحیت جیسے موضوعات پر گفتگو کی ہے۔

نصیر احمد ناصر کا ماننا ہے کہ اقبال کے جمالیاتی نظریہ کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ان کے جمالیاتی تصورات بکھرے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے ان تصورات کو یکجا کرکے نظریات کی صورت میں اس کتاب میں بیان کیا ہے۔

وہ حسن کے معروضی نظریہ پر گفتگو کرتے ہوئے وحدت الوجودی اور معروضی نظریۂ حسن کو یکساں قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک جمالیات کا تعلق ہے وحدت الوجوی اور معروضی نظریوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں، کیونکہ دونوں دبستان حسن کی آزاد معروضیت کے قائل ہیں؛یعنی دونوں موضوع سے آزاد حسن کے خارجی وجود کو تسلیم کرتے ہیں،اس امر کی تشریح یہ ہے کہ معروضی نقطۂ نظر سے حسن معروض یا خارج میں فی الواقعہ موجود ہوتا ہے اور

اسے اپنی ہستی کے لیے موضوع کی حاجت نہیں ہوتی؛ لیکن وحدت الوجود اور معروضی دبستانوں میں فروعی لحاظ سے فرق بھی ہے، جسے 'تفاعتی علتی' کہہ سکتے ہیں۔"[1]

علامہ اقبال کا پورا فلسفہ حرکت و عمل کا تھا اس فلسفہ کی کار فرمائی اقبال کے نظریۂ فن میں بھی نظر آتی ہے۔ نصیر احمد ناصر کے مطابق اقبال کے حسن کا فلسفہ بھی حرکی ہے۔ انہوں نے کتاب کے چھٹے باب 'حسن کا حرکی نظریہ' میں اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اقبال کے کلام کے علاوہ اقبال کے خطبات سے بھی شواہد پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ اقبال کے نظریۂ حرکت و عمل کی کار فرمائی ان کے نظریۂ حسن تک محیط ہے۔

نصیر احمد ناصر کو اس بات کا احساس ہے کہ حسن اور جمالیات کے الفاظ اگرچہ سننے میں اچھے لگتے ہیں لیکن ان کی تعبیر و تفہیم اتنی ہی پیچیدہ ہے۔ خاص طور پر فلسفہ حسن کی وضاحت ایک مشکل امر ہے۔ نصیر احمد ناصر نے اگرچہ اس کو آسان لفظوں میں بیان کیا ہے لیکن اس کی تفہیم ایک عام قاری کے لیے دشوار گزار ہے۔

مجموعی طور پر نصیر احمد ناصر کی کتاب اقبال کے کلام میں جمالیاتی عناصر اور جمالیاتی نظام کو سمجھنے میں معاون کتاب ہو سکتی ہے۔

---

1 اقبال اور جمالیات، نصیر احمد ناصر، ص ۷۷، اقبال اکادمی پاکستان، ط اول ۱۹۶۴، دوم ۱۹۸۱ء

# جابر علی سید

پروفیسر جابر علی سید اقبال کے اہم ناقدین میں سے ہیں انہوں نے اقبالیات کو دو اہم کتابوں کا تحفہ دیا ہے۔ ان کی کتاب 'اقبال کا فنی ارتقاء' (۱۹۷۸ء) اقبال کی شاعری کی فنی خوبیوں کو اجاگر کرنے والی ایک اہم کتاب ہے۔ پروفیسر جابر علی سید کو علم عروض پر دسترس حاصل ہے۔ اس موضوع پر ان کی کتاب 'لسانی اور عروضی مقالات' کافی اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقبالیات میں بھی فنی مباحث کو اپنے بحث کا موضوع بنایا اور مختلف موضوعات کے تحت اقبال کے فن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب 'اقبال کا فنی ارتقاء' کے چند اہم مضامین یہ ہیں: اقبال اور لفظ و معنی کا رشتہ، اقبال کا فنی ارتقا، ابوالعلا مصری۔ ایرج میرزا اور اقبال اور خطابیہ نظم، اقبال کی ایک غزل، اقبال کا شعری آہنگ، اقبال کا تصور فن۔ یہ سبھی مضامین اقبال کے فن کو محیط ہیں۔ اقبال کے فن پر لکھنے والوں کی قلت کے پیش نظر عام طور پر اقبال کے فن پر مضامین کے مجموعوں سے کام چلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پروفیسر جابر کی کوشش لائق ستائش ہے کہ انہوں نے ایک مستقل کتاب اقبال کے فنی ارتقاء کے موضوع پر لکھ دی۔

پروفیسر جابر علی کی دوسری کتاب 'اقبال۔ ایک مطالعہ' (۱۹۸۵ء) ہے۔ اس میں اقبال کی شاعری اور فن پر دس مضامین شامل ہیں۔ چند اہم مضامین کے نام یہ ہیں: اقبال اور فطرت، اقبال کا نظریہ حسن، شمع و شاعر تجزیہ، اقبال اور ذوق استفسار، اقبال اور تغزل، اقبال اور قطعہ، رباعی تنازعہ، اقبال کے ایک مصرعے کی تشریح، اقبال کے کلام میں فنون لطیفہ کے عناصر، مثنویات اقبال اور الہلال۔ ان مضامین پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبال کی فنی مباحث کو اپنی تحریروں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ جابر علی سید نے اپنی تنقیدوں میں اقبال کے فنی امور پر خاص طور پر توجہ دی ہے۔

وہ زبور عجم میں لالہ طور کی رباعیوں کو قطعات مانتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ فنی لحاظ سے یہ رباعی نہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اقبال نے جو استثناء، قطعہ اور رباعی کے فرق کے سلسلے میں اختیار کیا ہے اس کی وجہ رباعیات باباطاہر ہیں، جن میں سے صرف پہلی دو رباعیات ہیں اور بقیہ سب مندرجہ ذیل وزن میں ہیں۔ مفا عیلن مفا عیلن فعولن، لیکن یہ

وزن رباعی کے وزن سے خارج ہے۔ اس میں صرف تین رکن آرہے ہیں۔ رباعیات باباطاہر کے اولین مرتب کانام معلوم نہیں ہوسکا۔اس کی غلط فہمی نے قطعے اور رباعی کے لازمی فرق کو نظر انداز کر دیاہے۔"[1]

جابر علی کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اقبال کے فنی امور میں ان موضوعات کو منتخب کیا جن پر کم لوگوں نے توجہ دی ہے۔ ان کا ایک مضمون 'اقبال کے تین لہجے' اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے۔اس میں انہوں نے اقبال کی شاعری کے تین لہجوں کی نشاندہی کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"اقبال کی شاعری میں ہمیں تین بڑے معنی خیز اور بنیادی لہجے محسوس ہوتے ہیں۔ نشاطیہ، جو غزلیہ ہے۔ فکریہ جو اس کے فلسفے اور پیغام سے پیدا ہوتا ہے اور حزنیہ جو پہلے دو لہجوں کے مقابلے میں کمزور واقع ہوا ہے۔ لیکن اس کا گہرا احساس اور معنویت پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔"[2]

جابر علی نے 'اقبال کا آہنگ' میں کلام اقبال کے اوزان اور بحور پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ :

"اقبال نے دانستہ طور پر دقیق بحروں میں شاعری کرنے سے گریز کیا ہے۔ وہ انحطاطی نہیں انقلابی ہے جو انتہائی شعری سطح پر موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اپنے شعری آہنگ اور اپنے انقلابی یا تجریدی افکار میں زیادہ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"[3]

جابر علی اقبال کے مداح ہیں۔ لیکن انہوں نے اقبال کے فن پر لکھتے ہوئے غیر جانب داری کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے عام ناقدین کی روش سے ہٹ کر اپنے مطالعہ کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر 'بال جبریل' کو

---

1 اقبال کا فنی ارتقاء، جابر علی سید، ص ۳۵، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۸

2 اقبال کا فنی ارتقاء، ص ۵۴

3 اقبال کا فنی ارتقاء، ص ۱۴۱

'بانگ درا' پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ اس کے اندر پائی جانے والی فکری بلندی ہے۔ لیکن جابر علی سید کا ماننا ہے کہ 'بال جبریل' میں اقبال کی عظمت کی ایک اہم وجہ جس کا تعلق فطرت نگاری سے ہے دب کر رہ گئی ہے۔[1]

جابر علی سید نے اقبالیات پر بہت زیادہ نہیں لکھا لیکن جو بھی لکھا ہے اس میں ان کے تنقیدی شعور کی چھاپ کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ علم عروض کے ماہر ہیں اس وجہ سے اس کی چھاپ ان کی تنقیدوں میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کی دونوں کتابوں میں شامل مضامین کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے کلام اقبال کو مشرق و مغرب کے تنقیدی اصولوں رکھتے ہوئے اقبال کے فن کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی تنقید زیادہ تر ہیئ ر ۔ ی تنقید کے زمرہ میں آتی ہے۔ اقبال کی شاعری میں پائے جانے والے ہیئ ر ۔ ی تجربوں کو سامنے رکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''اقبال علم عروض کے ماہر یا نقاد نہیں لیکن وہ عروض کی عمارت کو وسعت اور رنگ دے سکتے ہیں۔ بحور کی فراوانی اور آہنگ کے Patterns کی دل پذیری میں وہ اردو، فارسی، عربی کے کسی شاعر سے پیچھے نہیں ہیں۔ اقبال نے متداول اور مقبول اور مطبوعہ بحروں کے علاوہ بعض نئی بحریں بھی ایجاد کی ہیں۔ بعض نامقبول اور بظاہر بد آہنگ بحروں کو اپنے حسن افکار اور جمال ہیئت سے ایک بار پھر زندہ کر دیا ہے۔''[2]

رفیع الدین ہاشمی نے ان کی اقبالیات پر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ ان نقادوں میں سے تھے جن کا تنقیدی سرمایہ بقامت کہتر مگر رطب و یابس سے پاک ہے۔ اور ایک توازن، وقار اور ٹھہراؤ لیے ہوئے ہے۔''[3]

---

1 اقبال ایک مطالعہ۔ بزم اقبال لاہور ۱۹۸۵، ص ۵۴

2 تنقید و تحقیق، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۸۷، ص ۹۸

3 ۱۹۸۵ کا اقبالیاتی ادب، رفیع الدین ہاشمی، ص ۳۷

جابر علی سید نے جن موضوعات کو اٹھایا ہے وہ انوکھے اور اہم ہیں۔ ان سے پہلے کسی نے ان موضوعات پر اتنی تفصیل سے گفتگو نہیں کی ہے۔ اس وجہ سے ان کی کتابوں کو اقبالیات کی تفہیم میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ خصوصی طور پر اقبال کی فنی اور ہیئ ر ہ ی ی تنقید کے حوالے سے ان سے بے نیازی نہیں برتی جاسکتی ہے۔

# مسعود حسین خاں

مسعود حسین خاں کا شمار اردو کے اہم ناقدین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اقبالیات میں ایک اہم کتاب 'اقبال کی نظری و عملی شعریات' (1983) لکھ کر اقبال شناسوں کی فہرست میں اپنا نام شامل کر لیا ہے۔ ان کی کتاب اگر چہ چند صفحات تک محدود ہے مگر اس کتاب میں مسعود حسین خاںنے جن موضوعات پر لکھا ہے وہ اچھوتے اور اہم ہیں۔ کتاب کے دو حصے ہیں ایک حصہ میں عملی شعریات کو دوسرے میں نظری شعریات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اقبال کی نظری شعریات کے تحت اقبال کے تصور حسن و فن کا جائزہ لیا ہےشعرویاتِ عملی کے تحت لسانی صلاحیت اور شعور، صوتی آہنگ ارو ہید ر ے ی ی تجربے کو موضوع بنایا ہے۔

مسعود حسین خاں نے شعر و شاعری سے متعلق اقبال کے نظریات اور ان کے فنی امور پر اقبال کے افکار پر بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آزاد نظم اور وزن و قافیہ کی آزادی کے بارے میں اقبال کے نظریات پر لکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> "اقبال ایک نہایت محتاط فن کار تھے گو فنی اعتبار سے وہ ایک روایت پسند شاعر تھے، ان کی فکر کی جدت اور اور دلِ گداختہ نے اردو زبان کو پگھلا کر اظہار کے نئے سانچوں میں ڈھال دیا۔ وہ زبان کو ایک بت نہیں تصور کرتے تھے اور ہید ر ے ی ی اعتبا ر سے بھی شعری آزادی اور تصرفات کے قائل تھے لیکن بلیک ورس کا مستقبل تاریک دیکھتے تھے اور وزن و قافیہ کو شاعری کا لازمی جزو سمجھتے تھے" ([1])

وزن و قافیہ سے متعلق اقبال کا یہ نظریہ مثبت ہے۔ اقبال می شاعری میں ایک بھی نظم یا غزل بے وزن و قافیہ نہیں ہے۔

---

1 اقبال کی نظری و عملی شعریات ص 96

مسعود حسین خان نے اقبال کی شاعری کا مطالعہ خالص فنی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ ان کی تنقید ہیئتی تنقید کے زمرہ میں آتی ہے۔ اقبال کے صوتی آہنگ کا مطالعہ انہوں نے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں اقبال کے کلام میں مستعمل مصوتوں کا موازنہ غالب سے کیا ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ غالب اور اقبال کے صوتیاتی آہنگ کا بنیادی فرق مصمتوں سے زیادہ مصوتوں کے استعمال میں کھلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''غالب کا کمال لفظ اور ترکیب میں ظاہر ہوتا ہے صوتی آہنگ میں نہیں۔ وہ لفظ کی تہ داری اور ترکیب کی پہلو داری سے اکثر اوقات صوتی آہنگ کی کمی کو چھپالے جاتے ہیں''[1]

مجموعی طور پر 'اقبال کی نظری و عملی شعریات' دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی ایک عمدہ کوشش ہے۔

---

1غالب کے اردو کلام کا صوتی آہنگ از مسعود حسین خاں، مشمولہ بین الاقوامی غالب سیمینار ۱۹۶۹ء ص ۲۰۵

# عبادت بریلوی

اقبال شاعر اور فلسفی پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے مگر اقبال بحیثیت نثر نگار ناقدین کی نظروں سے اوجھل رہا۔ مضامین کی شکل میں تو بہت کچھ دیکھنے میں آیا مگر کتابی شکل میں سب سے پہلی اور کامیاب کوشش عبادت بریلوی کی ہے 1983 میں شائع ہونے والی کتاب ''اقبال کی اردو نثر'' میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اقبال کی نثر کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اقبال کی شاعری کا تو ہر کس و ناکس قائل ہے لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اقبال کی نثر نگاری بھی ان کی شاعری سے کم سحر انگیز نہیں۔ ان کی شاعری کی طرح ہی ان کی نثر نگاری بھی لازوال ہے، یہاں بھی علم و فن کے بیش بہا چراغ روشن ہیں، ڈاکٹر عبادت بریلوی علامہ اقبال کی شاعری اور نثر نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اس میں شبہ نہیں کہ یہ سب کچھ ان کی شاعری کی ساحری ہے لیکن ان کی نثر نگاری بھی اس اہم کام کو انجام دینے میں پیچھے نہیں رہی، ان کی نثر ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور وہ اقبال کی عظیم شخصیت کا صحیح آئینہ ہے اس میں بھی وہ سب کچھ موجود ہے جو ان کی شاعری میں ہے، ان کے افکار و خیالات اور نظریات و تصورات ان کی نثر میں بھی پوری طرح واضح ہوتے ہیں''۔

اس کتاب میں مصنف نے اقبال کی نثر کا تجزیہ ان کی تصنیفات، مکتوبات، انداز گفتار، نوادر خطوط اقبال کی روشنی میں مکمل کیا ہے جو کافی حد تک اقبال کی نثری خصوصیات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

# خواجہ محمد ذکریا

اقبال تنقید پر کام کرنے والے ناقدین میں خواجہ محمد ذکریا کا نام اقبال کی فنی تنقید کے لیے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی تنقید میں اقبال کی شاعری میں پائے جانے والے ہید ر ۓ ی ی اور صنفی تجربات کو بیان کرنے کے ساتھ چند مغالطوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اقبال کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ ''موضوع اور مواد میں وہ روایتی شاعری سے الگ ہٹے ہوئے ہیں مگر ہیئتوں میں اُنھوں نے روایت سے سر مو انحراف نہیں کیا۔"

وہ اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ' ان کے ہاں متعدد نظمیں ایسی ملتی ہیں جن میں روایتی ہیئتوں کو ترک کر کے نئی ہیئتیں تراشی گئی ہیں۔' ان کا ماننا ہے کہ ان نظموں کی طرف نقادوں کی نظر اگر نہیں گئی ہے تو اس میں ناقدین کے ساتھ اقبال کی انکساری بھی ذمہ دار ہے۔ انھوں نے خود

''شاعری بحیثیتِ فن کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔'' اور: اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے / شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات / ا ب ع ب مہ ر کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست / سوئے قطار مے کشم ناقۂ بے زمام را"

کہہ کر اپنی شاعری کی فنی مہارتوں کو کم کر کے پیش کیا۔ حالانکہ اس سے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ

'لوگ ان کے کلام میں شعری نفاستیں ہی تلاش کرتے نہ رہ جائیں کیونکہ اُنھیں احساس تھا کہ اُن کے ہاں فنی باریکیاں بھی بہت زیادہ ہیں۔ اس خوف نے کہیں کہیں انکسار کی صورت بھی اختیار کر لی ہے اور اُنھوں نے اپنے کلام میں اپنے افکار کے مقابلے میں فنی اہمیت کو بہت گھٹا کر پیش کیا ہے، جس سے بے شمار لوگ گمراہ ہوئے ہیں۔'[1]

---

1 اقبال کی اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے از ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، مشمولہ مطالعۂ اقبال کے سو سال

انہوں نے رومانی شاعروں اور اقبال کا موازنہ روایت شکنی کے حوالے سے کرتے ہوئے اقبال کو رومانی شاعروں سے بڑا روایت شکن قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

'اقبال ہیئت پر سوار ہیں اور رومانیوں پر ہیئت سوار ہے۔ اقبال اپنے افکار کے اظہار کے لیے ہیئت کو ظروف ساز کی مٹی کی طرح جدھر چاہتے ہیں، موڑ دیتے ہیں، جب کہ رومانی شعرا نئی نئی شکلیں بنا کر اُنہیں پوجنے لگتے ہیں۔ اقبال جیسے بُت شکن کا ہیئت پرستی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے! اقبال کے ہاں ہیئت کے جس تجربے کو بھی دیکھیں، اس کا موضوع سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہو گا۔'[1]

محمد ذکریا کے نزدیک اقبال کا سب سے بڑا اختراع ان کے وہ قطعات ہیں جن پر ناقدین اب بھی مختلف الخیال ہیں کہ انہیں قطعہ کہا جائے یا کوئی اور صنف۔ محمد ذکریا نے اس مسئلہ کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک کلام اقبال کے ایک ایسے گوشہ کی طرف توجہ دی جس کی طرف کم لوگوں متوجہ ہوئے ہیں۔

1 ایضاً

# سلیم احمد

سلیم احمد اپنی متنازعہ تنقیدوں کی وجہ سے ہمیشہ سرخیوں میں رہے۔ انہوں نے اقبالیاتی ادب میں اپنی پہچان 'اقبال ایک شاعر' کے ذریعہ بنائی۔ ان کا شمار اقبال شکن ناقدوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اقبال کے خلاف ہی نہیں لکھا ہے بلکہ انہوں نے اقبال کی فنی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ اقبال کی مشہور نظم 'مسجد قرطبہ' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کچھ لوگوں کے نزدیک عشق اور کچھ لوگوں کے نزدیک موت۔ لیکن میرے نزدیک ''مسجدِ قرطبہ'' کا موضوع وہ حیاتِ شاعرانہ ہے جو معجزہ ہائے ہنر میں اپنی نمود کرتی ہے۔ اس حیاتِ شاعرانہ کے دو مرکز ہیں۔ ایک داخلی دوسرا خارجی۔ ''مسجدِ قرطبہ'' میں اقبال داخلی مرکز کو ''قلب'' کہتے ہیں اور خارجی مرکز علامتی طور پر مسجدِ قرطبہ ہے۔ یعنی وہ معجزۂ فن جو قلب سے خارج میں نمود کے لیے رنگ و چنگ، خشت و سنگ اور حرف و صوت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ حیاتِ شاعرانہ انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ انفرادی حیاتِ شاعرانہ فن کے شخصی نمونوں میں اپنا اظہار کرتی ہے، جب کہ اجتماعی حیاتِ شاعرانہ سے اجتماعی فنی کارنامے ظہور میں آتے ہیں اور اس کا اظہار بیشتر قوموں کے فنِ تعمیر میں ہوتا ہے۔ اجتماعی حیاتِ شاعرانہ کا ایک اور مظہر قوموں کی تاریخ ہے جس میں وہ اقدار کی تخلیق کرتی ہیں اور انفرادی قلب کی طرح ان کا بھی ایک داخلی مرکز ہے۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباس میں انہوں نے اقبال کی نظم کے حوالے سے اقبال کی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس کو یہ کہہ کر ہم نظر انداز نہیں کرسکتے کہ انہوں نے دل میں کینہ رکھ کر ظاہری دل سے اقبال کی تعریف کی ہے۔ اس لیے کہ اقبال سے ان کی دشمنی ذاتی نہیں ہے۔ ذاتی دشمنی میں آدمی منہ پر کچھ اور دل میں کچھ رکھتا ہے۔ اقبال کے دفاع میں لکھی گئی ایوب صابر کی کتاب 'اقبال کی شخصیت پر اعتراضات' کے مقدمہ میں سہیل عمر نے لکھا ہے:

---

1 اقبال: ایک شاعر، سلیم احمد، قوسین، لاہور، ۱۹۸۷ء

'خلیفہ عبد الحکیم کی یہ شکایت کہ اقبال مغرب دشمنی میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ اور سلیم حمد کہ یہ دریافت کہ ان کی شاعری کا مرکزی مسئلہ موت ہے اقبال دشمنی کا مظہر نہیں ہے ان پر گفتگو کی سطح اور اسلوب بالکل مختلف ہونا چاہئے۔''[1]

سلیم نے اقبال کے تعلق سے اپنی کتاب 'اقبال ایک شاعر' میں کچھ ایسی باتیں بھی کہیں ہیں جس کی وجہ سے اقبال کے شیدائیوں نے ان کی سخت تنقید کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال کی شاعری ان کی محرومیوں اور ناکامیوں کی دین ہے۔ اقبال نے جو کچھ لکھا یا کہا وہ ان کی ذاتی زندگی کی ناکامیوں، بے عملی، جذبہ کی کمی اور مستقل خواہشات کی کمی کا نتیجہ ہے وہ جنس اور جبلت سے خائف تھے۔ اپنے ذاتی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے شاعری کا استعمال کیا۔ پرائیویٹ نظمیں لکھیں جو ضائع کر دی گئیں۔ اس بات سے سلیم احمد غالباً یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔

ضروری سی بات کہ ان الزامات کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ علامہ اقبال نے ایک کامیاب زندگی گزاری۔ ان کی زندگی میں ان کو وہ مقام دیا گیا جو کسی اردو شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ قوم نے ان کی باتوں کو سر آنکھوں پر لیا۔ اس میں ان کی محرومیاں کہاں سے آ گئیں۔ یورپ سے واپسی سے بعد کچھ دنوں تک علامہ اقبال بے چینی کے شکار رہے، معاشی پریشانیوں سے جوجھتے رہے۔ لیکن بعد میں یہ ساری باتیں قصہ پارینہ بن گئیں۔ عطیہ فیضی کے ساتھ بھی اقبال کا معاملہ کچھ ایسا نہیں تھا جو پردہ میں رکھنی کی چیز ہو۔ اقبال کی زندگی کھلی کتاب تھی اس وجہ سے پرائیویٹ نظموں کی بات سمجھ سے بالاتر ہے۔ اقبال متروک کلام بھی شائع ہو گیا ہے۔ اس میں بھی کوئی پرائیویٹ نظم نہیں ہے۔ اس وجہ سے سلیم احمد کا الزام بے بنیاد ہے۔

---

1 مقدمہ اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ ص ۹

# افتخار احمد صدیقی

ڈاکٹر افتخار احمد کا نام اقبالیاتی تنقید میں ان کی کتاب 'عروج اقبال' اور 'فروغ اقبال' کی وجہ سے یاد کیا جائے گا۔ انہوں نے اقبال کے فکر و فن دونوں حیثیتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ 'عروج اقبال' میں انہوں نے عطیہ فیضی کی تنقید کا محاکمہ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ اسی طرح فروغ اقبال میں انہوں نے خاص فنی مباحث کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کا مضمون 'کلام اقبال میں خون جگر کی علامتی حیثیت' ان کی تنقیدی بصیرت کی زندہ مثال ہے۔ اقبال کے یہاں علامتوں کے استعمال پر کئی محققین نے قلم اٹھایا ہے۔ اکبر حسین اور سید عابد علی عابد نے اس پر مستقل کتابیں بھی تحریری کی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر افتخار احمد نے جس خوبصورتی سے 'جگر' اور خون جگر کی علامت کی تشریح اور کلام اقبال میں اس کی معنویت پر روشنی ڈالی ہے وہ مذکورہ بالا ناقدین کی فہرست میں ان کا مقام طے کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> اقبال ''نے اپنی شاعری کے مختلف ادوار میں، کہیں اجمالاً اور اشارۃً اور کہیں صراحۃً اپنے نظریۂ فن کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے، لیکن جس تکرار و تواتر کے ساتھ ''خون جگر'' کا ذکر آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصطلاح ان کے نظریۂ فن میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔''[1]

افتخار احمد فن کی مقصدیت کے قائل ضرور ہیں لیکن ان کا ماننا ہے کہ 'کسی ادبی تخلیق کو، فن پارہ بننے کے لیے، سب سے پہلے، فن کی جمالیاتی اقدار کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شعر، اخلاق آموزی کے باوجود، فن کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا، تو وہ محض ایک منظوم وعظ ہے، شعر نہیں۔' اس طرح وہ فن اور فکر دونوں کی آویزش سے وجود میں آنے والے فن پارے کو ادب پارہ تسلیم کرتے ہیں۔

---

1 فروغ اقبال، افتخار حسین، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۶ء

# قدوس جاوید

اقبال کے اسلوب پر تو تھوڑا بہت مواد ناقدین نے فراہم کر دیا ہے مگر اقبال کی منفرد تخلیقی صلاحیتوں کی نقاب کشائی پر کم ہی توجہ دی گئی ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کی کوشش اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ انہوں نے پہلی بار مبسوط انداز میں اقبال کی [illegible] کی تہوں اور طرفوں کی کھولا ہے، اور اس فن میں کلام اقبال کی قرأت اور قاری، [illegible] اور بین [illegible]، لسانی ساخت اور استعاراتی نظام وغیرہ میں اقبال کی منفرد [illegible] اور مابعد جدید ادبی تصورات کے حوالے مفصل گفتگو کی ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید 'اقبال شناسی - مفہوم و میعار' کے عنوان کے تحت آج تک اقبال پر لکھی گئی تحریروں میں سے اکثر کو غیر معیاری قرار دیتے ہیں ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ اقبال شناسی کے لیے مروجہ تنقیدی اصول ناکافی ہیں وہ لکھتے ہیں:

'دیکھا جائے تو اردو تنقید میں اقبال شناسی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود تنقید کے مروجہ اصول و نظریات ہیں جو یقیناً اقبال شناسی کے ضمن میں کم عیار ہی ثابت ہوتے ہیں دراصل "اقبالیات" اقبال شناسی کے لیے ایک منفرد تنقیدی رویہ، اصول اور جمالیاتی اقدار کا تقاضہ کرتی ہے اور جن تنقیدی رویوں اصولوں اور جمالیاتی اقدار کی مدد سے اردو کے دیگر شعرا کی قدر شناسی کی جاتی ہے وہ رویے اصول اور اقدار اقبال شناسی کے باب میں زیادہ کار آمد ثابت نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ اکثر ہمارے مستند اور معتبر ناقدین بھی اقبال کی تعین قدر میں زیادہ کامیاب نہیں ہوپاتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ احتشام حسین اور سردار جعفری جیسے [illegible] ترقی پسند اور گوپی چند نارنگ، حامدی کاشمیری، شمس الرحمن فاروقی اور وہاب اشرفی جیسے جدت پسند مابعد جدیدیت کے ہم نوا جب اقبال شناسی کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں تو ان کے مخصوص نظریات کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹتا نظر آتا ہے'[1]

---

1 اقبال کی [illegible]، قدوس جاوید، ص 14، ط: 2007

پروفیسر قدوس جاوید کے مطابق مختلف نظریات میں صرف اسلام ہی ایک ایسا نظریہ ہے جس کے سہارے ہم اقبال شناسی کا حق ادا کرسکتے ہیں۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اقبال کی ء . لمیقیب کی تفہیم کے لیے قاری کے اندر مخصوص قسم کی افتاد طبع ہونی چاہیئے اور ساتھ ہی منفرد آداب بھی۔اس کی وجہ ان کی نظر میں یہ ہے:

'سبب یہ ہے کہ شعر اقبال اس غیر معمولی تاریخی عمرانی ثقافتی اور جمالیاتی شعور کا زائیدہ ہے جو اقبال کے یہاں اسلامی ہندوستانی اور یورپی نظریات حیات اور اقدار و روایات فن کے بصیرت مندانہ تجزیہ و تحلیل کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی ر ی ء . لمیقیب بحیثیت مجموعی اردو شعری جمالیات کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے بھی شعری جمالیات کے عام مفہوم سے باہر کی طرف جست لگاتی ہے اور اقبال کے تخلیقی تجربات، افکار و نظریات کے حوالے سے مانوس نظر آنے کے باوجود قاری کے طے شدہ تاریخی، عمرانی، ثقافتی حتی کہ مذہبی ارتقاء کا سبب بنتے ہیں لیکن ایسا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب ایک معیار اور مقام پر فائز قارئین شعر اقبال کی تفہیم کے لیے قرات کا بھی غیر روایتی انداز اپناتے ہیں، ورنہ شعر اقبال کے شعری ولسانی نظام ہی نہیں فنی و فکری اجتہادات کی بھی ہمہ جہت تفہیم و تعبیر کے باب میں تنقید کے سابقہ رویے اصول اور سانچے عام طور پر ناکافی ہی ثابت ہوتے رہے ہیں اور اقبالیات پر ہزاروں لاکھوں صفحات سیاہ کیے جانے کے باوجود اکثر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال شناسی کے باب میں "کہیں کچھ کم ہے۔" [1]

'کہیں کچھ کم ہے' کا احساس ہی ہے جس کی وجہ ہے قدوس جاوید نے قلم اٹھایا۔ اور اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو دنیائے علم میں ہر ابتدا انتہاء ہوتی۔ بہرحال ان کی اس بات میں واقعیت ہے کہ اقبال کی تفہیم کے لیے مروجہ تنقیدی رویوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

اقبال کی ر ی ء . لمیقیب اقبال شناسی کو صحیح سمت اور رفتار دینے کی ایک عمدہ کوشش ہے۔

---

1 اقبال کی لمیقیب ص 99-100

# سید صادق علی

ہر شاعر، ادیب اور فنکار کا اپنا اسلوب ہوتا ہے جس کے ذریعہ اس کو پہچانا جاتا ہے، یہ اسلوب ہی اس کو دوسرے شاعروں اور ادیبوں سے جدا کرتا ہے۔ اقبال پر ویسے تو بہت کام ہوا مگر اسلوب پر کم ہی کام ہوئے ہیں، سید صادق علی کی کتاب اقبال کے شعری اسالیب (1999) اس کمی کو پر کرنے کی کوشش ہے، سید صادق علی نے اقبال کے سبھی اسالیب خطیبانہ، بیانیہ، ڈرامائی، مکالماتی اور تمثیل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

سید صادق علی کی نظر میں اقبال نے اگرچہ اسلوب کی سطح پر کئی شعراء سے اثر لیا ہے جن میں میر، سودا، آتش، حالی اور اکبر الٰہ آبادی وغیرہ شامل ہیں لیکن ان پر غالب کی چھاپ زیادہ ہے۔ سید صادق علی مانتے ہیں کہ

> ''اقبال نے کبھی الفاظ کی قید قبول کی اور نہ اسالیب کی الفاظ اور اسالیب کو ہمیشہ معانی و مضامین کے تابع فرمان رکھا۔ الفاظ برائے الفاظ، اسالیب برائے اسالیب، شکوہ برائے شکوہ، زور بیان برائے زور بیان کا اقبال کے یہاں گزر نہیں۔ وہی اسلوب وہ اختیار کرتا ہے جو جذبہ، احساس، تاثر یا مفہوم کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہو۔''[1]

وہ اقبال کے خطیبانہ اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''کلام اقبال میں اسلوب کی خطیبانہ لے اس قدر بڑھی ہوتی ہے کہ نہ صرف نظمیں بلکہ ان کی غزلوں کے بھی کئی کئی اشعار اور کہیں کہیں تو مکمل غزل بھی خطیبانہ انداز لیے ہوئے ہیں۔''[2]

---

1 اقبال کے شعری اسالیب، سید صادق علی، ص 31

2 اقبال کے شعری اسالیب ص 38

آخر میں اقبال کے کلام میں وارد عربی فقرات، قرآنی آیات و احادیث کا اشاریہ اور ایک اشاریہ فارسی اشعار اور مصرعوں کا ہے جو اردو میں وارد ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں مضامین اور اشاریے اپنے موضوع اور معلومات کے لحاظ سے کافی اہم ہیں مگر ان کو علیحدہ شائع کرنے میں ان کی افادیت زیادہ تھی۔

مجموعی طور پر ''اقبال کے شعری اسالیب'' اقبال کی شاعری کا اسلوب کی حیثیت سے ایک عمدہ مطالعہ ہے۔

# قاضی عبید الرحمن ہاشمی

قاضی عبید الرحمن ہاشمی، اردو کے ممتاز ناقدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ شعبہ اردو جامعہ ملیہ کے سابق استاد ہیں۔ اگرچہ انہوں نے فکشن تنقید پر بھی لکھا ہے لیکن اقبالیات ان کا خصوصی موضوع ہے۔ انہوں نے 'شعریات اقبال' نامی کتاب لکھ کر خود کو اقبال کی شناسوں کی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں اقبال کے فن سے سروکار رکھا ہے۔ انہوں نے کتاب کو پانچ ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں فن بلاغت کی ماہیت پر گفتگو کی ہے۔ دوسرے باب میں اقبال کے ورثہ کے نام سے اردو شاعری میں تشبیہات واستعارات وعلامات کی روایت کا جائزہ لیا ہے، نیز اقبال کا نظریۂ فن وغیرہ پر گفتگو کی ہے۔ تیسرے باب میں اقبال کی تشبیہات، چوتھے میں استعارات اور پانچویں باب میں علامات سے بحث کی ہے۔ اس طرح ان کی یہ کتاب مکمل طور پر اقبال کی شاعری کے فنی محاسن پر مرکوز ہے۔ قاضی عبید الرحمن ہاشمی کی یہ کتاب اصل میں ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اسی کو انہوں نے مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ وہ کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> پیش نظر مطالعہ چونکہ میرے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے جو اقبال کی تشبیہات، استعارات، اور علامات کے مطالعہ تک محدود ہے اس لیے اس کے دائرے میں شعر اقبال کے جملہ رموز و نکات آسکتے تھے اور نہ ہی میں ان کے احاطے پر قدرت رکھتا تھا۔"[1]

قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے اگرچہ اپنے مطالعہ کو صرف اقبال کی شاعری میں استعارات و تشبیہات تک محدود رکھا ہے لیکن انہوں نے جس طرح سے اقبال کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے استخراج نتائج کیا ہے اس سے اس کمی کی تلافی ہو جاتی ہے۔

وہ اقبال کی شاعری کے ان امور کو جو خالص آرائش اظہار کی چیز مانی جاتی ہے، مطالعہ کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ابتدا میں اقبال کے یہاں یہ صرف آرائش کی چیز تھی لیکن بعد میں وہ بتدریج جمالیاتی آگہی کے اظہار کا وسیلہ بنتی گئی۔ اس سلسلے

---

1 شعریات اقبال، قاضی عبید الرحمن ہاشمی، ص۹، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۸۶ء

میں وہ خاص طور پر ان تشبیہات کا ذکر کرتے ہیں جو خاص طور پر حرکی اور ایجابی گوشوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال کی شاعری میں تشبیہوں سے زیادہ استعارات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں استعارات علائم سے بھی زیادہ نظر آتے ہیں۔

اس معاملے میں وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اقبال نے جتنی خوب صورتی سے استعاروں کو برتا ہے علائم کو اس خوبی کے ساتھ نہیں برت سکے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''استعارات کے مقابلے میں اقبال کی علامتیں کمزور معلوم ہوتی ہیں، اس لیے کہ ان میں سے بیشتر اپنا ایک روایتی و تاریخی کردار رکھتی ہیں جن سے تصورات کا استخراج توضیح اور تشریح تو ضرور ہوتی ہے لیکن ان میں سے بیشتر بذات خود ایک زندہ و توانا وجود کی حیثیت نہیں رکھتیں۔''[1]

اس کو اقبال کی کمزوری کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اقبال نے اپنے شعری کائنات میں جہاں جس اسلوب کو مناسب سمجھا وہاں اس کو برتا ہے۔ علائم کی جہاں تک بات ہے تو اس کے اندر معانی کی ایک دنیا آباد ہے۔ اگر اس کی تعبیر و تفہیم قاری کے لیے دشوار ہو تو اس میں اقبال کا کیا عیب؟

قاضی عبید الرحمن ہاشمی اقبال کی شاعری کے مطالعہ کے وقت اقبال کی بے جا وکالت نہیں کرتے۔ وہ اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے بے خوف اپنی بات پیش کرتے ہیں۔ اقبال ناقدین نے اقبال کے فکر و فن کے حسین امتزاج پر بہت زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کی عظمت کا راز ہی یہی ہے کہ اقبال کے یہاں فن اور فکر دونوں شیر و شکر ہیں۔ لیکن قاضی عبید الرحمن ہاشمی اس معاملے میں مختلف نظریہ رکھتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اقبال نے شاعری کے لیے جن موضوعات کو چنا ہے وہ خالص علمی اور زندگی کے ٹھوس جامد پیکر تھے۔ ان کو شعری پیرایہ میں ڈھالنا ایک مشکل امر تھا۔

''انہوں نے جن مرئی یا غیر مرئی حقائق کو شاعرانہ ضرورتوں کے لیے نکتۂ ارتکاز بنایا وہ بیشتر زندگی کے ٹھوس اور جامد پیکر تھے جو تخلیق کی گرمی اور تپش سے بھی نہ پگھل سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر کے لیے اس نقش بند پلاسٹک جہان کی مصوری ممکن نہ ہو سکی جو ہمارے وجود کو اس عام آب و گل کی حامل دنیا سے دور اور نادیدہ پر

---

1 شعریات اقبال، ص ۱۲

اسرار اور شعری پیکروں سے آراستہ سرزمین میں پہنچاسکے جہاں انسانی وجود اور زمان کی برگزیدہ روح ایک دوسرے میں جذب ہو جاتی ہے۔"[1]

اقبال کی شاعری کے کل سرمایہ پر یہ بات ثابت نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری کا وہی حصہ اس پر صادق آتا ہے جہاں اقبال کے یہاں مقصدیت غالب آگئی ہے اور انہوں نے شعری پیرایۂ اظہار پر توجہ کم دی ہے۔

قاضی عبید الرحمن ہاشمی ایک جگہ اور اقبال کی تشبیہات پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی رائے پیش کرتے ہیں:

"اقبال کی بیشتر تشبیہات اپنے حقیقی سیاق وسباق سے علیحدہ ہو کر کسی جمالیاتی جاذبیت کا جادو جگانے سے قاصر رہتی ہیں ان کا تمام تر حسن اس تناظر میں ابھرتا ہے جس میں وہ لمحۂ تخلیق میں ابھرتی اور پرورش پاتی ہیں۔"[2]

قاضی عبید الرحمن ہاشمی کے اس مطالعہ میں فکر وفن دونوں دست وگریباں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کا ماننا ہے اقبال اپنے شعری سفر میں فنی تقاضوں کی ہمیشہ رعایت کرتے ہیں۔ قاضی عبید الرحمن ہاشمی سے پہلے عابد علی عابد نے بھی اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ قاضی عبید الرحمان نے اس سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔ لیکن دونوں کے نتائج مختلف ہیں۔

---

1 شعریات اقبال ص ۱۲، ۱۳

2 شعریات اقبال۔ ص ۳۳۴

# توقیر احمد خاں

پروفیسر توقیر احمد خاں کی اقبالیات پر چار کتابیں 'اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی'شعریات بال جبرئیل'، 'اقبال اور ہندوستان'(۲۰۰۷ء) اور 'غبارے از جہان اقبال'(۲۰۰۹ء)

توقیر احمد خاں کی نظر میں اقبال کی شاعری کی تین اہم خصوصیات ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> "کچھ حادثات اور کچھ گردش ایام کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ اقبال کی مقبولیت روز افزوں ہے۔ اس کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں لیکن مجملہ ان کے اقبال کی تین خصوصیات نہایت اہم ہیں۔ اول یہ کہ اقبال کے مطالعہ سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور علم کی پیاس بجھتی ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ علم کی پیاس بڑھتی ہے۔ دوم یہ ہے کہ اقبال کو پڑھنے سے مایوسی دور ہوتی ہے اور حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں مایوسی نہیں ہے اس سے دل اچھلتا اور جوش مارتا ہے۔ سوم یہ کہ اقبال کی شاعری ہم سے مانوس ہے۔ اس میں اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کا دلچسپ اور دلکش نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے جس سے اقبال کو پڑھنے کی طلب بڑھتی ہے۔"[1]

اپنی کتاب 'اقبال اور ہندوستان' میں انہوں نے اقبال کی حب الوطنی اور ان کی شاعری میں پائے جانے والے ہندوستانی عناصر کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے جن موضوعات کو اس کتاب میں جگہ دی ہے وہ یہ ہیں: اقبال کا ترانۂ ہندی، اقبال کی ابتدائی شاعری میں مذہبی رواداری، اقبال اور حب الوطنی، جنگ آزادی کے مجاہد اعظم: ڈاکٹر اقبال، سیاسی انقلاب میں اقبال کا حصّہ، فن اور شخصیت کے آئینے میں: ڈاکٹر اقبال، اقبال اور سنسکرت، اقبال کی شاعری میں برہمن، بچوں میں

---

1 غبارے از جہان اقبال، ص ۱۳۰

جذبۂ حبّ الوطنی اور اقبال۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ موضوعات کے اس تنوع کے ساتھ انہوں نے اقبال پر لگنے والے الزامات کا بڑی خوبصورتی سے جواب دیا ہے۔ وہ کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ہمارا یہ دعویٰ تو نہیں کہ ان مضامین میں اقبال کے متعلق بعض متعصبانہ اعتراضات کا جواب ملے گا لیکن یہ ضرور امید کرتے ہیں کہ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد اس قسم کا نظریہ رکھنے والوں کو شاید از سر نو غور کرنا ہوگا اور ان کو اپنے تعصب آمیز خیالات پر نظر ثانی کرنے پڑے گی۔"[1]

توقیر احمد خاں اقبال کو ایک محب وطن شاعر قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کی حب الوطنی پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد ان کی شاعری میں پائی جانے والی حب الوطنی کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔:

> "اقبال کی حب الوطنی کے تین دائرے نظر آتے ہیں۔ ایک وہ کہ جس میں اقبال اپنے وطن مولد ہندوستان کی مدح سرائی کرتے ہیں اور اسے سارے جہاں سے اچھا بتاتے ہیں۔ دوسرے جس میں اقبال پوری ایشیاء کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں حصار رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں۔ 'چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا' ر 'مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔' یہ دائرہ پہلے دائرے سے وسیع تر ہے اور اس میں ایشیاء کے تمام ممالک شامل ہو جاتے ہیں بلکہ کرۂ ارض کے تمام حصے زد میں آتے ہیں۔ لیکن اقبال کے تو طن کا ایک دائرہ اور بھی ہے جو اس دوسرے دائرے سے بہت زیادہ بڑا ہے اور یہ دائرہ کرۂ ارض سے نکل کر عالمِ کائنات تک پہنچ جاتا ہے۔ جس میں اقبال کہتے ہیں:
>
> قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
> چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں"[2]

توقیر احمد کی اقبالیات پر دوسری اہم کتاب 'غبارے از جہان اقبال' ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اقبال اور اکابرین کے ذیل میں، اقبال کی اردو شاعری اور مولانا رومؒ، سعدیؒ اور اقبال، سر سید اور اقبال، حالیؔ اور اقبال، کلام اقبال پر مسدسِ حالیؔ کے اثرات، اقبال اور کارل مارکس اور رشید احمد صدیقی اور اقبال۔ رکھا ہے۔ فکر و فلسفہ

---

1 اقبال اور ہندوستان، ص ۱۲، نئی کتاب پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

2 اقبال اور حب الوطنی، مشمولہ اقبال اور ہندوستان

کے ذیل میں مضامین کے عناوین یہ ہیں: اقبال کا تصورِ اجل، اقبال کا شاہین اور عصرِ حاضر، واقعات اقبال، اقبال کے جعلی خطوط، فکر اقبال کا ایک نرالا پہلو، اقبال کا زمانہ۔ شعر و ادب کے تحت عناوین یہ ہیں: اقبال ایک شاعر، امیجری اردو اور اقبال، اقبال کی امیجری کے چند اساسی پہلو اور اقبال کا ایک پیکر -موج دریا۔ قوم و وطن کے تحت شامل مضامین کی ہیں: اقبال اور اسپین، اقبال کی شاعری میں سیکولرازم۔ مذہب و ملت کے ذیل میں شامل مضامین یہ ہیں: اقبال اور عشق رسولؐ، کلام اقبال میں کربلا اور شہادت حسینؓ، اقبال کی نظر میں حج اور قربانی، اقبال کا تصوف اور اقبال اور دعوت اسلام۔

''اقبال کی پیکر تراشی'' میں پروفیسر توقیر احمد خاں نے اقبال کی شاعری میں پائے جانے والے پیکروں کا جائزہ لیا ہے اپنے مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اقبال کو اپنے خیال کے اظہار کے لیے بہت سے نئے پیکروں کو تراشنا پڑا اور بہت سی جگہ پرانے پیکروں کا سہارا لینا پڑا۔ اس لیے ان کی شاعری میں زیادہ تعداد فکری، مذہبی، تاریخی اور تہذیبی پیکروں کی ہے۔ زمان ان کے فلسفہ کا ایک انفرادی تصور پیش کرتا ہے ان کے فلاح میں اس کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ اس غیر مرئی سی کو جو انسان کی گرفت سے باہر ہے اقبال نے مرئی زندہ اور توانا تصور بنا کر پیش کیا ہے۔'' [1]

پروفیسر توقیر احمد خاں کی اقبال تنقید کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں قطعیت کی کمی ہے۔ وہ باتوں کو مدلل کہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے لہجے میں وہ قطعیت نہیں ہے جو اقبالیات پر ان کے وسیع مطالعہ کی وجہ سے ایک قاری کو ان سے توقع ہوتی ہے۔ وہ جب بھی کوئی فیصلہ کن بات کہتے ہیں تو عموماً 'شاید' یا 'غالباً' کے ساتھ کہتے ہیں۔ درج ذیل مثالوں میں ان کے اسلوب کو سمجھا جا سکتا ہے۔:

> ''یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہمالہ پہاڑ کے موضوع پر لکھی جانے والی یہ اردو زبان کی پہلی نظم تھی اور غالباً جدید ہندوستانی زبانوں میں بھی سب سے پہلی۔ ([2])

---

1 بحوالہ، اقبال کے شعری اسالیب از عبد الحق ص 115-116

2 اقبال اور حب الوطنی، مشمولہ غبارے از جہان اقبال

" یہ بات اپنی جگہ بجا اور درست ہے کہ اقبال نے جس طرح مولانا رومی اور حافظ سے فکری اخذ واستفادہ کیا
۔اس طرح کا فیض بابل شیراز کے کلام سے نہیں اٹھایا یا سعدی اور اقبال کے فکر و فلسفہ میں زبردست فاصلہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ اقبال کے ذہنی سفر کے ارتقاء میں سعدی کے اخلاقی نقوش کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ شاید سعدی کی برہنہ گوئی رہی ہو کیوں کہ اقبال "بہ کنایہ گفتن" میں یقین رکھنے والے تھے اور "سر دلبراں" کو "بہ حدیث دیگراں" بیان کرتے تھے جو شاید سعدی کے کلام کا خاصہ نہیں ہے۔"([1])

ایک اور جگہ وہ جاوید اقبال کی مدلل تردید کرتے ہیں۔ اس کے باوجود آخر میں وہی تشکیک والا لہجہ استعمال کرتے ہیں:

"جسٹس جاوید اقبال کو شاید سہو ہوا، حمایت اسلام ۱۹۰۴ء کے اس جلسے میں جو نظم حالی نے پڑھی تھی اور جس کو بعد میں اقبال نے اپنی باوقار اور دل گداز آواز میں پڑھ کر سنایا، وہ نظم بعنوان "مادر پنجاب انجمن" نہیں تھی۔ جواہراتِ حالی طبع اول میں اس عنوان کی کوئی نظم نہیں ملتی۔ اس اڈیشن کے مطابق انجمن حمایت اسلام لاہور کے اپریل ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے میں حالی نے جو نظم پڑھ کر سنائی وہ "انجمن حمایت اسلام اور اس کے کام" ہے۔ حالی نے ۱۹۰۴ء میں صرف دو نظمیں "آرنلڈ کی روانگی ولایت" اور "انجمن حمایت اسلام لاہور اور اس کے کام" کہیں۔ جواہرات حالی کے مطابق ایک اسٹریچی ہال علی گڑھ میں اور دوسری انجمن کے سالانہ جلسے ماہ اپریل ۱۹۰۴ لاہور میں پڑھی گئی اور غالباً یہی وہ نظم ہوگی جسے حالی کے بعد اقبال نے بہ نفس نفیس خود پڑھ کر سنائی تھی۔" ([2])

اس کی وجہ یہ ہے کہ توقیر احمد خاں تنقید کے اس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں جس میں تنقید کا نام ادعائیت نہیں ہے۔ وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اب یہ دوسرے پر منحصر ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم کرے یا رد کر دے۔

---

1 سعدی اور اقبال، مشمولہ غبارے از جہان اقبال

2 حالی اور اقبال، مشمولہ غبارے از جہان اقبال

# ارشد محمود ناشاد

اقبال کے ناقدین فن میں ایک نام پروفیسر ارشد محمود ناشاد کا بھی ہے۔ انہوں نے ' غزل کا فنی سفر۔۔۔۔۔ حالی سے اقبال تک' لے کر اقبال تک کے سفر میں غزل کی ہیئتی اور موضوعاتی تبدیلیوں اور تجربات کا ذکر کرتے ہوئے صنف غزل پر اقبال کے احسانات اور اجتہادات کا ذکر کیا ہے۔

اقبال نے سب سے پہلے غزل کو ایک مربوط فلسفیانہ افکار کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ اس سے پہلے اگرچہ غالب کے اشعار میں فلسفیانہ افکار کی آمیزش پائی جاتی ہے مگر انہوں نے کسی مربوط فلسفے کو نہیں پیش کیا۔ اقبال چونکہ جدت پسند طبیعت کے مالک تھے اس وجہ سے انہوں نے اپنی سہولت کے لحاظ سے غزل کی تنگدامنی کو نظم کی وسعتوں سے ہمکنار کرتے ہوئے غزل کی سرحدوں کو نظم سے اور نظم کی سرحدوں کو غزل سے ملا دیا۔ ارشد محمود ناشاد ناقدین کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ اقبال اصلاً نظم کے شاعر تھے، اقبال چونکہ ایک فلسفی شاعر تھے، ان کا دماغ اسی طرح کام کرتا تھا بیان میں تعین اور صراحت کا متقاضی تھا، جس کے لیے غزل موزوں صنف نہ تھی اس وجہ سے انہوں نے 'اپنی غزلوں میں تغزل یعنی رمز و ایما اور علامات کے استعمال کے ساتھ ساتھ غزل کے اشعار میں جذباتی تسلسل پیدا کر کے اُسے نظم کا رنگ دے دیا۔' ([1])

وہ لکھتے ہیں:

> 'میرے خیال کے مطابق یہ نقطۂ نظر درست نہیں۔ اس میں شُبہ نہیں کہ اقبال کی غزلیں ایک ہی موڈ، کیفیت اور مزاج کی حامل ہیں لیکن ان غزلوں میں ہر شعر ایک منفرد یونٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کی کسی غزل سے کوئی شعر نکال لیجیے غزل میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہو گی اور شعر معنوی تشنگی کا شکار نہیں ہو گا۔ لیکن اس کے برعکس نظم کے چند مصرعے نکال لینے سے اس میں خلا پیدا ہو جائے گا اور وہ چند مصرعے سیاق وسباق سے

---

1 اقبال کے کلام میں موضوع اور ہیئت کی ہم آہنگی، مشمولہ: اقبال بحیثیت شاعر، ص ۱۵۲۔

کٹ کر مبہم یا مہمل ٹھہریں گے۔ اقبال کی نظم و غزل میں قربت کا احساس شاید اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کی نظمیں بھی تغزل کے اُس رچاؤ سے محروم نہیں ہیں جو غزل میں روح کی حیثیت رکھتا ہے۔'

اقبال کے بارے میں عام رائے یہ قائم کی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں صرف فکر پر توجہ دی، فن پر نہیں۔ یہ صرف ترجیحات کی حد تک صحیح ہے، ورنہ خود اقبال کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اشعار کی جگر کاوی پر توجہ دیا کرتے تھے مولانا گرامی کے نام اپنے ایک خط میں اقبال رقم طراز ہیں:

'' مجھے اپنا مصرع ابھی تک کھٹکتا ہے۔ طبیعت حاضر ہوئی تو پھر غور کروں گا۔ اس جگر کاوی کا اندازہ عام لوگ نہیں لگا سکتے۔ ان کے سامنے شعر بنا بنایا آتا ہے وہ اس روحانی اور لطیف کرب سے آشنا نہیں ہو سکتے جس نے الفاظ کی ترتیب پیدا کی ہے۔ جہاں اچھا شعر دیکھو سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے۔'' ([1])

اس کی توثیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ اقبال کے کلام کے مسودے جو دریافت ہوئے ہیں اس میں اقبال نے کئی ایک مصرعوں کو ایک سے زائد مرتبہ نشان زد کیا ہے۔ ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب شاعر اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مسلسل کوشش کر رہا ہو۔ البتہ خود اقبال کو اس بات کا اعتراف ہے کہ اکثر دفعہ پہلی فرصت میں اشعار کی جو شکل سامنے آتی تھی اس میں ردو بدل کی گنجائش کم ہوتی تھی، ترمیم کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ پہلی صورت ہی زیادہ موزوں اور جامع ہوتی تھی۔

انہوں نے اقبال کی غزلوں کی جن فنی خصوصیات کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یہ ہیں:

o فکر و فن کا حسین امتزاج۔ اردو شاعری میں اقبال سے پہلے اور نہ اقبال بعد میں کوئی اس میدان میں اقبال کا ہمسر نہیں ہو سکا۔

---

1 اقبال اور بعض دوسرے شاعر، خواجہ منظور حسین، لاہور، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اوّل، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۰۔

- اقبال کی غزل کے تکنیکی عناصر میں زبان کا معجزانہ استعمال۔ اقبال غزل کی روایت کا عرفان رکھتے تھے اس کے باوجود اس کے دائرۂ لفظیات میں وسعت پیدا کی تا کہ اس صنف کو جدید زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جاسکے۔

- شعری زبان کو وسعت دینے کے لیے ترکیب سازی پر خصوصی توجہ۔ اقبال کی اکثر ترکیبیں ان کی اپنی اختراعی صلاحیتوں کا نتیجہ ہیں۔ اس سے غزل کا لسانی قالب بھی وسیع ہو کر ہر قسم کے خیالات پر قادر ہوا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بالِ جبریل کی غزلوں میں مستعمل تراکیب کا خصوصی حوالہ دیا ہے۔

- صنائع وبدائع کا ہنر مندانہ استعمال۔ اقبال نے ان عناصر کو اس بے تکلفی سے اظہارِ مطالب کا آئینہ دار بنایا ہے کہ کہیں بھی تصنع کا گمان نہیں گزرتا۔ تضاد، حشوِ ملیح، مراۃ النظیر، حسنِ تعلیل اور ایہامِ تناسب جیسی صنعتوں کا استعمال ان کے کلام میں بہ کثرت دکھائی دیتا ہے۔

- غزل کے خارجی ڈھانچے (ہیئت) کو پوری پابندی سے برتتے ہوئے اقبال نے غزل کی تکنیک کو نئی آب وتاب عطا کیا۔

- بحروں کے مزاج اور اوزان کی مخصوص خاصیتوں کا گہرا شعور۔ اسی شعور کے باعث انہوں نے اپنے مزاج اور فکر کی مناسبت سے بحروں کا انتخاب کیا۔[1]

پروفیسر ارشد محمود ناشاد نے اقبال کی غزلوں کی جن خصوصیات کی طرف توجہ دلائی ہے وہ ان کی تنقیدی بصیرت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے صرف اقبال ہی کے فن پر روشنی ڈالی بلکہ جدید غزل کے پورے سفر کو سامنے رکھا ہے اس وجہ سے ان یہاں تقابلی مطالعہ کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات قابل اطمینان ہے کہ انہوں نے اپنا دامن جدلیاتی اسلوب سے بچائے رکھا۔

---

1 غزل کا فنی شعور ۔۔۔ حالی سے اقبال تک، پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، www.alqlmlibrary.org پر دستیاب ہے۔

# باب چہارم

# اقبال کے شارحین

# اردو میں شرح نگاری کی روایت

شرح عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ش ر ح ہے۔ ابن منظور لسان العرب میں لکھتے ہیں:

شرح: الشَّرْحُ والتَّشريح: قَطْعُ اللحم عن العضو قَطْعاً، وقيل: قَطْعُ اللحم على العظم قطعاً، والقِطْعَةُ منه شَرْحة وشَريحة، وقيل: الشَّريحةُ القِطعةُ من اللحم المُرَقَّقَةُ. ---- والشَّرْحُ: الكَشفُ؛ يقال: شَرَحَ فلان أَمره أَي أَوضحه، وشَرَح مسأَلة مشكلة: بَيَّنها، وشَرَح الشيءَ يَشْرَحُه شَرْحاً، وشَرَّحَه: فتحه وبَيَّنَه وكشَفه. وكل ما فُتح من الجواهر، فقد شُرِحَ أَيضاً. تقول: شَرَحْتُ الغامِضَ إِذا فَسَّرْته؛ ومنه تَشْريحُ اللحم؛----- وشَرَحَ اللهُ صدرَه لقبول الخير يَشْرَحه شَرْحاً فانْشَرح: وَسَّعَه لقبول الحق فاتَّسَع. وفي التنزيل: فمن يُرِد اللهُ أَن يَهْدِيَه يَشْرَحْ صدرَه للإِسلام.[1]

ترجمہ: 'شرح' جسم کے کسی حصہ سے گوشت کے ٹکڑے کو کاٹنے کو کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہڈی کے اوپر سے گوشت کے ٹکڑے کو کاٹنے کو کہتے ہیں۔ اس ٹکڑے کو 'شرح' یا 'شریحۃ' کہا جاتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ 'شریحۃ' پسے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کو کہا جاتا ہے۔---- 'شرح' کشف کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے 'شرح فلان امرہ' تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ 'اس نے فلاں معاملے کی وضاحت کی ہے۔ کسی مشکل مسئلہ کی شرح کرنے کا مطلب ہے اس کی وضاحت کرنا۔ کسی چیز کی شرح کرنے کا مطلب ہوتا ہے اس کو کھولنا اور وضاحت کرنا۔ موجودات میں سے کسی بھی چیز کی شرح کرنے کا مطلب اس کو کھولنا ہے۔ آپ اگر کہیں 'میں نے پیچیدگی کی شرح کی' تو اس کا مطلب ہوگا کہ اس کی تفسیر بیان کی ہے۔ اسی سے 'تشریح اللحم' بھی ہے۔ ----- 'شرح اللہ صدرہ' کا مطلب ہے کہ اللہ نے اس کا سینہ حق کو قبول کرنے کے لیے کھول دیا اس لیے اس کا سینہ کشادہ ہو گیا۔ قرآن میں ہے 'فمن یرد اللہ ان یہدیہ یشرح صدرہ للاسلام' جس کو اللہ ہدایت کی توفیق دیتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔"

---

[1] لسان العرب مادہ ش ر ح

گویا کہ شارح اسی طرح کلام کے ایک ایک حصہ کو الگ الگ کر کے واضح کرتا ہے جیسے کہ گوشت کے ڈھیر سے ایک ایک ٹکڑے کو نکالتا ہے۔ وہ کلام کی پیچیدگیوں اور گرہوں کو کھولتا ہے اور کلام کو عام لوگوں کی فہم کے قابل بناتا ہے۔ شرح ہی سے ملتا جلتا لفظ تفسیر بھی ہے۔ اس کے معنی بھی وضاحت کرنا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ یہ قرآن اور آسمانی صحائف کے ساتھ خاص ہے اس کا استعمال کسی اور کتاب کے ساتھ نہیں کیا جاتا ہے۔ جیسے 'تفسیر ابن کثیر' ، 'تفسیر قرطبی'، اور تفسیر تفہیم القرآن' وغیرہ چنانچہ حدیثوں کی شرح کو تفسیر نہیں کہا جاتا۔ اس کو شرح ہی کہا جاتا ہے جیسے: فتح الباری فی شرح صحیح البخاری، شرح النووی للامسام وغیرہ

ڈاکٹر مدثر ماجد لکھتے ہیں:

''شرح کے معنی کسی مقولہ، بات، حدیث، محاورہ، مکالمہ، شعر، اقتباس یا ٹکڑے کی شرح وبسط اور سیاق وسباق و تاریخی حوالہ جات نیز مفہوم و معانی کے ساتھ وضاحت کرنے کی ہیں۔''[1]

ڈاکٹر مدثر نے اپنی تعریف میں نظم و نثر کی تمام اصناف کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ سے تعریف طویل ہو گئی ہے۔ اس کو آسان لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شرح، کسی کلام کی وضاحت کا نام ہے۔ کلام میں سبھی اصناف نظم اور نثر شامل ہیں۔ شرح کے لیے مختصر یا طویل کی شرط نہیں ہے البتہ وضاحت ایک لازمی عنصر ہے۔ کلام کی شرح اس طرح کی جائے کی مفہوم قاری کے لیے واضح ہو جائے تو وہ شرح ہے۔ خواہ وہ ایک سطر پر مشتمل کیوں نہ ہو۔

اردو میں شرح نگاری کی روایت کا آغاز بھی عربی کی طرح قرآن مجید کی تفسیروں اور احادیث وفقہ کی کتابوں کی گرہ کشائی سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے سب سے پہلے اردو مترجم شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر ہی کو اردو کا سب سے پہلا شارح ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس لیے کہ شاہ رفیع الدین نے قرآن کا ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کے اہم تشریحی نوٹ کو حواشی میں 'موضح القرآن' کے نام سے لکھا ہے۔ اس طرح وہ اردو کے اولین شارح بھی ہیں۔

---

[1] اقبال کی شرحیں، ڈاکٹر مدثر ماجد، ص ۱

اردو میں قرآن کی کئی تفسیریں لکھی گئیں۔ تفسیر ابن کثیر کا ترجمہ کیا گیا۔ تفسیر ثنائی ، تفہیم القران، تدبر القرآن اور ترجمان القرآن اردو کی معروف شرحوں میں اپنی قدامت اور معیار کے لحاظ سے قابل اعتماد تسلیم کی جاتی ہیں۔ قرآن کی تفسیروں کے علاوہ اردو میں احادیث کی شرحیں بھی لکھی گئیں۔ نواب صدیق حسن خاں (والیِ بھوپال) نے صحاح ستہ کا اردو ترجمہ کرواکر اپنی حکومت کی طرف سے شائع کروایا۔ ان میں صرف ترجمہ ہی نہیں بلکہ مختصر تشریحی نوٹ کو بھی شامل کیا گیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اب تک حدیث کی کتابوں کے یہی ترجمے عوام وخواص کی ضرورتوں کی تکمیل کر رہے ہیں اور انہیں کسی قسم کی دشواری نہیں محسوس ہوتی ہے۔

مذہبی کتابوں کے علاوہ عربی زبان میں ادبی کتابوں کی بھی شرحیں لکھی گئیں۔ تدریسی ضرورتوں کے لیے معلقات، مقامات حریری اور حماسہ وغیرہ کی شرحیں لکھی گئیں۔ ان میں سے کچھ کتابوں کی ایک سے زائد لوگوں نے شرحیں لکھی ہیں۔ لیکن ہماری گفتگو چوں کہ اردو میں شرح نگاری سے ہے اس لیے ساری توجہ اردو کے ادبی پاروں کی شرحوں پر مرکوز کی جائے گی۔

اردو میں غالبؔ اور اقبالؔ دو ایسے خوش نصیب شاعر ہیں جن کے کلام کی شرحیں ایک سے زائد لوگوں نے لکھیں۔ ان میں بھی بعض وجوہات سے غالب کو فوقیت حاصل ہے۔ دراصل غالب کی مشکل پسندی کی وجہ سے ان کے کلام کی تہہ تک پہنچنا عام قاری کے لیے مشکل ہے۔ جب کہ اقبال کا کلام فکری وحدت کی وجہ سے فہم کی دسترس میں آجاتا ہے یا قاری سیاق وسباق سے مفہوم تک پہنچ جاتا ہے۔ اس وجہ سے اقبال کی شرح پر غالب کے مقابلہ میں کم توجہ ہوئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ غالب کا اردو کلام ایک دیوان تک منحصر ہے جس کو پڑھنا اور شرح کرنا آسان ہے جب کہ اقبال کے تمام کلام کو پڑھنے کے لیے کثیر وقت درکار ہے۔ شرح کے معاملے میں غالب جیسے شارح اقبال کو نہیں مل سکے۔ اقبال کی شرحوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شارحین نے اقبال کے فکر وفن کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔

شارحین نے ادبی شہ پاروں کی شرحیں کیوں لکھی ہیں؟ اس سلسلے میں پروفیسر عبد الحق نے 'شارحین اقبال' کے نام سے اپنے مضمون میں نفیس بحث کی ہے۔ انھوں نے شرح نگاری کے پانچ اسباب شمار کرائے ہیں۔ یہاں مختصر طور پر ان اسباب کو بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔:

1) ۔'متن کی مشکل یا پیچیدہ عبارت کی گرہ کشائی'

2) ۔'نصابی ضرورت' کی تکمیل۔ اقبال کی شرحوں کے پیچھے عام طور پر یہی محرک کار فرما ہے۔ چونکہ اقبال کے کلام کا بڑا حصہ اسکول سے لے کر یونیورسٹیوں تک نصاب میں شامل ہے۔ جس کی وجہ سے طلبہ اور اساتذہ کو کلام اقبال کی تشریح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ انہیں ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اکثر شارحین نے اقبال کے کلام کی شرح پر توجہ دی۔

3) ۔'فن کار سے ذاتی یا ذہنی قربت' تاکہ اپنے پسندیدہ فن کار کے خیالات اور اس کے فن کو عوام الناس تک پہنچایا جاسکے۔ اس کی مثال حالی کی یادگار غالب ہے۔

4) ۔'نئی تعبیر یا نئی تفہیم کا اظہار' بڑے فن کاروں کے فن میں معنی کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ ایک ایک شعر کے کئی کئی مفہوم بیان کیے جاسکتے ہیں۔ بعض دفعہ شارح کو لگتا ہے کہ بعض اشعار کی تشریح الگ لگ انداز سے بھی کی جاسکتی ہے تو وہ اس کے اظہار کے لیے بھی شرح لکھتا ہے۔ کلام اقبال میں وحدتِ فکر کی وجہ سے اس کی گنجائش کم ہے لیکن کلام غالب میں اس کی پوری پوری گنجائش ہے۔ 'یادگار غالب' سے لے کر شمس الرحمن فاروقی تک سب نے کلام غالب کی اپنے اپنے انداز سے تعبیر و تفسیر کی ہے اور کی جاتی رہے گی۔ ہر ایک نے اپنے فکر کی شمع روشن کی ہے۔ دراصل شرح کا معاملہ بھی دوسری اصناف کی طرح کچھ اس طرح ہے کہ ندا فاضلیؔ کے الفاظ میں کچھ نہ کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ جس کو بعد میں آنے والا پورا کرتا ہے۔

5) ۔'علمی و ادبی زوال پذیری' بھی شرح نگاری کے اہم محرکات میں سے ہے۔ جیسے جیسے زمانہ ترقی کے منازل طے کرتا جاتا ہے۔ لوگوں کے ادبی ذوق میں کمی آتی جارہی ہے۔ پہلے جس کلام کو عام آدمی بھی سمجھ لیا کرتے تھے اب وہ خواص کی دسترس سے باہر کی چیز معلوم ہونے لگی ہے۔ اس وجہ سے غالبؔ و اقبالؔ ہی نہیں مومنؔ، داغؔ اور فانیؔ کے کلام کی بھی شرحیں لکھی جانے لگی ہیں۔[1]

غالب کے سب سے پہلے شارح مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔ انہوں نے 'یادگار غالب' میں غالب کے منتخب اشعار کی تشریح دل نشین پیرائے میں کی ہے۔ یادگار غالب اگرچہ مکمل طور پر شرح کی کتاب نہیں ہے لیکن سچ بات یہ ہے کہ

---

[1] فکر اقبال از عبد الحق میں شامل مضمون 'شارحین اقبال ص ۸۲ تا ۸۸ سن اشاعت ۱۹۸۹ ناشر مؤلف

'یادگار غالب' سوانح کی کتاب بھی نہیں ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے غالب کے اشعار کی جو تشریح کی ہے ان میں سے اکثر کو ہم انہیں کے حوالے سے جانتے ہیں۔ حالی چونکہ غالب کے شاگرد تھے۔ ان کی صحبت میں رہنے کا انہیں موقع ملا۔ وہ غالب سے بعض اشعار کے معانی و مفاہیم کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر حالی نے 'یادگار غالب' نہ لکھی ہوتی تو ہم بہت سارے اشعار کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتے یا ان کی تشریح و توضیح کچھ اور کر رہے ہوتے۔ غالب کی عظمت کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے اس کا بڑا حصہ حالی ہی کا تعمیر کردہ ہے۔

حالی کے بعد جن دوسرے شارحین نے اس جانب توجہ دی ان میں حسرت موہانی، نظم طباطبائی، شوکت میرٹھی، بیخود دہلوی، آسی، جوش ملسیانی، آغا محمد باقر، غلام رسول مہر، یوسف سلیم چشتی اور شمس الرحمان فاروقی سرفہرست ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنہوں نے پورے کلام غالب کی شرح لکھی ہے جیسے نظم طباطبائی، جوش ملسیانی، غلام رسول مہر اور آغا محمد باقر وغیرہ لیکن کچھ شارحین نے کلام غالب کے منتخب کلام کی شرح لکھی ہے جیسے شمس الرحمان فاروقی کی شرح 'تفہیم غالب' غالب کے پورے دیوان کو شامل نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق غالب کے مقصود تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن آغا محمد باقر کی شرح اس وجہ سے ان سب میں ممتاز ہے کیوں کہ یہ ایک ساتھ کئی شرحوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ انہوں نے ایک ساتھ کئی شرحوں کو اپنی شرح میں شامل کر لیا ہے۔ اس طرح ایسے اشعار جہاں مختلف شارحین کی رائیں مختلف ہیں سبھی آراء کو حوالہ کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔

ہم عصر شارح شمس الرحمان فاروقی کی شعر فہمی کی صلاحیت کا اعتراف پوری دنیا کرتی ہے۔ انہوں نے 'شعر شور انگیز' کے نام سے کلام میر کی شرح لکھ کر ادبی دنیا میں میر فہمی کی تجدید کی ہے۔ کلام غالب پر ان کی شرح 'تفہیم غالب' ایک خوب صورت اضافہ ہے۔ انہوں نے دیوان غالب کی مکمل شرح کرنے کے بجائے انہی اشعار کی شرح کی ہے جو ان کے خیال سے بحث و مباحثہ کی گنجائش رکھتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اظہار خیال کے لیے وہی اشعار منتخب ہوں جن میں کوئی ایسا نکتہ ہو جو عام شارحین سے نظر انداز ہو گیا ہو یا جن کی شرح میں کوئی ایسی بات کہنا ممکن ہو جو متداول شارح سے ہٹ کر ہو۔''[1]

---

[1] تفہیم غالب ص ۱۲

شمس الرحمان فاروقی کا مطالعہ بہت وسیع ہے وہ مشرق مغرب کے علوم سے بہرہ ور ہیں۔ ان کے مطالعہ میں اس سے پہلے لکھی گئی سبھی شرحیں تھیں اس وجہ سے غالب کی شرح لکھتے وقت انہوں نے سابقہ شرحوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جہاں ضرورت پڑی ہے وہاں انہوں نے ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ 'تفہیم غالب' شمس الرحمان فاروقی کی علمی صلاحیتوں کا منہ بولا ثبوت ہے۔ ہمارا مقصد چونکہ اقبال کے شارحین پر لکھنا ہے اس وجہ سے اس سرسری گفتگو کے بعد ہم اقبال کے شارحین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر ہم اقبال کے شارحین کو تین خانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

1. مکمل کلام اقبال کی شرح لکھنے والے۔ جیسے یوسف سلیم چشتی، انہوں نے اقبال کے اردو اور فارسی پورے کلام کی شرح لکھی ہے۔ اس لحاظ سے ان کو شارح اقبال کہا جاتا ہے۔ یہ شرف ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں حاصل ہوا ہے۔
2. کلام اقبال کے چند مجموعوں کی شرح لکھنے والے۔ اس ضمن میں غلام رسول مہر اور خواجہ حمید یزدانی کو رکھا جاسکتا ہے۔
3. کلام اقبال کی چند نظموں اور غزلوں کی شرح لکھنے والے۔ اس کے اندر وہ شارحین آتے ہیں جنہوں نے صرف چند نظموں اور غزلوں کی شرح لکھی جیسے اسلوب احمد انصاری جنہوں نے 'اقبال کی تیرہ نظمیں' میں اقبال کی چند منتخب طویل نظموں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے شارحین بھی آجاتے ہیں جنہوں نے اپنی تنقیدی کتابوں میں اقبال کی نظموں اور غزلوں کے ایک بڑے حصے کی تشریح کی ہے جیسے سید عابد علی عابد 'شعر اقبال' میں، کلیم الدین احمد 'اقبال۔ ایک مطالعہ' میں، یوسف حسین خاں 'روح اقبال' میں، عبد المغنی 'اقبال کا نظام فن' میں اور سید ابوالحسن علی میاں ندوی 'نقوش اقبال' میں۔ اگر ان ناقدین کی کتابوں سے ان منتخب حصوں سے ان تشریحات کو الگ کرکے شائع کردیا جائے تو کئی معنوں میں اقبال کی موجودہ شرحوں سے زیادہ کارآمد ثابت ہوں گی۔ لیکن مسئلہ یہی ہے کہ وہ اقبال کے مکمل کلام کی شرح نہ ہوکر منتخب کلام کی شرح ہوگی۔ تنقیدی کتابوں میں شائع ان کتابوں کی تشریحات اگرچہ عمدہ ہیں لیکن ان کی حیثیت مجموعی طور پر تنقید کی ہے۔ اس وجہ سے ہم ان کا ذکر اقبال کے شارحین میں نہ کرکے متعلقہ ابواب میں ہی کریں گے۔ اسی ضمن وہ کتابیں بھی ہیں جو جزوی طور پر اقبال کی شرح سے تعلق رکھتے ہیں جیسے عابد علی عابد کی 'تلمیحات اقبال' اور اکبر حسین قریشی کی کتاب' مطالعہ تلمیحات و اشارات اقبال' وغیرہ لیکن ان کتابوں کو بھی شرحوں میں شمار نہ کرکے اقبال کے فن کے ناقدین میں شمار کیا جائے گا۔

غالب کے مقابلہ میں اقبال کے یہاں پیچیدگی نہیں ہے۔ ان کا فکر مربوط ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے اکثر ناقدین اور شارحین حیران و پریشان نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انہوں نے کلام اقبال کا مکمل مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے زمانے میں بھی اقبال کے کلام کی مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے تعبیر کی تھی۔ اگرچہ شاعر اپنے کلام کا سب سے بڑا شارح ہوتا ہے لیکن اقبال نے اس جانب کبھی توجہ نہیں دی۔ اقبال کا کلام اگرچہ اس قسم کی

پیچیدگیوں کا متحمل نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک مربوط فکر کا حامل ہے۔ لیکن اس کے باوجود فکر اقبال سے مکمل ہم آہنگی اور ان کے کلام پر بھرپور نظر نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے سارے شارحین بھٹک گئے۔ یہ معاملہ شارحین اقبال کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ناقدین اقبال بھی اس میں شامل ہیں۔''[1]

اس کی مثال میں یوسف چشتی کی شرح کو رکھا جاسکتا ہے۔ خاص طور وہ حصے جہاں تصوف کے مباحث ہیں انہوں نے ان مقامات کی تشریح میں اقبال کے افکار کے نام پر اپنے افکار بیان کیا ہے۔

شرح کے تعلق سے ایک مسئلہ اور بھی سامنے آتا ہے کہ کیا شرح کرتے وقت شاعر کے مقصود کی رعایت کی جانی چاہئے؟ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ ایک شعر کہتے وقت شاعر کے ذہن میں جو مفہوم تھا اس کی رعایت شرح کرتے وقت کرنی ضروری ہے یا شارح اپنی صواب دید کے مطابق شعر کے الفاظ کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے مدلول کے مطابق تشریح کرنے میں آزاد ہے۔ کئی دفعہ ہم یہ پڑھتے ہیں کہ اس شعر کا مفہوم فلاں نے وہ بیان کیا ہے جہاں تک خود شاعر کا بھی ذہن نہیں گیا ہو گا۔ اس سلسلے میں راقم کی رائے یہ ہے کہ شاعر کی خود اپنی تشریح کا لحاظ تو کیا جائے گا لیکن اس کے ساتھ اگر لفظیات کسی اور مفہوم کی بھی نشاندہی کر رہی ہوں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ غالب نے 'کاغذی ہے پیرہن' کی تشریح خود کی ہے اس کے باوجود شارحین نے اس کی تشریح غالب سے مختلف کی ہے۔ ان میں سے بعض تشریحات غالب کی تشریح سے بھی زیادہ جامع معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر اپنے ہر شعر کی تشریح کرے ایسا ممکن نہیں ہے۔ لامحالہ ہم کو خود اپنی فہم کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض مرتبہ شاعر کوئی شعر کہتا ہے لیکن اس شعر کے معانی کی تمام پرتوں تک وہ خود بھی نہیں پہنچ پاتا ہے۔ غزل کی پوری کائنات رمز و کنایہ پر ہے۔ اس کی تشریح جس پس منظر میں کی جائے صحیح مانی جائے گی۔ عشق مجازی کے اشعار کو عشق حقیقی پر اور اس کے برعکس تشریح کی جاسکتی ہے۔ کلام اقبال کا ایک معتدبہ حصہ ایسا ہے جس کی تشریح ہندوپاک میں الگ الگ پس منظر میں بیان کی جاتی ہے۔ اس لیے میری رائے میں اصل شاعر کا فہم نہیں بلکہ شاعر کا شعر ہے۔

آنے والے سطور میں اقبال کے شارحین کا جائزہ لیا جائے گا۔

---

[1] فکر اقبال ص ۸۳

# یوسف سلیم چشتی

علامہ اقبال اردو کے ایسے خوش نصیب شاعر ہیں جن کے کلام کی ایک سے زائد شرحیں لکھی گئیں۔ اس معاملہ میں غالب کے علاوہ اقبال کا کوئی ہمسر نہیں۔ یوں تو کلام اقبال کی شرح ایک سے زائد لوگوں نے کی لیکن یوسف سلیم چشتی کا عظیم کارنامہ جس میں ان کا کوئی مقابل نہی، یہ ہے کہ انہوں نے اقبال کے اردو اور فارسی کے تمام کلام کی شرح پوری تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اقبال پر مضامین اور کتابیں بھی تحریر کی ہیں لیکن ان کو شہرت شرحوں کی وجہ سے ملی۔ وہ اقبال کے واحد شارح ہیں جنہوں نے اقبال کے تمام کلام کی شرح لکھی ہے۔ یوسف سلیم چشتی کو دنیا 'شارح اقبال' کے نام سے جانتی ہے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں اقبال سے استفادہ کا موقع ملا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ان کے نانا نے انہیں 'اسرار خودی' کا ایک نسخہ پڑھنے کو دیا تھا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت تک وہ 'اقبال کے کلام اور پیغام سے نا آشنا تھے۔' انہیں یہ کتاب سمجھ میں نہیں آئی اس وجہ سے چند صفحات سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس دشواری کا سامنا کرتے ہوئے انہوں نے اقبال سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک دوست کی معیت میں پہلی مرتبہ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا اور جب کچھ دنوں بعد مرحوم کے مزاج میں کسی قدر دخل حاصل ہو گیا تو ایک دن دبی ہوئی زبان سے یہ عرض کی کہ 'اسرار' اور 'پیام' دونوں کتابیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ لیکن ان سے قطع نظر بھی نہیں کر سکتا۔ دماغ قاصر سہی لیکن دل ان کی طرف مائل ضرور ہے۔ یہ سن کر علامہ اقبال نے فرمایا کہ 'اسرار خودی کتنی مرتبہ پڑھی ہے؟' میں نے کہا ساری کتاب تو نہیں پڑھی، پہلا باب پڑھا لیکن سمجھ میں نہیں آیا اس لیے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ 'پیام مشرق' کی غزلیں تو پڑھ لی ہیں لیکن 'لالۂ طور' تک رسائی ہوئی نہ نقش فرنگ تک۔۔۔۔ یہ سن کر علامہ اقبال نے فرمایا 'خوش نویسی یا موسیقی ایک دن میں نہیں آسکتی ہیں فلسفیانہ نظمیں ایک دفعہ پڑھنے سے کیسے اور کیونکر سمجھ میں آسکتی ہیں۔ الفارابی نے ارسطو

کی مابعد الطبیعات' کو کئی سال تک مسلسل پڑھا تھا۔ تم بھی اس کی تقلید کرو اور ان کتابوں کو بار بار پڑھو۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لو"[1]

یوسف سلیم چشتی نے اقبال کے مشورہ کے مطابق اسرار خودی ہی نہیں بلکہ پورے کلام اقبال کو بغور پڑھنا شروع کیا۔ ایک ایک حصہ کو کئی کئی بار پڑھا۔ جہاں ضرورت محسوس کی اقبال سے بھی مشورہ کیا۔ ضروری باتیں وہ نوٹ کر لیا کرتے تھے تاکہ بعد میں شرح لکھتے وقت ان کے کام آئیں۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی اقبال سے ملاقاتیں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک ہوتی رہیں۔ خاص طور سے انجمن حمایت اسلام سے وابستگی کے زمانے میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی کو اقبال سے استفادہ کا موقع زیادہ ملا۔ علامہ اقبال اس انجمن کے صدر تھے اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی اسی انجمن کے اشاعت اسلام کالج کے پرنسپل تھے۔

یوسف سلیم چشتی جب بھی کسی مجموعۂ کلام کی شرح لکھتے ہیں تو پہلے اس مجموعۂ کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں۔ یہ خاکہ صرف موضوعات ہی کا نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر کلام کے فنی امور سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ وہ 'شرح ارمغان حجاز' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ اس پورے مجموعہ کلام میں ایک بھی غزل نہیں ہے اور نہ ہی کسی نظم میں تغزل پایا جاتا ہے۔ وہ ۱۸۹۴ء سے ۱۹۳۴ء تک کے دور کو غزلوں کا دور قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ 'ضرب کلیم' میں تغزل اور شعریت بہت کم ہے۔ یہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ زندگی کے آخری دور میں اقبال کی شاعری پر فلسفہ غالب آگیا تھا۔ ضرب کلیم کی چھ تمثیلی نظموں سے یوسف سلیم چشتی نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ اگر اقبال مزید کچھ سالوں تک زندہ رہتے تو وہ ملٹن کی طرح خالص تمثیلی شاعری کرنے لگتے۔[2]

علامہ اقبال کی شاعری اپنے اندر معانی کا ایک بیش بہا ذخیرہ رکھتی ہے۔ اکثر اشعار میں معانی کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ قاری کو ایسا لگتا ہے کہ وہ معانی کی تہہ تک پہنچ چکا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ معانی کے گوہر میں سے صرف چند ایک تک ہی اس کی رسائی ہو پاتی ہے۔ اس وجہ سے کلام اقبال کی شرحوں کی ضرورت اور افادیت بڑھ جاتی ہے۔

---

[1] شرح اسرار خودی، یوسف سلیم چشتی ص ۷

[2] شرح ارمغان حجاز از کا مقدمہ

یوسف سلیم چشتی عموماً کسی نظم کی تشریح کرنے سے پہلے اس نظم کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اگر اس نظم سے متعلق کوئی اہم یادگاری واقعہ ہوتا ہے تو اسے بھی بیان کرتے ہیں۔ 'بانگ درا' کی مشہور نظم 'ترانۂ ہندی' کے شروع میں لکھتے ہیں:

> 'یہ ترانہ اقبال نے ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا اور ۱۰ء اگست ۱۹۰۴ء کو کانپور اتر پردیش کے مشہور اردو رسالہ 'زمانہ' کے ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم کو اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ اس میں آخری مصرعہ یوں لکھا تھا: (معلوم ہے ہمیں کو درد نہاں ہمارا!) لیکن بعد میں انہوں (منشی دیانرائن نگم) نے اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے یوں کر دیا: 'معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا' اس میں شک نہیں کہ لفظ کسی نے مصرعہ میں سوز و گداز کی کیفیت میں اضافہ کر دیا ہے۔"[1]

ایسی بات نہیں کہ یوسف سلیم چشتی ہر جگہ تفصیل سے ہی کام لیتے ہیں۔ بعض جگہوں پر انہوں نے اتنی مختصر شرح کی ہے کہ وہ اختصار مخل کے درجہ میں آ گیا ہے۔ پیام مشرق کی نظم 'کشمیر' صرف چھ اشعار پر مشتمل ہے اس کی شرح یوسف سلیم چشتی نے بہت مختصر کی ہے۔ پہلے چار اشعار کی تشریح میں انہوں نے لکھا ہے کہ 'ان اشعار میں کشمیر کی وادیوں کا نقشہ کھینچا ہے' پانچویں شعر میں ناظرین کو موسیقی اور مے نوشی کی ترغیب دی ہے۔ اور آخری شعر میں کشمیر جنت نظیر کی سب سے بڑی دلکشی یعنی دختر برہمن کا ذکر کیا ہے۔ اور صرف دو لفظوں میں اس کا سراپا بیان کر دیا ہے۔

دخترکے برہمنے لالہ رخے سمن برے
چشم بروئے او کشا باز بخویشتن نگر

یوسف سلیم چشتی کلام اقبال کی شرح کرتے وقت کسی ایسے موقع کو جانے نہیں دیتے جہاں ان کے محبوب موضوع یعنی 'تصوف' کا ذکر ہو۔ ایسے مواقع پر اقبال کے کلام کی آڑ لے کر وہ تصوف کی تشریح پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ بال جبریل کی پہلی غزل کی تشریح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

> "غور سے دیکھو تو پوری غزل وحدۃ الوجود کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ پہلے شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان خدا کے عشق میں گرفتار ہے۔ اور اس کے فراق میں 'نوائے شوق' پر مجبور ہے۔

---

[1] بانگ درا مع شرح ص ۲۰۳

(ا) عشق میں کیوں گرفتار ہے؟ اس لیے کہ کند ہم جنس پرواز' والا معاملہ ہے۔ انسان کا خدا سے عشق کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی اصل خاکی نہیں ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

'ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو'

فروغ دیدۂ افلاک ہے تو 'نوائے شوق' اس بات کی دلیل ہے کہ عاشق کو صحبت آب و گل پسند نہیں آتی۔ اس لیے وہ محبوب حقیقی کی ملاقات کا آرزومند ہے اور یہ بالکل فطری امر ہے:

'کل شئ یرجع الی اصلہ'

ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ مرشد رومی نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

ہر کسے دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

ہر شخص جو اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے وہ اپنی اصل سے ملاقات کا آرزومند رہتا ہے۔ بلکہ ملاقات کے لیے کوشاں رہتا ہے۔"[1]

یوسف سلیم چشتی کسی بھی مجموعے کی شرح کرنے سے پہلے اس کا مقدمہ تحریر کرتے ہیں۔ یہ مقدمہ عموماً تفصیلی ہوا کرتا ہے اس میں وہ کتاب کے سیاق وسباق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اجمالی طور پر اس کی نظموں اور غزلوں کے موضوعات کو بیان کرتے ہیں۔ شعری خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ اتنی عمدگی سے تعارف کراتے ہیں کہ قاری کو اس مجموعے کو پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے۔

یوسف سلیم چشتی کی شرح کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ کلام اقبال کی تشریح دوسرے شعراء کے کلام سے بھی کرتے ہیں۔ دوران شرح اگر انہیں اقبال کے کلام کے ہم معنی دوسرے شعرا کا کلام ملتا ہے تو اس کو بھی شرح میں جگہ دیتے ہیں۔ علامہ اقبال کا یہ شعر 'بال جبریل' میں ہے:

---

[1] بال جبریل مع شرح ص ۸۰

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں

نہ ادائے کافرانہ، نہ تراش آزرانہ

اس شعر کی تشریح میں اکبر الہ آبادی کے اشعار کو بھی بیان کیا ہے، اکبر الہ آبادی کا شعر ہے:

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

دیکھ اے قوم سنتے تھے جسے

چند لڑکے تھے مشن اسکول کے

راہ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے

وا نہ پہنچے اور ہم سے چھٹ گئے

یوسف سلیم چشتی نظموں کے تعارف میں عموماً یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ 'یہ نظم فلاں کتاب کی ان نظموں میں سے جن کا جواب جدید اردو ادب میں نہیں مل سکتا۔' یہ یوسف سلیم چشتی کا تکیۂ کلام ہے۔ لیکن اس تکیۂ کلام سے اقبال کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اقبال کے تعلق سے ان کا رخ توصیفی ہے۔ وہ اقبال کی عظمت کے دل سے قائل ہیں۔ ان کے اس عقیدت کو ہم مذموم غلو کے دائرے میں اس وجہ سے نہیں رکھ سکتے کہ انہوں نے اقبال سے یہ عقیدت ان کے کلام کے تفصیلی مطالعہ کے بعد قائم کی ہے۔ انہوں نے جو منصب (شرح نگاری) اپنے لیے چنا ہے اس میں ان کی یہ عقیدت نقصان دہ نہیں ہے۔

یوسف سلیم چشتی اپنی شروحات میں متن کو بھی درج کرتے ہیں۔ لیکن ضرب کلیم میں انہوں نے اس سے انحراف کرتے ہوئے صرف تشریحی نوٹ کو درج کیا ہے۔ اس سے قارئین کو شرح سے استفادہ میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ ضرب کلیم میں انہوں نے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب خصوصی طور پر طلبہ کے لیے لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''یہ شرح میں کالج کے طلبہ کے لیے لکھ رہا ہوں'[1]

اس کے باوجود انہوں نے نہ کسی نظم کا عنوان درج کیا ہے اور نہ ہی اشعار۔ صرف نمبر ڈال دیا ہے۔

حسین احمد مدنی اور اقبال کی چپقلش مشہور ہے۔ اقبال کی نظم جو زبور عجم میں 'حسین احمد' کے نام سے موجود ہے اس کے شعر:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

پر لکھتے ہوئے یوسف سلیم چشتی نے اہل دیوبند کی ایک دوسرے کے بارے میں افترا بازیوں کو خصوصاً اہل نجد اور اہلحدیثوں کے بارے میں ان کی تنقیدوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ان کی کتابوں سے عربی عبارتوں کو بھی درج کیا ہے۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ ہیں ان علما کے ارشادات جن کے علم، ثقاہت اور دیانت و تقوی کی دھوم رہی ہے اگر یہ بزرگ اہل نجد اور ان کے ہم مسلک گروہ اہلحدیثوں سے واقف نہیں تھے تو تعجب ہے کہ لاعلمی کے باوجود اتنے ادعا کے ساتھ لب کشائی کی جرأت کیسے کی؟ اور اگر وہ واقف تھے تو ہم حیران ہیں کہ ان کی اس جسارت کو احتیاط و دیانت کے کس خانے میں شمار کریں؟''[2]

یوسف سلیم چشتی کی سب سے بڑی خوبی جو ان کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے، وہ کلام اقبال کی ایسی تشریح کرنا جس میں کوئی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ اس کے لیے انہوں نے کلام اقبال کی بہت تفصیلی شرح لکھی ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ کلام اقبال سے متعلق تقریباً سبھی مباحث سامنے آگئے ہیں۔ ایک ایک اشعار کہ تشریح میں انہوں نے کئی صفحات سیاہ کر دیے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ یہ ان کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ زیادہ بولنے والا

---

[1] ضرب کلیم مع شرح ص۹

[2] شرح ارمغان حجاز، جدید ایڈیشن ۲۰۰۹ء ص ۳۷۵

غلطیاں بھی زیادہ کرتا ہے۔ یوسف سلیم چشتی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ بعض دفعہ اقبال کے فکر وفلسفہ سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور اپنی خود کی فکر کو اس کی آڑ میں بیان کرنے لگتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ غیر ضروری تفصیل سے قاری کو بوجھل کر دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر وہ شرح کر کے کلام اقبال کی تفہیم کو آسان بنانے کے بجائے اسے اور مشکل کر دیتے ہیں۔ 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' اقبال کی مشہور تمثیلی نظم ہے۔ اس کا مضمون بہت آسان اور واضح ہے۔ مگر اس کی شرح کرتے وقت یوسف سلیم چشتی نے اپنی تمام فلسفیانہ معلومات کو صرف کر دیا۔ نظم کے پہلے شعر:

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں
ساکنان عرش اعظم کی تمناؤں کا خون

کی تشریح کرتے وقت 'یہ عناصر کا پرانا کھیل' کی تعبیر و تشریح میں انہوں نے دنیا بھر کے ادیان و مذاہب اور فلسفۂ فکر کا حوالہ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سانکھ درشن، چارواک مت، جین دھرم، بودھ دھرم، دیمقراطی، لاادریت، تشکیک، دہریت، الحاد، زندقہ، مادہ پرستی، مزدکیت، مارکسزم، انارکزم، پازیٹیوزم، ڈی ازم، بالشوازم، سوشلزم، اور کمیونزم اور اس قبیل کے دوسرے دوسرے ازموں کی بنیاد یہی ہے کہ یہ دنیا عناصر مادی کا پرانا کھیل ہے۔''

غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں فرداً فرداً تمام ازموں کو گنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جبکہ ان میں بعض ایک ہی ازم کے دو نام ہیں۔ جیسا کہ لاادریت اور تشکیک، دہریت اور الحاد ایک ہی ازم کے دو نام ہیں۔ انہوں نے ان ازموں کے نام اس طرح لیے ہیں جیسے یہ دو نام ہیں۔ وہ آگے مزید لکھتے ہیں:

''پرانا کھیل' غور طلب ترکیب ہے اقبال نے پوری مادیت کو دو لفظوں میں بند کر دیا ہے۔ واضح ہو کہ مادیت کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا سالمات مادی کے غیر شعوری اور ازلی امتزاج کا نتیجہ ہے۔ بالفاظ واضح تر:

ا۔ تجارب اور تنافر، سالمات کا جذب باہمی یا اس کے برعکس عمل کا کوئی مقصد نہیں۔ ایک اندھی طاقت ان سالمات کو ملاتی رہتی ہے۔ اور ان کے بلا مقصد امتزاج سے مختلف چیزیں بنتی رہتی ہیں۔

۲۔ یہ کھیل پرانا ہے یعنی مادہ ازل ہے اس کی کوئی ابتدا نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مسلک مادیت کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ اس مسلک کی بنیاد انہیں دو باتوں پر ہے۔ اگر اس نکتہ کو مد نظر رکھ کر اس مصرعہ کو پڑھا جائے تو اس کی موزونیت بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔"

ان اقتباسات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس تشریحات سے کہیں آسان کلام اقبال کا سمجھنا ہے۔ ان تشریحات نے اقبال کی نظم کے سیدھے سادے الفاظ کی تفہیم کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شعر کو سامنے رکھ کر موضوع سے الگ ہٹ کر تقریر کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور پھر اصل مضمون تشنہ رہ جاتا ہے۔ اس لمبی چوڑی تقریر سے کار آمد حصے کو نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ علامہ اقبال کا شعر ہے:

طبع مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علم کلام

اس شعر پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب اس کی وضاحت کر دوں کہ علم کلام سے قوت عمل کس طرح مردہ ہو جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ علم کلام میں ان امور سے بحث کی جاتی ہے جو عقل کی دسترس سے بالاتر ہیں مثلاً ماہیت وجود، ماہیت علم کلام، ماہیت روح، ماہیت عالم، ربط حادث بالقدیم، حدو قدم کائنات، ذات و صفات ذات باری تعالیٰ، تقدیر و تدبیر، جبر واختیار، اور مسئلہ خیر و شر وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام مسائل ایسے ہیں کہ نہ انسانی عقل ان کو سمجھ سکتی ہے اور نہ کبھی آئندہ سمجھ سکے گی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ساری عمر ان بحثوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقت ہی نہیں مل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی متکلم نے میدان جنگ میں جام شہادت نوش نہیں کیا اور اسی علم کلام کو امام ابو حنیفہ نے اپنی زندگی کا شعار بنایا تھا۔ جس کی وجہ سے علم حدیث و تفسیر قرآن سے محروم تھے۔''[1]

---

[1] شرح اسرار خودی ص ۲۴

یوسف سلیم چشتی نے مذکورہ اقتباسات میں کئی دعوے کیے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا علم کلام صرف ان ہی مذکورہ مباحث تک محدود ہے؟ اور کیا واقعی یہ مباحث ایسے ہیں جن کو اب تک کوئی نہیں سمجھ سکا ہے؟ بلکہ مصنف نے دو قدم آگے بڑھ کر یہ دعوی بھی کر ڈالا کہ آئندہ بھی کوئی اسے نہیں سمجھ پائے گا۔ میرے خیال سے یہ تمام فلاسفہ اور علم کلام کے ماہرین کی کاوشوں کو بے کار اور رایئگاں ثابت کرنے جیسا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی بے کار اور لایعنی چیزوں میں ضائع کر دیا۔

امام ابو حنیفہ کے بارے میں یہ مشہور کیا جاتا ہے کہ انہیں حدیثوں کا علم نہیں تھا۔ کچھ لوگوں نے یہاں تک کہا ہے کہ ابو حنیفہ کو صرف ایک درجن حدیثیں یاد تھیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک ایسا فقیہ جو امت کا سب سے بڑا فقیہ ہو، اس کے نام پر ایک فرقہ موجود ہو، اس کے بارے میں اس قسم کی باتیں کہاں تک درست ہو سکتی ہیں۔ تعجب کی بات یہ کہ یوسف سلیم چشتی نے ان لوگوں کی آواز میں آواز ملا کر ایسی بے سروپا بات کہہ دی۔ وہ کلام اقبال کی شرح کرتے وقت اکثر اپنے مقصد سے ہٹ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ایسی باتیں لاتے ہیں جو دوسروں کی دلآزاری کا بھی سبب بن جاتی ہیں۔ اقبال کے کلام کی شرح کرتے وقت انہیں حق ہے کہ وہ اقبال کے کسی کلام کو معیار سے فروتر ثابت کریں۔ انہیں غالب ہی نہیں سودا اور درد سے کم تر گردانیں لیکن مذہبی شخصیات کے بارے میں رائے دینے کا اختیار انہیں نہیں ہے۔

یوسف سلیم چشتی کی شرحیں صرف شرح نہ ہو کر اقبال کی تنقیدی کتابوں کے بھی زمرے میں آتی ہیں۔ انہوں نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ کلام اقبال کے بارے میں کوئی بات نہ چھوٹنے پائے۔ اس وجہ سے ان کی شرحیں بہت طویل ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کی شرحوں میں کچھ باتیں قابل ملاحظہ ہیں لیکن کلام اقبال کی تفہیم کے لیے انہوں نے شرحوں کی شکل میں جو خدمت انجام دی ہے اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ شارح اقبال ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اقبال تنقید پر بھی لکھا ہے لیکن وہ شارح اقبال کی حیثیت سے زیادہ کامیاب ہیں۔

مجموعی طور پر یوسف سلیم چشتی کلام اقبال کے سب سے بڑے شارح ہیں۔ انہوں نے بہت ساری جگہوں پر شرح کے بنیادی اصولوں سے انحراف کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اقبال کے شارحین میں ان کا مقام سب سے اعلا و ارفع ہے۔

# مولانا غلام رسول مہر

مولانا غلام رسول مہر کا شمار اقبال کے احباب میں ہوتا ہے۔ غلام رسول مہر کے اقبال کے ساتھ گہرے رواسم تھے۔ علامہ اقبال کو جن لوگوں کی صلاحیت پر اعتماد تھا ان میں مہر کا نام سر فہرست ہے۔ علامہ اقبال کے خطوط جو مہر کے نام ہیں ان دونوں کے درمیان کے رشتوں کی گہرائی کو واضح کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کی صحبتوں میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے اقبال کی سوانح نگاری کے لیے بھی اقبال کے شیدائیوں کی نگاہیں انہیں کی طرف اٹھتی تھیں۔ خود ان کو بھی اس کا احساس تھا مگر پوری زندگی صرف اقبال کی سوانح عمریوں کے معیار پر نقد ہی کرتے رہے۔ خود یہ کام نہ کر سکے۔ اگر رفیع الدین ہاشمی کی بات مانیں تو ایک مرتبہ انہیں سوانح عمری لکھنے کی ذمہ داری سونپی بھی گئی تھی لیکن معاوضہ کی رقم سے وہ مطمئن نہ تھے اس وجہ سے انھوں نے یہ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ عبدالمجید سالک نے اس کام کو کم معاوضہ پر کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا اس وجہ سے انہیں سوانح عمری کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔[1]

بانگ درا کے شروع میں انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کی توجہ اقبال کی سوانح کی طرف تھی اس سے وجہ اقبال کے کلام کی شرح لکھنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ لکھتے ہیں:

> "عزیزی شیخ نیاز احمد صاحب مدت سے اصرار کر رہے تھے کہ کلام اقبال کے لیے ایک معاون تیار کر دیا جائے جو مختلف نظموں کے پس منظر، تلمیحات کی تشریح اور شعروں کے صحیح مفہوم مختصر توضیح پر مشتمل ہوتا کہ پڑھنے والوں کے لیے کلام کا سمجھنا اور اس سے استفادہ کرنا ایک حد تک آسان ہو جائے۔ لیکن اس فرمائش کو قبول کرنے سے طبیعت گریزاں تھی۔ اول اس لیے کہ اقبال جیسے شاعر کے کلام کی شرح کرنا ایک ذمہ داری کا کام تھا۔ وہ محض شاعر نہ تھے بلکہ ایک صاحب پیغام شاعر تھے جن کی زندگی اسی پیغام کی تبلیغ بیں گزر گئی۔ دوسرے میری

[1] اقبال صدی کی سوانح عمریاں از رفیع الدین ہاشمی، مشمولہ اقبالیات: تفہیم و تجزیہ ص ۲۳۳

طبیعت اقبال کی مفصل سیرت مرتب کرنے پر جمی ہوئی تھی اور میں اس ضروری کام کو اپنی ناچیز بساط کے مطابق مکمل کر دینے سے بیشتر کوئی دوسرا کام شروع نہ کرنا چاہتا تھا۔''[1]

لیکن وہ 'ضروری کام' مولانا مہر پورا کر نہیں سکے۔ ان کی مصروفیات اقبال کے بجائے دوسری جانب ہو گئیں اور مجبوراً ان کو اقبال کی شرح کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ غالباً شرح کے لیے جس یکسوئی کی ضرورت تھی وہ انہیں میسر نہ ہوئی۔

مولانا مہر نے اپنی شرحوں میں سب سے زیادہ اختصار پر توجہ دی ہے۔ اس کے باوجود مفہوم کی ترسیل میں عموماً کامیاب رہے ہیں۔ بعض جگہوں پر حد سے زیادہ اختصار کی وجہ سے مفہوم کی وضاحت نہیں کر سکے ہیں۔ اختصار کے باوجود بعض نظموں کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے سیاق وسباق بھی بیان کیا ہے جیسے کہ انہوں نے 'مسجد قرطبہ' کی شرح لکھنے سے پہلے اس مسجد کی عظمت پر ایک تفصیلی نوٹ لکھا ہے جس میں اس مسجد کی تاریخ کے علاوہ اس کے فن تعمیر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مولانا مہر لکھتے ہیں:

''یہ نظم بھی ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی جس کا پرانا جاہ وجلال گو باقی نہیں رہا لیکن وہ اب تک صفحۂ ہستی پر موجود ہے۔ اس کی بنیاد عبدالرحمان اول نے رکھی تھی جو ہسپانیہ کی سلطنت کا بانی تھا۔ پھر اس میں مختلف اضافے ہوتے رہے۔ مسجد کا طول ۶۲۰ فٹ اور عرض ۴۴۰ فٹ تھا۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد تھی جس میں ایک ہزار چار سو سترہ ستون تھے جن کی جلا کا یہ عالم تھا کہ انسان ان میں اپنا عکس دیکھ سکتا تھا۔ مسجد کی مختلف دیواروں میں اکیس دروازے تھے جن پر پیتل کا بے حد خوصورت کام کیا گیا تھا۔ اس کا مینار جس میں اذان کہی جاتی تھی ایک سو آٹھ فٹ بلند تھا۔ چوٹی پر چاندی اور سونے کے سیب نما گولے نصب کر دئے گئے تھے۔ روشنی کے لیے مسجد میں دو سو اسی بلوری جھاڑ آویزاں تھے۔ سب سے بڑے جھاڑ میں موم کی چودہ سو بتیاں جلتی تھیں۔ ان کے علاوہ پیتل کے سات ہزار چار سو پچیس پیالے دیواروں میں لگے ہوئے تھے جن میں تیل بتی سے روشنی ہوتی تھی۔ مسجد کا منبر آبنوس، صندل اور ہاتھی دانت کے ۳۶ ہزار ٹکڑوں کو سنہری کیلوں سے جوڑ کر بنایا گیا تھا او راس کی تیاری میں سات سال لگے تھے۔''[2]

---

[1] مطالب بانگ درا ص ۳۔۴

[2] مطالب بال جبریل ص ۱۶۵۔۱۶۶

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مہر نے جہاں پر ضروری سمجھا وہاں وضاحت کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ دراصل انہوں نے اپنی شرح کے اسلوب کے بارے میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ اشعار کے سیاق و سباق پر خصوصی توجہ دیں گے۔ مولانا مہر اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے کہ اقبال کے کلام کو بعض لوگ اس کے اپنے سیاق سے الگ کر کے اس کا ایسا مفہوم نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اقبال کی مراد نہیں ہے۔ اس کے لیے انہوں نے اقبال کے کلام کی شرح کی طرف توجہ دی۔ مولانا مہر کا مقصد پورے کلام اقبال کی شرح لکھنا تھا مگر وہ صرف 'بانگ درا' ، 'بال جبریل' اور 'ضرب کلیم' کی شرح ہی مکمل کر سکے۔ فارسی کلام میں انہوں نے اسرار و رموز کا ترجمہ کیا۔ مولانا مہر 'بال جبریل' کی شرح کے شروع میں اپنے منہجِ شرح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے کلام کی شرح کے سلسلے میں زیادہ بسط و تفصیل سے کام لیا جاتا اور ایک ایک مسئلے کو کھول کر بیان کیا جاتا تو شرحیں بہت ضخیم ہو جاتیں اور عام شائقین ان سے استفادہ نہ کر سکتے، لہٰذا تشریح مطالب کا ایسا انداز اختیار کیا گیا کہ کتابیں زیادہ ضخیم نہ ہونے پائیں اور اشعار کا مفہوم بخوبی ذہن نشین ہو جائے۔''[1]

مولانا چونکہ اقبال کے ہم نشین محفل بھی رہ چکے ہیں اس وجہ سے اقبال کے کلام کے شان ورود سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے بعض حصوں کی شرح لکھتے وقت اپنی ان معلومات کو بھی سیاق وسباق کے طور پر پیش کیا ہے۔ 'شمع وشاعر' اقبال کی مشہور نظم ہے جو ان کے مجموعہ بانگ درا میں شامل ہے۔ مولانا غلام رسول مہر اس نظم سے متعلق دیگر معلومات قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں:

> ''یہ طویل نظم اقبال نے ۱۹۱۲ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی۔ اس سال اجلاس اسلامیہ کالج کے میدان میں ہوا تھا۔ اتفاق یہ کہ انجمن حمایت اسلام کے دو بڑے سرپرستوں سلطان احمد صاحب اور فقیر افتخارالدین صاحب نے اصرار کیا کہ اقبال کی نظم ان کی صدارت میں پڑھی جائے۔ اقبال کو مجبوراً اس امر پر راضی کیا گیا کہ نصف حصہ ایک صاحب کی صدارت میں پڑھیں اور نصف دوسرے صاحب کی صدارت میں،

---

[1] مطالب بال جبرئیل ص ۵

چنانچہ یہی ہوا۔ اقبال نے یہ نظم ترنم سے پڑھی تھی۔ پہلی صدارت میں چھ بند پڑھ کر تھک بھی گئے تھے۔ آخری چھ بند سنانے سے پہلے ایک قطعہ بھی سنایا تھا جس میں دو صدروں کے واقعہ کا ذکر تھا''[1]

اقبال نے اپنے اس فارسی قطعہ میں دونوں صدور کے نام 'سلطان' اور 'فقیر' پر جو بر محل شعر کہا تھا اس کا ایک مصرعہ بہت مشہور ہوا:

در میان انجمن معشوق ہر جائی مباش
گاہ باسلطان باشی گاہ باشی بافقیر

اقبال کے اس قطعہ سے محفل لالہ زار ہو گئی تھی۔

اس قسم کی تشریح کی ایک عمدہ مثال 'ضرب کلیم' کی نظم 'غلاموں کی نماز' کی شرح ہے۔[2]

مولانا اپنی شرح کے اسلوب پر گفتگو کرتے ہوئے 'مطالب بانگ درا' میں رقمطراز ہیں:

''اس شرح کو اتنا پھیلایا نہیں گیا ہے کہ پڑھنے والے پر بار ہو یا عام خواندہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ نہ اتنا مجمل رکھا گیا ہے کہ مفہوم تشنہ رہ جائے۔ جہاں جہاں ضروری تھا اشعار کے محاسن کی طرف بھی اشارے کر دئے گئے ہیں۔ اس بات کا خیال بخوبی رکھا گیا ہے کہ اقبال کے مفہوم میں نہ اپنی طرف سے کوئی آمیزش ہو، نہ اسے کھینچ تان کر انفرادی تصورات کے مطابق بنایا جائے۔ کوشش یہی رہی کہ اقبال نے جس ماحول میں خاص تاثرات و تصورات کے پیش نظر جو کچھ کہا اسے دیانت داری سے اسی رنگ میں پیش کر دیا جائے۔''[3]

مولانا غلام رسول مہر اپنے پہلے مقصد میں کامیاب ہیں۔ انہوں نے مختصر ترین شرح لکھی ہے۔ بعض اشعار کی تشریح محض ایک سطر میں کی ہے۔ لیکن جملے کے دوسرے حصہ میں جس بات کا دعوی کیا ہے وہ محل نظر ہے۔ یوں تو اقبال کے

---

[1] مطالب بال جبریل ص ۳۔۶

[2] مطالب ضرب کلیم ص ۲۲۳

[3] مطالب بانگ درا ص ۵

کلام کی شرح میں صفحات سیاہ کرنے والے شارحین بھی اس بات کا دعوی نہیں کرسکتے کہ انہوں نے اقبال کے کلام کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے۔ اس وجہ سے اختصار سے شرح کرنے والے کے اوپر ہم کوئی الزام کیوں کرر کھ سکتے ہیں؟

انہوں حتی الامکان کلام اقبال کی آسان سے آسان زبان میں شرح کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عموماً پہلے مشکل الفاظ کے معانی بیان کرتے ہیں۔ پھر اس کی تشریح کرتے ہیں۔ انہوں نے بال جبریل اور ضرب کلیم میں اشعار کو درج کرنے کے بجائے صرف عنوانات کے نام درج کر دیے ہیں، اس سے قاری کو دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی جگہ پر اگر اشعار کو درج کرنے کے بعد اس کی تشریح کی جاتی تو قاری کے لیے آسانی ہوتی۔ قاری سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ کلیات اقبال کا ایک نسخہ شرح پڑھتے وقت سامنے رکھے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

ان فرو گزاشتوں کے باوجود ان کی شرحیں سب سے کار آمد ہیں۔ان کا علمی قد دیگر تمام شارحین سے بلند ہے۔ وہ ادبی دنیا میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالحق مولانا مہر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''غلام رسول مہر اردو ادب میں اپنی خدمات کی بنا پر احترام کی نظر سے دیکھے جائیں گے۔ اسلامیات، غالب اور اقبال ان کے مطالعے کے خصوصی پہلو ہیں۔ سیرت سید احمد شہید۔ مکاتیب غالب کے مرتب کی حیثیت سے بہت معروف ہوئے۔ 'سرود رفتہ' اقبال میں ان کی غالباً پہلی کتاب ہے جس میں اقبال کے غیر مطبوعہ اور حذف شدہ کلام کو احتیاط سے شامل اور شائع کیا گیا ہے۔ یہ بے حد مفید اور اہم تصنیف ہے۔ اس کے بعد ان کی شرحیں سامنے آتی ہیں۔ ان میں مطالب بال جبریل، مطالب ضرب کلیم وغیرہ اہم شرحیں ہیں۔ ان کی حیثیت صرف شرح نگار کی نہیں بلکہ ادیب و ناقد اور محقق کی ہے۔ اس لیے ان کی شرحوں میں اعتبار کا پہلو زیادہ ہے۔ تشریح میں توازن اور ایک ہم آہنگی ہے۔ انہوں نے بہت اختصار سے بھی کام لیا ہے جو ان کی شرحوں کے لیے معیوب ہے۔''[1]

ان فرو گزاشتوں کے باوجود ان کی شرحیں بہت کار آمد ہیں۔

---

[1] فکر اقبال کی سرگزشت ص۸۹۔۹۰

# عارف بٹالوی

ڈاکٹر عارف بٹالوی ان خوش نصیبوں میں ہیں جن کا شمار اقبال کے خادموں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اقبال کے اردو کلیات میں شامل سبھی مجموعوں کی شرح کی ہے۔ انہیں علامہ اقبال سے عقیدت ہے۔ یہی عقیدت اس شرح کی وجہ بنی۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں نے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر فیصلہ کیا ہے کہ اقبال کی چاروں اردو کتب بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کی شرحیں قلم بند کروں گا اگر میری ان کوششوں میں کسی قسم کی کمی رہ گئی تو اسے اپنی علمی معلومات میں کمی محسوس کروں گا۔ میں اپنی پوری بصیرت اور نہایت دیانت داری سے ایک ایک شعر کو اقبال کی قرآنی بصیرت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے قلم بند کروں گا۔''

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عارف بٹالوی کی توجہ خاص طور پر اقبال کے مذہبی افکار پر ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے کوئی بلند بانگ دعوی نہیں کیا ہے۔ انہیں اقبال سے عقیدت ہے اور یہ عقیدت غلو کے دائرے میں بھی پہنچ جاتی ہے۔ وہ اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''جب مجھے معلوم ہوا کہ ہندو قوم نے ٹیگور کو اس کتاب (گیتانجلی) پر نوبل پرائز دیا تو میں نے اپنی قوم پر آنسو بہائے جس نے حضرت علامہ اقبال جیسی عظیم و نادر ہستی کو داد تک نہ دی بلکہ اس پر کفر کے فتوے صادر کر دئے۔ کروڑوں انسانوں میں سے کسی نے اٹھ کر نہ کہا کہ اے فتوی دینے والو یہ کیسا ستم ڈھا رہے ہو۔ دیدہ وری سے کام لو اور قدرت کی اس نعمت کبری کو غور سے دیکھو اور توجہ سے سنو:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے\
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''[1]

---

[1] شرح بانگ درا، ڈاکٹر عارف بٹالوی ص ۱۱

کسی بھی شخصیت کے ساتھ حد سے زیادہ غلو بعض دفعہ نقصان کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ عارف بٹالوی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اقبال کی عقیدت میں انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ٹیگور کو نوبل پرائز ہندوؤں نے نہیں بلکہ نوبل پرائز کمیٹی نے دیا جس کا تعلق کسی بھی صورت میں ہندوؤں سے یا ہندوستان سے نہیں ہے۔ عارف بٹالوی کا یہ کہنا بھی اصل حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے کہ اقبال کے خلاف فتوی دینے والے کے خلاف کروڑوں میں سے ایک بھی نہیں کھڑا ہوا۔ سچ یہ ہے کہ اس فتوی کے خلاف مسلمانوں کے ہر طبقہ کی طرف سے آواز بلند ہوئی تھی۔ فتوی ددینے والے کو ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس فتوی کو کسی نے بھی لائق اعتبار نہیں سمجھا۔ اور جہاں تک اس کا سوال ہے کہ مسلم قوم نے اقبال کے کلام کی داد تک نہ دی یہ بھی سراسر حقیقت کے خلاف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلم قوم نے اقبال کی زندگی میں اقبال کی جو عزت وتوقیر کی وہ کسی دوسرے اردو شاعر کے حصہ میں آئی ہی نہیں۔ غالب اور میر کے حال سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ دنیا نے ان کی موت کے بعد ہی ان کی قدرومنزلت کو سمجھا لیکن اقبال کا ستارہ ان کی زندگی سے ہی بلند رہا اور آج بھی بلند ہے۔

عارف بٹالوی اقبال کا موازنہ ٹیگور سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ٹیگور کے یہاں کوئی مقصد حیات نہیں۔ وہ بھٹکے مسافر کی طرح ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے اس کتاب (گیتانجلی) کو کئی بار پڑھا اور گہرے مطالعے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ٹیگور کے سامنے کوئی مقصد حیات نہیں ہے۔ بلکہ بھٹکے ہوئے راہی کی طرح زندگی کے راستے پر ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز کھوچکا ہے اور اسے اندھیرے میں ٹٹول کر تلاش کر رہا ہے۔ نہ قلب روشن ہے کہ عقل کوئی چراغ جلا کر رکھ دے، نہ ہی نگاہ میں نور ہے کہ تاریکیوں میں روشنی پیدا ہو جائے۔''[1]

مذکورہ بالا اقتباس اقبال کی عقیدت میں دوسرے کے قد کو چھوٹا کر کے ناپنے کی کوشش ہے جس کو کسی بھی حال میں مستحسن نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

---

[1] بٹالوی شرح بانگ دراص ۱۱

عارف بٹالوی کے سامنے اقبال کی شرحیں موجود تھیں۔ غلام رسول مہر، اور یوسف سلیم چشتی وغیرہ کی شرحیں آسانی سے مہیا تھیں۔ انہوں نے ان شرحوں کا مطالعہ بھی کیا ہو گا مگر ان کی شرح دیکھ کر لگتا نہیں ہے کہ انہوں نے ان شرحوں سے کوئی فائدہ اٹھایا ہے۔ عام طور پر اقبال کے اشعار پر ان کی تشریحات کلام اقبال کا ترجمہ معلوم ہوتی ہیں۔ سپاٹ لب ولہجہ میں کلام اقبال کا مفہوم ادا کر دیا ہے۔

عارف بٹالوی کی شرح کی ایک بڑی خامی جس کا اعتراف انہیں خود بھی ہے اشعار کو درج کیے بغیر شرح کرنا ہے۔ وہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''شرح کا دستور، قاعدہ اور تقاضہ یہ ہے کہ شرح کے ساتھ شعر متعلقہ بھی لکھا جائے۔ میں اس کمی کو نہایت دکھ کے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔''[1]

اگر قاعدہ، تقاضہ اور دستور اشعار کو درج کرنا تھا تو پھر کیا چیز اس سے مانع تھی، اس کا جواب عارف بٹالوی ہی دے سکتے ہیں۔

نظموں کی شرح میں عارف بٹالوی نے نظم کا عنوان درج کر دیا ہے اور غزلوں میں مطلع درج کر کے پوری غزل کی شرح کی ہے۔ اس سے کم از کم یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کی کس غزل کی شرح کی جارہی ہے۔

شرح کرتے وقت وہ صرف مفہوم کو بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ کہیں کہیں انہوں نے مشکل الفاظ کے معانی بھی بیان کیے ہیں۔ وہ ہمیشہ مختصر انداز میں بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ طویل مباحث سے دامن بچاتے ہوئے آسانی سے ان جگہوں سے بھی گزر جاتے ہیں جہاں دوسرے شارحین کو تفصیلی بحث کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ بال جبریل کی شرح کرتے ہوئے وہ پہلے شعر:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر

---

[1] بٹالوی شرح بانگ درا ص ۱۹

کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''پھول کی پتی سے ہیرے کو کاٹنا قطعی ناممکن ہے لیکن یہ ناممکن بات تو ممکن ہوسکتی ہے مگر یہ کبھی ممکن نہیں ہوسکتا کہ کم عقل اور بے شعور انسان کسی دانا کی بات پر مائل ہو جائے۔ یا کوئی بے وقوف انسان کسی دانا کی پند و نصیحت کا اثر قبول کرے''[1]

عارف بٹالوی کی شرح کو پڑھتے ہوئے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اقبال کے کلام کے حسن کو وہ اپنی شرح میں بیان کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس سے ان کی عاجزی ٹپکتی ہے۔ ادبی شہ پارے کی تشریح کرتے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تشریح بھی اسی شہ پارے کا ہم پلہ ہو۔ لیکن اتنا ضرور ہے زبان وبیان درست اور جملے چست و درست ہونے چاہئے اور مفہوم کی ترسیل مکمل طور پر ہونی چاہئے اس لیے کہ شرح کی بنیادی شرط تشریح ہے۔

بعض اشعار کی شرح انہوں نے عمدگی کے ساتھ کی ہے۔ بانگ درا کی نظم 'سرگزشت آدم' کی شرح بٹالوی اس طرح کرتے ہیں:

''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا' علامہ اقبال نے اپنی اس نظم میں غالب کے اسی خیال کی ترجمانی کی ہے کہ اگرچہ انسان عقل اور تحقیق کے بل بوتے پر زمین سے اٹھ کر چاند تک پہنچ گیا ہے لیکن یہ اپنی ہستی سے آگاہ نہ ہوسکا۔ عقل سے دونوں عالم تسخیر کرلئے لیکن اپنے اندر عشق کی چنگاری بھی نہ سلگا سکا جس کی روشنی سے اپنے خالق حقیقی کے خدوخال کو پہچان سکے۔''[2]

غالب کے حوالے سے اقبال کی نظم کی تشریح نے اس کے اندر جاذبیت پیدا کردی ہے اور قاری کے لیے اس نظم کے پیغام تک رسائی آسان ہوگئی ہے۔

---

[1] بٹالوی شرح بال جبریل ص ۱۰

[2] بٹالوی شرح بانگ درا، سرگزشت آدم

عارف بٹالوی نے اشعار کی شرح کرتے وقت عموماً مشکل الفاظ کی تشریح کی طرف کم توجہ دی ہے وہ صرف مفہوم بیان کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔اس سے مفہوم تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔

مجموعی طور پر عارف بٹالوی بحیثیت شارح اقبال زیادہ کامیاب نہیں معلوم ہوتے ہیں۔اس کے باوجود وہ اس بات پر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اقبال کے کلام کو عام فہم بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انہوں نے اقبال کے کلام کی شرح کے علاوہ اقبال پر تنقیدی کام بھی کیا ہے۔'اقبال اور قرآن' اور 'اقبال اور ٹیگور' ان کی دو تنقیدی کتابیں ہیں ۔ اول الذکر میں انہوں نے اقبال کے افکار و فلسفہ کا رشتہ قرآن کریم سے جوڑا ہے اور دوسری کتاب میں برصغیر کے دو اہم شاعروں کا موازنہ کر کے اقبال کے فکر و فن کو ٹیگور پر ترجیح دی ہے۔

# محمد باقر

اقبال کے شارحین میں ایک نام ڈاکٹر محمد باقر کا بھی ہے۔ موصوف پنجاب یونیورسٹی لاہور میں شعبۂ فارسی کے استاد اور صدر شعبہ رہ چکے ہیں۔ انہوں نے بانگ درا کی شرح کی ہے۔ ان کی شرح عام مبتدی طلبہ کے لیے ہے۔ وہ اپنے مختصر سے مقدمہ میں بانگ درا کی شرح کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ شرح مبتدی کے لیے لکھی گئی ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ ذوق شعری اور وجدان شرح کا محتاج نہیں ہوتا اس لیے صاحب ذوق اور صاحب بصیرت فضلا کو اس شرح سے کم مدد ملے گی۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ جو اصحاب اب تک کسی وجہ سے حضرت علامہ کے اولین مجموعۂ افکار یعنی 'بانگ درا' کے مطالب و معانی کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں انہیں اس شرح کی وساطت سے اپنی مشکلات حل کرنے کا موقع ملے گا۔''[1]

انہوں نے اپنے مقدمہ میں کتاب کی ترتیب بھی بیان کی ہے۔ جس کے مطابق انہوں نے نظموں اور غزلوں کو لکھنے کے بجائے صرف عناوین لکھا ہے۔

محمد باقر کی ساری توجہ طلبہ کی نصابی ضرورت کی تکمیل پر تھی اس وجہ سے انہوں نے ہر شعر کی تشریح الگ الگ کی ہے۔ ہر شعر سے پہلے مشکل الفاظ کی تشریح کی ہے۔ اس کے بعد بہت مختصر انداز میں معانی کی وضاحت کی ہے۔ اتنی مختصر کہ اس کو تشریح کے بجائے اشعار کا اردو ترجمہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اگر کوئی تشریح کرنی پڑی ہے تو اس کو بریکٹ میں کیا ہے۔

---

[1] شرح بانگ درا ص: س مطبع تاج بک ڈپو، اردو بازار، لاہور سن اشاعت: ۱۹۵۱، ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے بانگ درا کی شرح کے علاوہ اقبالیات میں ایک اور کتاب ''اشاریہ ہائے آثارِ منظومِ اقبال'' کے نام سے بھی لکھا ہے۔

محمد باقر نظموں کی شرح سے پہلے اس نظم کے بارے میں کوئی تشریح نہیں کرتے۔ عنوان درج کرتے ہی مطالب کے بیان کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اپنے اس اصول سے ہٹ کر انہوں نے بعض نظموں کے بارے میں ایک دو جملوں میں وضاحت بھی کی ہے۔ وہ اقبال کی مشہور نظم 'پرندے کی فریاد' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ نظم اس پرندے کی فریاد پر مشتمل ہے جو پنجرے میں قید ہے۔''[1]

نظم 'داغ' کی شرح سے پہلے داغ کے بارے میں چار سطر کا ایک نوٹ لکھا ہے:

''نواب مرزا خاں داغ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۶ھ میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شمس الدین خاں نواب ضیاء الدین خاں والیٔ لوہارو کے بھائی تھے۔ ۱۸۹۱ء میں جب دوسری مرتبہ حیدرآباد (دکن) پہنچے تو میر محبوب علی خاں والیٔ دکن کے استاد مقرر ہوئے۔ بعارضۂ فالج ۱۹۰۵ء میں وہیں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔''[2]

اقبال کی نظم 'ابر' کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

'' صفحہ ۹۳

ابر

(۱) پورب: مشرق

آج پھر مشرق سے کالی گھٹا اٹھی ہے جس کی وجہ سے سر بن سے پہاڑ نے کالا لباس پہن لیا ہے۔

۲۔ توسن ابر: بادل کا گھوڑا

جب سورج بادل کے دامن تلے چھپ گیا تو سر دھوا بادل کے گھوڑے پر سوار ہو کر آئی۔

---

[1] شرح بانگ درا ص:۳

[2] شرح بانگ درا ص ۱۴۳

۳۔ بے خروش: شور و غوغا کے بغیر

یہ گھٹا خاموش ہے اس میں گرج کا شور نہیں۔ یہ گھٹا ایسا میخانہ ہے جس میں شور و غوغا نہیں۔

۴۔ نشاط مدام: ابدی مسرت، ہمیشہ رہنے والی خوشی

یہ باغ کے لیے ابدی مسرت کا حکم لاتی ہے اور پھول کے لباس میں موتی ٹانکنے کو لاتی ہے۔ (بارش کے اُن قطروں کو موتی سے تشبیہ دی ہے جو پھول سے چمٹ جاتے ہیں)۔

۵۔ جو پھول سورج کی گرمی سے مرجھا گئے تھے وہ شاداب ہو گئے اور جن کے بیج زمین میں گر پڑے تھے۔ وہ اگ آئے۔

۶۔ ہوا کے زور سے بادل ابھرا، بڑھا اور اُڑا۔ گھٹا اٹھی اور بادل برس پڑا۔

۷۔ کہسار: پہاڑوں کا سلسلہ، نہال: پودا، درخت

پہاڑ کے درختوں نے کیسا خوبصورت خیمہ بنایا ہے۔ وادی میں پھرنے والو! یہیں قیام کرو۔" [1]

اس حوالہ کو مکمل طور نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ محمد باقر کا اسلوب سمجھنے میں آسانی ہو۔ سب سے پہلے انہوں نے صفحہ نمبر درج کیا ہے تا کہ اصل کتاب سے قاری کو رجوع کرنے میں آسانی ہو۔ دراصل محمد باقر نے شرح کرتے وقت 'بانگ درا' کی نظموں اور غزلوں کی عبارت کو درج نہیں کیا ہے۔ اس لئے اس کمی کی بھرپائی کے لیے انہوں نے یہ طریقہ نکالا۔ لیکن انہوں نے کہیں بھی اس بات کی وضاحت نہیں کی ہے کہ انہوں نے کس نسخہ کا اعتبار کیا ہے۔ بانگ درا جیسی مشہور و معروف کتاب جس کے سیکڑوں ایڈیشن ہندوپاک میں شائع ہو گئے ہیں۔ قاری کے لیے یہ اندازہ لگانا ایک مشکل امر ہے کہ یہ صفحات شماری کس نسخہ کے اعتبار سے ہے ۔اور اگر معلوم بھی ہو جائے تو کوئی ضروری نہیں کہ اس کے پاس وہ نسخہ موجود بھی ہو۔

---

[1] شرح بانگ دراص ۱۴۹۔۱۵۰

صفحہ نمبر کے بعد محمد باقر نے نظم کا عنوان درج کیا ہے۔ شارح نے اس کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ قاری کے لیے مطلوبہ مقام تک پہنچنے میں اس سے سہولت تو ہوئی ہے لیکن غزلوں کے سلسلے میں یہ طریقہ کار آمد نہیں ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ فہرست میں غزلوں کی فہرست دے دی جاتی۔ لیکن محمد باقر نے صرف 'غزلیات' لکھ کر سبھی غزلوں کو ایک ہی عنوان میں سمیٹ دیا ہے۔

انہوں نے سبھی اشعار کی ترتیب سے شرح کی ہے۔ قاری کی سہولت کے لیے انہوں نے ہر شعر کی نمبر شماری کی ہے۔ لیکن یہ نمبر نظموں کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ بانگ درا کے اس نسخہ کے اعتبار سے ہے جس کو اصل مان کر انہوں نے یہ نمبر شماری کی ہے جس سے مزید الجھن کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

محمد باقر کی شرح کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر شعر کے شروع میں مشکل الفاظ کی تشریح کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا مثالوں میں اس کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن شارح نے اس معاملہ میں تساہل سے کام لیا ہے۔ بعض ایسے الفاظ کے معانی لکھے ہیں جو عام فہم ہیں۔ جیسے پورب کا معنی مشرق۔ حالانکہ پورب ہندوستانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی یہاں ہر شخص جانتا ہے۔ البتہ مشرق کا مطلب ہر کوئی جانتا ہو ایسا ضروری نہیں ہے۔ یہ جس شعر کی تشریح ہے اس کے الفاظ ہیں:

"اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سر بن کا"

تعجب کی بات یہ ہے کہ اسی شعر میں مستعمل لفظ 'سر بن' کی تشریح نہیں کی گئی ہے۔ ہر طالب علم 'سر بن' کے پہاڑ کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔ اس وجہ سے اس کی وضاحت ضروری تھی۔ دوسرے مصرعے کی وضاحت میں بھی صرف ایک لفظ 'توسن ابر' کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ اسی مصرعہ میں دوسرے مشکل الفاظ 'نہاں'، 'رخ مہر' اور' دامن ابر' کو چھوڑ دیا گیا۔ ان الفاظ کے معانی نہیں بیان کیے گئے۔

چوتھے شعر" قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے" کی تشریح انہوں نے مختصر الفاظ میں بہت عمدہ طریقے سے کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرح کو مختصر رکھنے کے لیے انہوں نے اختصار سے کام لیا ورنہ ان کے اندر ایک کامیاب شارح کی صلاحیتیں تھیں۔

سہولت کی خاطر پوری نظم یہاں درج کی جا رہی ہے جس کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف نے کن الفاظ کی تشریح کی ہے اور کسے عام فہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔ سہولت کی خاطر میں نے بھی شرح میں اصل اشعار میں نمبر ڈال دیا ہے۔

''ابر

۱۔ اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا
۲۔ نہاں ہوا جو رخ مہر زیر دامن ابر
ہوائے سرد بھی آئی سوار توسن ابر
۳۔ گرج کا شور نہیں ہے، خموش ہے یہ گھٹا
عجیب مے کدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا
۴۔ چمن میں حکم نشاط مدام لائی ہے
قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے
۵۔ جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے، اٹھے
زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے، اٹھے
۶۔ ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل
اٹھی وہ اور گھٹا، لو! برس پڑا بادل
۷۔ عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا''[1]

یوں تو محمد باقر الفاظ کے صرف معانی درج کرنے سے سروکار رکھا ہے لیکن کہیں کہیں انہوں نے بعض الفاظ کے معنی درج کرنے میں اس لفظ کی تفصیل بھی فراہم کی ہے۔ بانگ درا کی نظم ''آفتاب'' کی شرح کرتے وقت پہلے اس نظم

[1] علامہ اقبال بانگ درا

کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ 'رگ وید' کا بیمسر ہے جسے برہمن صبح وشام پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد ہر شعر کی شرح درج ہے۔ پہلے شرح کی وضاحت کرتے وقت 'روح ورواں' کا معنی اس طرح بیان کرتے ہیں:

'روح (زبان پہلوی میں روح یا زندگی کو کہتے ہیں۔ پہلوی کا 'رُبان' اردو میں 'رواں' بن گیا ہے) مراد وہ چیز ہے جس پر کسی چیز کا انحصار ہو۔"[1]

اسی طرح انہوں نے اس نظم کے آخر میں ایک مختصر نوٹ بھی لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:

"یہ نظم ہندوؤں کے اس عقیدہ سے تعلق رکھتی ہے جس کا اظہار گایتری میں کیا گیا ہے اور اقبال نے صرف اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اس میں اس کے اپنے عقائد کو دخل نہیں۔ کیوں کہ اس نظم میں سورج کو خدا تسلیم کیا گیا ہے۔"[2]

محمد باقر نے بعض تاریخی واقعات کی وضاحت بھی کی ہے مثال کے طور پر 'طلوع اسلام' کا یہ شعر:

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اس کی تشریح اس طرح کی ہے:

"اگر عثمانیوں (ترکوں) پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تو کیا ہوا۔ ایک صبح ہزاروں ستاروں کے خون سے پیدا ہوتی ہے۔ (ترکوں سے خلافت چھن جانے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔)"[3]

مجموعی طور پر محمد باقر کی شرح طلبا کے لیے مفید ہے۔ انہوں نے تشریحی مواد کے معاملے میں اپنی صوابدید کے مطابق کہیں کہیں تفصیل فراہم کی ہے۔ یہ معلومات ان کے وسعت مطالعہ کا پتہ دیتی ہیں۔

---

[1] شرح بانگ دراص ۵۰

[2] شرح بانگ دراص ۵۲

[3] شرح بانگ دراص: ۴۸۲

محمد باقر نے صرف بانگ درا کی شرح لکھی ہے۔ یہ مبتدی طلبہ کے لیے ہے اس وجہ سے انہوں نے طلبا کی ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے انہیں باتوں کا خیال کیا ہے جو ان کے لیے ضروری ہے۔ ان کی شرح کو اگر اسی نظر سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔

# عبدالرشید فاضل

عبدالرشید فاضل ایک معروف اقبال شناس ہیں ان کا شمار اقبالیات میں شارح کے علاوہ مترجم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ 'سلسلہ درسیات اقبال' کے ذریعہ انہوں نے اقبال کو عام فہم انداز میں نوخیزوں کے لیے پیش کیا ہے۔ اسرار ورموز کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا۔ شارحین اقبال میں ان کا نام 'بال جبریل کی شرح' کے ذریعہ سامنے آتا ہے۔

عظیم شاعری کی پہچان یہ ہے کہ اس کے اندر معانی کا بحر زخار ہے۔ ایک متوسط درجے کا قاری بھی اس کے مفہوم تک پہنچ سکتا ہے لیکن اس کی شاعری میں موجود فنی اور فکری خوبیوں تک پہنچنے کے لیے ایک ماہر کی ضرورت ہوتی ہے جو کلام کی گہرائی میں پہنچ کر اس کے مفہوم کو دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ غالب کی شاعری کی جو تشریح مختلف شارحین نے مختلف انداز سے کی ہے ان میں سے کسی شرح کو غلط کہنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ عظیم شاعری کی پہچان ہی یہ ہے کہ اس کے اندر کئی مفاہیم کا امکان ہوتا ہے۔ جہاں تک اقبال کی شاعری کا تعلق ہے تو اقبال کی شاعری ایک مستقل پیغام رکھتی ہے۔ اس کے اندر تسلسل ہے۔ اس وجہ سے ایسے مواقع کم آتے ہیں جہاں ایک ہی شعر کی تشریح مختلف طریقے سے کی جا سکے۔ لیکن کلام اقبال کے اندر پائی جانے والی گہرائی تک پہنچنا ہر قاری کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس وجہ سے اقبال کے کلام کی شرح کی ضرورت پیش آتی ہے۔

عبدالرشید فاضل نے لکھا ہے کہ ان کی نظر سے تین شرحیں گزری ہیں لیکن ان کو دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی ہے۔ ا ن کی نظر میں یہ نہ عام قاری کے لیے مفید ہیں اور نہ ہی طالب علم کے لیے اور یہی اسباب میرے لیے بال جبریل کی شرح لکھنے کا باعث ہوئے۔[1]

---

[1] شرح بال جبرئیل، صفحہ: ب

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی یہ شرح کیا سابقہ شروحات کے مقابلہ میں طلبہ اور اردو قارئین کے لیے زیادہ مفید ہے؟ انہوں نے سابقہ شروحات کا مطالعہ کیا تھا اس وجہ سے انہیں ان کی خامیوں کا اندازہ تھا۔ مگر افسوس کہ انہوں نے خود ان خامیوں کو دور کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ بال جبریل کی غزلوں کی تشریح کرتے وقت انہوں نے اشعار کو درج کرنے کے بجائے صرف صفحہ درج کر دیے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ عام قاری شرح کا مطالعہ کرتے وقت کلیات اقبال اپنے ساتھ رکھ کر نہیں پڑھتا ہے۔ اس وجہ سے وہ شرح سے پوری طرح مستفید نہیں ہو سکتا۔

عبدالرشید فاضل نے بھی دوسرے شارحین کی طرح شرح کرتے وقت ہر جگہ یکساں رویہ نہیں اختیار کیا ہے۔ کہیں تفصیل سے کام لیا ہے اور کہیں مختصر انداز میں تشریح کرکے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس سے اگرچہ شرح میں یکسانیت نہیں رہتی لیکن شرح کرتے وقت اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ کسی بھی شاعر کا ہر شعر یکساں نہیں رہتا۔ اس لیے اس سلسلے میں ان کو معذور سمجھنا چاہئے۔

عبدالرشید فاضل کا مطالعہ وسیع ہے۔ اشعار کی پرکھ کا مادہ ان کے اندر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شرح کرتے وقت بعض اشعار کی ایک سے زائد شرحیں کرتے ہیں۔ مثال کے طور وہ اقبال کے اس شعر

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید تیرا اندازۂ صحرا!

کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

''اپنے جنوں کے غیر محدود ہونے کو بیان کرتے ہیں کہ یہ کسی صحرا میں نہیں سما سکتا۔ بھلا ایک مومن جو سارے عالم کی ہدایت کے لیے آیا ہے اس کی جنون کے لیے صحرا کیا چیز ہے! اس کے لیے تو زمان و مکاں کی وسعتیں بھی ناکافی ہیں۔ طارق نے سمندر کو دیکھ کر کہا تھا کہ کاش! زمین اتنی جلدی ختم نہ ہو جاتی۔ دوسرا مطلب: گویا ایک مسلمان کہتا ہے کہ میرا کام معمولی نہیں ہے میں ایک عالمگیر پیغام رکھتا ہوں اور جب تک ساری دنیا میں اس پیغام کو نہ پہنچا دوں چین سے نہیں بیٹھ سکتا اگر میں کسی خاص جگہ یا وقت کو اپنے پیغام کے لیے مخصوص و معین کر کے رہ جاؤں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں نے اپنے مقصد حیات کو نہیں سمجھا۔''[1]

---

[1] شرح بال جبرئیل، سید عبدالرشید فاضل، ص۷۷

بال جبریل علامہ کی شاعری کا نقطہ عروج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالرشید فاضل نے بال جبریل کو ہی شرح کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس شرح کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے مفہوم کو پہنچانے میں کامیاب رہے ہیں۔

# ابو نعیم خاں نشتر جالندھری

نشتر جالندھری نے بھی بال جبریل کی شرح 'موج سلسبیل' کے نام سے کی ہے۔ ان کی شرح طلبہ کے لیے خاص نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے تشریح کم ترجمہ زیادہ کیا ہے۔ دوسری خامی یہ ہے کہ انھوں نے اشعار کو درج کیے بغیر شرح لکھی ہے۔ نظموں کے عناوین اگرچہ بیان کر دئے گئے ہیں لیکن اصل متن کی غیر موجودگی میں کلام کی تشریح مشکل ہو جاتی ہے۔ بعض نظموں سے پہلے متعلقہ نظم کے بارے میں معلومات فراہم کر دی ہے۔ مثلاً 'جاوید کے نام' کے شروع میں تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''نظم جاوید کے نام لکھی گئی ہے۔ جو اقبال کے چھوٹے اور نہایت عزیز فرزند ہیں۔ اس میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے اگر عشق رسول میں ڈوب کر خودی کو معراج کمال پر پہنچا دیا جائے تو انسان اپنا مقصد زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ یعنی دنیا میں خلافت الٰہیہ کا فریضہ انجام دے کر حیات جاوید کی دولت سے مالا مال ہو سکتا ہے۔ بری صحبت سے بچنا چاہئے اور جوانی کے نشے میں چور ہو کر صراط مستقیم سے بھٹکنا نہیں چاہئے۔''[1]

نشتر جالندھری کی شرح میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کو دوسری شرحوں سے ممتاز قرار دیا جا سکے۔ تشریح میں بھی عمدگی نہیں ہے۔ اس لیے اس کو اقبالیات میں کوئی اہم اضافہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

---

[1] موج سلسبیل، نشتر جالندھری، ص ۲۴۳۔۲۴۴

# مقبول انور داؤد

اردو اور فارسی شاعری میں موضوعات کے تنوع اور فکر کی گہرائی کے باب میں چند ہی شاعر علامہ اقبال کے حریف ہوں گے۔ تاریخ، فلسفہ، منطق، علم کلام، تصوف، سیاست، مذہبیات، شاعری، عالمی ادب اور فنون لطیفہ کے افق تا افق پھیلے منظر نامہ اور لطیف حوالے علامہ کے ذخیرۂ شعر و ادب میں پائے جاتے ہیں۔ ان حوالوں کی تفہیم آسان نہیں اسی لیے اقبالیات میں شارحین اقبال کا ایک مستقل گروہ وجود میں آیا۔ ان شارحین میں سے بعض نے تو علامہ کے کلام کی شرحیں لکھی ہیں اور بعض نے علامہ کے شعری و نثری آثار میں پائی جانے والی تلمیحات، رجال اور مقامات وغیرہ کی فرہنگ مرتب کیے ہیں۔ شارحین کے اس مؤخر الذکر مختصر گروہ میں چار افراد کے نام سامنے آتے ہیں سید عابد علی عابد مؤلف ''تلمیحات اقبال'' اکبر حسین قریشی مؤلف 'تلمیحات واشارات اقبال'، نسیم امروہوی مؤلف 'فرہنگ اقبال'۔ اس کے ساتھ ایک نام اور بھی جڑتا ہے 'مطالب اقبال' (1994) جس کے مؤلف مقبول انور داؤد ہیں۔

یہ کہنے میں کوئی تأمل نہیں کہ مذکورہ شارحین اقبال میں سے عابد علی عابد کے علاوہ سبھی نے مایوس کیا ہے فرہنگ اقبال کے مصنف مقبول انور داؤد نے ایک طرف چوہا اور گلہری جیسے الفاظ کی تشریح کرکے کتاب کی ضخامت کو غیر ضروری طور پر بڑھایا ہے۔ دوسری طرف اپنے مخصوص نظریے کے مطابق بعض الفاظ کی تشریح کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

مطالب اقبال اس معاملہ میں تو قابل اطمینان ہے کہ اس کے اندر غیر ضروری الفاظ کی تشریح سے بچتے ہوئے صرف ضروری الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کتاب کے لیے جس عمیق مطالعہ کی ضرورت تھی اس کا ثبوت فراہم کرنے سے وہ قاصر ہیں۔ اسی وجہ سے مقبول انور داؤد نے جگہ جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بعض جگہ غلط، نامکمل اور غیر ضروری تشریحات کی ہیں جس کی وجہ سے اس سے اقبال فہمی میں مدد کے بجائے الجھن اور دشواری ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مقبول انور داؤد نے الفاظ کی تشریح کے وقت یہ بھی نہیں بتایا کہ یہ لفظ کلام اقبال میں کہاں ملے گا جس سے قاری ان کی تلاش کر سکے۔ صرف حروف تہجی کے اعتبار سے الفاظ کی ترتیب دے دی ہے۔ قرآنی

آیات واحادیث نیز اشعار غلط درج ہونا ایک عام بات ہے اس طرح اس کتاب کو اقبالیات میں کسی عمدہ اضافہ کے طور پر نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ عابد علی عابد نے ''تلمیحات اقبال'' میں کام جہاں چھوڑا ہے اس سے آگے بڑھانے کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔

# غلام احمد پرویز

جن شارحین اقبال نے اقبال کے کسی ایک مجموعے کی شرح لکھی ہے ان میں غلام احمد پرویز کا نام بھی ہے انہوں نے مثنوی اسرار خودی کی تفصیلی اردو شرح مجلس اقبال کے نام سے کیا ہے۔[1] غلام احمد پرویز کا شمار ان ماہرین اقبال میں ہوتا ہے جنہیں اقبال سے شرف ملاقات حاصل رہا ہے۔ وہ اقبال کی مجلسوں میں برابر شریک ہوا کرتے تھے اس کی روداد انہوں نے خود بھی بیان کی ہے اور سید نذیر نیازی کی کتاب 'اقبال کے حضور میں' بیان کی گئی ہے۔ اسرار خودی کی اشاعت کے وقت ان کی عمر صرف ۱۷ یا ۱۸ سال تھی۔

اسرار خودی اقبال کی تصانیف میں سب سے اہم مانی جاتی ہے۔ طباعت کے لحاظ سے یہ کتاب اقبال کے کلام میں اولیت رکھتی ہے۔ اس کے اندر علامہ اقبال نے اپنا مشہور فلسفہ خودی پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال کو خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ ان کا یہ فلسفہ وضاحت طلب ہے اس وجہ سے انہوں نے خود ایک تفصیلی دیباچہ تحریر کیا۔ یہ مثنوی اس وجہ سے بھی چرچا میں رہی کہ اس میں اقبال نے تصوف کے خلاف بہت سخت قسم کی تنقید کی تھی۔ ان کی زد میں حافظ بھی آئے۔ حافظ پر تنقید کی وجہ سے اقبال کے خلاف متصوفین نے ایک محاذ کھڑا کر دیا۔ اس میں خواجہ حسن نظامی پیش پیش تھے۔ اقبال نے اس کا بھی جواب تحریر کیا۔ اور اس طرح جواب الجواب کا سلسلہ نکل پڑا۔ پروفیسر ا ب کلسہ ں نے اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی میں کیا تو اس پر کچھ وضاحتی نوٹ بھی تحریر کیے اور اقبال کے فلسفہ پر کچھ اعتراض بھی کیا جسے ایک خط کی شکل میں انہوں نے اقبال کو روانہ کیا۔ اقبال نے ان خطوط کا جواب دیا۔ اسرار خودی کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت سے انگریزی داں طبقہ بھی اقبال کے خیالات سے واقف ہوا۔ اس طبقہ نے بھی اقبال کے فلسفہ پر چند سوالات کئے۔ خاص بات یہ ہے کہ ہندوپاک کے معترضین سے ارض انگلش کے اعتراضات کی نوعیت مختلف تھی۔

---

[1] یہ کتاب طلوع اسلام ٹرسٹ 25-B گلبرگ 2 لاہور، سن ۱۹۹۶ء

ان سوالات وجوابات کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اقبال کے فکر وفلسفہ کے بارے میں وارد اعتراضات کا جواب خود اقبال کی طرف سے بھی دیا گیا اور اقبال شناسوں کی طرف سے بھی۔ یہ ساری بحثیں بعد میں اقبال تنقید میں بنیادی مواد بنیں۔

غلام احمد پرویز کی کوشش یہ رہی ہے کہ ان کی یہ شرح کم از کم اسرار خودی کی حد تک جامع ہو۔ اس سے متعلق جو بھی مواد انہیں ملا اس کو اس شرح میں شامل کر دیا ہے۔ محمد عمر دراز کے تفصیلی دیباچہ کے علاوہ علامہ اقبال کا لکھا ہوا 'دیباچہ اسرار خودی' کا ترجمہ، پروفیسر نکلسن کو اقبال نے اپنے فلسفیانہ نکات کی وضاحت کے لیے جو کچھ لکھا تھا، پرویز نے اس نوٹ کا ترجمہ بھی شامل کر لیا ہے، یہ حصہ چونکہ خود اقبال نے لکھا ہے اس وجہ سے کافی اہم ہے، اس میں اقبال نے خودی کی آزادی، خودی انا اور تسلسلِ شخصیت، عشق اور خودی کی تربیت، فقدان عمل، مقام محمدی، خلافت و نیابت جیسے نکات کی تشریح کی ہے۔ پروفیسر نکلسن کے نام اقبال کے خط کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جس میں اقبال نے اپنے مختلف فلسفیانہ افکار کی تشریح کی ہے۔ مثلاً انسان کامل کے نظریہ کے بارے میں اقبال نے لکھا ہے کہ:

> "وہ (پروفیسر نکلسن) انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خلط مبحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل، انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر وہ قلم اٹھایا تھا تب نہ تو [illegible] کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا، نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں۔"[1]

اقبال نے اپنے خیالات کو سمجھنے کے لیے جرمن مفکر کے بجائے ایک انگریز مفکر لیگز نڈر کے افکار کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ خصوصاً گلاشکو والے خطبات جس میں اس نے خدا اور الوہیت کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ پرویز نے اسلم جیراجپوری کا تبصرہ بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے جو انہوں نے اسرار خودی پر کیا تھا۔ اس کے معاً بعد اس تبصرہ پر اقبال کے خط کو بھی شامل کیا ہے۔ ان مضامین میں اس زمانے میں اقبال کی حمایت اور مخالفت میں اٹھنے والی آوازوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اقبال نے تصوف کے خلاف اپنے نقطۂ نظر کو دلائل کے ساتھ پیش کیا تھا۔

---

1 مجلس اقبال ص ۱۷

اس میں اقبال نے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کے بجائے جارحانہ رخ اختیار کیا تھا۔ اقبال نے اس خط میں تاریخ تصوف پر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن ایک دو باب سے آگے مواد نہ ملنے کی وجہ سے کام آگے نہیں بڑھ سکا۔ اقبال کے مطالعہ میں منصور حلاج کا رسالہ کتاب الطواسین اور ابن حزم کی کتاب الملل تھی۔ اقبال حلاج کی سزا دہی میں مسلمانوں کو حق بجانب سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

'غیر صوفیاء قریباً سب کے سب منصور سے بیزار تھے، معلوم نہیں متاخرین اس قدر دلدادہ کیوں ہو گئے۔''[1]

اقبال نے تصور کے خلاف جو محاذ کھولا تھا اس کے پیچھے ان کا عمیق مطالعہ تھا۔ اگرچہ روایت پرستی کے زمانہ میں اقبال کی آواز کو دبانے کی کوشش کی گئی اور عمل کے بجائے تصوف کی سراب میں امت کے مسائل کا حل تلاش کرنے پر اصرار ہوتا رہا۔ اقبال نے تصوف پر جو کاری ضرب لگائی اس میں ابن تیمیہ کے بعد اسلامی تاریخ میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اقبال نے تصوف کے خلاف حرکت و عمل کے فلسفہ پر زیادہ اصرار کیا اور ابن تیمیہ نے دینی نقطۂ نظر سے زیادہ سروکار رکھا ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری کے بارے میں غلام احمد پرویز کی رائے یہ ہے کہ علامہ اگر اپنے خیالات کے لیے نظم کے بجائے نثر کا سہارا لیتے تو ان کے لیے زیادہ مفید ہوتا۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اقبال نے خود اس بات کا کئی جگہوں پر اظہار کیا ہے کہ ان کا مقصد صرف پیغام رسانی ہے شاعری مقصود نہیں ہے۔ پرویز لکھتے ہیں:

''اگر علامہ اپنے پیغام کو نثر میں لکھتے تو کہیں زیادہ مفید ہوتا۔ آپ نے (اپنے ابتدائی تحقیقاتی مقالہ کے بعد) اپنے خطبات کو نثر میں لکھا۔ ارباب نظر جانتے ہیں کہ جو بات اس کتاب میں ہے آپ کی کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ خود حضرت علامہ نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں اس کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لیے وہ مطالعہ قرآن اور فقہ اسلامی کے متعلق نثر ہی میں کتابیں لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔۔۔۔ ان کے اشعار میں (اس قدر احتیاط کے باوجود) بہت سی متضاد باتیں آ گئی ہیں۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ شاعر پر جذبات غالب ہوتے ہیں اور مضامین آفرینی کا خیال تضادات کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس سے حضرت علامہ کی پیغام رسانی

[1] مجلس اقبال ص ۳۹، اس خط پر ۱۷/ مئی ۱۹۱۹ء کی تاریخ درج ہے۔

کا مقصد مجروح ہو گیا ہے اور ان کی فکر مربوط اور ہم آہنگ انداز سے سامنے نہیں آسکی۔ لیکن اس کے باجود جو کچھ زبان شعر میں کہہ گئے ہیں وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہو سکا۔"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام احمد پرویز کے نزدیک اقبال کے کلام میں پایا جانے والا تضاد اس وجہ سے ہے کہ اقبال اپنے مدعا کو شاعری کی زبان میں مکمل طور پر ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے لکھا ہے کہ اگر اقبال نظم کے بجائے نثر میں لکھتے تو زیادہ کامیاب ہوتے۔ ضروری سی بات ہے کہ غلام احمد پرویز کے ان خیالات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر علامہ اقبال نے اپنے افکار کے لیے شاعری کے بجائے نثر کا سہارا لیا ہوتا تو کیا وہی اقبال ہوتے جنہیں آج ہم ایک عظیم شاعر اور دانشور جیسے القاب سے جانتے ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ ان کے افکار وخیالات بھی ان ہزاروں دانشوروں کی طرح تاریخ کے کسی گوشہ میں دفن ہو جاتے جن کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اقبال کے انکار کے باوجود اقبال حقیقتاً شاعر ہیں۔ وہ فلسفی اس وجہ سے ہیں کہ ان کی شاعری میں فلسفیانہ امور پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری سے ہٹ کر ان کے یہاں کوئی ایسی قابل قدر چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے انہیں یاد کیا جائے۔ اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہبی کتب کے براہ راست مطالعہ سے بعض طبائع واذہان اتنے متاثر نہیں ہوتے جتنا انہی حقائق کو اقبال کے کلام میں مطالعہ کرکے مطمئن ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ اقبال کے مشہور لکچرز 'اسلام کی تشکیل نو' میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کو جہاں تہاں تسلیم کرنے میں اکثر علماء کو تامل ہوا ہے لیکن انہی حقائق کو اقبال کی شاعری میں سن یا پڑھ کر بے ساختہ قائل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح جیسے وہ نکتے اپنے تمام معارف وبصائر کے ساتھ براہ راست ان پر منکشف ہو گئے ہوں۔"[2]

اشعار کی اپنی انفرادیت ہے ان کے اندر جو ذہن کو اپیل کرنے کی صلاحیت ہے اس کا مقابلہ نثر سے نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک اقبال کے افکار میں تضاد کی بات ہے تو اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اقبال کے افکار کی کتنی بھی توجیہیں کر لی

---

[1] مجلس اقبال ص ۲۷۔

[2] نقوش اقبال کا مقدمہ ص ۲۱۔ ۲۲

جائیں لیکن بالآخر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کے یہاں سبھی فکر وفلسفہ کے ماننے والوں کے لیے کچھ نہ کچھ ہے۔ یہ تضاد بتدریج ہے جس سے کوئی بھی صاحب عقل مستثنیٰ نہیں ہے۔

غلام احمد پرویز نے اسرار خودی کی شرح میں بہت تفصیل سے کام لیا ہے۔ کسی بھی نئے موضوع کو شروع کرنے سے پہلے وہ اس کے لیے تمہید باندھتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ متعلقہ مضمون کے بارے میں ایک سرسری خاکہ قاری کے ذہن میں بٹھا دیتے ہیں۔ ہر باب کے شروع میں تمہید کے ساتھ سابقہ باب کے مضمون کی وضاحت بھی کر دیتے ہیں جس سے ایک تسلسل قائم کرنے میں سہولت ہوئی ہے پہلے باب کی تشریح کرنے سے پہلے تمہیدی نوٹ میں لکھتے ہیں:

> ''اب ہم تمہید کے بعد اصل مثنوی پر آپہنچے ہیں، اس کے پہلے باب کا عنوان جسے ہم نے اوپر درج کر دیا ہے اقبال کے مرکز فکر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس میں حضرت علامہ نے دو باتیں کہی ہیں (۱) اصل نظام عالم از خودی است (۲) تسلسل حیات تعینات وجود بر استحکام خودی انحصار دارد۔۔۔۔ فکر اقبال کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ تمام عالم خودی ہی کے ذوق نمود کا مظہر ہے۔ خودی زندگی اور توانائی ہے لیکن یہ توانائی مشہود اس وقت ہو سکتی ہے جب یہ اپنے آپ کو مقید کر دے۔۔۔۔ تصوف کی اصطلاح میں اسے 'تعین' کہا جا سکتا ہے۔ یعنی تصوف کی اصطلاح میں یہ تعینات کے پردے ہیں۔''[1]

دوسرے باب کے شروع میں وہ پہلے باب کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''گزشتہ باب میں حضرت علامہ یہ بتا چکے ہیں کہ تمام کائنات اور زندگی سب خودی کی نمود سے ہے۔ خودی جس قدر مستحکم ہوتی ہے اسی قدر زندگی میں قوت اور توانائی ہوتی ہے۔۔۔ اب اس باب میں بتاتے ہیں کہ خود خودی کی حیات کا راز کس بات میں اس سوال کے جواب میں حضرت علامہ نے جو کچھ کہا ہے وہ درحقیقت ان کے پورے فلسفہ کا نقطۂ ماسکہ اور ان کے سارے پیغام کا مرکز فکر ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ انسان کے سامنے زندگی کا ایک متعین مقصد ہونا چاہئے۔ اور پھر اس مقصد کے حصول کی تڑپ۔۔۔ مقصد کے حصول کی تڑپ کا نام ان کی اصطلاح میں آرزو ہے۔''[2]

---

1 مجلس اقبال ص۷۶

2 مجلس اقبال، ص۸۸۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پرویز کی پوری کوشش رہی کہ مثنوی اسرار خودی کو ایک تسلسل کے ساتھ اس انداز میں سمجھا دیں جس طرح ایک استاد کلاس روم میں اپنے شاگردوں کو سمجھاتا ہے۔ انہوں نے صرف اسرار خودی کے ترجمہ پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے۔ جابجا تشریحی نوٹ بھی لکھا ہے۔ باب ششم میں علامہ اقبال میں تصوف کی مضرتوں کو بیان کرنے کے لیے بھیڑوں کے غلہ اور شیروں کے جھنڈ کی تمثیلی حکایت بیان کی ہے۔ جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ ایک علاقہ میں بھیڑوں کا ریوڑ عیش وآرام سے رہ رہا تھا انہیں کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ اتفاق سے شیروں کے جھنڈ نے وہاں پر آکر بھیڑوں کا شکار کرنا شروع کر دیا۔ ایک بھیڑ جو ان میں دانا وبینا تھی اس نے اپنی قوم کو اس ذلت سے نکالنے کی ایک ترکیب یہ سوچی کی بھیڑ چونکہ شیروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس وجہ سے شیروں کو اگر بھیڑ بنا دیا جائے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک بزرگ کی شکل اختیار کیا اور شیروں کے پاس گئی انہیں تشدد کے نقصانات بتا کر 'اہنسا' کی تعلیم دی۔ شیر خود بھی اس مشقت کی زندگی سے تھک چکے تھے اس وجہ اس کے جھانسے میں آگئے اور سبر ی خور بن گئے۔ ستم بالائے ستم انہوں نے اس کو تہذیب کا نام دے دیا۔ اس طرح ان کا رعب ودبدبہ ختم ہو گیا۔ اس پر تشریحی نوٹ لکھتے ہوئے پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''آپ نے اس حکایت کے اتنے ٹکڑے سے اس حقیقت کو بھانپ لیا ہو گا کہ علامہ اقبال کا اشارہ عرب اور ایران کی اس کشمکش کی طرف ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں تصوف جیسا غیر قرآنی تصور آگیا۔ عرب مسلمان اپنی قوتوں کے ساتھ ایران کے میدانوں میں آگئے اور ان ایرانیوں کو بری طرح سے شکست دی جو اہل عرب کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اہل ایران نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ وہ ان عربوں کا دین قبول کرلیں۔ دین تو انہوں نے قبول کر لیا لیکن ان کے سینہ میں انتقام کی آتش خاموش سلگتی رہی وہ میدان جنگ میں اپنی شکست کا انتقام نہیں لے سکتے تھے۔۔۔ انہوں نے قوت کے بجائے مکر وحیلہ سے کام لینے کی سوچی۔۔۔ عرب مسلمان ایک صاحب قوت قوم تھی جو افلاطون کے فلسفہ اور ارسطو کی منطق سے نا آشنا تھی۔ یہ ایرانی فلسفہ اور منطق کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اسلامی معاشرہ میں ہر طرف پھیل گئے اور اپنے تصورات اس انداز سے پھیلانا شروع کر دیا کہ عرب مسلمانوں کا سادہ ذہن اس کا حریف نہ ہو سکا۔۔''[1]

---

1 مجلس اقبال ص ۱۲۶

انہوں نے پوری تفصیل کے ساتھ ان امور پر روشنی ڈالی ہے جس کو علامہ نے اپنی مثنوی میں اشاروں کنایوں میں بیان کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایرانیوں نے عربوں کو تصوف کا جام پلا کر بزدل بنا دیا۔

پرویز نے کلام اقبال کی تشریح کے ساتھ کلام کی فنی باریکیوں پر بھی توجہ دی ہے ایک شعر کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں:

"زندگی صید افگن و دام آرزو
حسن را از عشق پیغام آرزو

زندگی کا کام یہ ہے کہ وہ کائنات کے تمام عناصر کو شکار کرتی چلی جائے۔ لیکن شکار بغیر جال کے ممکن نہیں، زندگی کے پاس وہ دام جس سے وہ ہر شے کا شکار کر سکتی ہے، آرزو ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس شکاری کے پاس جال ہی نہ ہو، وہ شکار کیا کر سکے گا؟

دوسرا مصرعہ بڑا ہی خوب صورت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عشق حسن کی طرف ایک ہی پیغام بھیجتا ہے اور پیغام ہوتا ہے آرزو۔ عشق در حقیقت نام ہی آرزو کا ہے۔ اگر آرزو کی چنگاری باقی نہیں تو سعلہ ِ عشق خود بخود بجھ جاتا ہے۔"[1]

پرویز نے جہاں مناسب سمجھا ہے اپنے تشریحی نوٹ میں اپنے مذہبی افکار کو بھی بیان کر دیا ہے۔ اسرار خودی کے اس شعر پر تشریحی نوٹ لکھا ہے:

بندہا"ئے کوہسار آساں گسیخ ییب
در زمین ہند تخم سجدہ ریخت"

وہ لکھتے ہیں:

"وہ غزنہ (اپنے وطن مالوف) سے چلے۔ راستہ میں بڑے بڑے پہاڑ ان کے سد راہ ہوئے۔ لیکن وہ ان تمام کو سر کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ آگے بڑھتے گئے، تا آنکہ ہندستان (پنجاب میں) پہنچ گئے اور یہاں آکر انہوں نے

---

1 مجلس اقبال ص ۱۴۵

اس کفر آباد میں توحید کی آواز بلند کی اور لوگوں کو بتایا کہ بتوں سے منہ موڑ کر کس طرح ایک اللہ کے سامنے جھکنا چاہئے۔

کس قدر مقام تأسف و تعجب ہے کہ آج ان کے مزار پر وہی کچھ ہو رہا ہے جسے بند کرنے کے لیے وہ یہاں آئے تھے لیکن اس میں کوئی تاسف کی بات ہے نہ تعجب کی۔ یہ شجر تصوف کا لازمی پھل ہے۔"[1]

چونکہ غلام احمد پرویز خود تصوف کے خلاف ہیں اس باب میں ان کے عقائد اقبال کے عقائد اور نظریات سے میل کھاتے ہیں اس وجہ سے انہوں نے اسی مثنوی کو اپنی تشریح کے لیے منتخب کیا ہے۔

مجموعی طور پر غلام احمد پرویز کا انداز اسرار خودی سے لے کر رموز خودی تک یکساں ہے۔ جو شعر ان کے یہاں جس قدر تشریح طلب ہے اسی قدر اس کی تشریح کرتے ہیں۔ بعض اشعار کی تشریح وہ چند جملوں میں کرتے ہیں تو بعض اشعار کے لیے کئی صفحات صرف کرتے ہیں۔ ان کی یہ شرح کلام اقبال کی شرحوں میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔

---

1 مجلس اقبال ص ۲۰۵۔۲۰۶

# خواجہ حمید یزدانی

کلام اقبال کے تمام مجموعوں کی شرح کے لیے اب تک صرف یوسف سلیم چشتی کا نام لیا جاتا تھا لیکن ابھی حال ہی میں خواجہ حمید یزدانی نے کلام اقبال کے اردو اور فارسی سبھی مجموعوں کی شرح ایک پروجیکٹ کے تحت مکمل کی ہے اس طرح خواجہ حمید یزدانی نے یوسف سلیم چشتی کی برابری کرلی ہے۔[1]

'شرح ضرب کلیم' جو اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے، اس کے مقدمہ میں وہ خود لکھتے ہیں:

> "راقم اس سے پہلے، نیاز صاحب کے ایما پر، علامہ کی تمام فارسی شاعری کی شرح و فرہنگ کا کام کر چکا ہے۔ چھ مجموعۂ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں، دو بھی انشاء اللہ العزیز، جلد چھپ جائیں گے۔ اب نیاز صاحب کی خواہش تھی کہ میں علامہ کی اردو شاعری کی تشریح ولغت کا بھی کام کروں۔ یہ ان کی محبت ہے کہ وہ مجھ سے یہ کام لے رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے شرح ضرب کلیم کا کام کیا ہے۔"[2]

یہ مقدمہ انہوں نے ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں لکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ۲۰۰۴ء تک اردو میں 'شرح ضرب کلیم' اور فارسی کے سبھی مجموعۂ کلام کی شرح لکھ چکے تھے۔

انہوں نے چوں کہ اپنی شرح عام طالب علموں کے لیے لکھی ہے اس وجہ سے طویل مباحث سے اجتناب کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

---

[1] خواجہ حمید یزدانی نے اگر چہ تمام کلام اقبال کی شرح لکھی ہے لیکن انہوں نے ارمغان حجاز کے فارسی والے حصہ کی شرح خود نہ لکھ کر ڈاکٹر سلیم اختر سے لکھوائی ہے۔ اس طرح حقیقی معنوں میں اب بھی یوسف سلیم چشتی ہی اکیلے تمام کلام اقبال کے شارح ہیں۔

[2] شرح ضرب کلیم، خوانہ حمید یزدانی، ص ۳، ایم آر پبلی کیشنز دہلی، یہ کتاب پاکستان میں سنگ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوئی ہے۔

"عربی مقولہ ہے ' المعنی فی بطن شاعر (کذا) معنی شاعر کے پیٹ / دل میں ہوتے ہیں۔ شاعر ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ہر شارح یا مترجم اپنے اپنے مطالعہ کے مطابق کسی شعر کا ترجمہ یا تشریح کرتا ہے۔ راقم نے اس کتاب کی تشریح خاصی محنت اور شوق و جذبہ کے تحت کی ہے۔ چوں کہ میرے پیش نظر عام قاری کی نسبت زیادہ تر طلبہ ہیں اس لیے یہ کوشش کی ہے کہ زبان سادہ اور عام فہم ہو، کسی بھی قسم کی فلسفیانہ بحثوں کو نہیں چھیڑا۔"[1]

یہی بات مصنف نے بال جبریل کے مقدمہ میں بھی لکھا ہے۔ 'شرح ارمغان حجاز' اس سلسلے کی سب سے پہلی شرح ہے اس کے مقدمہ میں بھی اسی امر کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"'ارمغان حجاز' کی زیر نظر شرح کا انداز کچھ اس طرح کا ہے جیسے کوئی استاد کلاس میں پڑھا رہا ہو۔ کلاس میں استاد ذرا تفصیل سے بات کرتا اور جملہ ہائے معترضہ اور مختلف مثالوں سے کام لے کر شعر کی توضیح کرتا چلا جاتا ہے لیکن یہاں طوالت سے بچنے کی خاطر اس قسم کی تفصیل سے اجتناب برتا گیا ہے۔"[2]

مصنف پہلے اقبال کی غزل یا نظم درج کرتے ہیں اس کے بعد ایک ایک شعر کی مختصر تشریح کرتے ہیں۔ یہ تشریح عموماً چند سطور پر مشتمل ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود مفہوم کی ترسیل میں وہ عموماً کامیاب رہے ہیں۔ کلام اقبال کی دیگر شرحوں کے مقابلہ میں حمید یزدانی کی شرحوں میں ایک خاص قسم کا تناسب ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی شعر کی تشریح میں کئی صفحات میں کی ہو اور کسی شعر کی تشریح کے بغیر صرف یہ کہہ کر گزر گئے ہوں کہ یہ عام فہم شعر ہے۔

خوانہ حمید یزدانی نے اپنا دامن غیر ضروری تفصیل سے بچا کر بھی اقبال کی نظموں اور غزلوں کے بارے میں ضروری تفصیلات کو بیان کر دیا ہے۔ اس کے لیے وہ بریکٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ ارمغان حجاز کی ایک نظم عصر حاضر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چہ عصر است این کہ دیں فریادی اوست
ہزاراں بند در آزادی اوست

---

[1] عرض شارح، شرح بانگ دراشارح ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

[2] شرح ارمغان حجاز ص ۳

زروئے آدمیت رنگ ونم برد
غلط نقشے کہ از بہزادی اوست

یہ کیسا دور ہے کہ دین اس کے ہاتھوں نالاں یا فریادی ہے۔ اس کی آزادی میں بھی ہزاروں قیدیں ہیں۔ (آج کے مسلمان اسلام سے دور ہو رہے ہیں۔ ان میں الحاد اور مادہ پرستی بڑھ رہی ہے۔ بظاہر وہ آزاد ہیں لیکن اپنی بے دینی کے باعث وہ کئی قسم کی غلامیوں کا شکار ہیں جبکہ صرف خدا کو حاکم مطلق مان کر وہ باطل قوتوں کے آگے سر نہیں جھکاتے تھے۔)

اس دور الحاد پرستی نے تو انسانیت کے چہرے کی چمک دمک اور نمی ہی ختم کر دی ہے۔ یہ ایک غلط نقش ہے جو اس کی مصوری کا نتیجہ ہے۔ (یہ نقش بظاہر لیکن بباطن برا ہے۔ آج کا آدمی انسانیت سے دور ہو گیا ہے اور مختلف برائیوں میں کھویا ہوا ہے۔)"[1]

یزدانی نے بریکٹ کے باہر والے حصے میں متن کی رعایت کی ہے اور اصل مضمون کی رعایت کرتے ہوئے اس کا ترجمہ کیاہے۔ لیکن اس کی تشریح کرتے وقت متن سے باہر کی چیزوں کو بھی شامل کیاہے تاکہ مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجائے۔

علامہ اقبال کی شاعری کے ساتھ یہ المیہ رہاہے کہ اس کی تعبیر کرتے وقت شارحین نے اپنے اپنے مطلب کی باتیں اخذ کی ہیں۔ ایک ہی بات کو آزادی سے پہلے کسی اور مفہوم میں لیا گیا اور آزادی کے بعد اس کی تفہیم ہندو پاک میں الگ الگ طرح سے کی جا رہی ہے۔ معاملہ صرف ان علامتوں کی تفہیم کا ہے جنہیں اقبال نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال کی مشہور نظم 'برہمن' جو 'ارمغان حجاز فارسی' میں شامل ہے اس کے اندر علامہ اقبال نے برہمن کے طرز عمل سے مسلمانوں کو سبق لینے کی تلقین کی ہے اور کہاہے کہ وہ تو اپنے بتوں سے لگا ہوا ہے، لیکن تم نے قرآن جو رشد وہدایت کا ذریعہ تھا اس کو طاق میں سجا کر رکھ دیاہے اس سے استفادہ ہی نہیں کرتے۔ برہمن تو تم سے زیادہ قوت و عمل والا ہے کہ وہ کم از کم بتوں کو تراشنے میں پتھروں کو ریزہ ریزہ کر ڈالتاہے۔ تم تو اس سے بھی گئے گزرے ہو۔ برہمن کی نظر ہمیشہ اپنے مقصد کی حصولیابی پر لگی رہتی ہے۔ وہ اپنے راز کسی کو نہیں بتاتا ہے۔ وہ کمال ہوشیاری سے ہمیں تسبیح کو ترک کرنے کو کہتاہے اور

---

[1] شرح بانگ درا ص ۸۸

خود اس کا یہ حال ہے کہ وہ زنار کو اپنے کندھے پر لیے چلتا ہے۔ برہمن کہتا ہے کہ غیر کے در سے اٹھ جاؤ۔ اہل وطن سے خیر کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔ ایک مسجد میں دو ملا نہیں سماتے لیکن بتوں کے جادو سے ایک ہی مندر میں سارے لوگ جمع ہیں۔

یہ اقبال کی نظم 'برہمن' کا مختصر خلاصہ تھا جس کو میں نے پیش کیا ہے۔ اس کے اندر مستعمل علامتیں مثلاً برہمن، دیر، تسبیح اور مسجد وغیرہ بہت معنی خیز ہیں۔ اگر ہم برہمن کو آسان زبان میں ہندو دھرم کا نمائندہ مان لیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے لیکن ہمارے بعض شارحین جن میں یزدانی بھی شامل ہیں اس شعر کو بھی دو قومی نظریہ کی عینک سے دیکھا ہے اور برہمن سے کانگریس اور غیر کی محفل سے اٹھنے کو تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت کی شمولیت مراد لیا ہے اس طرح یہ شعر مکمل طور پر الگ مفہوم کا ہو گیا ہے۔

خوجہ حمید یزدانی نے اس نظم کی جو تشریح کی ہے اس کا صرف بریکٹ کے اندر والا حصہ جو ان کی تشریح کا حصہ ہے اس کو درج کیا جا رہا ہے:

''اس میں اشارہ ہے برصغیر کی سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کی طرف جو درحقیقت ہندوؤں ہی کی سیاسی جماعت تھی جبکہ اس کے پلیٹ فارم سے یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ ہم سب، ہندو و مسلم ایک ہیں۔ اس جماعت میں جو مسلمان شامل ہوئے اسی نعرے سے متاثر ہو کر شامل ہوئے جبکہ یہ سراسر فریب تھا۔''

اس سے کانگریس کو مراد لینا متن کی عصمت کے خلاف ہے۔ اقبال نے یہاں صرف یہ پیغام دینا چاہا ہے کہ غیروں کی عیاری بھی دیکھئے اور اپنوں کی بے عملی بھی دیکھیں۔

'برہمن گفت 'برخیز از در غیر
زیاران وطن ناید بہ جز خیر
بیک مسجد دو ملامی نہ گنجد
زافسون بتاں گنجد بیک دیر'

اس شعر کی تشریح وہ کرتے ہیں:

'' برہمن (یعنی ہندو قوم یا نیشنل کانگریس) ہم مسلمانوں سے تو یہ کہتا ہے کہ غیر کے دروازے سے اٹھ جا۔ (یعنی انگریزوں کی غلامی چھوڑ دو اس غلامی کی وجہ سے یہ ملک ہمارا نہیں رہا۔ کانگریس نے اس ملک سے ہجرت کرنے کو کہا کہ یہ اب غیر یعنی انگریز کا ملک ہے۔ چنانچہ مسلمان اس کے فریب میں آ گئے۔ انہوں نے ملازمتیں چھوڑ دیں اور تحریک خلافت کے تحت مسلمان ملکوں کو ہجرت کر گئے جبکہ ہندو خود اسی ملک میں ڈٹا رہا اور انگریزوں کے ساتھ ساز باز کرنے میں لگا رہا۔''[1]

اس اقتباس میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ جنگ آزادی کے پس منظر سے ناواقفیت کی دلیل ہے یا آزادی کی جنگ کو ایک محدود عینک سے دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اقبال کے اتنے اہم مفہوم کہ ایک مندر میں کئی بت رہ سکتے ہیں مگر مسلمانوں کا انتشار اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ ایک مسجد میں دو ملا نہیں ٹھہر سکتے' کو اس اصل مفہوم سے ہٹا دیا دیا گیا ہے۔ اور شرح کے نام پر جو بھی کہا گیا ہے اس سے کلام اقبال کا واسطہ ہی نہیں ہے۔

خواجہ حمید یزدانی کے یہاں بعض جگہوں پر خود اعتمادی کی کمی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اقبال کے اس قطعہ

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اے ذات کریم! اے محبوب حقیقی! کیا تیری صراحی میں شراب نہیں رہی یا تو میرا ساقی ہی نہیں ہے اگر تو میرا ساقی اور تیرے پاس شراب بھی کبھی کم ہونے والی نہیں ہے پھر یہ کیا بات ہے؟ یا کیا یہ مناسب ہے کہ ایک پیاسے کو سمندر سے صرف شبنم کے چند قطرے ملیں۔ یہ تو (گستاخی معاف) رزاقی نہیں یہ تو سراسر بخیلی ہے۔ اس لیے

---

[1] شرح ارمغان حجاز فارسی ص ۹۱

کہ تیرا رزق ایک وسیع سمندر کی مانند ہے اور انسان گویا پیاسا ہے اسے زیادہ سے زیادہ رزق عطا ہونا چاہئے۔ (غالباً یہی مراد ہے) "[1]

یزدانی سے پہلے یوسف سلیم چشتی اور غلام رسول مہر کلام اقبال کی شرح لکھ چکے تھے۔ یزدانی اگر ان کی طرف رجوع کر لیتے تو انہیں 'غالباً' لکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

یزدانی کی شرح دوسری شرحوں سے اس معنی میں زیادہ اہم اور کارآمد ہے کہ ان کے آخر میں علامہ کی شاعری کی ایک فرہنگ بھی شائع کر دی گئی ہے۔ اس سے اس کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

مجموعی طور پر خواجہ حمید یزدانی کی شرحیں طلبہ کے لیے مفید اور کارآمد ہیں۔ انہوں نے اسی مقصد کے لیے انہیں لکھا تھا اس وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔

---

[1] شرح بانگ دراص ۸

# کتابیات

## بنیادی مآخذ

| اقبال | کلیات اقبال | شیخ غلام علی،لاہور،1973 |
|---|---|---|
| اقبال | کلیات اقبال(فارسی) | شیخ غلام علی لاہور،1973 |
| اقبال | Six Lectures On The Reconstruction Of Religious Thoughts In Islam | لاہور،1930 |
| بشیر احمد ڈار(مرتب) | انوار اقبال | اقبال کادمی،کراچی،1969 |
| بشیر احمد ڈار، (مرتب) | letters of Iqbal | اقبال اکادمی،لاہور،1978 |
| بی اے ڈار، (مرتب) | Letters and writings of Iqbal | اقبال اکادمی کراچی،1967 |
| جاوید اقبال،(مرتب) | Stray Reflection | شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور،1961 |
| رفیع الدین ہاشمی (مرتب) | خطوط اقبال | مکتبہ خیابان ادب،لاہور،1976 |
| سید عبدالواحد معینی،(مرتب) | مقالات اقبال | آئینۂ ادب،لاہور1963 |
| سید نذیر نیازی، | تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ | بزم اقبال،لاہور،1958 |

| | | |
|---|---|---|
| (مترجم) | | |
| شہزاد احمد (مترجم) | اسلامی فکر کی تشکیل نو | مکتبہ خلیل لاہور، 2000 |
| شیخ عطاء اللہ (مرتب) | اقبال نامہ، اول | شیخ محمد اشرف،لاہور، 1944، |
| شیخ عطاء اللہ (مرتب) | اقبال نامہ، دوم | شیخ محمد اشرف،لاہور، 1951، |
| محمد رفیق افضل (مرتب) | گفتار اقبال | ادارہ تحقیقات پاکستان، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، 1969 |
| محمد عبداللہ قریشی (مرتب) | اقبال بنام شاد | بزم اقبال،لاہور، 1986 |
| مظفر حسین برنی | کلیات مکاتیبِ اقبال | اُردو اکادمی. نئی دہلی، 1993 |
| وحید عشرت، (مترجم) | تجدید فکریات اسلام | اقبال اکادمی لاہور، 2003 |

## ثانوی آخذ

| | | |
|---|---|---|
| ابواللیث صدیقی | اقبال اور مسلکِ تصوف | اقبال اکادمی .لاہور 1977 |
| ابواللیث صدیقی | آج کا اردو ادب | قصر کتاب، کراچی 1981 |
| آتش بہاولپوری | نذرِ اقبال | انجمن ترقی اُردو. ہریانہ 1981 |
| احمد دین مولوی | اقبال | اسلامیہ پریس لاہور 1926 |

| احمد میاں اختر | قاضی اقبالیات کا تنقیدی جائزہ | اقبال اکادمی پاکستان لاہور 1965 |
|---|---|---|
| احمد ہمدانی | اقبال فکر کے آئینے میں | اقبال اکادمی. لاہور 1995 |
| اسد ملتانی | اقبال شناسی | نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد 1999 |
| اسد ملتانی | یہ ر اقبال | ادارہ روزنامہ شمسی. ملتان 1938 |
| اسلم انصاری | اقبال عہد آفرین | کاروان ادب، ملتان صدر 1987 |
| اسلوب احمد انصاری | اقبال کی تیرہ نظمیں | مجلس ترقی ادب، لاہور 1977 |
| آسی ضیائی | کلامِ اقبال کا بے لاگ تجزیہ | ت لمیٹڈ ،لاہور، 1957، |
| اشفاق حسین | مقامِ اقبال | ادارہ اشاعت اُردو. حیدرآباد دکن 1945 |
| اصغر عباس | سرسید اقبال اور علی گڑھ | ایجوکیشنل بک ہاؤس. علی گڑھ 1987 |
| اعجاز الحق قدوسی | اقبال کے محبوب صوفیاء | اقبال اکیڈمی. کراچی 1976ء |
| آفاق احمد | مجلس اقبال (حصہ چہارم) | کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز. بھوپال، 1994 |
| آفاق احمد | مجلس اقبال (حصہ ششم) | کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز. بھوپال، 1998 |
| افتخار حسین | شاہ اقبال اور پیروی شبلی | اعتقاد پبلشنگ ہاؤس. دہلی، 1978 |
| افضل حق قرشی | اقبال کا فکر و فن | بزم اقبال لاہور 1994 |
| اکبر حسین قریشی | طالعہ تلمیحات و اشارات اقبال | انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ 1970 |
| اکبر حیدری | اقبال اور علامہ شیخ زنجانی | کریان بک سیلرز، کشمیر 2002 |

| کشمیری | | |
|---|---|---|
| آل احمد سُرور | تشخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال | اقبال انسٹی ٹیوٹ. سری نگر1984ء |
| آل احمد سرور ، | اقبال کے مطالعے کے تناظرات | اقبال انسٹی ٹیوٹ. سری نگر1978ء |
| آل احمد سُرور | اقبال اور اُردو نظم | اقبال انسٹی ٹیوٹ. سری نگر1986 |
| آل احمد سُرور | اقبال کا نظریہ شعر اور شاعری | جامعہ لمیٖد . نئی دہلی1978ء |
| آل احمد سرور | اقبال اور مغرب | اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر1981 |
| آل احمد سرور | اقبال اور تصوف | اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر1980 |
| آل احمد سرور | تنقیدی اشارے | ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ1964 |
| آل احمد سرور | ادب اور نظریہ | ادارہ فروغ اردو لکھنؤ1954 |
| آل احمد سرور | دانشور اقبال | ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1996 |
| امین اندرابی | اقبال اور غزل | اقبال انسٹی ٹیوٹ. سرینگر1988 |
| امین اندرابی | اقبالیات کا تنقیدی جائزہ | اقبال انسٹی ٹیوٹ. سرینگر1997ء |

| | | |
|---|---|---|
| انور سدید | اقبال کے کلاسیکی نقوش | مکتبہ عالیہ. لاہور1988 |
| انور سدید | اردو ادب کی مختصر تاریخ | عالمی اردو ٹرسٹ2014 |
| انور سدید | مولانا صلاح الدین احمد ۔ ایک مطالعہ | اسلام آباد اکادمی ادبیات 1991 |
| ایس ایم منہاج الدین | افکار اقبال | کاروان ادب، ملتان 1986 |
| ایس ایم منہاج الدین | تصورات اقبال | کاروان ادب، ملتان 1989 |
| ایوب محمد صابر | معترضین اقبال | انٹر نیشنل اردو پبلی کیشنز، درناگنج2004 |
| بدرالدین بٹ | اقبال اور عالمِ عربی | اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر2007ء |
| بشیر احمد ڈار | انوارِ اقبال | اقبال اکادمی. کراچی، 1967ء |
| بشیر احمد نحوی | ذعاتِ اقبال | اقبال انسٹیٹیوٹ، کشمیر2001ء |
| بشیر احمد نحوی | وہ دانائے سبل ختم الرسل | اقبال انسٹیٹیوٹ، کشمیر2000ء |
| بشیر احمد نحوی | اقبال-ایک تجزیہ | اقبال انسٹیٹیوٹ، کشمیر2000ء |
| بشیر احمد نحوی | اقبال کی تجلیات | اقبال انسٹیٹیوٹ، کشمیر2002ء |
| بشیر احمد نحوی | اقبالیات۔گذشتہ دس سال | اقبال انسٹی ٹیوٹ، سری نگر، کشمیر2004 |

| | | |
|---|---|---|
| بشیر احمد نحوی | جامعہ کشمیر اور اقبالیات | اقبال انسٹیٹیوٹ. سری نگر2009 |
| بہار الہ آبادی | اوصافِ اقبال | چمن بک ڈپو. دہلی1981، |
| تحسین فراقی | نقدِ اقبال حیات اقبال میں | بزم اقبال لاہور1992 |
| ر. ہ فاضل | مطالعہ مثنوی اسرارِ خودی | اقبال انسٹی ٹیوٹ2000ء |
| توقیر احمد خاں | غبارے از جہان اقبال | ناشر مصنف خود2008 |
| توقیر احمد خاں | اقبال اور ہندوستان | نئی کتاب پبلی کیشنز، نئی دہلی2007 |
| توقیر احمد خاں | اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی | ناشر مصنف1989 |
| جابر علی سید | اقبال کا فنی ارتقا | بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور1978 |
| جاوید اقبال | زندہ رود اقبال | شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور1979 |
| جاوید اقبال | مئے لالہ فام | اقبال اکادمی لاہور1944 |
| جگن ناتھ آزاد | مُرقع اقبال | پبلیکیشنز ڈویژن حکومت ہند. نئی دہلی1977 |
| جگن ناتھ آزاد | اقبال اور مغربی مفکرین | مکتبۂ عالیہ. لاہور |
| جگن ناتھ آزاد | فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو | شاہین پبلشرز. سرینگر، 1994 |
| جگن ناتھ | اقبال : زندگی، شخصیت اور | نیشنل کونسل فار ایجوکیشن ریسرچ اینڈ ٹرینگ |

| | | |
|---|---|---|
| آزاد | شاعری | . نئ دہلی، 1977ء |
| جگن ناتھ آزاد | اقبال کی کہانی | ترقیِ اُردو بورڈ. نئ دہلی 1976ء |
| جگن ناتھ آزاد | محمد اقبال: ایک ادبی سوانح | ماڈرن پبلشنگ ہاؤس. نئ دہلی، 1983 |
| جگن ناتھ آزاد | اقبال اور اُس کا عہد | ادارۂ انیس. الہ آباد 1960 |
| جگن ناتھ آزاد | بچوں کا اقبال | کپور برادرس بک سیلرز اینڈ پبلشرز. سری نگر 1977ء |
| جگن ناتھ آزاد | اقبال اور کشمیر | علی محمد اینڈ سنز. سری نگر کشمیر 1977 |
| جگن ناتھ آزاد | ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد | مکتبہ علم ودانش لاہور |
| جمیل جالبی | علامہ اقبال خطوط کے آئینہ میں | ڈپارٹمنٹ آف فلسفہ، پنجاب یونی ورسٹی پاکستان 1985 |
| چراغ حسن حسرت | حیات اقبال | اقبال اکادمی، لاہور 1938 |
| حامدی کاشمیری | غالب اور اقبال - تخلیقی عمل کا مطالعہ | ادارہ ادب، سری نگر 1978ء |
| حامدی کاشمیری | اقبال کا تخلیقی شعور | اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر 2001ء |
| حمید احمد خاں | اقبال شخصیت اور شاعری | بزم اقبال، کلب روڑ، لاہور 1974 |
| خالد نظیر | اقبال درونِ خانہ | بزم اقبال. لاہور 1971 |

| مصنف | کتاب | ناشر |
|---|---|---|
| صوفی | | |
| خرم علی شفیق | ارتباط حرف و معنی | اقبال اکادمی لاہور |
| خرم علی شفیق | اقبال تشکیلی دور 1905 تا 1913ء) | اقبال اکادمی لاہور 2008 |
| خرم علی شفیق | اقبال درمیانی دور 1914 سے 1922ء تک | اقبال اکادمی لاہور 2008 |
| خلیفہ عبدالحکیم | فکر اقبال | ایجوکیشنل بک ہاؤس ، علی گڑھ 1977 |
| رشید احمد صدیقی | اقبال کی شخصیت اور شاعری، | مکتبہ جامعہ، دہلی 1977 |
| رضی الدین صدیقی | اقبال کا تصورِ زمان و مکان | مجلس ترقی ادب .لاہور 1973 |
| رفیع الدین ہاشمی | کتابیات اقبال | تاج بکڈپو .لاہور 1975 |
| رفیع الدین ہاشمی | علامہ اقبال مسائل ومباحث | اقبال اکادمی لاہور 2012 |
| رفیع الدین ہاشمی | اقبال شناسی اور "محور" | بزم اقبال،لاہور 1989 |
| رفیع الدین ہاشمی | 1985 کا اقبالیاتی ادب | اقبال اکادمی،لاہور 1986 |
| رفیع الدین ہاشمی | اقبال شخصیت اور شاعری | اکادمی،ادبیات،پاکستان 2008 |
| رفیع الدین | اقبالیات: تفہیم و تجزیہ | اقبال اکادمی لاہور 2005 |

| مصنف | کتاب | ناشر |
|---|---|---|
| ہاشمی | | |
| رفیع الدین ہاشمی | اقبالیاتی ادب 85 ایک جائزہ | اقبال اکادمی لاہور 1986 |
| رفیع الدین ہاشمی | اقبالیاتی ادب 86 ایک جائزہ | اقبال اکادمی لاہور 1988 |
| رفیع الدین ہاشمی | اقبالیاتی جائزے | اقبال اکادمی لاہور 1990 |
| رفیع الدین ہاشمی | پاکستان میں اقبالیاتی ادب (1927تا 2008ء) | اقبال اکادمی لاہور 2009 |
| رفیع الدین ہاشمی | تحقیق اقبالیات کے ماخذ | اقبال اکادمی لاہور 1996 |
| رفیع الدین ہاشمی | تصانیف اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ | اقبال اکادمی لاہور 1982 |
| رفیق زکریا | اقبال شاعر اور سیاستدان | انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1995ء |
| رئیس احمد جعفری | اقبال اور عشق رسول | شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور 1963 |
| رئیس احمد جعفری | اقبال اپنے آئینہ میں | چمن بک، دہلی 1978 |
| زیب النساء بیگم | اقبال اور بچوں کا ادب | ترقی اُردو بیورو. نئی دہلی 1992 |
| ساحل احمد | اقبال اور غزل | اُردو رائٹرس گلڈ. الہ آباد 1986 |
| ۔چدانند سنہا | IQBAL THE POET AND HIS MESSAGE | رام نرائن لال . ہ مر اینڈ بک سیلر، الہ آباد 1947 |

| | | |
|---|---|---|
| سردار جعفری | اقبال شناسی | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ1976 |
| سردار جعفری | ترقی پسند ادب | ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد1945 |
| سعید اختر درانی | اقبال یورپ میں | اقبال اکادمی، پاکستان1985 |
| سلطان محمود حسین | سید اقبال کی ابتدائی زندگی | اقبال اکادمی. لاہور1986 |
| سلمان اطہر جاوید | اقبال -ماورائے دیرو حرم | موڈرن پبلشنگ ہاؤس. نئی دہلی1992 |
| سلیم احمد | اقبال : ایک شاعر | قوسین، لاہور 1987 |
| سلیم اختر | اقبال اور ہمارے فکری رویے | ل پبلیشرز، لاہور1985 |
| سلیم اختر | اقبال شعاع صدرنگ | ل پبلیشرز، لاہور1985 |
| سلیم اختر | اقبال شناسی کے زاویے | بزم اقبال لاہور 1985 |
| سلیم اختر | اقبال ممدوح عالم | اقبال اکادمی لاہور1978 |
| سہل بخاری | اقبال ایک صوفی شاعر | مکتبہ اسلوب کراچی1988 |
| سید افتخار حسین | اقبال اور پیروی شبلی | اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی1978 |
| سید حامد جلالی | علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی1990 |
| سید صادق علی | اقبال کے شعری اسالیب | نازش بک سینٹر1999 |
| سید عابد علی عابد | تلمیحاتِ اقبال | بزمِ اقبال. لاہور1959ء |
| سید عابد علی | شعر اقبال | بزمِ اقبال.لاہور1959 |

| | | |
|---|---|---|
| عابد | | |
| سید عبداللہ | شیخ اکبر اور اقبال | مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور 979ء |
| سید عبداللہ | طیف اقبال | لاہور اکیڈمی لاہور 964ء |
| سید عبداللہ | مسائل اقبال | مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور 1974ء |
| سید عبداللہ | مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ | بزمِ اقبال لاہور 1984ء |
| سید عبداللہ | مقاصد اقبال | علمی کتاب خانہ لاہور 1981ء |
| سید عبدالواحد معینی | نقشِ اقبال | آئینۂ ادب۔ لاہور 1969ء |
| سید محمد عبدالرشید | علامہ اقبال اور تصوف | ادارۂ تنویرِ علم وادب۔ کراچی 1967 |
| عبدالرشید فاضل | اقبال اور عشقِ رسالتماب (ص) | ادارۂ تنویراتِ علم وادب۔ کراچی (س ن) |
| سید مظفر برنی | اقبال اور قومی یکجہتی | ہریانہ ساہتیہ اکادمی۔ چنڈی گڑھ، 1984، |
| سید نذیر نیازی | اقبال کے حضور | اقبال اکادمی۔ کراچی 1971 |
| سید نذیر نیازی | مکتوباتِ اقبال | اقبال اکادمی۔ کراچی، 1957ء |
| سید وقار عظیم | اقبال معاصرین کی نظر میں | مجلس ترقی ادب۔ لاہور 1973 |
| سیدہ خاتون | بیسوی صدی کے اردو مصنفین | ط: خود مصنف 2004 |
| شبنم منیر | اقبال کا تصورِ عشق | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2008 |
| شفیق عجمی | اقبال شناسی عالمی تناظر میں | پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور، |

| مصنف | کتاب | ناشر |
|---|---|---|
| | | 2011 |
| شکیل الرحمٰن | محمد اقبال | موڈرن پبلشنگ ہاؤس. نئی دہلی 1993 |
| شکیل الرحمن | اقبال اور روشنی کی جمالیات | اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی 1977 |
| شکیل الرحمن | اقبال اور فنون لطیفہ | شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجران کتب، سری نگر 1978 |
| شمس الدین صدیقی | قبال کی مابعد الطبعیات | اقبال اکادمی لاہور 1977 |
| شورش کاشمیری | اقبال پیامبر انقلاب | فیروز سنز. لاہور 1968 |
| شورش کاشمیری | اقبال ی مجرم | چٹان لاہور 1974 |
| شیخ اعجاز احمد | مظلوم اقبال | مصنف، کراچی 1985 |
| شیخ اکبر علی | اقبال اور اُس کی شاعری اور پیغام | کمال پبلشرز. لاہور 1946ء |
| شیم حنفی | اقبال کا حرفِ تمنا | انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی 1996 |
| صابر کلوروی | اشاریہ مکاتیب اقبال | اقبال اکادمی لاہور 1987 |
| صابر کلوروی | کلیات باقیات اقبال | کتابی دنیا، دہلی، 2004 |
| صلاح الدین احمد | مولانا صریر خامہ، جلد اول تصورات اقبال | ادارہ ادبی دنیا، لاہور 1965 |
| طارق سعید | اسلوبیاتِ اقبال | ایجوکیشنل بک. علی گڑھ 1991 |
| طارق ہاشمی | مولانا صلاح الدین احمد احوال وآثار | مقتدرہ قومی زبان، پاکستان 2011 |

| | | |
|---|---|---|
| الطاف حسین | اقبال اور اسلامی معاشرہ | گلشن پبلشرز. سرینگر 1995 |
| طاہر تونسوی | اقبال اور مشاہیر | مکتبۂ نعیمیہ. دہلی 1981 |
| طاہر تونسوی | اقبال شناسی اور نیا دور | ظفر سنٹر پرنٹرز شمع پلازہ، لاہور 1998 |
| طیب انصاری | خیالاتِ اقبال | ادبی مرکز. حیدر آباد، 1993 |
| ظ۔ انصاری | اقبال کی تلاش | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ 1978 |
| ظہیر الدین احمد جامعی | اقبال کی کہانی کچھ میری زبانی | اشاعت محل دارالسلام حیدر آباد 1952 |
| عارف بٹالوی | اقبال اور قرآن | ادبی پریس. کراچی 1950 |
| عاشق حسین بٹالوی | اقبال اور تحریک پاکستان | پنجاب یونیورسٹی. لاہور 1967 |
| عاشق حسین بٹالوی | اقبال کے آخری دو سال | اقبال اکیڈمی. کراچی 1969 |
| عالم خوندمیری | اقبال، کشش اور گریز | اقبال اکیڈمی، حیدر آباد 1985 |
| عامر حیات حسینی | اقبال اور مابعد التاریخ | اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر 1996ء |
| عبادت بریلوی | اقبال کی اُردو نثر | مجلس ترقی ادب. لاہور 1977 |
| عبادت بریلوی | اقبال - احوال و افکار | مکتبہ نعیمیہ. دہلی 1981، |
| عبد القوی | اقبال کی تلاش | جامعہ لمیٹڈ 1984 |

| | | |
|---|---|---|
| دسنوی | | |
| عبد المجید سالک | ذکر اقبال | اردو بازار دہلی1955 |
| عبد المغنی | اقبال کا نظام فن | ب اہتمام: اُردو بک فاؤنڈیشن. نئ دہلی 1984 |
| عبد المغنی | اقبال کا نظریہ "خودی" | ب اہتمام: مکتبۂ جامعہ ط . نئ دہلی1989 |
| عبدالمغنی | اقبال کاذہنی وفکری ارتقاء | باہتمام: انجمن ترقی اردو1991 |
| عبد المغنی | تنویر اقبال، | ب اہتمام: مکتبۂ تعمیر انسانیت، لاہور: 1990 |
| عبدالمغنی | اقبال اور عالمی ادب | بہیہ ط ب پبلی کیشنز، گیا1982 |
| عبدالحق | اقبال کی شعری وفکری جہات | شعبۂ اُردو. دلی یونیورسٹی. دہلی1998 |
| عبدالحق | فکرِاقبال کی سرگذشت | مصنف خود1989ء |
| عبدالحق | اقبال کے ابتدائی افکار | مصنف خود1969ء |
| عبدالحق | تنقید اقبال اور دیگر مضامین | جمال پرینٹنگ پریس دہلی ، 1976 |
| عبدالرحمن طارق | پیام اقبال | چمن بکدپور، اردو بازار، دہلی1938 |
| عبدالرحمن طارق | اشارات اقبال | کتاب منزل، کشمیری بازار،لاہور1951 |
| عبدالرحمن طارق | جہان اقبال | ملک دین محمد اینڈ سنس،اشاعت منزل، لاہور1947 |
| عبدالرحمن طارق | جواہر اقبال | ملک دین محمد اینڈ سنس،اشاعت منزل لاہور1953 |
| عبدالرحمن منشی | علامہ اقبال کی کردار کشی | جاوید اکادمی، ملتان، 1988 |
| عبدالسلام خورشید | سرگزشت اقبال | اقبال اکادمی،لاہور1977 |

| عبدالسلام ندوی | اقبالِ کامل | دارالمصنفین. اعظم گڑھ /1949 |
|---|---|---|
| عبدالقوی دسنوی | اقبال اور دارالاقبال بھوپال | نسیم بک ڈپو. لکھنؤ،1983، |
| عبدالقوی دسنوی | اقبال اور دلی | مکتبہ نئ آواز، جامعہ نگر، نئ دہلی1978 |
| عبدالقوی دسنوی | اقبالیات کی تلاش | مکتبۂ جامعہ . نئ دہلی1984ء |
| عبداللہ خاور | مفتاح اقبال (1) | اقبال اسٹی ٹیوٹ کشمیر1994ء |
| عبداللہ خاور | مفتاح اقبال (2) | اقبال اسٹی ٹیوٹ کشمیر2003ء |
| عبداللہ شاہ ہاشمی | اقبالیات نذیر نیازی | اقبال اکادمی لاہور1996 |
| عتیق صدیقی | اقبال جادوگر ہندی نژاد | 1980, |
| عزیز احمد | برصغیر میں اسلامی جدیدیت | ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور،1977 |
| عزیزاحمد | اقبال اور پاکستانی ادب | مکتبہ عالیہ،لاہور1977 |
| عزیزاحمد | اقبال اور نئ تشکیل | گلوب پبلشرز،لاہور1968 |
| عطیہ بیگم مترجم عبدالعزیز خالد | اقبال | آئینۂ ادب. لاہور1975 |
| علی سردار جعفری | اقبال شناسی | مکتبہ جامعہ دہلی1976 |
| علی عباس جلالپوری | اقبال کا علم کلام | مکتبۂ فنون. لاہور1972 |
| عمر حیات | اقبال اور مودودی کا تقابلی | مرکزی مکتبہ اسلامی. دہلی،1981 |

| خاں | مطالعہ | |
|---|---|---|
| غلام احمد پرویز | اقبال اور قرآن | ادارہ طلوع اسلام، کراچی1955 |
| غلام احمد پرویز | مجلس اقبال | (شرح اسرار خودی و رموز بے خودی) طلوع اسلام ٹرسٹ،لاہور1996 |
| غلام حسین | اقبال کا ذہنی و فکری ارتقاء (سرگذشتِ اقبال) | بزمِ اقبال. لاہور1998 |
| غلام حسین | ذوالفقار اکبر اور اقبال | مکتبہ عالیہ. لاہور1977 |
| غلام دستگیر | آثارِ اقبال | رشید ادارۂ اشاعت. حدرآباد دکن1944 |
| غلام رسول مہر | مطالب بال جبریل | بانگ درا، ضرب کلیم وغیرہ اعتقاد پبلشنگ ہاوس |
| لام مصطفٰ خاں | اقبال اور قرآن | اقبال اکادمی لاہور1988 |
| الف۔د۔ نسیم | مسئلہ وحدۃالوجود اور اقبال | بزم اقبال کلب،لاہور1992 |
| فرمان فتحپوری | اقبال سب کے لئے | یجوکیشنل پبلیبنگ ہاوس، دہلی ۱۹۸۰ء |
| فضل الٰہی عارف | متاع اقبال | شیخ غلام علی اینڈ سنز، مرز، ۱۹۷۷ |
| قاضی احمد میاں اطہر جوناگڈھی | اقبالیات کا تنقیدی جائزہ | اقبال اکادمی، کراچی1955 |
| قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی | شعریاتِ اقبال | شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ1986ء |
| قدوس جاوید | ء ب ملیقیہ | اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر2007 |

| | | |
|---|---|---|
| قدوس جاوید | اقبال کی جمالیات | اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر1998ء |
| گوپی چند نارنگ | اقبال کا فن | ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس. دہلی1983 |
| گوپی چند نارنگ | اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں | مکتبہ جامعہ |
| گوپی چند نارنگ | اقبال کا فن | ایجو کیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی1983 |
| گیان چند جین، | ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ وسال | اقبال اکادمی لاہور1988 |
| مجنوں گورکھپوری | اقبال اجمالی تبصرہ | ایوان اشاعت، گورکھپور1948 |
| محمد بدیع الزماں | پیامِ اقبال | ،بک امپوریم.پٹنہ1986 |
| محمد حمزہ فاروقی | حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے | جامعہ پنجاب.لاہور1988ء |
| محمد حمزہ فاروقی | سفر نامہ اقبال | ،مکتبۂ معیار، کراچی،1973، |
| محمد حنیف | اقبال پر نئی تنقید و دیگر مضامین | رضوان پبلی کیشنز.گیا1990 |
| محمد حنیف شاہد | اقبال چودھری محمد حسین کی نظر میں | سنگِ میل پبلیکیشنز. لاہور1975ء |
| محمد حنیف شاہد | مفکر پاکستان | اقبال اکادمی۔لاہور1982 |

| محمد سہیل عمر | خطبات اقبال۔نئے تناظر میں | اقبال اکادمی لاہور |
|---|---|---|
| محمد منظور عالم | کلام اقبال میں قرآنی آیات و احادیث اور مذہبی اصطلاحات کا جائزہ | انجمن ترقی اردو، دہلی1995 |
| محمد منور | ایقان اقبال | اقبال اکادمی، پاکستان1988 |
| محمد منور | میزانِ اقبال | اقبال اکادمی، لاہور1982 |
| محمد منور | قرطاس اقبال | اقبال اکادمی، پاکستان1998 |
| محمد منور | برہان اقبال | اقبال اکادمی پاکستان1987 |
| محمد ہاشم | اقبال -فکروفن | شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی. علی گڑھ1985 |
| محمد وسیم انجم | شخصیت: اقبال کا فن وادب | انجم پبلشرز. راولپنڈی1995 |
| محمد اسد اللہ وانی | اقبالیات آزاد | محروم میموریل لٹریری ساسائٹی . نئی دہلی 1997 |
| مسعود حسین خاں | اقبال کی نظری اور عملی شعریات | اقبال انسٹیٹیوٹ. سرینگر1983 |
| مظفر حسین برنی | کلیات مکاتیبِ اقبال | اُردو اکادمی. نئی دہلی،1993 |
| مظفر حسین برنی | محب وطن اقبال | ہریانہ ساہتیہ اکادمی،1984 |
| ممتاز حسن | اقبال اور عبدالحق | مجلس ترقی ادب. لاہور1973 |
| منظر اعجاز | اقبال اور قومی یکجہتی | انجم ترقی اردو، ہندجون1996 |
| منظر حسین | اقبال اور دانتے | لٹریری انفارمیشن سینٹر. رانچی1998 |
| منہاج الدین | اقبال و تصورات اقبال | کاروان ادب ملتان صدر1985 |
| مولانا سعید احمد اکبر آبادی | خطباتِ اقبال پر ایک نظر | 1983مارچ |

| | | |
|---|---|---|
| مولوی عبدالحق | دانائے راز | اقبال انجمن ترقی اُردو پاکستان. کراچی 1977 |
| میکش اکبر آبادی | نقد اقبال | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1953 |
| نذیر نیازی | سید دانائے راز | اقبال اکادمی پاکستان 1988 |
| نصیر احمد ناصر | اقبال اور جمالیات | اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1980 |
| نورالحسن نقوی | اقبال: فن اور فلسفہ | ایجوکیشنل بک ہاؤس. علی گڑھ 1999 |
| وحیدالدین | فقیر سید روز گار فقیر - حصہ دوم | مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، 1987 |
| وحیدالدین | فقیر سیدروز گار فقیر - حصہ اول | لائن آرٹ پریس کراچی 1966 |
| وحید عشرت | علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے عمرانی تصورات | بزم اقبال لاہور 1981 |
| وحیدالدین | مفکر اقبال | اقبال انسٹیٹیوٹ. سرینگر، 1987 |
| وقار عظیم | اقبال معاصرین کی نظر | میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1982 |
| یوسف حسین خان | غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات | غالب اکیڈمی، دہلی 1979 |
| یوسف حسین خان | روح اقبال | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ 1957 |
| یوسف حسین خان | روحِ اقبال | اعظم اسٹیم پریس. حیدرآباد دکن 1941 |

## رسائل وجرائد

| نقوش (اقبال نمبر) | محمد طفیل شمارہ104 | ادارہ فروغ اردو، لاہور |
| --- | --- | --- |
| شاعر (اقبال نمبر) | مدیر افتخار امام صدیقی | مکتبہ قصر الادب، ممبئ |
| اقبالیات (اقبال نمبر) | شہرت بخاری، 89/1990 | اقبال اکیڈمی، پاکستان |
| صحیفہ (اقبال نمبر) | وحید قریشی، کلب علی خان 66/1974 | زریں آرٹ پریس، لاہور |
| ادیب (اقبال نمبر) | 1/3/1989 | جامعہ اردو علی گڑھ |
| آج کل، دہلی (اقبال نمبر) | | 1977 |
| اقبال ریویو | جولائی1976 | اقبال اکیڈمی لاہور |

# Naaqadin -e- Iqbal Ka Tanqeedi Mutalaa

**Thesis submitted to the UNIVERSITY OF DELHI in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of**

**DOCTOR OF PHILOSOPHY**

**By**

**Uzair Ahmad**

**Under Supervision of**

**Prof. N. M. Kamal**

**DEPARTMENT OF URDU**

**UNIVERSITY OF DELHI**

**DELHI- 110007**

**2014**

# خلاصۂ بحث

# خلاصۂ بحث

علامہ اقبال اردو و فارسی کے عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر و فلسفہ کی دنیا آباد ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو وسعت دینے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ غزل، نظم، مثنوی، قطعہ، رباعی اور مرثیہ تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی اشعار کہے ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی، انگریزی، عربی، جرمن اور سنسکرت زبان سے واقف تھے اس وجہ سے ان کی نظر ان تمام زبانوں کے ادبیات پر تھی۔ یہ اقبال کی ایسی خصوصیات ہیں جن میں ان کا مدمقابل دور دور تک نہیں نظر آتا ہے۔

علامہ اقبال کی خوش قسمتی ہے کہ ان کی زندگی، شخصیت، فکر اور فن پر ان کی زندگی ہی میں مضامین اور کتابوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ رسائل کے خصوصی نمبر نکالے گئے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ علامہ اقبال اگرچہ انجمن حمایت اسلام کے جلسے (۲۴ فروری ۱۹۰۰ء) میں اپنی نظم ''نالۂ یتیم'' کے ذریعہ ایک محدود حلقے میں متعارف ہو چکے تھے لیکن ادبی دنیا میں وہ متعارف نہیں ہوئے تھے یہی وجہ ہے کہ سر عبدالقادر مدیر 'مخزن' نے اقبال کی نظم 'ہمالہ' شائع کرتے وقت ان کا تعارف ان الفاظ میں کرنا ضروری خیال کیا: ''شیخ محمد اقبال صاحب اقبال، ایم اے قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور، علوم مشرقی و مغربی دونوں میں صاحب کمال ہیں''[1]

حقیقی معنوں میں ادبی دنیا میں یہ اقبال کا پہلا تعارف تھا جو سر عبدالقادر نے اپنے رسالے میں کیا تھا۔ یہ تعارف ان کے اس مضمون سے پہلے کا ہے جسے اقبالیاتی ادب میں پہلا تنقیدی مضمون ہونے کا شرف حاصل ہے۔ سر عبدالقادر نے اس تعارف میں خصوصی طور پر اقبال کے مشرقی اور مغربی علوم سے واقفیت کا ذکر کیا ہے۔ بعد میں اقبال تنقید نے جو رخ اختیار کیا اس کی بنیاد یہی ہے۔ یہیں سے اقبال کے فن پر ان کی فکر کو ترجیح دینے کی روایت کا سراغ ملتا ہے۔ اس وقت کے ایک مشہور ادبی جریدہ 'خدنگ نظر' کے مدیر کی خواہش تھی کہ وہ اقبال کا تعارف اپنے رسالہ میں شائع کریں۔ اس کے لیے انہوں نے سر عبدالقادر سے گزارش کی۔ سر عبدالقادر چونکہ اقبال کے دوستوں میں سے تھے اس وجہ سے وہ اس کے زیادہ

---

[1] مخزن اپریل ۱۹۰۱ء

اہل سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اقبال پر ایک تعارفی مضمون لکھا جس میں انہوں نے اقبال کی تعلیم، زندگی کے اہم واقعات اور ان کی فکر و فن پر مختصر گفتگو کی۔ اس میں انہوں نے اقبال کی شاعری کے بارے میں بتایا کہ ان کا کلام ''قوت بیان اور جوش سخن کے ساتھ اعلیٰ درجے کی علمی معلومات کا ثبوت دے رہا ہے'' اور یہ رائے دی کہ ''جو کچھ اقبال نے اب تک لکھا ہے، وہ اس اعتبار سے، کہ ایک نوجوان انگریزی خواں کا کلام ہے جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علوم انگریزی کی تحصیل میں صرف کیا ہے اور جسے اہل زبان ہونے کا دعویٰ نہیں، نہایت بے بہا ہے اور مایۂ فخر و ناز ہے۔''[1]

ایک صدی سے بھی زائد عرصہ پر محیط اقبالیاتی ادب میں اس کثرت اور تواتر کے ساتھ لکھا گیا کہ اقبالیات کا ایک عظیم ذخیرہ وجود میں آگیا۔ ادب میں اقبالیات نے ایک شعبہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اقبالیات کیا ہے؟ یا دوسرے لفظوں میں کن کن چیزوں کو اقبالیات میں شمار کریں گے؟ اس بارے میں قاضی اختر میاں جونا گڑھی لکھتے ہیں:

> ''اقبالیات کا جائزہ لینے سے پیشتر یہ بتادینا ضروری ہے کہ اس اصطلاح سے ہماری مراد کیا ہے اور یہ جن چیزوں پر حاوی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں تمام تحریریں اور تقریریں، نظم و نثر خواہ وہ کسی زبان میں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ یا روایتی صورت میں اقبال کی زندگی، ان کی شخصیت، ان کے علمی و ادبی کمالات کے کسی پہلو اور کسی حیثیت سے نزدیک و دور کا تعلق رکھتی ہیں اقبالیات میں شمار ہوتی ہیں۔ اسی طرح خود علامہ اقبال کی اپنی تحریروں، تقریروں، مکاتیب، تصانیف اردو، فارسی، انگریزی وغیرہ بھی اس ضمن میں آجاتی ہیں۔''[2]

اس تعریف میں 'اقبالیات' میں اقبال پر لکھی گئی تنقیدی اور تحقیقی کتابوں کے علاوہ خود اقبال کی تحریروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہی بات صحیح بھی ہے۔ اس لیے کہ اقبال کی شعری اور نثری تحریریں ہی اقبالیات کی بنیاد ہیں۔ اسی خیال کی تائید رفیع الدین ہاشمی نے بھی کی ہے۔[3]

---

[1] خدنگِ نظر مئی ۱۹۰۲ء، بہ حوالہ: اقبال، جادوگرِ ہندی نژاد از عتیق صدیقی، علی گڑھ ، اگست ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۷، ۱۴۴

[2] قاضی اختر میاں جوناگڑھی اقبالیات کا تنقیدی جائزہ ص ۲

[3] مقدمہ اقبالیات کے سو سال

علامہ اقبال کی خوش بختی ہے کہ ان کی زندگی میں ہی ان پر اتنا کام ہو چکا تھا کہ ان پر لکھی گئی تحریروں پر تحقیق مقالات بھی لکھے جانے لگے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش قاضی اختر میاں جوناگڑھی کی ہے۔ ان کی کتاب 'اقبالیات کا تنقیدی جائزہ' اقبال کی وفات کے محض ۱۷ سال بعد ہی ۱۹۵۵ میں شائع ہو کر منظر عام پر آگئی تھی۔وہ لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے پیغام، ان کی شاعری، ان کے فلسفے اور ان کی علمی وادبی اور سیاسی کوششوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن ان کی تحصیلات اور کمالات کے پیش نظر یہ سرمایہ ابھی زیادہ سے زیادہ اضافہ کا محتاج ہے۔ اس سلسلے میں کئی کتابیں، مقالے اور مضامین شائع ہو چکے ہیں اور ان میں آئے دن جستہ جستہ اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ ہماری قومی زبان کے علاوہ دنیا کی کئی زبانوں میں بھی خاصہ لٹریچر شائع ہو گیا ہے۔ جس کو 'اقبالیات' کا موزوں نام دیا گیا ہے۔ اس خیال کے پیش نظر کہ اقبال پر کس حد تک کام ہوا ہے؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟ اور ہمیں اس سلسلے میں مزید کیا کام کرنا ہے؟ اس پورے لٹریچر پر ایک تنقیدی نظر ڈالنی ضروری ہے تاکہ ہم اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکیں اور یہ معلوم کر سکیں کہ ہمیں اقبال کی شخصیت، ان کے خیالات اور ان کے پیغام کو سمجھنے میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ہم نے عالم اسلام کی اس عظیم اور بلند ترین شخصیت کے افادات بہرہ مند اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کہاں تک کوشش کی ہے۔''[1]

انہوں نے یہ بات ۱۹۵۵ء میں لکھی تھی۔ تب سے اب تک اقبالیات میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ اقبالیات کے ہر گوشہ پر ناقدین اقبال نے اپنی کاوشوں کے ذریعہ اقبالیات کو وقار بخشا ہے۔

علامہ اقبال جیسے کثیر الجہات شاعر اور فلسفی پر لکھنے کے لیے یوں تو کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔ اقبالیات پر ہزاروں کتابوں کے باوجود اب بھی کچھ گوشے ایسے ہیں جو تشنۂ تحقیق ہیں۔ اب بھی تحقیق کے شیدائی اقبالیات کے بحر بے کنار میں غواصی کر کے کچھ نادر و نایاب موتی سامنے لاتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اقبالیات پر لکھنے والوں نے عموماً اقبالیات میں کوئی اچھی، عمدہ اور جامع کتاب نہ ہونے کا شکوہ کرتے ہوئے اپنی تحریر کو اس دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ یہ تحریر اقبال کے شیدائیوں کی ان محرومیوں کا مداوا ثابت ہو گی۔ اقبالیات میں دعوؤں کے باوجود ایسی کتابوں کی تعداد اتنی

---

[1] قاضی اختر میاں جوناگڑھی اقبالیات کا تنقیدی جائزہ ص ۱-۲، ناشر اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول ۱۹۵۵، طبع ثانی ۱۹۶۵

کم ہے کہ انہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے جو اقبال کے فکر و فن کی تفہیم میں زیادہ دیر اور دور تک ساتھ دے سکیں۔ اکثر کتابیں اقبالیات میں عددی اضافہ کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ الفاظ کے تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ سابقہ اقبال شناسوں کی باتوں کا اعادہ ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے فکر و فن پر لکھنے والے زیادہ تر ناقدین ناکام کیوں ہیں؟ راقم کی نظر میں اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی شاعری عام شاعروں سے مختلف ہے۔ اس کے اندر مشرق و مغرب کے فلسفہ کا نچوڑ ہے۔ وہ اردو، فارسی، عربی، انگلش، جرمن اور سنسکرت کی ادبیات سے واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر و فن پر ان سب سے خوشہ چینی کی مثالیں ملتی ہیں۔ اقبال پر لکھنے کے لیے ان سب کے بارے میں کم از کم بنیادی باتوں کا علم ہونا چاہئے، جسے عزیز احمد نے 'اطراف اقبال' کا نام دیا ہے۔ ہمارے ناقدین نے عموماً اطراف اقبال کو نظر انداز کر کے اقبال کے اشعار کے صرف چند مجموعوں سے سروکار رکھا ہے۔ اس طرح ان کو صرف ادھورا اقبال ہی ملا۔ علامہ اقبال کے فکر و فن پر متضاد ناقدین کی آراء کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اقبال پر بہت زیادہ لکھا جارہا ہے۔ ہر ناقد اپنے تنقیدی سفر کا آغاز عموماً اقبال سے کرتا ہے۔ یہ اقبال کی مقبولیت ہی نہیں بلکہ ان کی مظلومیت کی بھی دلیل ہے۔ ان مبتدیانہ تنقیدی کاوشوں کا ایک بڑا حصہ 'صاحب کتاب' بننے کی طلب کی وجہ سے کتابی صورت میں سامنے آجاتا ہے اور اقبالیات میں معیاری اضافہ کے بجائے خزف ریزوں کی تعداد میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

اس وجہ سے اس مقالہ میں اقبال شناسوں کی تنقیدی اور تحقیقی کاوشوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور معلوم کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ ان میں سے کس نے اقبال کے فکر و فن کے ساتھ انصاف کیا ہے اور کون کون ناکام رہے ہیں۔

علامہ اقبال ہندوپاک کے لیے نقطۂ اتصال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرحد کے دونوں طرف اقبال شناسوں نے اقبالیات میں ایک سے بڑھ کر ایک تحقیقی اور تنقیدی کاوشیں اہل علم کے سامنے پیش کی ہیں۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ہندوستان کے اقبال شناسوں کا پلڑا بھاری ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی، یوسف حسین خان، جگن ناتھ آزاد، کلیم الدین احمد اور پروفیسر عبدالمغنی اقبالیات کے وہ درخشندہ ستارے ہیں جن کے پایہ کے اقبال شناس وہاں بھی نہیں ہیں جہاں انہیں قومی شاعر تسلیم کیا گیا۔ اس سے پاکستان کے اقبال شناسوں کی تنقیص مقصود نہیں ہے۔ وہاں بھی سر عبدالقادر، محمد دین تاثیر، سید نذیر نیازی، خلیفہ عبدالحکیم اور رفیع الدین ہاشمی جیسے اقبال شناس ہیں جو اقبال کی حیات سے لے کر اب تک اقبالیات کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں اقبال شناسی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کے بارے میں

پائی جانے والی عقیدت ہے جو بعض دفعہ غلو کے دائرے میں بھی پہنچ جاتی ہے۔ اس غلو آمیز عقیدت میں علامہ کی فکر و فن کا تعین قدر دشوار گزار عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے بالمقابل ہندوستان کے اقبال شناسوں میں توازن و اعتدال زیادہ ہے۔ استثنائی صورتیں دونوں طرف ہیں لیکن تحقیق میں عموم سے بحث کی جاتی ہے استثنائی صورتوں سے نہیں۔ ہندوستان میں بھی آزادی کے بعد کچھ دنوں تک اقبالیات کو شجر ممنوعہ کی حیثیت حاصل تھی۔ چونکہ یہ کیفیت بدگمانی کے سبب تھی۔ اس وجہ سے بدگمانی کے بادل چھٹتے ہی اقبال کی فنی اور فکری صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا جانے لگا۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی اقبال صدی تقریبات پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ منائی گئیں۔

اقبالیاتی ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے ساتھ زیادہ ناانصافی کرنے والے وہ ہیں جنہوں نے اقبال کو ان کے مرتبہ سے بڑھا کر فرشتہ بنانے کی کوشش کی۔ یہ ناقدین، اقبال شکن کے زمرے میں رکھے جانے کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ناقدین نے اقبال تنقید کو اس کی اصل ڈگر سے ہٹا کر اس جگہ پہنچانے کی کوشش کی ہے جہاں اقبال کی تعین قدر ناممکن ہے۔

ایک صدی سے بھی زائد عرصہ پر محیط اقبالیاتی ادب کے سرمایہ کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کو ہندوپاک اور بیرون ملک میں توجہ دی گئی۔ زیادہ تر اقبال شناسوں نے اقبال کی فکر پر خوشہ چینی کی ہے۔ البتہ اقبالیات کے ابتدائی نقوش میں فکر و فن کا جو امتزاج ملتا ہے وہ بعد کی تحریروں میں نہیں ہے۔

اقبال کے سب سے پہلے ناقد سر عبدالقادر کی تحریریں ہوں، مولوی احمد دین کی کتاب 'اقبال'، یا محمد دین تاثیر کے مضامین ان سب کے یہاں ایسا نہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے صرف فکر یا صرف فن کا مطالعہ پیش کررہے ہیں۔ ان کے یہاں فکر و فن کا جو امتزاج ملتا ہے وہ بعد کے ناقدین کے یہاں نہیں ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بعد کے ناقدین نے اقبالیات میں وسعت کی وجہ سے اپنے ذہنی رویوں کو سامنے رکھتے ہوئے اقبال کا مطالعہ کیا ہے۔ کچھ اقبال شناسوں کو اقبال مفکر نظر آئے تو کچھ شاعر۔ بحیثیت مجموعی اقبال کی دونوں حیثیتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے لیکن شاعر اور دانشور کی کشمکش سب کے یہاں ہے۔

اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جو ہندوپاک میں یکساں مقبول ہیں، ان کا مطالعہ دونوں ممالک میں اپنے اپنے طور پر کیا گیا ہے۔ وہی اقبال جو ہندوستان میں محب وطن ہے، وطن دوستی کا نغمہ گاتا ہے، پاکستان میں دو قومی نظریہ کا داعی ہے۔ ہندوستان میں

ہندو مسلم دوستی کا نقیب ہے تو پاکستان میں اور خود ہندوستان کے کچھ حلقوں میں صرف مسلمانوں کا شاعر ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مطلب کی دلیلیں اقبال کے کلام سے پیش کرتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں اقبال ناقدین کے یہاں خصوصی طور پر اقبال کے سیاسی افکار کا مطالعہ کرنے والوں کے یہاں بکثرت ہیں۔ اقبال کے بعض کلام کو الگ الگ پس منظر میں پیش کرنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ یہ کلام اقبال کا اعجاز ہی ہے کہ ان کے کلام کی اتنی تعبیریں ممکن ہیں۔

فکر اقبال کے حوالے سے بہت کام ہوا ہے۔ اقبال کی زندگی سے لے کر اب تک یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں مشرق ومغرب کی خوشہ چینی اور خود اقبال کی جدت طبع کے نتیجہ میں فکر وفلسفہ کی جو دنیا آباد ہے وہ ناقد کی توجہ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد دین سے لے کر عصر حاضر کے ناقدین اقبال تک سب نے اقبال کی شاعری اور فن کی عظمت کے اعتراف کے باوجود اقبال کی فکر وفلسفہ پر توجہ زیادہ دی ہے۔

جہاں تک اقبال کی شاعری اور فن کا تعلق ہے یہ موضوع اب تک تشنہ ہے۔ اس موضوع پر اب تک سب سے عمدہ کوشش عابد علی عابد کی ہے۔ اس کے علاوہ مضامین کی شکل میں گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمن فاروقی کا کام ہے۔ اقبال کی شاعری اور فن پر کام کس قدر کم ہوا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال کی شاعری پر تنقید کی اکثر کتابیں یک موضوعی نہیں ہیں۔ عموماً مضامین کا مجموعہ ہیں۔ اس موضوع پر یک موضوعی کتاب عبدالمغنی کا 'اقبال کا فن' ہے ورنہ گوپی چند نارنگ، عبدالحق اور رفیع الدین ہاشمی کی کتابیں مختلف اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہیں۔

اقبال کی شاعری اور فن پر کم توجہ دینے کی وجہ سے اقبالیات کے بہت سے گوشے اب تک تشنۂ تحقیق ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کی 'تاریخ گوئی' پر کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ یہ ایک اہم موضوع ہو سکتا ہے۔ اقبال نے مختلف مشاہیر کی وفات پر تاریخیں کہی ہیں۔ ان میں اقبال کی فنی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر کی تلاش پر اب تک کوئی قابل قدر کوشش نظر نہیں آتی۔ اسی طرح اقبال کی شاعری میں واقعات، قصے کہانیوں کی ایک عجیب دنیا ہے۔ اس حوالے سے ابھی کام ہونا باقی ہے۔

عربی کے ایک صاحب معلقہ شاعر نے کہا تھا کہ ہمارے اسلاف نے ہمارے لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں کہ ہم کسی موضوع پر کچھ کہیں۔ اس شاعر کا یہ شکوہ اس وقت کا ہے جس کو زمانۂ جاہلیت کا دور کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود روزانہ نئی نئی باتیں شاعری اور ادب میں سامنے آتی ہیں۔ ایک ہی بات کو الگ الگ انداز سے پیش کرکے شاعر اپنی مہارت کا ثبوت دے رہے ہیں۔

اقبالیاتی تنقید پر بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ ایک صدی تک مسلسل لکھے جانے کے باوجود اقبالیات پر کچھ گوشے ایسے نکل آتے ہیں جن پر کام ہونا باقی ہے یا ان پر حقیقی معنوں میں کام نہیں ہوا ہے۔

اوپر میں نے اقبال کی شاعری کے حوالے سے کچھ موضوعات ایسے شمار کرائے ہیں جن پر کام نہیں ہوا ہے یا جو کام ہوا ہے اس میں تشنگی ابھی باقی ہے۔ اقبال کے فن پر بھی بہت زیادہ لکھے جانے کے باوجود اب تک کچھ ایسے موضوعات ہیں جو توجہ طلب ہیں۔ ابھی بھی کسی ایسے ناقد و محقق کا منہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ آئے اور اس کام کو انجام دے۔

اقبال اور قرآن کے رشتہ پر غلام مصطفی خاں کا کام 'اقبال اور قرآن' ہے۔ اس کے علاوہ دیگر لوگوں نے بھی کام کیا ہے۔ لیکن یہ سبھی کام معیاری نہیں ہیں۔ انہوں نے اقبال کے کلام کو توڑ مروڑ کر قرآن کی آیت کا ترجمہ اور مفہوم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے وہ اکیلے نہیں ہیں۔ اقبال اور قرآن پر جن لوگوں نے بھی کام کیا ہے ان سب نے عموماً مضحکہ خیز کام کیا ہے۔ اس وجہ سے یہ کام ابھی بھی توجہ طلب ہے۔

فکر اقبال کے حوالے سے ایک اور موضوع ہے جس پر ابھی تک توجہ نہیں دی گئی۔ وہ ہے اقبال اور حدیث کا رشتہ، علامہ اقبال کا حدیثوں کے تعلق سے کیا نظریہ تھا اس پر سرسری گفتگو ہوئی ہے۔ اقبال کے کلام میں وارد احادیث پر ضمناً کام ہوا ہے۔ لیکن کوئی ایسی منظم کوشش سامنے نہیں آئی ہے جس میں اقبال کے نظریۂ حدیث پر گفتگو کی گئی ہو اور کلام اقبال میں وارد احادیث کی فنی اور اسنادی حالت کو بیان کیا گیا ہو۔

فکر اقبال پر لکھی گئی کتابوں میں سب سے اچھی کتابیں وہی ہیں جن کو اقبال کے ہم عصر احباب نے لکھا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی 'فکر اقبال' اور یوسف حسین خان کی 'روح اقبال' اب بھی اس موضوع پر مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جہاں تک اقبال کی سوانح عمریوں کا معاملہ ہے اس میں بھی رطب و یابس کو جمع کر کے اقبالیات کا دامن بھرا گیا ہے۔ اس معاملہ میں اگرچہ جاوید اقبال کی 'زندہ رود' سب سے تحقیقی ہے لیکن اس میں بھی اقبال کے بارے بہت ساری بے سر و پا باتیں آگئی ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی نے اس کمی کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود اب بھی کسی اچھی جامع و مانع سوانح کی ضرورت باقی ہے۔

کلام اقبال کی شرحوں کا معاملہ سب سے نرالا ہے۔ غلام رسول مہر سے لے کر خواجہ حمید یزدانی تک سب نے اپنے اپنے انداز سے کلام اقبال کی شرح لکھی ہے۔ ان شرحوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر کے یہاں توازن کی کمی ہے۔ اکثر من مانی تاویلیں کی گئی ہیں۔ اقبال کے کلام کی آڑ میں اپنے افکار و نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ بعض شرحیں اتنی مختصر ہیں کہ انہیں شرح کے زمرے میں رکھنے میں تردد ہوتا ہے۔ جب کہ بعض شرحیں اتنی طویل ہیں کہ ان کو پڑھنا بھی ایک مشکل امر ہے۔ غلام رسول مہر کی شرح مختصر ہوتے ہوئے بھی اقبال کی شرحوں میں سب سے عمدہ ہے لیکن اقبال کے عربی وفارسی کلام کو محیط نہ ہونے کی وجہ سے یہ بھی مکمل نہیں ہے۔ اقبال کے اردو کلام کے علاوہ عربی وفارسی کلام کو محیط جب تک کوئی اچھی اور جامع شرح نہ لکھی جائے یوسف سلیم چشتی اور خواجہ حمید یزدانی کی شروحات ہی سے کام چلانا پڑے گا۔

یہ تھا اقبال تنقید کے اب تک کی پیش رفت کا مختصر جائزہ۔ اقبال شناسوں کی ایک بڑی تعداد اب بھی اپنی تنقیدی اور تحقیقی کاوشوں کو پیش کر رہی ہے اور مستقبل میں بھی کرتی رہے گی۔ اس وجہ سے اسے اقبالیات کا مکمل جائزہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔